یا معین
ہو الکل
ہو الکل
ہو الکل
سی پارۂ دل
یعنی
مجموعہ مضامین خواجہ حسن نظامی
حصہ اول
جس کو
پیرزادہ سید محمد صادق صاحب کارکن حلقۃ المشائخ
ڈاکخانہ عرب سرائے دہلی نے
۱۳۳۴ھ

قیمت

Sipara-1-Dil

از واقف اسرار انشا پردازی جناب مولانا مولوی عبدالحق صاحب بی۔ اے

سکریٹری انجمن ترقی اُردو و افسر محکمۂ تعلیم

اقلیم دکن

دو زبان میں نثر کا دور تھوڑے ہی عرصہ سے شروع ہوا ہے۔ اسکی ابتدا بھی مثل بعض زبانوں کے شاعری ہی سے ہوئی اور کیوں نہ ہوتی، اِس بھاشا کا دودھ پیا ہے۔ جو گویا شاعری ہی کے لئے بنی تھی۔ سب سے پہلے میر امن نے نثر کا سکّہ جمایا اور حقیقت یہ ہے کہ اُس کی کتاب اپنے رنگ میں بے مثل ہے۔ اِس کے بعد مرزا نوشہ۔ پھر سیّد احمد خاں۔ مولانا حالی۔ نذیر احمد۔ مولینا آزاد لانا شبلی نے اِس کا وہ رُتبہ بڑھایا کہ نثر نظم پر سبقت لے گئی۔

بکل خواجہ حسن نظامی صاحب نے اِس میدان میں اشہبِ قلم دوڑایا ہے اور کوس "لن ترانی" بجایا ہے۔ اِن کا رنگ سے نرالا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ آزاد کا رنگ اُڑایا ہے۔ یہ صحیح نہیں۔ اِس میں شک نہیں کہ آزاد کی جھلک پائی جاتی ہے وہ ہیں اِس سے بالکل الگ ہے۔ آزاد میں تصنع زیادہ ہے۔ خواجہ صاحب کے جُملے اور فقرے بھی اگرچہ فکر و تراش سے خالی نہیں لیکن اُسے اِس خوبی سے چھپایا ہے کہ بے تکلفی اور بے ساختہ پن قربان ہو ہو جاتی ہے۔ بلکہ دیکھا جائے تو خواجہ صاحب کا رنگ غالب سے بہت ملتا جلتا ہے۔ لیکن فرق یہ ہے کہ ظرافت کی چاشنی نہیں، مگر اس کی بجائے سوز و گداز ہے۔ مرزا کے فقرے ں کے ساتھ محبت میں گھلے ہوئے ہوتے ہیں۔ خواجہ صاحب کے مضمون درد سے بھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ خواجہ صاحب رت میں چوچلا بھی ہے جو سیدھی سادی بات کو پھول کی طرح شگفتہ کر دیتا ہے۔ مرزا ایک ذرا سی ترکیب لفظی یا ایک جملے ہ کچھ کہہ جاتے ہیں کہ آدمی مزا لیتا رہے۔ خواجہ صاحب اپنے اپنے مضمون میں ایک ایک جُز کو الگ الگ کر دکھاتے اور وہ گلکاری ہیں کہ آدمی عش عش کرے۔

و حکیمانہ اسرار اور فلسفیانہ نکات چاہتے ہیں۔ یہ تحریریں اُن کے لئے نہیں۔ یہ اُن کے لئے ہیں جو دل رکھتے ہیں۔ جو عقل ت سے راز دہر کی جستجو میں ہیں اُن کی نظروں میں شاید یہ نہ جچیں گی۔ لیکن جو دردِ دل اور عشق و محبت کے توسّل سے وہاں پہنچنا تے ہیں، اُنہیں اِس میں لطف آئیگا۔

یہ اخلاقی مضامین نہیں، لیکن اخلاق کا رنگ اِن سے ٹپکتا ہے۔ اِن میں تصوّف کا دعوےٰ نہیں، لیکن تصوّف کی بو اِن میں پاتی ہے۔ یہ معاشرتی تحریریں نہیں، لیکن معاشرت کی اصلاح اِن میں نظر آتی ہے۔ یہ حکیمانہ رسائل نہیں، لیکن حکمت اِن کی تہ ہے۔ ہر کوچہ کی سیر کی ہے اور ہر گلی کی خاک چھانی ہے۔ کہنی اور اَن کہنی سب کچھ کہدی ہے۔ آگے پڑھنے اور سمجھنے والے کی صلاحیت

پر سوقوت ہے۔

اِن مضامین میں کہیں خواجہ صاحب کسی سے باتیں کرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں کہیں وہ اپنے سے ہمکلام ہیں۔ کہیں رازِ دنیا ہے۔ کہیں دردِ دل کی داستان ہے اور اپنا اور ہمارا دُکھڑا رو رہے ہیں۔ کون ہے جو "ایک غریب کے گھر" کو دل تھامے بغیر پڑھ سکتا ہے؟ کہیں تخیّل کا زور عرش تک لے گیا ہے کہیں نثر میں وہ شاعری کی شان دکھائی ہے کہ نظم مقفّٰے ہیچ ہے۔ کہیں ذرّے کو آفتاب بنایا ہے اور کہیں آفتاب کو خاک۔ غرض عجیب گلدستہ ہے جس میں ہر رنگ کے پھول اور ہر پھول میں نئی خوشبو ہے۔ گو سب کچھ ہے مگر سُر وہی ہے اور لَے میں فرق نہیں آیا ہے۔

لیکن معترض یہ پوچھتا ہے کہ آخر اِس کی غرض کیا ہے؟ خواجہ صاحب کیا چاہتے ہیں؟ اُن کا مشن کیا ہے؟ کوئی خاص غرض و غایت بھی ہے یا یوں ہی ٹُک سے ٹُک جو جی میں آتا ہے کہے چلے جاتے ہیں۔ وہ جواب دیتے ہیں کہ "میں مدینہ نگری سے پریم کا سندیسا لایا ہوں" اور یہ کہکے چُپ ہو جاتے ہیں اور اُن کی چُپ سے جی گھبراتا ہے۔

بعض لوگ کہیں کہیں مضمون کی طوالت سے گھبرائیں گے۔ کہیں کہیں وہ بظاہر بے ربطی سی پائیں گے۔ کہیں مضمون و طرزِ تحریر کی یکسانی سے اُکتائیں گے۔ کہیں عامیانہ باتوں پر ناک بھوں چڑھائیں گے۔ لیکن یاد رکھنا چاہئے کہ اِنہی عامیانہ باتوں میں کام کی باتیں بھی ہوتی ہیں۔ عُرفی نے خوب کہا ہے۔ ع اینہا ہمہ راز است کہ معلوم عوام است

ہاں نظر ہونی چاہئے ؎

اُس کی خوبی کے تو کیا کہنے مگر دیکھنے والے کو دیکھا چاہئے (داغ)

آپ پڑھ کے دیکھئے اور خود اندازہ کیجئے، کسی کے کہنے پر نہ جائیے۔ جی کو لگے تو کہنے والے کی محنت کی داد دیجئے نہیں تو خاموش ہو رہیے۔ شاید ابھی اِس کا وقت نہیں آیا۔

زبان کی نسبت کچھ کہنا فضول ہے۔ ظاہر ہے۔ عیاں ہے۔ ایک صاحب نے مجھسے پوچھا کہ میں اچھی اُردو سیکھنا چاہتا ہوں کیا پڑھوں؟ میں نے کہا اگر تم صاف ستھری اور نکھری ہوئی اُردو اور دلّی کی اصل زبان پڑھنا اور سیکھنا چاہتے ہو تو خواجہ حسن نظامی کی تحریر پڑھو کہ زبان کے مزے کے ساتھ دلی کیفیات اور جذبات کا لطف بھی آئے۔ اِس میں کسے انکار ہو سکتا ہے؟

آجکل اپنی جہالت چھپانے یا اپنی علمیّت جتانے کے لئے خواہ مخواہ بعض لوگ عربی۔ فارسی ترکیبوں اور مشکل اور دقیق الفاظ کا بوجھ بیچاری اُردو کی گردن پر ڈال دیتے ہیں کہ وہ اِس کی متحمّل نہیں ہوتی۔ یہ اُردو کی ترقّی نہیں، تنزّل ہے۔ کوشش یہ ہونی چاہئے کہ اُردو سب میں مقبول ہو مگر ان تحریروں سے وہ مردود ہوتی ہے۔ جو فصاحت سادگی میں ہے وہ اِن پیچیدہ اور مغلق تحریروں میں کہاں یہ گُر کوئی خواجہ صاحب سے سیکھے۔

میں کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا کہ عقل نے اجازت نہیں دی اور مصلحت نے قلم روک دیا اور کہا کہ "بس"*

عبدالحق

دیباچہ طبع اوّل

از جناب مولوی غلام بھیک صاحب بی۔ اے فقیر اللہ شاہ نظامی وکیل سرکار انبالہ

مولٰنا خواجہ حسن نظامی زید مجدہ السامی اپنی نسبی اور خاندانی حیثیت سے میرے محترم مخدوم ہیں اور دیرینہ ذاتی تعلقات کے اعتبار سے ایک شفیق اور عزیز دوست۔ مصنف اور تصنیف کا تعلق فرزند و پدر کا سا ہوتا ہے۔ یعنی جو تحریریں اس مجموعے کی شکل میں شائع ہوتی ہیں وہ میرے ایک مخدوم دوست کے معنوی فرزند ہیں اور اسی نسبت سے مجھکو عزیز ہیں۔ دیباچہ کا کام کسی کتاب کا اُس کے ناظرین سے تعارف کرانا ہے۔ گویا یہ مختصر تمہید لکھکر میں اپنے ایک مخدوم دوست کے فرزندانِ معنوی کو اہل بصیرت سے روشناس کرا رہا ہوں۔ صاف ظاہر ہے کہ یہ کام میرے لئے خاص طور سے باعث مسرت ہے۔

جو تحریریں اِس کتاب میں جمع کرکے شائع کی جاتی ہیں یہ وقتاً فوقتاً اخباروں اور رسالوں میں چھپکر قبول خاص کا تمغہ اور دلچسپی عام کا خلعت حاصل کرچکی ہیں۔ لیکن پھر بھی اِن کو ایک مجموعہ کی صورت میں شائع کرنا مصنف اور ناظرین دونوں کے لیے ضروری اور مفید ہے جس غرض اور غایت کیلئے مصنف نے اِس قدر محنت اور دماغ سوزی گوارا کی وہ اوراق پریشاں کی نسبت مجموعہ سے بہتر حاصل ہوسکتی ہے گویا ایک ایک سپاہی کا فرداً فرداً غنیم پر حملہ کرنا وہ اثر ہرگز نہیں رکھ سکتا جو ایک فوج کی فوج کا یک تحت حملہ کرنا رکھتا ہے۔ یا یوں سمجھو کہ اب تک یہ پھول کے پودے الگ الگ کیاریوں میں لگے ہوئے تھے۔ اور اب سب کے سب ایک کیاری میں قرینے سے لگادئے ہیں۔ تاکہ سیر کرنے والے کا دماغ یکایک مہک اُٹھے۔ آنکھیں مجموعی نظارے سے تازہ ہوجائیں اور اُس کو بہت سی کیاریوں میں گھومنے کی زحمت گوارا نہ کرنی پڑے۔

یہ ایک بدیہی اور مشہور بات ہے کہ اِس زمانہ کے ممتاز اہل قلم میں خواجہ صاحب ایک امتیاز خاص رکھتے ہیں۔ اِن کا رنگ گفتگو طرزِ بیان۔ اندازِ خیال۔ جیسا مقبول ہے ویسا ہی نرالا اور اچھوتا بھی ہے۔ زبان سادہ اور شیریں۔ محاورہ ٹکسالی اور نگین بیان رواں اور دلنشین۔ بناوٹ سے معرا۔ تصنع سے مبرا۔ غرض انداز مقال ہے کہ ایک سحر حلال ہے۔ علاوہ ازیں اِن کی نگاہ حقیقت شناس ہر چھوٹے بڑے واقعہ میں ایک بڑا سبب اور بڑا نتیجہ دیکھتی ہے۔ معمولی بلکہ بظاہر گھٹیا چیزوں کے مشاہدے سے اعلیٰ روحانی و اخلاقی سبق حاصل کرتی ہے حتیٰ کہ وہ عزلت گزین گوشہ نشین شب بیدار پرندہ یعنی اُلّو جو اہل ملامت کی سنت پر عمل کرکے عام طور سے لوگوں کی نفرت اور ظرافت کا ہدف ہی بنا رہتا ہے خواجہ صاحب کی نگاہوں میں ایک خاص وقعت رکھتا ہے۔ اور اِن کو اِس کی زندگی کے تاریک اوراق میں بڑے بڑے سبق لکھے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ دیا سلائی کے ننھے سے تنکے سے خواجہ صاحب کا گوش ہوش وہ وہ ترش باتیں سنتا ہے جن سے حضرت انسان کا نشۂ خود پسندی ہرن ہوجاتا ہے۔

خواجہ صاحب کی تحریروں کی سب سے بدیہی خصوصیت قومی ہمدردی ہے۔ لیکن یہ وہ قومی ہمدردی نہیں جو واقعات کو سطحی نگاہ سے دیکھنے والے۔ دقائق اسلام سے بے خبر اور بے سوچے سمجھے تقریریں کرنے والے لکچرار ظاہر کیا کرتے ہیں بلکہ یہ قومی ہمدردی حقائق شناسی پر مبنی ہے۔ اِس ہمدردی کی وجہ سے خواجہ قوم کی حالت کو اس کے اعمال کا نتیجہ تصور کرتے ہیں اور اِس کو جابجا عبرت کا سبق دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر دیکھیئے۔ خواجہ صاحب کو خاندان تیموریہ کے بعض حالات اور غدر ۱۸۵۷ء کے بعض واقعات کی خاص واقفیت حاصل ہے کچھ تو یہ واقعات اور حالات بجائے خود عبرتناک اور درد انگیز ہیں اور کچھ

خواجہ صاحب کی طرزِ بیان کا جادو سونے پر سہاگے کا کام کرتا ہے اور انسانی ہمدردی کی رگ پر جگہ جگہ نشتر لگاتا ہے۔ لیکن ان واقعات میں بھی سلسلۂ علت و معلول کو خاص صوفیانہ نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ مورخانہ طبیعت کے انسان کو خاندان تیموریہ کی تباہی کے اسباب تاریخ خالص پولیٹیکل رنگ میں نظر آئینگے۔ لیکن خواجہ صاحب کے نزدیک اس کے اسباب بھی روحانی ہیں۔ اور اس کے سبق بھی روحانی۔ اُن کے نزدیک سلطنتِ مغلیہ تاجداروں اور اُن کے خاندان کی بداعمالیوں کی وجہ سے تباہ ہوئی۔ اور یہ تمام داستان ایک دفترِ عبرت ہے جس سے دنیا کی بے ثباتی تکبر و نخوت کی سفاہت اور مردم آزاری کی مذمت دلوں پر نقش ہونی چاہئے (ملاحظہ ہو صفحہ ۱۳ و صفحہ ۱۵)

اہلِ طریقت کو سرِ دلبراں در حدیثِ دیگراں گفتن کے فن میں ہمیشہ سے کمال رہا ہے چنانچہ خواجہ صاحب بھی اس فن میں یدِطولیٰ رکھتے ہیں۔ مثلاً "خدائی گراموفون" "کھٹکا" وغیرہ وغیرہ معمولی معمولی عنوان قائم کر کے طریقت اور تصوف کے نکات بڑی دلچسپی کے ساتھ بیان فرماتے ہیں۔ اور ان عام پسند اور عام فہم پیرایوں میں ان مسائل کو بیان کر کے اس زمانہ کے مادہ پرستوں کی توجہ کامیابی کے ساتھ حقائقِ اسلام کی طرف منعطف کرتے ہیں۔ اس رنگ کے مضامین کی اس زمانے میں بہت ضرورت ہے۔ دہریت اور مادیت کا چاروں طرف زور ہے۔ اور معاش و معاد کے گہرے مسائل کی طرف جدید تعلیم یافتہ حضرات کو کافی اعتنا نہیں ہے کاش کہ اس قسم کی تحریروں سے اُن کو ایسے مسائل پر غور کرنے کی عادت ہو۔

یہ سب کچھ ہے مگر سب سے زیادہ قابلِ قدر وہ خاص خاص تحریریں ہیں جن کو دیکھکر قلب و روح میں ایک برقی رو دوڑ جاتی ہے جن کو پڑھکر زبان یا قلم سے پہلے آہِ سرد اور چشمِ تر داد دیتے ہیں۔ مثلاً "مستِ الست کی دعا" "مزارِ حضرت یوسفؑ پر دعا" "محرابِ حضرت زکریاؑ میں دعا" "استقبالِ رسولؐ" "مستانہ بزمِ مولود" "حالِ دل" وغیرہ۔ ان مضامین میں اس جوہر کی خاص جھلک ہے جس کے بغیر کسی مومن کا ایمان مکمل نہیں ہوتا۔ یعنی شاہنشاہِ اقلیمِ رسالت کی ذاتِ احسن الصفات کا عشقِ صادق۔ اور جب کتاب میں یہ صفت ہو اس میں اور کسی صفت کی ضرورت نہیں۔ ہمیں بس باقی ہوس۔

شہر انبالہ

۱۱ر جون ۱۹۱۲ء

نیرنگ

ء سابقہ مجموعہ کے مضامین جن کا حوالہ جناب نیرنگ نے دیا ہے اس مجموعہ میں نہیں ہیں بلکہ غدر دہلی کے افسانہ کے نام سے علیحدہ فروخت ہوتے ہیں۔

خود خواجہ صاحب

از جناب ملا محمد الواحدی صاحب ایڈیٹر رسالہ نظام المشائخ واخبار خطیب دہلی

سیدی و مولائی حضرۃ خواجہ حسن نظامی کے مضامین کا مجموعہ دوسری مرتبہ چھپکر شائع ہوتا ہے۔ پہلے ایڈیشن میں مضامین بھی کم تھے اور ترتیب بھی کچھ نہ تھی، اِس دفعہ بہت کچھ ترمیم ہوئی ہے۔ وقت کے نا مناسب مضامین خارج کر دئیے گئے اور اُن سے کئی حصّے زیادہ اور اچھے اچھے تازہ مضامین شامل ہوگئے۔ درحقیقت پہلے مجموعے کو تو مجموعہ کہنا ہی ٹھیک نہ تھا۔ اب بے شک چند اعتبارات سے یہ مجموعۂ مضامین کہلانے کا حق دار بن گیا ہے۔

محبی جناب مولوی شیخ محمد احسان الحق صاحب قادری، رئیس لال کرتی میرٹھ نے اِس مجموعے کی ترتیب و اشاعۃ میں جتنی محنت کی ہے اُسکی تعریف کرنی چاہئے۔ اصل میں شیخ صاحب موصوف کا یہ فرض تھا، جس کو اُنہوں نے ادا کیا۔ کیونکہ ہم سب پر جو حضرۃ خواجہ صاحب کے ادبی و روحانی خوشہ چین ہیں، اِس قسم کی خدمتیں واجب و فرض ہیں۔

میں اِس موقع پر خود حضرت خواجہ صاحب کی ادبی شخصیت پر کچھ لکھنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ میری اُن کی پانچ برس مسلسل یکجائی رہی ہے اور میں نے جس قدر اخباری و لٹریری دنیا میں تعارف حاصل کیا ہے، وہ اُسی زمانے کی ہم نشینی کا پرتو ہے۔ اِس لئے حضرت خواجہ صاحب کی اندرونی زندگی کا جیسا حال مجھے معلوم ہے، دنیا میں شاید کسی کو نہو گا۔

لوگوں میں دستور تو یہ چلا آتا ہے کہ کتاب کے شروع میں مصنف کی سوانح عمری لکھ دیا کرتے ہیں مگر میں نے اِس روش سے ایک الگ موضوع قرار دیا ہے، کیونکہ لائف کا لطف موت کے بعد ہے نہ کہ حیات میں، خدا خواجہ صاحب کو عمر طبعی عنایت فرمائے سوانحعمری لکھکر بدشگونی کرنی ٹھیک نہیں، اِس کے علاوہ مجھے علم ہے کہ خود حضرت خواجہ صاحب "آپ بیتی حسن نظامی" کے نام سے اپنے حالات اِسی مشہور طرزِ تحریر میں لکھ رہے ہیں، جس نے اُن کو تمام اُردو انشا پردازوں سے ممتاز کر دیا ہے، ظاہر ہے کہ لائف کا جو مزا اِس کتاب میں ہوگا دوسرے کی تحریر میں کہاں آ سکتا ہے۔ لہٰذا میں صرف لٹریری زندگی کی تاریخ اور اسی موضوع کی تشریحات پر اکتفا کرونگا جس سے حضرت خواجہ صاحب کی اِس کتاب کو تعلّق ہے۔

ابتدائی حالات

مختصراً یہ بتانا ضروری ہے کہ حضرت خواجہ صاحب درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیآؒ میں پیدا ہوئے، جو دہلی سے ۳ میل کے فاصلے پر واقع ہے، اُنہوں نے مروجہ نصاب عربی کو مکمّل کیا اور جناب منشی غلام نظام الدین صاحب تاجر کتب دہلی کی صحبت کے سبب ادبی و اخباری میلان پیدا ہوا، یہ غالباً سب جانتے ہیں کہ حضرت خواجہ صاحب حضرت خواجہ نظام الدین اولیآؒ کے خواہرزادوں میں ہیں اور اُن کی نشو و نما پیرزادگی میں ہوئی ہے، اگر منشی صاحب کی صحبت کا اثر نہ ہوتا تو اِس قدرتی جوہر کا کھلنا جو خواجہ صاحب کی طبیعت میں تھا یقیناً دشوار تھا۔ کیونکہ پیرزادگی اِس زمانے میں اکثر لوگوں کو مغرور و خود پرست بنا دیتی ہے اور ہاتھ پاؤں چومنے والے معتقدین پیرزادوں کے دماغ بگاڑ دیتے ہیں۔ خواجہ صاحب فرماتے ہیں کہ منشی صاحب کا وہ ابتدائی جملہ مجھے ہمیشہ یاد رہیگا کیونکہ وہ میری ادبی زندگی کی بنیاد ہے

کہ دنیا میں چھوٹا اور انجان بننے سے کچھ ملتا ہے، بڑا اور دانا بننا انسان کو محروم کر دیتا ہے۔ میں نے اس قول پر عمل کیا اور آج تک کبھی اس خیال کو پاس نہ آنے دیا کہ میں کچھ ہوں۔ جس کے پاس گیا انجان اور طالب علم بنکر گیا۔

حضرۃ خواجہ صاحب نے سب سے پہلے جو اخبار دیکھا وہ مراد آباد کا ایک ہندو اخبار رہبر روتھا۔ فرماتے ہیں اس سے پہلے مجھے معلوم نہ تھا کہ اخبار کیا چیز ہوتی ہے، سب سے پہلے جس اخبار میں مضمون لکھا وہ بمبئی کا انڈیا گزٹ تھا جس کو لاہور کے حکیم غلام محی الدین صاحب نکالتے تھے۔ اس مضمون کا عنوان تھا "انڈیا کی نازک حالت" اور اس میں قحط کی پریشانیوں کو بیان کیا گیا تھا۔

منشی غلام نظام الدین صاحب کتابوں کے سوداگر تھے، انہوں نے خواجہ صاحب کو مولانا شرر کے ناول دئیے، جن کو پڑھکر خواجہ صاحب کو انشا پردازی کا چسکہ لگا۔ فرماتے ہیں کہ شمس العلما مولانا محمد حسین آزاد اور مولانا شرر کی تحریریں میری لفظی اُستاد ہیں اور فطرت اُستاد معنوی، ان تحریروں سے میں نے مضامین کی بندش سیکھی اور فطرت و مشاہدہ قدرت نے معنوی اثر تعلیم کیا، ان کا ارشاد ہے کہ یہ حال شروع زمانے کا ہے جسے آج بیس برس سے زیادہ عرصہ ہو گیا۔ بعد میں جو کچھ ترقی کی وہ حضرت مولانا سید اکبر حسین صاحب جج الٰہ آبادی کی صحبت کا فیض ہے۔ جنکے ساتھ سال میں کئی مرتبہ یکجائی کا موقع نکالتا تھا۔ اور اُن کا کلام پر دوسروں سے جداگانہ نظر ڈالتا تھا۔ خواجہ صاحب تو یہاں تک مبالغہ فرماتے ہیں کہ مجھ میں اگر کسی کو کچھ آدمیت نظر آئے تو سمجھ لینا کہ وہ جناب اکبر کا عکس ہے۔ میری ذاتی نہیں ہے۔

ادبی حیثیت سے دیکھا جائے تو وسطی اور آخری زمانے کے مضامین سے واقعی وہی شوخی و بیباکی اور نرالا پن ٹپکتا ہے جو جناب اکبر کی نظموں میں صفت مخصوص ہے۔

"مقصد مضامین نویسی"

حضرت خواجہ صاحب پیرزادے ہیں اور خود صاحب سلسلہ وارشاد پیر ہیں، اُن کو طبیعت کی موزونی ورثے میں ملی ہے، کیونکہ تمام صوفیائے کرام اسرار تصوف کو ہمیشہ اشعار کی رنگینی اور لٹریچر کی تاثیروں میں بیان کرتے آئے ہیں۔ خواجہ صاحب شاید پہلے صوفی ہیں جنہوں نے نثر میں تصوف کے ولولے اور جذبات کو نظم کے انداز سے بڑھکر لکھا۔ وہ شعر نہیں کہہ سکتے لیکن بعض مضامین میں قافیہ بندی کی شان گواہی دیتی ہے کہ وہ کوشش کرتے تو بہت بڑے شاعر بن سکتے تھے۔ علامہ شبلی (مرحوم) سچ فرمایا کرتے تھے کہ خواجہ صاحب نثر میں ایسی بے نظیر شاعری کرتے ہیں جس کا اثر آجکل کی نظموں میں بھی بہت کم پایا جاتا ہے۔

خواجہ صاحب کی مضامین نویسی کا صرف ایک مقصد ہے جو ان کا موروثی ہے اور وہ تصوف کی اشاعت ہے۔ وہ فرمایا کرتے ہیں کہ میں نے جو کچھ خامہ فرسائی کی ہے وہ محض اس لئے ہے کہ نئی روشنی کے لوگ جو صوفیوں کی پرانی کتابوں کو نہیں پڑھتے اور ان کتابوں کے قدیمی طرز تحریر کے سبب تصوف سے ہی غیر مانوس ہوتے جاتے ہیں میرے نئے انداز تحریر سے ادھر راغب ہوں اور کیفیت روحانی سے فائدہ اُٹھائیں۔ چنانچہ اس میں حضرت خواجہ صاحب کو بڑی کامیابی ہوئی۔ اور آج جو ہزاروں انگریزی تعلیم یافتہ لوگ تصوف کے دلدادہ ہو گئے وہ محض حضرت خواجہ صاحب کی تاثیر قلم کا طفیل ہے۔

ملک میں جس قدر صوفیانہ رسالے نکلتے ہیں، جن میں نظام المشائخ، صوفی، اُسوۂ حسنہ، طریقت، انوار الصوفیہ اور معارف زیادہ ممتاز ہیں، یہ سب ظاہری یا اخلاقی اثر خواجہ صاحب کی تحریروں کا ہے، کیونکہ سب سے پہلے حضرت خواجہ صاحب نے صوفیانہ

رسالہ نظام المشائخ جاری کیا تھا، بعد میں اس کے اثر سے اور رسالے نکلنے لگے۔

خواجہ صاحب کی تحریروں میں غالب مقصد تصوّف ہے۔ اس کے علاوہ، غربا، شریف محتاجوں اور بیکس لوگوں کی نسبت جو کچھ لکھا ہے وہ بھی درحقیقت تصوّف ہی کی ایک شاخ ہے۔ ان تحریروں کو بھی تصوّف کے تحت میں رکھکر پڑھنا چاہیئے۔

پالیٹکس وسیاست کی نسبت جو مضامین خواجہ صاحب کے قلم سے نکلے وہ مقصود بالذات نہیں ہے۔ بلکہ مذہب اور مظلوموں کی حمایت کرتے وقت جو ایک جزو تصوّف ہے خواجہ صاحب نے ایسا لکھا جس کو حکومت نے پالیٹکس سمجھا اور خواجہ صاحب کو اُس سے کچھ تکلیف مالی وجسمانی کا مقابلہ کرنا پڑا۔

یہ تصوّف کا مشہور اصول ہے کہ سب قوموں اور فرقوں سے یکساں محبت کرنا۔ خواجہ صاحب کے مضامین میں یہ وصف بھی جگہ جگہ نمایاں نظر آتا ہے۔

مسئلۂ وحدت وجود کے بیان میں متقدمین نے چند مثالوں اور تشبیہات کو مخصوص کر لیا تھا جو شخص کچھ لکھتا ان ہی مثالوں کو پیش کرتا تھا۔ حضرت خواجہ صاحب کی یہ جدّت صدیوں زندہ رہیگی کہ اُنہوں نے ہزاروں نئی تشبیہات اس مسئلے کی تشریح کے لئے اُردو میں پیدا کر دی ہیں۔ یہ مثالیں خواجہ صاحب کے زمانے میں تو محض ادبی لطائف تصوّر کیجاتی ہیں۔ مگر ایک وقت ایسا آئیگا جب کہ صوفیائے کرام اِنہی مثالوں پر اپنے درس وارشاد کی بنیاد رکھیں گے۔

اگلے صوفی شعرا نے خصوصاً حضرت جامیؒ نے نعت گوئی میں سوز وگداز کی بڑی بڑی مؤثر تحریریں یادگار چھوڑی ہیں۔ مگر حضرت خواجہ صاحب جس انداز سے نعت لکھتے ہیں وہ اُردو کیا کسی زبان میں اپنی مثل نہیں رکھتی۔ خواجہ صاحب شوق اور درد کو مجسم بنا کر کھڑا کر دیتے ہیں اور مسلمانوں کے دل میں اپنے رسولؐ کی محبت کو ایسا بھڑکاتے ہیں کہ سنگدل سے سنگدل لوگ بھی حبِّ رسولؐ میں آنسو بہائے بغیر نہیں رہتے۔ اِن دونوں باتوں کا ثبوت جن کو میں نے اب لکھا ہے ناظرین اس کتاب میں آسانی سے دیکھ سکتے ہیں کہ آیا وحدت اور نعت میں اس سے زیادہ مؤثر کوئی تحریر اُن کی نظر سے گزری ہے؟

بندے اور خدا کے راز ونیاز، شوخیاں، گستاخیاں اور مستی سے بھری ہوئی محبت خواجہ صاحب سے پہلے شاید ہی کسی کے قلم سے اتنی زیادہ نکلی ہوں۔ بلکہ میرا تو خیال ہے کہ اس عجیب پیرائے سے تو شاید کسی نے بھی نہیں لکھا۔ اس سے بندے کے دل میں اپنے خالق کے ساتھ خوف کی مجبورانہ محبت نہیں بلکہ خالص یگانگت ویکسوئی کا تعلق پیدا ہوتا ہے۔ اور یہی تصوّف کا حاصل مطلب ہے۔

اثر اور نرالاپن

خواجہ صاحب کی تحریروں میں اثر اور نرالے پن کی بہت سی وجوہات ہیں۔ ایک تو اُن میں یہ ہے کہ خواجہ صاحب وہی لکھتے ہیں جو خود ان کے دل پر طاری ہوتا ہے، آورد میں کبھی دل چھیننے کی طاقت نہیں دیکھی۔ یہ آمد ہی ہے جو پہاڑوں کو بھی ڈالتی ہے۔

دوسرے وہ نہایت عام فہم اور سیدھے سادے پیرائے میں لکھتے ہیں۔ تیسرے جن واقعات وحالات پر لکھتے ہیں وہ بجائے خود طبیعتوں کو کھینچنے والے ہوتے ہیں۔ اور جب خواجہ صاحب کے قلم سے ادا ہوں تو ان میں چار چاند لگجانے عجیب نہیں ہیں۔ مثلاً تیموری شہزادوں کی دردناک حالتیں خود ایسی ہیں کہ معمولی طور پر بھی کوئی بیان کرے تو سننے والا اشکبار ہو جاتا ہے۔ خواجہ صاحب نے انکو جب لکھا تو قیامت ڈھادی۔ میں نے دیکھا ہے کہ پڑھنے والے یہ مضامین پڑھکر بے قابو ہو جاتے ہیں اور سنجیدہ سنجیدہ اشخاص بچوّں

کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتے ہیں، خود خواجہ صاحب کو دیکھا کہ اپنے ہی مضمون کو پڑھتے ہیں اور زار و قطار روتے ہیں۔

چوتھی وجہ نرالے پن کی یہ ہے کہ خواجہ صاحب ہر مضمون میں سب سے زیادہ غور عنوان تجویز کرنے میں کرتے ہیں بعض اوقات جب انہیں کوئی خاص مضمون آورد سے لکھنا ہوتا ہے تو گھنٹوں بلکہ دو چار دفعہ میں نے دیکھا کہ تین تین روز صرف عنوان مقرر کرنے میں انہوں نے لگا دیئے اور جب تک نرالا عنوان ہاتھ نہ آیا، مضمون نہ لکھا۔

ایک دفعہ میں نے ہنسی میں اُن سے کہا جبکہ وہ فکرِ عنوان میں بہت چُپ چُپ تھے کہ سارے جہان میں خواہ مخواہ آپ کی انشا پردازی مشہور ہو گئی ہے کوئی دیکھے کہ تین دن سے ایک عنوان آپ کی سمجھ میں نہیں آیا تو جانے کہ اُن کو خاک لکھنا نہیں آتا۔ خواجہ صاحب اِس گستاخی کو بھی پی گئے اور اپنی فکر میں لگے رہے اور جب عنوان ذہن میں آ گیا تو مضمون اُنہوں نے دو گھنٹے میں لکھ دیا اور فرمایا کہ شہرت اِسی کی ہے کہ میرے عنوان نرالے ہوتے ہیں۔ میں مضمون سے زیادہ عنوان کو ضروری سمجھتا ہوں۔ میری کوشش ہوتی ہے کہ عنوان سے سارا مضمون سمجھ میں آ جائے۔ اِس پر طرّہ یہ کہ مختصر ہو، نظر کش ہو اور تقلید سے آزاد ہو۔

خواجہ صاحب مقلد ہیں اور حنفی مشرب رکھتے ہیں، لیکن انشا پردازی میں تقلید سے اُن کو اتنی چڑ ہے کہ پانچ برس کی یکجائی میں میری اُن کی جب کبھی بد مزگی ہوئی تو اکثر اِسی بات پر کہ وہ دوسرے لکھنے والوں کی تقلید سے خلافِ فطرت گریز کرنا چاہتے تھے اور مجھ سے یہ تاکید ہوتی تھی کہ کسی اچھے یا بُرے طرز کی پیروی نہ کروں، خود کوئی بات نکالوں۔ لیکن یہ بات نہ میرے امکان میں تھی نہ میں اِس کو اِتنا ضروری سمجھتا تھا جتنا خواجہ صاحب سمجھتے ہیں۔

ان کا فرمانا ہے کہ وہ لوگ اُردو کے دشمن ہیں جو اس میں عربی و سنسکرت کے موٹے موٹے الفاظ جن کو عوام نہیں سمجھ سکتے ہیں داخل کرتے ہیں اور وہ لوگ احمق یا سرمایۂ زبان سے جیب خالی ہیں جو ان کی پیروی کرتے ہیں۔ مولوی ابو الکلام آزاد کی تحریروں کو خواجہ صاحب اُردو کا قاتل کہا کرتے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ اپنی لیاقت جتانے کو ایسی اُردو لکھنی جس میں دو حصے عربی ہو اُردو کے گلے پر ٹھنڈی چھُری ہے۔ ایسی عبارتوں کے پڑھنے سے کم پایہ طبیعتیں اُردو سے گھبرا جاتی ہیں اور اسکو مشکل زبان سمجھنے لگتی ہیں۔ حالانکہ حامیانِ اُردو کا فرض ہونا چاہیئے کہ اسے عام پسند بنائیں۔

خواجہ صاحب نے اُردو میں جو نئی راہ نکالی ہے جس کا ہر انشا پرداز کو اقرار ہے۔ اِس کا راز یہی غیر مقلدی ہے۔ ایک بات کسی شخص نے ایک پیرایہ سے بیان کی اور خواجہ صاحب کو منظور ہوا کہ اس کی تائید کریں تو وہ کبھی اِس کے بیان کردہ پیرایہ کی نقل نہیں کرینگے۔ بلکہ ایک ایسے انداز کی تلاش میں رہیں گے جو سابق لکھنے والے سے علیٰحدہ ہو اور بالکل ایک نئی مستقل بات بن جائے۔ اِس کوشش میں وہ ہفتوں مصروف رہتے ہیں اور مضمون نہیں لکھتے، جب تک جدت ان کے قبضے میں نہ آ جائے۔

صوفیوں کے اصول یکسوئی خیال کو وہ مضامین نویسی میں ہمیشہ ملحوظ رکھتے ہیں یعنی جب اُن کو کوئی مضمون لکھنا ہوتا ہے تو پہلے اِسکو کچھ دیر خاموش رہکر خیال میں جاتے ہیں اور پھر بیٹھکر آن کی آن میں جھٹ پٹ گھسیٹ ڈالتے ہیں۔ جتنی دیر ان کو خیال کے اندر مضمون کو یکسو کرنے میں لگتی ہے۔ اُتنی دیر لکھنے میں نہیں لگتی۔

ایک وجہ اثر او نرالے پن کی اور بھی ہے کہ خواجہ صاحب وقت شناس بہت زیادہ ہیں جس وقت میں کوئی بات خلقت کی طبائع پر مسلّط ہوتی ہے تو خواجہ صاحب اِس بات کو بالکل پبلک کے احساس کے موافق مضمون میں ادا کر دیتے ہیں اور خلقت اُس سے قدرتاً بے حد متاثر ہوتی ہے۔

یہ ملکہ ہر شخص میں نہیں ہوا کرتا۔ فطرت کے مطالعہ اور قدرت کے نظاروں کی محویت اور کچھ خداداد ذہانت سے یہ چیز میسّر آتی ہے

خواجہ صاحب کے مضامین کی تاریخ لکھی جائے تو اُس میں کا بیشتر حصہ ایسا نکلیگا جس سے معلوم ہوگا کہ ان میں کا ہر مضمون اپنے وقت پر
ہندوستان میں بڑی ہلچل ڈال چکا ہے۔

یہ نوعیت جناب اکبر الہ آبادی سے بہت ملتی جلتی ہے وہ بھی کبھی ایسے واقعہ کو نہیں چھوڑتے جس کا پبلک میں زیادہ چرچا ہو۔ بلکہ کہنا چاہئے کہ
سوائے ایسی موثر باتوں کے اور کسی چیز کو چھوتے ہی نہیں۔

یہ کچھ بھی بات ہے کہ فطرت یکایک کسی بات پر توجہ دلاتی ہے۔ دہلی میں ایک دفعہ گرمی کے شدید موسم میں نل بند ہو گئے اور خلقت ایسی پریشان
ہوئی کہ قیامت کا مزا آگیا۔ رات کے وقت خواجہ صاحب کچھ لکھنے بیٹھے میں نے منع کیا کہ گرمی میں لیمپ کے آگے نہ بیٹھئے، مگر وہ ایسے ہوتے کہ
میرے کہنے کو سنا بھی نہیں۔ پندرہ منٹ کے بعد ایک مضمون تیار کر لائے جس میں نلوں کی بندش پر ایک بڑے لطف کا صوفیانہ نوٹ لکھا تھا انہوں نے
راتوں رات اسکو لکھوا کر بصورت اشتہار چھپوایا اور صبح تمام شہر میں چسپاں کرا دیا۔ پھر تو یہ کیفیت تھی کہ دہلی میں ایسے شوق سے آجتک کوئی اشتہار
نہیں پڑھا گیا جیسا کہ یہ، ہر اشتہار کے آگے پانچ پانسو آدمیوں کا ہجوم ہو جاتا تھا اور راستے بند ہو جاتے تھے۔

خواجہ صاحب نے اس مضمون میں یاد دلایا تھا کہ اگر خدا پانی کے چشمے خشک کر دے تو کون تمکو پانی دے، اور تمہارا کیا حال ہو جبکہ تم ایک دن
میں ایسے پریشان ہو گئے۔ ان کا اشتہار اس آیت پر تھا جو قرآن پاک کے اُنتیسویں پارے کی سورۂ ملک میں ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر تمہارا
پانی زمین کی تہ میں سوکھ جائے، تو کون اُسکو اوپر لا کر بہائے۔ اسکی تفسیر ایسے دلکش انداز سے ہوئی تھی کہ ہندو مسلمان یکساں جھومتے تھے۔

خواجہ صاحب نے اس قسم کے سینکڑوں اشتہار لکھے ہیں مگر افسوس کہ اس مجموعہ کی ترتیب کے وقت وہ ناپید ہو گئے ورنہ ناظرین دیکھتے
کہ فطرت کے اس فوٹو گرافر نے اپنے وقت میں کیا کیا کام کئے اور معمولی معمولی باتوں کو کیسے چار چاند لگائے ہیں۔

نرالے پن کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ابتدا سے خواجہ صاحب کی نظر ذلیل اور بے حقیقت اشیا پر جاتی تھی اور یہ وہ چیزیں تھیں جنکو اچھا لکھنے والوں نے
اپنی بلند نظری کے سبب نظروں سے گرا دیا تھا خواجہ صاحب نے انہی کو اٹھایا اور چونکہ عوام کے طبائع کیلئے یہ بڑی کشش دار چیز تھی اسواسطے ہر دل میں انکا گھر بن گیا۔

دلچسپ جزئیات

اب میں بہت معمولی معمولی باتوں کو اپنے حضرت کی پیروی میں لکھتا ہوں جو اول اول تو معمولی معلوم ہوتی ہیں، مگر آخر میں انہی سے کیرکٹر کا پتہ چلایا جاتا ہے۔

خواجہ صاحب بہت نحیف البدن اور دائم مریض رہنے والے ہیں۔ کوئی شخص ان کو دیکھے تو کبھی خیال نہیں کریگا کہ وہ ایک وقت اور ایک نشست میں
بیٹھے بیٹھے ایک رسالہ دو جزو کا لکھ سکتے ہیں، حالانکہ دیکھا گیا اور بارہا دیکھا گیا کہ انہوں نے ایسا کیا۔ خواجہ صاحب کی قلم دوات کبھی صاف ستھری نہیں رہتی
نہ انکو مضمون لکھنے میں اچھے کاغذ کی تلاش ہوتی ہے۔ جہاں وہ لکھتے پڑھتے ہیں وہاں اس قدر پراگندہ کاغذات اور چیزوں کا ڈھیر ہوتا ہے کہ آدمی دیکھکر
گھبرا جائے۔ مگر خواجہ صاحب اس کوڑے کرکٹ میں بیٹھے لکھا کرتے ہیں

ان کو مضامین تین حالتوں میں زیادہ سوجھتے ہیں، ایک گانے میں۔ دوسرے تھیٹر میں تیسرے کسی عاشق یا آشفتہ حال کو دیکھنے میں۔
تھیٹر کا تماشہ بہت دیکھتے ہیں، اور کبھی ایسا نہیں ہوا کہ انہوں نے تماشہ دیکھکر کوئی مضمون نہ لکھا ہو۔ یہ مضمون نفس تماشہ پر نہیں ہوتا تھا
بلکہ تماشہ سے متاثر ہو کر کسی نئے خیال پر خامہ فرسائی کرتے تھے۔ بارہا ایسا ہوا ہے کہ میں تماشے میں ساتھ ہوں اور خواجہ صاحب بجائے لطف کے
تماشے میں غمگین و افسردہ ہیں، حالانکہ تماشے میں کوئی بات غم کی نہیں ہے۔ گھر آکر میں سو گیا، خواجہ صاحب صبح تک کچھ لکھتے رہے۔ "غریب شہید کا گھر"
"تبریزی یتیم کی آہ" وغیرہ مضامین اسی طرح لکھے گئے ہیں جنکو لکھکر خواجہ صاحب رات بھر پڑھتے اور روتے رہے اور صبح کر دی۔ بعض اوقات میں نے
دیکھا کہ وہ آدھی رات کو خود بخود بیدار ہو کر لکھنے لگے۔ پوچھا تو فرمایا کہ کل شام کو فلاں بات نے بہت متاثر کیا تھا۔ اب خود بخود آنکھ کھل گئی اور اسکے لکھنے پر طبیعت مجبور ہوئی

ان کی طبیعت بہت حاضر ہے، لیکن ہر وقت یہ حالت نہیں رہتی بعض اوقات وہ بغیر تخلیہ و تنہائی کے کچھ نہیں لکھ سکتے، مگر عام طور پر وہ مجمع میں باتیں کرتے جاتے ہیں اور لکھتے جاتے ہیں۔ ایک دفعہ میں نے امتحان لیا۔ رات کا وقت تھا۔ بہت سے لوگ جمع تھے میں نے سوچا کہ خیال میں جمائے بغیر خواجہ صاحب کچھ نہیں لکھ سکتے ہیں اس واسطے فرمائش کی کہ اس مجمع میں کچھ لکھئے اور میرے بتائے ہوئے عنوان پر لکھئے، شرط یہ ہے کہ دو چار آدمی باہم باتیں بھی کرتے جائیں گے۔ آپ نے ہنسکر اسکو قبول کیا اور لالٹین جو اس وقت روشن تھی وہی عنوان قرار پایا۔ آپ نے فرمایا میں بولتا جاتا ہوں ایک آدمی لکھتا جائے۔ تم سب آپس میں باتیں کرو۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور ۲۵ منٹ میں خواجہ صاحب نے ایک لمبا اور نہایت دلچسپ معنی خیز مضمون لالٹین پر لکھوا دیا جو شاید اس کتاب میں بھی ہو۔

فرمائشی مضمون نویسی سے اُنکو نفرت ہے۔ مگر موقع آجاتا ہے تو اسکی تعمیل بھی خوب کر دیتے ہیں۔ ایک دفعہ میں نے عرض کیا کہ کاپی نویس بیکار بیٹھے ہیں بڑا حرج ہو رہا ہے جلدی ایک چھ صفحے کا مضمون دیجئے۔ فرمایا پان کی ڈبیہ منگاؤ اور دروازے پر بیٹھکر آنے والوں کو روکو۔ میں نے ایسا کیا۔ آدھ گھنٹہ میں نقطہ کے عنوان پر چھ صفحے لکھکر دے دئے۔

اب وہ مضمون لکھنے میں پان بہت کھاتے ہیں، پان جب تک پاس نہوں مضمون ادا کرنے میں دشواری ہوتی ہے۔ باجہ بج رہا ہو تو وہ دوڑ بیٹھکر بہت اچھا مضمون لکھ لیتے ہیں۔ اُنہوں نے گراموفون محض مضمون لکھنے کی خاطر خریدا ہے۔ دوسرا آدمی اسکو بجاتا جاتا ہے اور وہ مضمون لکھتے جاتے ہیں۔

خواجہ صاحب کا شہرۂ آفاق مضمون "کہو تکبیر" جو ضبط ہوگیا۔ اور اب اُس کے شائع ہونے کی ممانعت ہے اور جو کانپور کی مسجد کے معاملے میں لکھا گیا تھا اور جس کے ترجمے تمام عربی و ترکی اخبارات تک نے شائع کئے تھے اور جو اب تک ہندوستان میں سینکڑوں آدمیوں کو حفظ یاد ہے۔ اسی طرح لکھا گیا تھا۔ میں نے سنا ہے کہ خواجہ صاحب نے سحری کے وقت گراموفون بجوایا اور اُس وقت یہ لکھا۔ یہ واقعہ میرٹھ کا ہے جبکہ خواجہ صاحب اخبار توحید کی ایڈیٹری کرتے تھے اور میرٹھ میں مقیم تھے۔

علمی مضامین بھی وہ خوب لکھ سکتے ہیں مگر ان کا فرمان ہے کہ ہمارے مخاطب جاہل لوگ ہیں۔ ہم کو اُن کی زبان میں بات کرنی ہے۔ پڑھے لکھے لوگوں کو سمجھانے کے لئے ہزاروں پڑھے لکھے عالم فاضل لکھنے والے موجود ہیں مگر ان غریبوں کا کوئی نہیں۔ وہ غم کے مضامین بہتر لکھتے ہیں۔ ظرافت میں بھی ان کے قلم کو بہت قدرت ہے۔ اخبار خطیب میں گدگدیوں اور چٹکیوں کے عنوان سے مہینوں اُنہوں نے ایسی ظریفانہ عبارتیں لکھی ہیں جو اپنی شان میں سب سے نرالی ہیں اور جن کو پڑھکر بے اختیار ہنسی آتی ہے۔

خواجہ صاحب کا قلم کسی مضمون میں بند نہیں ہے۔ وہ ہر بحث میں صوفیانہ نکتہ نکال لیتے ہیں۔ چنانچہ اخبار خطیب میں اُنہوں نے علم طب پر ایسے ایسے صوفیانہ مضامین لکھے جن کی طبقۂ اطبا میں دھوم مچ گئی۔ ایک مضمون خیال میں آتے اور اُس کو نہ لکھ سکیں تو خواجہ صاحب بیمار ہو جاتے ہیں۔

وہ مضمون لکھکر مسودہ کو صاف یا نقل نہیں کر سکتے۔ اور کہتے ہیں کہ نقل کرنا مشکل، دوسرا تیار کرنا آسان، اُردو ترقی کرتی رہی تو وہ وقت دور نہیں کہ خواجہ صاحب کے مضامین پر بڑی بڑی لیاقت والے مجھ سے زیادہ لکھینگے میں تو اتنا ہی لکھ سکا

فقط

واحدی

پہلی منزل

عبد و معبود کے راز و نیاز

مستِ الست کی دعا

از رسالۂ نظام المشائخ دہلی۔ جولائی سنہ ۱۹۰۹ء

"بجلی میں چمکنے والے۔ چاند میں جھلکنے والے۔ رات کے اندھیرے۔ سورج کی روشنی۔ آسمان کی بلندی۔ دریا کی روانی جنگل کی سنسانی۔ دلگیری و دلداری کے مالک! عرش کی اقامت میں جدا۔ دل کے گھرانے میں خدا۔ ہم تیرے آگے ہاتھ جوڑتے ہیں۔ اگر تو عرش پر ہے ہم کو سربلند کر۔ فرش میں ہے تو وسعت و ثابت قدمی عنایت فرما۔ دل میں ٹھکانا ہو تو اس کو اپنے رہنے کی قابل بنا دے۔ رگِ جاں میں ہو تو خون میں اپنی شان اور آن و بان کا جوش پیدا کر۔ اگر تو ہر جگہ ہے تو ہم کو بھی ہر جگہ پہونچا +

تو عالم ہے۔ اپنے علم کا حصّہ ہم کو بھی دے۔ رزاق ہے۔ ہمارے ہاتھوں سے رزق بانٹ۔ رحمٰن ہے۔ رحمت نازل فرما۔ قہر و جبر کی تلوار ہمارے دشمنوں کے ہاتھ میں نہ دے۔ خیر کو وسعت دے کر شر سے بچا۔ ہماری آنکھ بن، تجھ سے دیکھیں۔ کان بن، تجھ سے سنیں، زبان میں تو ہی بول۔ ہاتھ سے تو ہی کام کر۔ تو بعید ہے تو قریب آجا۔ قریب ہے تو اقرب ہوجا۔ اقرب ہے تو "نَحْنُ اَقْرَبُ" کا حجاب بھی اُٹھا دے۔ پھر ہم اور تو کا لفظ بھی فنا ہوجائے۔ اور فنا کو بھی ایسی فنا ہو کہ ازل سے ابد عدم سے نمود۔ نمود سے عدم۔ جہاں تلاش کریں اُس کا وجود بصارت و بصیرت کو نظر نہ آئے۔ اے حمد و ستایش کے قابل خدا۔ تو خود آ۔ تاکہ ہم تیری تعریف کریں۔ تیری تعریف اور تیرے رنگ برنگ کے ناموں کی تعریف۔ تیرے اچھے بُرے کاموں کی تعریف۔ او گاڈ! یورپ کے منکروں کا انکار اقرار سے بدل دے۔ ان کے پیاسے دل کو روحانی تسلی کی ایک شاگر وہ بھی نمبر ون عنایت فرما +

ہے پربھو پرشوتم پرم آتما! اگر تو نرگُن ہے ہم کو سگُن بنا دے۔ نراکار ہے تو ہماری موہوم شکلیں بھی مٹا دے۔ سگُن بن جا۔ ساکار ہوجا اور اپنی پریم شکتی کو دُنیا میں پرگھٹ کر۔ ہم کس سے فریاد کریں۔ تیرے سوا کس کو دیکھیں۔ اے مکّہ کے سیاہ پوش مکان پر نظرِ خاص رکھنے والے اے صلیب کی صورت کو عزت دینے والے۔ اے ہر دوار کے دوارے رہنے والے۔ تجھ کو ہم یقین دلاتے ہیں کہ تو ہی ہے اور کوئی نہیں۔ تو نہ ہوتا تو کچھ بھی نہ ہوتا۔ اور یہ جو کچھ ہے۔ کچھ بھی نہیں۔ تو ہی تو ہے اور بس۔ تو دیکھتا ہے مگر ہم بھی دکھانا چاہتے ہیں۔ تو سُنتا ہے مگر ہم بھی سُنانا چاہتے ہیں سُن اور دیکھ۔ اُمیدیں ڈوب رہی ہیں۔ ارمان جل رہے ہیں۔ ماتم برپا ہے۔ نوحوں کا شور مچ رہا ہے +

یہ ملک ہندوستان۔ اس کو تیری امان۔ فساد و خونریزی۔ قحط و بیماری۔ کاہلی و بیکاری۔ سب آفتوں سے جو زمین کی ہوں یا آسمان کی۔ مشرق کی ہوں یا مغرب کی۔ دین کی ہوں یا دنیا کی۔ حفاظت دے۔

مسلمان بے یار و مددگار مسلمان۔ غریب و لاچار مسلمان۔ کسی زمانہ کے تاجدار مسلمان وہ جو بھوکے سوتے ہیں۔ بھوکے بیدار ہوتے ہیں۔ وہ جو ٹھکرائے جاتے ہیں۔ جن پر رونے والے بھی ہنستے ہیں۔ خدا وُہی تیرے پیارے محمد صلعم (ہم اس نام پر فدا ہو جائیں) کے پیارے مسلمان۔ آج زمین و آسمان میں ان کا کہیں ٹھکانا نہیں۔ نرم غالیچوں کے بدلے خاک کے بچھونے پر پڑے ہیں۔ مگر اب بھی گردش کو چین نہیں۔ وہ اس سے بھی گئے گزرے ذلت کے گڑھے میں ڈالنا چاہتی ہے۔ تو اُن کی حمایت کر۔ صدقہ مدینے کی گلیوں کا۔ صدقہ اُس خاک کے ذرّوں کا جو تیرے رسولؐ کے قدموں سے پامال ہوئی +

اے مشکلوں کے حل کرنے والے۔ اپنے دیوانے مستانے صوفیوں کو اپنے اشارۂ چشم سے آمادہ کر کہ وہ اپنے بیکس و بے بس مسلمانوں کی دستگیری کو کھڑے ہو جائیں۔ پہلے ان کے سلسلوں کو اکٹھا کر تاکہ ان کی قوت مجتمع ہو اور وہ ظاہری مرحلے بھی اسی اجتماع سے طے کریں۔ جس طرح باطن کے مقامات اجتماع حواس و خیالات سے ہوتے ہیں +

الٰہی حلقۂ نظام المشائخ اور رسالۂ نظام المشائخ کو گروہ مشائخ کا۔ سچا۔ پکا مخلص خادم بنا۔ اور اس کے فرائض کو پختگی سے پورا کرنے کی توفیق عنایت فرما۔ آج جس میدان میں یہ قدم ہم نے رکھا ہے اُس کو ایسا بنا دے کہ ہم اور قدم بھی وہاں اُٹھا سکیں اور منزل پر پہونچ جائیں۔ آمین۔ ثم آمین۔ اور پھر آمین۔

آہ! یہ خط

مدت کے بعد خط آیا۔ تسلّی بھی۔ تسکین بھی۔ خشم و عتاب بھی۔ زخموں پر مرہم رکھ دیا۔ اور ہاں نمک پاشی بھی کی +

خط! اچھے اچھے حرفوں والے۔ پیارے پیارے مطلب والے آ۔ بہت راہ دکھائی۔ تجھ کو پہلے آنکھوں سے لگاؤں۔ کلیجہ پر رکھوں۔ اور دل پر بھی۔ جو پھڑکتا ہے۔ اور تجھ کو مانگتا ہے۔ تو کس کا نامہ ہے۔ تجھ میں کیا لکھا ہے۔ اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ۔

قاصد پر نثار۔ کیا ہی اچھا پیام لایا۔ ہاں تو یہ تاکید کر دی ہے کہ میرے مکتوب کا ادب کیا جائے۔ ناپاک ہاتھ نہ لگیں۔ دل و جان سے منظور۔ پیارے کا پیارا خط ہے بھلا اس کی بے ادبی ہو سکتی ہے؟

لکھا ہے یہ خط ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں۔ ہاں ہاں کچھ شک نہیں۔ بلاشبہ یہ آپ کا نامہ ہے۔ آپ بھی سچے اور آپ کا مکتوب بھی۔ اور وہ قاصد بھی جو پیام لایا۔

آپ کی یاد میں آپ کے انتظار میں۔ ازخود رفتہ دیکھکر اکثر لوگوں نے فرضی خطوط بنائے۔ اور کہا کہ یہ اُن کا ہے جنھیں تم یاد کرتے ہو۔ مگر تسلّی نہ ہوتی تھی۔ یقین نہ آتا تھا۔ شاید آپ کو بھی اغیار کی کارستانیوں کی خبر پہونچ گئی۔ جو لکھا کہ اس خط میں شک نہ کرنا۔ نہیں جناب یہ تاثیر۔ یہ تجلی۔ یہ کشش۔ اوروں میں کہاں تھی۔ دلی یقین کے ساتھ پڑھوں گا۔ آنکھیں ترس گئی ہیں۔ پتلیاں سیر نہیں ہوتیں اور کہتی ہیں۔ خط! ہم تیری یاد میں روتے تھے۔ پلکیں آنسوؤں سے بھگوتے تھے۔ تو اب آیا۔ بتا دے کیا تو آیا؟ تو ہمارے پیارے کا پیارا خط ہے۔ قاصد نے تیرا نام قرآن بتایا ہے۔ دل یہ کہتا ہے کہ تو قرۃ العین ہے۔ اب تیرے بھیجنے والے سے مخاطب ہوتا ہوں۔ بندہ نواز! آپ نے یہ تحریر فرمایا کہ ہم نے اپنی امانت آسمان۔ زمین اور پہاڑوں کے پاس رکھنی چاہی تھی۔ مگر سب نے انکار کیا۔ اور اس بھاری بوجھ کی ذمہ داری سے ڈر گئے۔ اور تو نے اس بار کو اُٹھا لیا۔ میں اس لکھنے سے بہت شکر گزار ہوا تھا اس تحریر سے آپ نے میری قدر بڑھائی۔ اور ہمچشموں میں ممتاز کر دیا۔ لیکن یہ محض ذرّہ نوازی

ہے۔ ورنہ میں اس قابل نہ تھا کہ اس نازک امتحان میں پورا اُترتا۔

یہ چھیڑ خوانی کا فقرہ خوب فرمایا کہ تو بڑا ہی ظالم اور جاہل ہے۔ ہاں جناب جو مرضی میں آئے ارشاد کیجئے۔ آپ کے دلدادہ ہیں۔ سب کچھ سُننا پڑے گا۔

نوک دار نشتروں کی امانت بھی دل و جگر میں رکھیں۔ اور پھر آپ کی نرم گرم باتیں بھی سُنیں۔ ہم جاہل سہی۔ ظالم سہی۔ ناعاقبت اندیش سہی۔ پر یہ تو دیکھئے کہ جان پر کھیل گئے۔ اور آپ کی فرمایش کو نہ ٹالا۔ اتنے بڑے ڈیل ڈول کے آسمان۔ ایسی چوڑی چکلی زمین اور بھاری بھرکم پہاڑوں نے بھی بات سے مُنہ چھپایا۔ اور حیلہ حوالہ کرنے لگے۔ اُس کا برداشت کرنا۔ ایک مشتِ خاک سے کیونکر ممکن تھا۔ مگر محض آپ کی رضامندی کی خاطر۔ اس ہولناک منزل میں قدم رکھ دیا۔ آپ کو خبر بھی ہے؟ آپ کی امانت کے سبب ہم پر کیا گزرتی ہے۔ آپ کی چاہت کا دم بھرنے والے میاں شیطان رات دن چوری کی فکر میں ہیں۔ ہر وقت وہ اور اُن کے یار غار خانۂ دل کے گرد منڈلایا کرتے ہیں کہ موقع بنے تو وار کر جائیں۔ اور ہم کو آپ کے سامنے خائن ثابت کر کے شرمندہ کریں۔

اس بیرونی طوفان کی حفاظت کے علاوہ ذرا اندرونی مشکلات کا حال بھی سُنیئے۔ آپ کی امانت ہے تو بالکل سربستہ اور سر بمہر۔ کوئی نہیں جانتا کہ یہ کیا ہے؟ اور اس میں کیا ہے۔ لیکن عجب طلسماتی پُڑیہ ہے۔ جہاں رکھی جائے۔ وہیں ایک طرح کا سوز۔ بے کلی اور اضطراب پیدا کر دیتی ہے۔ اُلجھن ہوتی ہے۔ شہر میں جی گھبراتا ہے۔ جنگل ویرانے میں نکل جانے کو طبیعت چاہتی ہے۔ دُنیا کی شان و شوکت زیب و زینت۔ عیش و راحت۔ سب ہیچ نظر آتے ہیں۔ آنکھیں سونا کم کر دیتی ہیں۔ زبان اپنا مزہ بھول جاتی ہے۔ بات چیت میں بھی زیادہ چلنا پسند نہیں کرتی۔ پیٹ مُن بھاتی غذائیں نہیں مانگتا۔ جو دے دو سو لے لیتا ہے۔ اور وہ بھی بار بار نہیں۔ کئی کئی وقت کے بعد۔ اپنے بیگانے۔ غیر اور بیگانے معلوم ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ خود اپنا تن مَن بے حقیقت و بے کار نظر آنے لگتا ہے۔ تو جناب امانت کیا ہے ایک بلائے بے درماں ہے۔ تاہم۔ ع۔ ہرچہ از دوست می رسد نیکوست۔

سُبحان اللہ۔ آپ کی تحریر کی آن بان کے قربان۔ نوازش کا اظہار ہوتا ہے۔ قہر و غضب کی شان کا ذکر بھی کر دیا جاتا ہے۔ وعدۂ وصل سے ڈھارس بندھائی جاتی ہے۔ تو فرقت و جُدائی کی دھمکی بھی ساتھ ہی ملتی ہے۔ جناب! کون کہتا ہے کہ آپ رحیم نہیں۔ کریم نہیں۔ دلنوازی نہیں کرتے۔ چارہ سازی نہیں فرماتے۔ نہیں۔ آپ کی ذات سے اس سے بڑھ بڑھکر اُمیدیں ہیں لیکن ان دھمکیوں سے کیا حاصل۔ ہم پہلے ہی ڈرتے ہیں اور حضرت کی بے نیازی اور کبریائی سے خوف کھاتے ہیں۔

اس خط میں سرکار نے سب کچھ تو لکھا ہے مگر یہ نہ بتلایا کہ اب آپ کا دیدار کس دن میسّر آئے گا۔ اس وعدہ سے اطمینان نہیں ہوتا کہ عنقریب ہم تم سے ملیں گے۔ وقت بتائیے۔ منٹ اور ساعت مقرر کیجیے۔ اور ملاقات کے پروگرام سے آگاہی بخشیے۔ ایسی گول مول بات کا نتیجہ یہ ہوگا کہ رہا سہا اطمینان بھی جاتا رہے گا اور ہر وقت انتظار کا سامنا ہوگا۔ جو موت سے زیادہ سخت چیز ہے

برافگن پردہ از رُخ بے محابا ✦ مکن وعدۂ امروز فردا

از نظام المشائخ اکتوبر سنہ ۱۹۱۰ء

خوشی بنکر آ غم میں سما کر آ مگر آ۔ عید کے چاند میں آ۔ محرّم کے ہلال میں نظر آ۔ چمک میں جھلک۔ تاریکی میں لہریں لے۔ کڑک سے دل ہلا۔

لیکن اسے آنے کے قابل آ +

رمضان کے سناٹے میں آیا۔ تراویح کے قرآن کی خوش لحنی میں جلوہ دکھایا۔ افطاری کے وقت تیری مزیدار آہٹ سُنائی دی اب بھی آ۔ جس طرح چاہے آ۔ لیکن آ +

کہتے ہیں تو ہر چیز میں آسکتا ہے۔ ہر حال میں تیری آمد کا امکان ہے۔ تیرے آنے میں دیر نہیں لگتی۔ تجھ کو بُلانے کی ضرورت نہیں۔ آنے کے بغیر جو آجائے۔ بلا حرکت متحرک ہو۔ وہ تو ہے۔ تو بس اسی طلسماتی۔ غیر مفہوم چال سے آجا۔ دیکھ آجا۔ سُن آجا۔ سمجھ آجا +

ہم کو وہ دیدار دے جو دیدۂ دیدار طلب کے شایاں ہو۔ موسیٰ کو بے ہوش کرنے والا۔ طور کو خاک سیاہ بنانیوالا نہیں۔

ہلالِ عید

آسمان کے کونے میں مُنہ نکالے ہم کو دیکھ رہا ہے۔ ہم اس کو دیکھ رہے ہیں۔ یہ وہی پارۂ نور ہے جو ہر ماہ کے ختم پر چھپکر نکلتا ہے۔ مگر کبھی آج کی سی خوشی۔ اُمنگ۔ کیفیت۔ پیدا نہیں ہوئی۔ یہ کیوں ہے؟ کیا تو اس کے پردہ میں اپنی ابرو دکھا رہا ہے۔ ہاں تو ہی ہوگا۔ نہیں۔ تو ہی ہے +

ایسے عالم بے شمار ہیں۔ ایسے فلک لاتعداد ہیں۔ چاند بھی بہت سے ہونگے اور دیکھنے والے بھی۔ پھر تو کہاں کہاں چشم نوازیاں کرنے جائے گا۔ آ۔ تجھے اپنی آنکھ میں چُرا کر۔ چھپا کر رکھ لیں۔ اپنے لیئے اور اپنے بیقرار دل کے لیئے بڑی سیر ہوگی۔ تو ذرا ہم میں چھپ کے تو دیکھ۔ لوگ تجھے ڈھونڈھتے پھریں گے۔ عرش و کرسی پریشان ہوں گے۔ فرشتوں کو تلاش ہوگی۔ دوسری دُنیا کے باشندے عید کی بہار چھوڑ کر تیری جستجو کی سرگردانی میں پھنس جائیں گے۔ کیا تو یہ سمجھتا ہے کہ ہماری آنکھ کا خانہ چھوٹا ہے۔ اس میں تیری گنجایش نہ نکلیگی۔ نہیں دریا حباب میں آسکتا ہے۔ انجن کی وہ بھاپ جو ریل کی لمبی قطار کو کھینچ کر لے جاتی ہے اور خود انجن کی حرکت اس کے دم سے ہے۔ کہاں رہتی ہے؟ انجن کے ایک چھوٹے سے ظرف میں +

اچھا یوں نہیں تو پھول کی خوشبو کی طرح دل کے گُل میں سما جا۔ یہ مدلّل مطالبہ تو قبول کر +

چاند رات

چاند تو چھپ گیا۔ مگر چاند رات موجود ہے۔ ہر طرف اندھیرا۔ اور وہی رات جو روز آیا کرتی ہے۔ پھر یہ چہل پہل۔ گھما گھمی کیسی؟ ہو نہو یہاں بھی تیرے گیسوؤں کی شرکت ہے۔ بے شک۔ یہی بات ہے۔ قسم لے لے۔ وَالّیلِ اِذَا یَغشیٰ۔

صبحِ عید

آنکھ کھُلنے سے پہلے۔ سورج نکلنے کے اوّل افکار کو شکست ہوئی۔ اسرار نے سُرور کے کپڑے پہن لیئے۔ اور فتحیابی کا جشن تیار ہوگیا۔ عید گاہ میں چھوٹے بڑے۔ اچھے بُرے۔ سب تیرے لیئے جمع ہوئے ہیں۔ کھڑے ہو کر انتظار کرتے ہیں۔ جُھک کر دیکھتے ہیں۔ اور عاجز ہو کر سر خاک پر رکھ دیتے ہیں۔ اب تو آجا اور گلے مل جا +

سنا تھا کہ تو دلوں میں رہتا ہے۔ اس لیئے ہر شخص سینے سے سینہ ملا کر معانقہ کرتا ہے۔ کہ شاید کسی دل میں تو مل جائے۔ مگر تو کیوں حجاب کرتا ہے اور ملنے سے گریز کرتا ہے۔ آج کے دن بھی نہ ملا تو کب ملیگا +

دیکھ آ۔ اب صبر نہیں ہو سکتا۔ دامن قرار ہاتھ سے چھوٹا جاتا ہے۔ تو نے کہا تھا۔ اُدْعُوْنِیٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ مجھ سے مانگو قبول کروں گا۔ سو تجھ ہی سے مانگتے ہیں اور تجھ ہی کو مانگتے ہیں ؏

وعدہ پورا کر اور آ۔ یہ عید ہے۔ وعید کا خیال چھوڑ دے۔ اگر آج تو من جائے تو ہماری عید بھی من جائے گی +

دعائے بیقراری

اور

دِل آشفتہ کی بکا وزاری

رمضان المبارک سنہ ۱۳۴۳ھ ہجری کی اکیسویں تاریخ کو منزل گاہ حلقۃ المشائخ میں امیر المومنین مولےٰ علی کرم اللہ وجہ کا سالانہ عُرس تھا۔ یہ دعا چند گرم فقروں کے اضافہ کے ساتھ اُسی موقع پر خواجہ صاحب مدظلہ نے پڑھی تھی :-

الٰہی تجھ سے کیونکر مانگیں۔ دل کو قرار نہیں۔ طبیعت کو یکسوئی نہیں۔ زبان میں گویائی نہیں۔ پہلے قرار دے۔ اطمینان عطا فرما۔ بولنے اور مانگنے کی طاقت مرحمت کر۔ تاکہ کہیں۔ سانس کی خیر۔ آس کی خیر۔ اور اُس کی خیر جس کی دم شماری کا وقت آگیا۔ دل کی حرکت بند ہو جائے تو انسانی مشین رُک جائے۔ مگر ایسی حرکت سے بچا جو درجۂ اختلاج کو پہونچ گئی ہے۔ جب دل ذرا صحت پر آئے گا تو پکاریں گے اَللّٰھُمَّ یَا رَبَّنَا! اے پروردگار اور ہر جگہ حاضر! آج کی رات کا صدقہ۔ ہماری دعا کو سُن۔ یہ وہ شب ہے جس میں تیرے شیر۔ تیری تیغ۔ اور تیرے کلمہ۔ علی مرتضیٰ ؑ کی یادگاری کا سالانہ جلسہ منانے کے لیئے ہم لوگ جمع ہوئے ہیں +

برادر رسول ؐ۔ زوج بتول ؓ۔ پدر فرزندان ملول۔ رموز و اسرار کے خرقہ پوش۔ عیب کاروں کے پردہ دار۔ حیدر کرار۔ شہسوار کارزار۔ اَنْ داتا۔ مَنْ داتار تجھ پر سلام۔ اور اُس برکت والی روح پر سلام جس کے وسیلے سے دُنیا کی اس شب تار میں خدائے برتر سے دل وجان کا اُجالا مانگا جاتا ہے +

" اللہ میاں! تم دیکھتے ہو۔ بجلی کی روشنیوں سے آنکھوں پر۔ انجن کی چیخوں اور توپ کی گرجوں سے کانوں پر۔ الحادی فلسفہ کی دلیلوں سے عقل وحواس پر حملے ہو رہے ہیں +

نورِ علوی کو ظاہر کر تاکہ برقی رو ماند ہو۔ حیدری نعرے کو بلندی دے۔ جس سے عارضی آوازیں پست ہوں۔ علوم (ربانی) کے باب کھول۔ جو عقل وحواس اپنی ہستی کو بچائیں۔ آمین اے رب العالمین آمین۔ اے قبول کر سکنے والے! یہ کون ہے جو پوچھتا ہے کہ علی مرتضیٰ ؑ کی روح یہاں کہاں؟ جس پر سلام بھیجتے ہو۔ بے تار کے برقی اشارات کی طاقت کو نہیں دیکھا۔ اس آلہ سے بڑھکر ہم کو ہُنر یاد ہے۔ ہم جو چاہیں کہیں اور اُن کو سُنائیں +

اے بیکسوں اور لاچاروں کی پناہ! ہماری مُرادوں کو پورا کرنے والے! ہم کو اپنے در کے سوا اور کسی کے آگے نہ جُھکا۔ معاش کی طلب میں در در کی ٹھوکریں نہ کھانے دے اپنے غیب کے خزانے سے رزق عنایت کر۔ بے اولادوں کو ایسے فرزند مرحمت فرما۔ جو دینِ اسلام کے سپوت ہوں +

خداوندا! اہل دہلی۔ حاضرین مجلس۔ اور حلقۂ نظام المشائخ کے تمام ممبران کی دلی مُرادیں پوری کر۔ خاصکران کے مقاصد برلا جنھوں نے حلقہ کے دعاخانے میں اپنی مختلف ضروریات کے لیئے دعا کی خواستگاریاں بھیجی ہیں۔ الٰہی ان سب کے ارمان برآئیں۔ جو اس حلقے اور دعاخانے اور اس قسم کی مجالس کے معین و مددگار ہیں +

اور مجھ موجود بے وجود کو بھی توفیق دے کہ زمانہ کے فیشن اور نمایشی نفاق آمیز اعمال سے محفوظ رہوں۔ جو کچھ کہوں وہی کروں اور تیری رضا کی حد سے آگے نہ بڑھوں +

بھگت کے بس میں آ بھگوان

از اخبار توحید میرٹھ مورخہ ۱۹ اپریل ۱۹۱۲ء

یا رحمٰن یا سبحٰن

تیری سمرن چھوڑوں۔ آگے سیس دھروں۔ کیسے بھگتی کروں

اے بھگوان۔ اے سبحٰن۔ اے رحمٰن

موسیٰؑ کے زمانہ کا چرواہا ہوتا۔ تجھ کو اپنے گھر بُلاتا۔ پاؤں دباتا۔ سر دُھلاتا۔ ٹھنڈا ٹھنڈا دودھ پلاتا۔ تو سوتا تو پنکھا جھلتا۔ تو سُنتا تو گانا گاتا۔ روتا۔ رُلاتا۔ جاتا تو روکتا۔ پیروں پڑتا۔ ہاتھ جوڑتا +

داتا تو کہاں ہے۔ میرے مَن کی بِپتا کے دِیکھن ہار۔ مولیٰ۔ مولیٰ۔ سُن۔ اُلجھنوں میں ہوں۔ گردشوں میں ہوں۔ بیقراری دیکھ۔ آہ وزاری دیکھ۔ اشکباری بھی۔

آنسو دے ان میں نہاؤں۔ سوزش دے۔ تڑپوں۔ لوٹوں۔ تجھکو پاؤں۔ بلالؓ کا دل دیدے۔ درِ آستان پر سر ٹکراؤں۔ عزّت تجھ سے ہے۔ ذلّت تجھ سے ہے۔ راحت تجھ سے ہے۔ میرے پربھو بھگوان۔ اپنے بھگت کے بس میں آجا۔ دے جا۔ دلا جا +

یہ رات کیونکر کٹے۔ تو یاد آتا ہے۔ کلیجہ مُنہ کو آتا ہے۔ اپنے داس کو درشن دے۔ روپ کھا۔ جلوہ افروز ہو۔ آنکھ بیہوش۔ اور نہ من سنتوش ہو۔ کس کا بلقان۔ کیسا ایران۔ تیری رحمت کا چشمہ اور اُس میں اشنان۔ اسی میں ہیں دونوں جہان۔ رین اندھیری بدلی کالی۔ رستہ بھاری۔ دشمن سر پر۔ غفلت دل میں۔ ہاتھ پکڑ بھگوان۔ میں قربان۔ تجھ کو دیکھوں۔ اور نہ دیکھوں کوئی۔ سب ہوں گم۔ تو کہے گر قُم۔

شوکت والے۔ طاقت والے۔ توپوں اور سنگینوں والے۔ زخموں اور مرہم والے۔ دُکھ کے کرتا۔ سُکھ سروپ۔ تیرے بھوکے تیرے پیاسے۔ یہ ہے اچھا۔ تو ہو پاس۔

پھول بھی تو۔ خار بھی تیرا۔ نور بھی تو۔ نار بھی تیری۔ آنکھیں میری۔ سب کچھ تیرا۔ اور نین کے اندر ڈیرا تیرا۔ بس میں آ بھگوان +

سر ہے حاضر۔ کھنچے کٹاری۔ عشق کی اگنی چتا ہماری۔ ست پکاریں۔ ست بنجائیں۔ جُز کو تیاگیں۔ کُل ہو جائیں۔ یثرب پہونچیں مکّہ دیکھیں۔ بیچ سمندر جھنڈا گاڑیں۔ مہدی باپو گونجیں گرجیں۔ اُن کے آگے چل کر کڑکیں۔ تیر چلیں سب سینوں پر۔ دشمن چھدے سنگینوں پر +

تو ہو بس میں۔ سب ہوں بس میں۔ حسن نظامی کس کا بندہ ؟ وقت کٹھن ہے۔ الٹا پھندا۔ بھگتی اپنی من کو دے۔ بھارت سیوا سب کو دے۔ بس میں آ بھگوان + تیرے نام کو پرنام۔ يَاذِي الْعِزَّةِ وَالْجَبَرُوتِ وَالْاِكْرَامِ

تو اگر عہدِ وفا باندھ کے میرا ہو جائے * گورے ملکوں کے اُجالوں میں اندھیرا ہو جائے

حُروف کی دُعا

الف تو آگے بڑھ اور کُن کہنے والے داتا کے سامنے ہمارا وکیل بن۔ کیونکہ تو بھی **ایک** دکیتا ہے۔ نقطہ و پہلو سے پاک ہے اور ہمارا مخاطب خدا بھی وحدہ لاشریک اور غیریت سے پاکیزہ ہے۔

مولیٰ ہم حروف ہیں۔ تیرے معانی کی امانت سینوں میں رکھتے ہیں۔ تو نے ہم کو ازل کے مخفی قلم سے پیدا کیا ہے اور ہمارے اجسام کو وہ روح دی ہے۔ کہ ظاہر میں بےحس و حرکت و بےجان نظر آتے ہیں مگر درحقیقت زندہ ہیں۔ اور جو ہم کو نظر غور سے دیکھے تو اُس کو بھی زندہ کر دیتے ہیں۔ تو نے ہم کو وہ زبان دی ہے جو خاص تیری بول چال میں کام آتی ہے۔ یعنی یہ کہ بغیر بولے اور بغیر لب ہلائے بات ادا ہو جاتی ہے۔ اور دوسرے اس کا مطلب سمجھ لیتے ہیں +

انسان روزمرّہ کتابوں، اخباروں اور خطوط میں ہماری باتیں سُنتا ہے۔ مطلب سمجھتا ہے۔ مگر یہ نہیں سوچتا کہ یہ کیا بھید ہے۔ کہ حروف مُنہ سے کچھ نہیں کہتے۔ لیکن جہاں آنکھ کے سامنے آئے اور خود بخود اُن کا مطلب ذہن میں آنے لگا۔ کانوں کو ان کی آواز سُنائی نہیں دی مگر دل و دماغ میں ان حروف کا مطلب چلا گیا +

خدایا ایسے آدمی پیدا کر، جو ہمارے پُراسرار وجود کا اصلی مطالعہ کریں۔ اور ہمارے ذریعہ **تو اُن کو مِل جائے**۔ اور جب تیرا اُن کا وصال ہو تو اس خوشی میں ہماری مراد بھی پوری فرما۔ اور وہ یہ ہے کہ ہم کو نااہل لوگوں کے قلم سے بچا۔ اپنے نافرمانوں کے قبضے میں نہ دے۔ جو ہم کو تیرے وجود واحد کے انکار میں استعمال کریں +

پروردگار! ہم عربی حروف ہوں یا سنسکرت۔ انگریزی ہوں یا فارسی۔ چینی ہوں یا جاپانی۔ اس لیئے ہیں کہ ہم سے تیری وحدت کے مضامین لکھے جائیں۔ نہ کہ تیری دشمنی اور مخالفت کی تحریریں ہمارے پُرزوں سے تیار ہوں +

آؤ حرفو! اخبار توحید کے قرطاسِ ابدی پر صف آرا ہوں۔ عین کی توپ سے غین پر گولہ باری کریں۔ تاکہ غیر فنا ہو جائے۔ اور وحدت کو مقام بقا حاصل ہو۔ آمین ربّنا ثُمّ آمین + اخبار توحید مورخہ ۲۴ر اپریل ۱۹۱۳ء

موسمی دعائیں

(۱) از اخبار توحید مورخہ ۲۴ر اپریل ۱۹۱۳ء

تیرے نام سے شروع۔ اے رحمت شفقت والے۔ اے آدمیوں اور سب کے پالنے والے۔ اے سب کے بادشاہ۔ اے سب کے معبود

پراگندہ دل کے وسوسوں اور شر یر خناس کے پھندوں سے محفوظ رکھ۔ جو گمراہ کرنے کے لیئے بہکاتے رہتے ہیں۔
جی بے کل ہے۔ اس کو کل دے۔ آنکھیں خشک ہیں۔ ان کو اپنی محبت کے آنسو مرحمت فرما۔ خوش قول بنا۔ خوش عمل بنا۔ خوش وقت بنا۔ دشمن زیر ہوں۔ حاسد خوار ہوں۔ بدخواہوں کو رُسوائی ہو۔ آزار دہندے زار و نزار ہوں۔ آمین ربنا آمین۔

پاک روزی عنایت کر۔ وہ مشکلیں دور ہوں جو کسب حلال میں حارج ہیں۔ غیب کے خزانے کھول۔ جن کے ہاتھ سے دلوانا چاہتا ہے اُن کو ہمارا بنادے۔ آمین ربنا۔ آمین۔

عزت و آبرو مرحمت کر۔ اپنے سوا کسی کے آگے جُھکنے نہ دے۔ مذہب۔ مُلک۔ قوم۔ خاندان۔ سب کی لاج رکھ۔ ذلت و رسوائی سے بچا۔ آمین ربنا آمین
بے گھروں کو گھر دے۔ بے زروں کو زر دے۔ شادیاں ہوں۔ خانہ آبادیاں ہوں۔ میاں بیویوں میں میل جول ہو۔ امن ہو۔ سُکھ ہو۔ چین ہو۔ سب گھر بہشت بن جائیں۔ بے اولادوں کو اولاد دے۔ نہ بجھنے والا چراغ دے۔ ماؤں کی گودیں بھریں۔ سُنسان ویرانوں میں نیک بچوں کی رونقیں ہوں۔ آمین ربنا آمین۔ بیماروں کو صحت ہو۔ بلائیں دور ہوں۔ وبائیں دور ہوں۔ آہ کے بدلے واہ ہو۔ غم کے بستر تہہ ہو جائیں۔ درد و الم کا فور ہوں۔ آمین ربنا آمین۔
مقدموں میں کامیابیاں ہوں۔ حق فتح پائے۔ بے گناہوں کو قید سے رہائی ہو۔ ٹل جائے اگر ناگہانی آئی ہو۔ آمین ربنا آمین +

(۳)

از اخبار توحید میرٹھ۔ مورخہ ۱۶ ارمئی ۱۳ ۱۹ء

رَبَّنَا رَبَّنَا رَبَّنَا

نافرمان بندوں کے معبود۔ بیکسوں کے سہارے۔ لاچاروں کے چارہ کار۔ پروردگار یہ ہاتھ تیرے آگے پھیلے ہیں۔ یہ کچھ امید سے دراز ہوئے ہیں۔ ان کو تجھ پر ناز ہے۔ کیونکہ تو بندہ نواز ہے۔ ان ہاتھوں کی خطا نہ تھی جو تیرے غیروں کے دروازے پر دستک دیتے رہے قصور نفس کا تھا۔ جو بہکا کر دربدر کی ٹھوکریں کھلاتا پھرا۔ اب تیرا دروازہ مل گیا ہے۔ آستانہ کی چوکھٹ پر جُھکے ہوئے شرمندہ سر کی لاج رکھ لے۔ یہ پیشانی تیرے سرکش بندے کی ہے جو عاجزی سے خاک پر پڑی ہوئی ہے +
رحم کرنے والے خطا پوش داتا۔ ہم تیرے ہیں۔ تو ہمارا ہے۔ تجھ سے نہ کہیں تو کس سے کہیں +
طاعون نے۔ قحط نے۔ مفلسی نے خود غرضی نے۔ اور ریاکاری نے۔ جھوٹی عزتوں کی حرص و ہوس نے۔ تیرے بندوں کو کہیں کا نہ رکھا اپنی رحمت کی کمند میں اسیر کر لے۔ اپنے کرم کے حصار میں بچا لے۔
صدقہ اُس گیسوؤں والے حجازی کا۔ جس کی یاد واللیل کے پیارے لفظ میں کی جاتی ہے۔ صدقہ اس نورانی مکھڑے کا۔ جس کو والضحیٰ کا خطاب عطا ہوا۔ اس کا طفیل جو بے قرار سمندر کے کنارے مستغرق پہاڑوں کے بیچ میں۔ یثرب کی خوش نصیب زمین پر کملی اوڑھے تیرے نام کی منادی کرنے آیا تھا۔ اُس پتھر کا صدقہ جو تیری محبت میں سات دن کی بھوک پیاسے پیٹ پر باندھا گیا۔ واسطہ اُن چھالوں کا جو بنت رسولؐ کے ہاتھوں میں چکی پیسنے سے پڑے۔ وسیلہ اُس پیاسے حلقوم کا جو کربلا کی تپتی زمین پر ستم کی چھری سے کٹ گیا۔ اور اُن تلواروں کا جو تیرا نام بلند کرنے کو اُٹھائی گئیں۔ اُن گھوڑوں کا جو تیرے دشمنوں کی صفوں میں ہنہناتے ہوئے۔ ٹاپیں مارتے ہوئے۔ کف برساتے ہوئے گھس گئے۔ حرم حجاز کا صدقہ۔ مدینے کے در و دیوار کا صدقہ۔ سُبکیاں بھرنے والے ستون کا صدقہ اور اُس پیار کا صدقہ جس سے فراق زدہ لکڑی کو تسلی دی گئی۔ اس ممبر کا صدقہ۔ جہاں تیرا مزّل تھا۔ تیرا مُدبّر تھا۔ اُس ہریالے گنبد کا صدقہ۔ جو تیری شمع سراج منیر کا فانوس ہے۔ اُن جالیوں کا صدقہ۔ جن کے اندر کچھ ہے۔ آہ کچھ ہے +

فریاد ہے مولیٰ۔ دوہائی ہے مولیٰ۔ سُن لے مولیٰ۔ دیدے مولیٰ۔ اپنا بنالے۔ ایک کردے۔ اور نیک کردے۔ آمین۔ اللھم آمین۔ ثم آمین۔ بیماروں کو شفا۔ بے اولادوں کو اولاد۔ بے روزگاروں کو روزگار۔ بے قراروں کو قرار۔ امتحان دینے والوں کو کامیابی۔ مقدمہ والوں کو فتحیابی۔ مقروضوں کی سُبکدوشی۔ ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم

(۳)

از اخبار توحید مورخہ ۲۴ مئی ۱۹۱۳ء

غریبوں کے دردمند خدا۔ ہم کو خس کی ٹٹی اور تہہ خانہ کی ٹھنڈک درکار نہیں ہے۔ اپنی رحمت کی خنکی مرحمت کر اور گرمی کے موسم کی بلاؤں سے بچا۔ گرم زمین کی حرارت سے ہمارے دماغ کو محفوظ رکھ جس پر ہم تیری دی ہوئی روزی کمانے کے لیئے اور بال بچوں کو پالنے کے واسطے دھوپ میں چلتے پھرتے ہیں۔ لُو سے۔ سرسام سے۔ اور گرمی کے کُل آلام سے حفاظت دے +

علی گڈھ کالج کی پیچیدگیاں دور ہوں۔ حاجی و نواب سکرٹری دلیری وحقانیت سے کارگزاریاں دکھائے +

ندوۃ العلماء کا انجام بخیر ہو۔ موجودہ خلفشار آسانی سے رفع ہوجائے۔ علم دین کا بول بالا رہے +

ہندو مسلمانوں کی تازہ کوشش اتحاد میں برکت ہو۔ دونوں کے دلوں کو خلوص عطا فرما۔ ذات کی رنجشیں اور خودغرضیاں بیچ میں نہ آنے دے

لارڈ ہارڈنگ کی سلامتی ہو۔ ان کو توفیق دے کہ ہندوستان میں عدل و انصاف برقرار رکھیں۔ گوروں کالوں کو برابر سمجھیں +

اخباری دُنیا میں اتفاق دے۔ ہر ایک کو حوادث ناگہانی سے بچائے رکھ۔ اور اپنے فضل کا سایہ ڈال تاکہ وہ حقیقی صداقت سے تیرے بندوں کی خدمت کریں +

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ +

آنسو بھری آنکھ کی التجا

از اخبار توحید میرٹھ مورخہ ۸ جون ۱۹۱۳ء

میرے مالک۔ پچھلی رات ہے۔ سب سوتے ہیں۔ تو جاگتا ہے۔ میں جاگتی ہوں۔ تو سامنے کے آسمان میں ہے۔ یا خود میرے اندر کے مکان میں ہے۔ جہاں ہے میری التجا کو سُن۔ صبح کا نور چمکنے سے پہلے۔ تاروں کی روشنی چھپنے سے پیشتر۔ پرندوں کی نغمہ خوانی سے قبل میری مراد مجھ کو دے۔ یہ سامنے تیرے اجمیری پیارے کا سفید گنبد ہے اس کے کلس پر اپنا دیدار دکھا۔ اس کو طور بنا۔ مجھ کو موسوی بصیرت دے۔ اور تو جلوہ افروز ہو۔ آنسو کا پردہ تیار ہے۔ اور کوئی نہ دیکھنے پائے گا۔ چپکے سے اس کے اندر آجا۔ تاکہ تجھ کو اپنی بپتا سُناؤں۔ کلیجہ کے زخم کھول کر دکھاؤں +

دن بھر اُن بیقراروں کی دید میں گزر گیا جو اجمیری **وسیلہ گاہ** میں تجھ کو ڈھونڈ تے پھرتے تھے۔ ایک کہتا تھا۔ آلٰہی قرض کے بوجھ نے پیس ڈالا۔ اپنے خواجہ کے صدقے میرے بازو ہلکے کر دے۔ دوسرے کی فریاد تھی۔ مولیٰ ناگہانی بلا نے گھیر لیا۔ خواجہ کے ہاتھ سے اس آفت کو دور فرما۔ تیسرے کی فریاد تھی۔ گود خالی ہے۔ گھر بے چراغ ہے۔ اولاد کے لیئے جی ترستا ہے۔ ارمان کا باغ اُجاڑ ہوا جاتا ہے۔ خواجہ کے وسیلے مراد مَن بھر دے۔ چوتھا مرض جسمانی میں مبتلا تھا۔ روضۂ خواجہ سے سر ٹکراتا تھا۔ اس کی بھی تجھ سے آس تھی۔ اور خواجہ کے در کی ڈھارس پاس تھی۔ پانچواں رزق کا بھوکا۔ ہاتھ خالی۔ پیٹ خالی۔ خواجہ کے دروازہ پر تجھ کو پکارتا تھا اور روٹی کا ٹکڑا مانگتا تھا۔ چھٹا آتش عشق میں جلتا۔ آہ شرربار کھینچتا۔ غلاف

خواجہ پر پابوسانہ ہاتھ مارتا تھا۔ کیونکہ اس کو بھی یہ یقین تھا کہ غلاف کے اندر تیرے پاس جانے کا راستہ ہے۔ اور تیرے پاس جاکر شربت وصل کا جام میسّر آسکتا ہے +

ساتواں کچھ اور کہتا تھا۔ دیوانہ تھا۔ مستانہ تھا۔ کائنات اور ہستی موجودات کے معمّہ کو۔ اور اُس کے گورکھ دھندے کو۔ نادانی کی اُنگلیوں سے سلجھا کر اُلجھا رہا تھا۔ اور خبر نہیں کیا بڑبڑا رہا تھا +

اتنے نظاروں سے تھکی ماندی۔ اپنی عاجز بندی۔ چشم اشکبار کی التجا پر رحم کر دے۔ اور اُن سب کی مرادوں کے ساتھ جن کا ذکر اوپر آیا۔ میری درخواست بھی پوری فرمادے +

جھولی والے فقیر کی بھیک

از نظام المشایخ۔ اگست سنہ ۱۹۱۳ء

تو ہی جانتا ہے۔ رمضان میں کون سی رات ہزار راتوں کی برابر ہے۔ کس کو تو نے خطاب قدر عطا فرمایا ہے۔ مجھ کو۔ ہزار۔ لاکھ۔ یا سو۔ پچاس سے غرض نہیں۔ میں اس کی بھی پروا نہیں کرتا۔ کہ وہ رات خطاب یافتہ ہے یا نہیں ہے۔ اس کا شوق بھی نہیں کہ نزول ملائکہ اور روحوں کی مُلاقات والی شب میسّر آئے +

میں تو اے بڑی اور اونچی چوکھٹ والے بادشاہ تجھ کو مانگتا ہوں۔ تیری آرزو میں سرِ شام سے نہیں سویا۔ چاہے تو رمضان میں مِل۔ یا شوّال میں۔ رمضان کے عشرۂ آخرہ میں جلوہ افروز ہو یا بیچ کی اور کسی رات میں۔ مجھے اس سے کچھ بحث نہیں۔ میں ہر حال میں راضی برضا ہوں +

قربان اس دروازے کے جس پر چشم لاہوت کو ہاہوتی نوشتہ نظر آتا ہے۔ دل کہتا ہے۔ میں جبروتی ہوں۔ روح کہتی ہے میں ملکوتی ہوں۔ ہاتھوں کا اصرار ہے کہ ہم ناسوتی ہیں تو کیوں نہ اس دروازے کے راز کو عالم ناسوت میں فاش کر دیں۔ کب تک اقلیم ہاہوت پردۂ خفا میں رہے گی +

مگر نہیں۔ میرے باپ۔ میرے امام۔ میرے مرشدِ اوّل۔ سیدنا علی۔ سلام اللہ علیہ نے تو وعدہ کر لیا تھا کہ راز کو مخفی رکھوں گا تو مجھ کو بھی یہ رمز ظاہر نہ کرنی چاہیئے۔ اچھا تو اے وہ جس کے پاس جانے کے لیئے ہاہوت جیسے گُم اور گُم کرنے والے دروازہ سے گزرنا پڑتا ہے۔ دوسے میری آواز سُن۔ میں ناسوت کے عالم خواہشات میں ہوں۔ وہیں سے پکارتا ہوں۔ پانچ پردوں کی دوری ہے۔ مگر جانتا ہوں کہ تو وہاں بھی سُن لیتا ہے۔ ناسوت میں ہوں۔ اس کے بعد ملکوت ہے۔ پھر جبروت ہے۔ پھر لاہوت ہے۔ پھر ہاہوت کا دروازہ ہے۔ مگر تو سب میں ہے۔ اوّل بھی۔ آخر بھی لاہوت میں بھی۔ ناسوت میں بھی۔ پس تو میری سُن۔ میں اپنے سر کو تیری چوکھٹ پر جھکاتا ہوں۔ میں تیرا بندہ ہوں۔ یہ میرے دونوں ہاتھ کُنڈی کھٹکھٹاتے ہیں۔ تو بخشش و کشایش کے دروازے کو کھول۔ جب تو دیتا ہے اور دے سکتا ہے تو مجھ کو دے۔ جب تیرے ہاں کسی بات کی کمی نہیں تو میرے لیئے دیر کیوں ہے۔ دست رحمت بلند کر۔ اور بندہ فقیر کی جھولی میں کچھ ڈال دے۔ یہ جھولی والا فقیر گھر بہ گھر نہیں جاتا۔ اسی دروازہ پر آتا ہے۔ اسی پر آیا ہے۔ اسی پر آتا رہے گا۔ کسی نے کہا وہ نوالہ دینے کے بہانے سے اپنے مشتاقوں کو دیدار دکھا دیتا ہے۔ اور یہ شعر پڑھا ؎

آمد بروں زخانہ چو آواز ما شنید * بخشیدن نوالہ گدا را۔ بہانہ ساخت

تو یہ بھکاری بندہ بھی صدا لگاتا ہے۔ بھیک کا ٹکڑا مانگتا ہے۔ دروازے کے فقیر کو مایوس نہ کر۔ وَاَمَّا السَّائِلَ فَلَا تَنْهَرْ کا خیال رکھ۔
اور میری جھولی میں خیرات ڈالنے کے لیئے دروازہ پر آجا۔ تاکہ میں رمضان کے روزے۔ تراویح۔ نوافل۔ شب بیداریاں۔ غرض تمام نیکیاں
جو میں نے اور تیرے سب بندوں نے کی ہیں۔ تجھ پر قربان کر کے پھینک دوں۔ اور پھر تیرے قدموں کو پکڑ لوں۔ اگر وہ نہوں اور یقیناً
نہیں ہیں۔ کیونکہ تو اعضائے جسمانی سے پاک ہے۔ تو اپنے خیال و تصور سے تیرے مثالی پاؤں بناؤں۔ اُن کو چوموں۔ اُن پر سر
ٹکاؤں۔ آنکھیں ملوں اور جب تک تو میری جھولی نہ بھر دے اُن قدموں کو نہ چھوڑوں۔

رمضان کے روزہ دار فقیر کی آواز سُن جو کہتا ہے۔

میری جھولی بھر دے میرا چنچل بھر دے

تیری جنت کی خیر	اُس کی نزہت کی خیر	شاخ طوبےٰ کی خیر	حور حمرا کی خیر
ٹھنڈی نہروں کی خیر	اُجلی لہروں کی خیر	تیرے جلوے کی خیر	دید میلے کی خیر

میری جھولی بھر دے میرا چنچل بھر دے

تیری دوزخ آباد	اُس کا برزخ آباد	طوق بھاری آباد	شعلے ناری آباد
قہر و خفگی آباد	طیش و تُرشی آباد	گرز و ہنٹر آباد	دُکھ کے سنٹر آباد

میری جھولی بھر دے میرا چنچل بھر دے

تیری کُرسی رہے	اُس کی بستی رہے	عرشِ اعظم رہے	حکم محکم رہے
لوحِ مخفی رہے	نقشِ ہستی رہے	نورِ نیّر رہے	شانِ اختر رہے

میری جھولی بھر دے میرا چنچل بھر دے

تیرے دریا بہیں	موجیں ہر جا اُٹھیں	کوہ و جنگل رہیں	چپ کے دنگل لگیں
مرنے والے مریں	جینے والے جئیں	عقل والے رہیں	بھولے بھالے رہیں

میری جھولی بھر دے میرا چنچل بھر دے

سُنا! تیرا فقیر بندہ تیری ہر چیز کی سلامتی چاہتا ہے۔ خیر و شر۔ نور ظلمت۔ قہر و رحم کا یکساں خیر طلب ہے تو تو بھی اس پر مہربان ہو۔ اور
اس کی خالی جھولی میں ایک غیبی ٹکڑا ڈال دے۔

فلک پر

از رسالۂ صوفی اگست ۱۹۱۳ء

جس کو حدِّ نظر کہتے ہیں۔ میں نے ایک مست کی متوالی آنکھ دیکھی۔ ستارے اس کو ستا رہے تھے۔ مگر وہ بے پروائی۔ مدہوشی۔ خود فراموشی
کے عالم میں آسمان کے دروازے میں داخل ہونے کی کوشش کر رہی تھی +

میں نہیں کہہ سکتا۔ اس آنکھ کو کس کی تلاش تھی۔ مجھے یہ بھی خبر نہیں کہ اس میں خمار و مستی تھی۔ یا کچھ اور تھا +
فلک کی کھڑکی کھلی۔ ایک فرشتے نے گردن نکالی۔ اور آنکھ سے کہا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكَارٰى کا حکم نہیں سُنا۔ نشہ بازوں
کا یہاں کام نہیں۔ زمین کے میخانے میں جا اور جام کی لال روح کو دیکھ۔ چشمِ دیدار طلب نے ملکوتی ہستی کے فرمان کی پروا نہ کی اور لڑکھڑاتی

ہوئی آسمان کے اندر گھس گئی +

فرشتے اس بے ادب گستاخ اور دیوانی آنکھ کے داخلہ سے گھبرا گئے۔ اُنھوں نے غل مچایا۔ اور کہا۔ تو اس مقدس اور پاکیزہ مقام پر بھی فتنہ فساد برپا کرنے آگئی۔ خُدا سے ہم نے کہا تھا۔ آدم کو خلیفہ نہ بنا۔ جو تیری با امن زمین پر خونریزی کریگا۔ مگر اُس نے آدم کی علمیت سے ہم کو قائل کر دیا وہ جو کچھ تھا زمین کے لیئے تھا۔ اس کی خلافت تجھ کو مبارک۔ مگر آسمان ہمارا ہے۔ ہم کو عبادت کرنے دے۔ اپنی آوارگی کو یہاں مت پھیلا +

عین فرشتوں کی یورش میں ایک غیبی صدا پیدا ہوئی جس نے کہا آنے دو۔ مت روکو۔ یہ میری ہے میں اس کا ہوں۔ اس کے بعد ایک تجلّی نمودار ہوئی۔ فرشتے کانپ کر سجدے میں گر پڑے۔ مگر اُنھوں نے گرتے گرتے دیکھا وہ تجلّی آنکھ کے پردے میں سما گئی۔ آنکھ نے اپنے دونوں غلافوں کو کھینچا۔ اور پپوٹے بند کر لیئے۔ پھر دیکھا۔ تو نہ فلک تھا۔ نہ زمین۔ نہ فرشتے۔ نہ کچھ اور۔ آنکھ اور اس کے اندر چھپی ہوئی تجلّی کے سوا سب نابود ہو گئی میں نے کہا کیا فنا و بقا اسی کا نام ہے۔

قدرت میرے ہاتھ میں

از نظام المشائخ ستمبر ۱۹۱۳ء

گنہگار۔ خطاؤں کی پوٹ۔ ابن آدم۔ خاک کا پتلا۔ میں ایک بشر ہوں۔ تم بھی جانتے ہو۔ میں بھی جانتا ہوں کہ کس قدر قصور میری ہستی سے نمودار ہوئے۔ تم نے مجھ کو آزمایا۔ میں نے تم کو دیکھا۔ ایک بار نہیں۔ ہزار دفعہ۔ محبت کے رشتہ کو کتنی مرتبہ خفقان کی چھری سے کاٹا۔ گو وہ نہ کٹ سکا لیکن زخمی ضرور ہوا۔

میرے خیالات۔ میرے حالات۔ میرا ظاہر۔ میرا باطن۔ تم سے پوشیدہ نہیں۔ جو عیاں تھا وہ بھی تم کو معلوم۔ جو مخفی تھا اُس سے بھی تم خبردار رہو۔ یکجائی رہی۔ آنکھ کی۔ کان کی۔ ہاتھ کی۔ پاؤں کی۔ زبان۔ اور ہونٹ کی۔ اور خبر نہیں کس کس کی +

مگر تم نے دیکھ بھالکر قول دیا۔ جان بوجھکر پیمانِ وفا باندھا۔ اور کہا۔ میں تیرا ہو کر رہوں گا۔ اور اپنا بنا کر رکھوں گا۔ یہ کہکر۔ طاقت اور قدرت کی کُنجیاں میرے حوالے کر دیں۔ اپنا سب کچھ سونپدیا +

میں نے یہ دیکھکر گرد و پیش کے تعلّقات توڑ ڈالے۔ تمھاری زنجیر سے ہاتھ پاؤں اور دل کے گلے کو باندھ لیا۔ تمہاری یاد کو بقائے زندگانی کا ذریعہ ٹھیرایا۔ تمھاری اطاعت و فرمانپذیری کے آگے جھک گیا۔ جو کہا۔ وہ کیا۔ جدھر لے گئے اُسی سمت چلتا رہا +

کچھ یاد ہے۔ وہ اندھیری راتیں۔ جن میں میں جاگتا تھا۔ اور تم کو جگاتا تھا۔ اور وہ گرمی کے دن۔ جبکہ میں تمہاری خاطر اپنے جسم کو پسینہ میں ڈبوتا تھا۔ وہ سردی کے سناٹے جن میں تمہاری مدارات کی جاتی تھی۔

تم کہتے تھے آہا یہ کیسے اچھے دن ہیں۔ میں کہتا۔ ہاں میاں یہ زمانہ ہر ایک کو نصیب نہیں ہوتا۔ تم مجھ پر فدا تھے۔ میں تم پر نثار تھا۔ آسمانی آبادی رشک کرتی تھی۔ بازوؤں کے فرشتے نیکی بدی کے علاوہ ایک تیسری چیز درج رجسٹر کرتے تھے +

اسی زمانہ میں جبکہ میں نے سمندر کی یورش سے نجات پائی۔ تم نے کہا۔ آدمی میں تیری یاد میں بے چین تھا۔ تو کہاں تھا۔ تو آگیا؟

اب کیا ہوا جو تم مجھ سے بیزار ہو۔ اگر خطا واری اور غلط کاری باعث حجاب ہے، تو یہ پہلے بھی تھی۔ کہہ چکا ہوں کہ تم نے آزما لیا تھا۔ اور خصلت و عادت کو پہچان گئے تھے +

اب تم مجھ سے بچتے ہو۔ بہانہ کرکے ٹالتے ہو۔ ظاہرداری کی رسموں سے بہلاتے ہو۔ اُسکو؟ جو تمہاری دی ہوئی قوت عرفان سے غیب کا مشاہدہ کرتا ہے۔ جو باوجود سیہ کاری وعصیاں آبی کے زبردست طاقت ہوش و دانش کی رکھتا ہے۔

آج اگر تم ناقص۔ اور تمہاری شان کو نہ سمجھنے والی ہستی کو اپنا بناتے ہو۔ اور تاج حکمرانی اُس کے سر پر رکھتے ہو۔ آج اگر تم کو یہ خیال ہے۔ کہ قدیمی رشتہ توڑنے سے منظر کائنات کی نمایش بڑھ جائے گی۔ تو میں ادب سے کہوں گا کہ انصاف کا خون ہو جائے گا۔ اور لطفِ رعنائی و کبریائی ہاتھ سے جاتا رہے گا +

یاد تمہاری ہے۔ اس کو سامنے لاکر سوچو۔ قدرت تو تم مجھ کو دے چکے ہو۔ میں ہجومِ اندوہ میں اپنے ہاتھ کی قدرت کو گردش دوں گا۔ اور ناقص العقل ہستی کو خاک و خون میں ملا دوں گا۔ پھر نہ کہنا کہ وفاداری و دلداری کے خلاف کیا۔ میرا دل پک گیا ہے۔ میرا جگر دکھ گیا ہے۔

(۲)

مسلمان ہوں جس پر نعمتوں کو پورا کرنے کا وعدہ کر چکے ہو۔ حجازی ہوں جس کی دلجوئی کا قول ہار چکے ہو۔ مستِ الست ہوں۔ جس کے "بلیٰ" کو قرآن میں شایع کر چکے ہو۔ وہ وجود ہوں جس کی پشت پر مُہرِ اسرار کے نشان ہیں۔ منکر اور ناشناس دوزخیوں کو مجھ پر مسلط نہ کرو۔ اپنی فرقت کی آگ میں مت جلاؤ۔ رقابت کی آتش میں نہ ڈالو۔ کوئی قصور ہوا ہو تو چشم کرم کو پھیر لو۔ اسی میں کام تمام ہو جائے گا۔ یہ دوسروں کے سامنے ذلیل و رُسوا نہ کرو۔ مانتا ہوں کہ یہ سب کچھ نگاہِ قہر کی کارسازیاں ہیں۔ مگر قہر اپنی ذات تک محدود رکھو۔ تمہاری رحیم سرکار ہے۔ پھر ایک نہ ایک دن ملائمت کی توقع ہو سکتی ہے۔ ان خود غرض بندۂ حرص و ہوس اجسام۔ ان مولویے اور فراموش کار افراد کی پالے نہ ڈالو جنھوں نے تمہارے دلدادہ کو جوتیوں میں ڈال رکھا ہے۔ اور اجازت دو کہ میں بھی انتظام کے لیئے باہر آؤں۔ اور اس خس و خاشاک کو نابود و فنا کرکے دکھاؤں کہ تھی تمہاری دی ہوئی قدرت میرے ہاتھ میں +

کعبے والے خداکو کیونکر پاؤں

ازرسالۂ خدّامِ کعبہ۔ جون ۱۹۱۴ء

میں اُس کو چاہتا ہوں۔ میرا جی اُس پر آگیا ہے۔ اُس کی یاد مجھ کو ستاتی ہے۔ دید مانگتا ہوں۔ ایک نظر ڈالنے کی ہوس ہے۔ وہ کہاں ہے۔ کس طرح دستیاب ہوتا ہے۔ ہر چیز کوشش سے مل جاتی ہے۔ ہرچرن نے پڑھتے پڑھتے بی۔ اے پاس کرلیا۔ لال خاں کو مرغبازی کا ہُنر آگیا۔ انجن دہلی سے دوڑا تھا کلکتے پہونچ گیا۔ گنگا ہردوار سے بہی تھی۔ بہتے بہتے سمندر میں جاگری۔ سورج طلوع ہوا تو اُس نے ہر سوتے کو جگا دیا۔ چاند غروب ہوا تو تارے چمک گئے +

میری بیٹی حور بانو نے پاؤ پارہ قرآن شریف کا صبح سے شام تک یاد کرلیا۔ پکانے والی نے آٹا گوندھا تھا۔ اب روٹی پکا رہی ہے۔ مگر میں اُس کو کعبہ کی کالی چادر میں۔ مدینے کے سبز غلاف میں۔ اجمیر کے صندل میں۔ دہلی کے نظام الدین میں۔ نماز کے سجدے میں۔ بیوہ کی آہِ سرد میں یتیم کی چشم تر میں۔ مظلوم کی مایوسی میں۔ ظالم کی خود فروشی میں ڈھونڈ چکا۔ ہر دروازہ کی کنڈی بجا چکا۔ آنسو بھی بہائے۔ ہاتھ بھی پھیلائے لیکن اُس کا دامن نصیب نہ ہوا۔ میں نیا گرفتار نہیں ہوں۔ میری اسیری پُرانی ہے۔ مگر اب بھی مجھ کو فریاد کرنی نہیں آتی۔ اُس کی ناز برداریاں نہیں جانتا۔ کوئی ہے جو مجھے بتائے کہ میں اُسے کیونکر پاؤں +

ادھر جھک۔ سن۔ بتانے والا بتاتا ہے۔ زخم کھول۔ مرہم کا پھاہا خود سامنے آتا ہے۔ تیری تلاش ادھوری تھی۔ تیری جستجو کا رُخ بے رُخ تھا وہ کعبے کی چادر میں مُنہ چھپائے موجود تھا۔ وہ مدینے کے سبز غلاف پر صاف جھلک رہا تھا۔ اس نے تجھ کو اجمیری صندل میں خوشبو بن کر اور دہلی کے نظام الدین میں سُلطان المشائخ ہو کر پکارا۔ مگر تیرے کان ہیں سائنس و فلسفہ اور نئے زمانہ کے ہوا و ہوس نے پردے ڈال رکھے تھے۔ تو اُس کی آوازِ بے صوت کو کیونکر سُنتا +

اور سُن۔ علی مرتضٰیؑ نے کیا آواز دی۔ کہ ارادہ کی شکست میں اُس کی شکل نظر آتی ہے۔ ہربرٹ سپنسر نے کتاب لکھی۔ اور ہر چیز کا فلسفہ بتا دیا۔ مگر چھپنے کا وقت آیا تو ناگہانی اُفتاد سے مسوّدہ غائب ہو گیا۔ اُس وقت اُس نے کہا۔ کہ یہ کون تھا جس نے میرے ارادے اور یقینی کوشش کو جلدی پورا ہونے سے روک دیا۔ کیا یہ امر اتفاقی تھا؟ اگر اتفاقی بات تھی تو مسودہ پریس میں دستیاب ہونے کے بعد پھر کیوں گم ہو گیا۔ کیا اتفاقات کو میرے ساتھ ضد ہے۔ شاید اس میں کوئی بھید ہو۔ ممکن ہے اسکا اختیار کسی مخفی طاقت کے ہاتھ میں ہو وہ کون ہے؟ کیا خلقت اسی کو خدا کہتی ہے +

اگر یہ سچ ہے تو میں اُسے کیونکر پاؤں۔ البیلی طوائف کو دیکھ۔ عمر بھی چھوٹی۔ صورت بھی انوکھی۔ لباس بھی طرحدار۔ آواز بھی قیامت گانے کا ڈھنگ بھی بے نظیر۔ مگر اس کو کوئی بھی نہیں پوچھتا۔ مُجرے کے لیئے کوئی نہیں بُلاتا۔ نوبلی جان طوائف۔ کالی بھونڈی چالیس برس کی عمر۔ پھٹی ہوئی آواز۔ ناچنا آئے نہ گانا۔ لیکن ہر شخص کی زبان پر اس کا چرچا ہے۔ یہ اثر اور یہ اثر ی کس نے پیدا کی۔ کیا اُس نے جسکو خدا کہتے ہیں۔ اگر بات یوں ہی ہے تو سمجھ کہ خدا ان ہی موقعوں پر پہچانا جاتا ہے۔

اُستاد شبّو کا قصّہ بھول گیا۔ خون کے مقدّمے میں گرفتار تھے۔ ثبوت پورا تھا۔ قانون پھانسی پر لٹکانے کے لیئے آستین چڑھا چکا تھا ہزاروں روپیہ روز لینے والا وکیل قلم ہاتھ سے رکھکر چپ چاپ کھڑا تھا۔ اُستاد کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں کہ جج صاحب نے حکم دیا شبّو خاں تم بری کیئے جاتے ہو۔

ختم خواجگان چشت پڑھوایا تھا۔ ان کا زیادہ بھروسہ اسی پر تھا۔ گو وکیلوں کے محنتانہ میں دس ہزار خرچ ہوا۔ لیکن ان کا دل کہتا تھا کہ یہ ایک روپیہ جو ختم خواجگان چشت میں خرچ ہوا بس یہی اصل اور مفید خرچ ہے۔

اگر یہ بات درست ہے۔ تو خدا اسی توکّل اور بھروسہ کے اندر تھا۔ اور سب ظاہری اسباب کو شکست دیکر ختم خواجگان میں نمودار ہونے والا وہی تھا۔ تو چاہتا ہے تو اس طرح اُس کو تلاش کر۔

چودھری سنگھ کا دس لاکھ روپیہ کیوں تباہ ہو رہا تھا۔ قانون کے ہاتھوں دستاویز کی تحریر کی بدولت وہ کس طرح مایوس ہو گئے تھے رشوت خوار حاکم کو ۷۵ ہزار روپیہ دینے کو تیار تھے۔ مگر آیت کریمہ کے ایک عمل نے جس میں صرف ۴۱ روپئے صرف ہوئے ان کی جائداد کو بچا لیا۔ ان کو حیرت تھی کہ غیبی ہاتھ کہاں سے نمودار ہو گیا۔ اس کا تو انہیں گمان بھی نہ تھا۔ لیکن قرآن نے ان کی حیرت کو یہ سُنا کر دور کیا کہ مَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ ۔ جو خدا پر بھروسا کر لیتا ہے تو وہ اُس کا حمایتی بنجاتا ہے۔ اور ایسی صورتوں سے مشکلیں آسان کرتا ہے جس کا اُس کو وہم و گمان بھی نہ ہو۔ بس تو بھی ان ہی کرشموں میں اس کو ڈھونڈا کر۔

ارمان والی اصغری۔ دولت والی اصغری اولاد کے لیئے پھڑکتی تھی۔ لیڈی ڈاکٹر اور حکیموں کے علاج میں پورا اکیس ہزار روپیہ پانی کی طرح بہا چکی تھی۔ مگر کیا ہاتھ آیا حسرت و مایوسی۔

اور سورۂ مزّمل کے وظیفہ میں کیا خرچ ہوا۔ صرف اکیس[۲۱] روپئے۔ اور نتیجہ کیا پیدا ہوا۔ چاند سی صورت کا بیٹا +

ہاں۔ یہ ٹھیک ہے۔ میرا اس پر ایمان ہے۔ اس گوشۂ تنہائی میں جہاں زندگی کے دن کاٹ رہا ہوں یہی شغل رہتا ہے۔ مگر یہ سب میرے

درد کی دوا نہیں ہیں۔ خون کے مقدمہ سے رہائی۔ دولت کی کمائی اور بچے کی ہوائی نہیں چاہتا۔

میرے دل میں ایک اور درد ہے۔ میری آنکھ کچھ اور دیکھنا چاہتی ہے۔ میں اُس کو پانے کا خواستگار ہوں۔ اور علانیہ دید کا طلبگار ہوں۔ جس کو خدا کہتے ہیں۔ جو رب کعبہ کہلاتا ہے۔ ابابیلوں سے ہوائی جہازوں اور کنکروں سے توپ کے گولوں کا کام لیتا ہے۔ جو اپنے نام کے گھر بنواتا ہے۔ اُن کی عزت و حرمت کراتا ہے مگر سکونتِ مکانی سے انکار ہے۔

وہ جس نے کشمیر کے گلزار پہاڑوں۔ شملے کے خنک آبشاروں۔ سوئزر لینڈ کے سہانے نظاروں کو چھوڑ کر حجاز کے سوکھے جلتے بلتے کوہستان کو اپنی پسندیدگی کا نشیمن بنایا۔ اور پروانہ بھجوایا۔ قرآنی گزٹ میں چھپوایا کہ ساری خدائی میں ایک دفعہ میر کر ہر ہمت طاقت والے شیفتہ پر اس مقام کی دید فرض ہے۔ میں اس کو مانگتا ہوں جو عرب کی کھجوروں۔ کانٹے دار بیریوں۔ اونٹوں کے کجاووں کو آم کی ٹہنیوں۔ گلاب کی شاخوں اور موٹروں پر ترجیح دیتا ہے۔

جس نے اپنے نام کی قسموں کو رب کعبہ کے لفظ سے نامزد کیا ہے جس کا اشارہ ہے کہ سب فدا کار کعبہ کے رُخ مجھ کو دیکھیں اور سر جھکائیں +

بس میں اُسی کو۔ بالکل ٹھیک ٹھیک اُسی کو پوچھتا ہوں کہ وہ کیونکر ملے +

طائرِ سبز فام کا پیام

از رسالۂ اُسوۂ حسنہ میرٹھ بابتہ اگست ۱۹۱۴ء

ذکر اسی شب برات کا ہے۔ جبکہ پہلے آسمان پر وہ جلوہ افروز تھا۔ جس کو خدا کہتے ہیں۔ آسمان پر پہرے لگے ہوئے تھے۔ فرشتے اپنی نوکریوں پر سر بسجود اور پا بقیام حاضر تھے۔ چاند کی شمع جل رہی تھی۔ تاروں کے فانوس جگمگا رہے تھے۔ زہرہ گنگناتی تھی۔ اور نغمہ بجاتی تھی۔ مشتری وجد کرتا تھا۔ عطارد سال بھر کی تقدیروں کے نوشتے پیش کر رہا تھا۔ مریخ تلوار کھینچے کھڑا تھا +

تختِ رب العالمین ظہور ذات سُبحانی کی مستی میں جھوم رہا تھا +

میں نے دیکھا ایک سبز پرندہ دستِ قدرت پر بیٹھا ہے اور مخلوق پناہ رب سے کچھ کہہ رہا ہے۔ قدرت کا دوسرا ہاتھ اس کے سر پر شفقت سے پھر رہا ہے۔ اور بار بار اُس پرند کی منقار سُرخ کو بوسے دیے جاتے ہیں۔

اتنے میں ایک زمردیں قفس لایا گیا جس کے اندر موتیوں کا جھولا پڑا ہوا تھا۔ جانور پھُدک کر اُس پنجرے کے اندر چلا گیا اور قفس کی تیلیوں میں سے چونچ نکال کر مستانی صدا میں کچھ اور گانے لگا۔ غیب کے ہونٹ پھر پھڑکے۔ اور فریادی پرندہ کی چونچ کو چوم کر اس کا پنجرہ ایک موجود وجود کے حوالے کر دیا گیا۔

یہ موجود وجود پنجرا ہاتھ میں لیے ہوئے ہوا میں تیرتا۔ فرّاٹے بھرتا دم کے دم میں زمین پر آگیا +

یہ بمبئی میں داؤد یہودی کا گھر تھا۔ جہاں حسن نظامی کا خاکستانی پیکر جلووں کی دید کے لیے آنکھیں مانگ رہا تھا۔ آج شب برات ہے۔ میں بصیرت مانگتا ہوں۔ لال پدڑی کا پنجرا نہیں مانگتا۔ آپ کی بھی عجیب دین ہے۔ بھوکے کو کپڑا دیتے ہو اور ننگے کو روٹی۔ اندھے کو کان دیتے ہو۔ اور بہرے کو آنکھیں +

صاحب نیشلی آنکھ کا طلبگار ہوں اور البیلے یار کا خواستگار ہوں۔ یہ جانور کسی بچے کو بخشیئے۔ یہ کھلونا کسی نادان کے حوالے فرمایئے +

چینی کی رکابی میں بنے ہوئے پھولوں کو کیا کروں۔ رنگ روپ بھی ہے دوام قرار بھی ہے۔ مگر پھول اوائیں نہیں۔ نہ وہ گل اندامی کی مہک ہی۔ طلائی نقرئی گلدانوں کے گلدستے مجھ کو منظور نہیں۔ پا بگل پودا درکار ہے۔ جو اپنے بھروسہ اور اپنے پاؤں کا سردار ہے۔

کھجور کے درخت میں آم نہ لگا۔ انگور کی شاخ میں کریلے نہ پھیلا۔

وجود موجود! قرنِ ہست کے ہمزود!! تو کیا جانے عبد و معبود کے کلمہ کلام کو۔ نابود ہو جا۔ اور اس جوہرستانی پنجرہ کے سامنے سے ہٹ جا +

وجود موجود نے ایک ہلکی سی جنبش کی اور اپنی نامفہوم صدا میں کہا +

معدوم ہستی نما آدم! آج کی رات لین دین اور جزا و سزا کی رات ہے۔ اجسام و ارواح۔ الفاظ و معانی۔ بندہ و خدا کی یکجائی کی رات ہے۔ ہر طلب کی حقیقت مجاز کا لباس پہنتی ہے۔ آج دربار ہے جس کو جو کچھ ملتا ہے اُس کی خواہشوں کا مجسمہ ہے۔ تو جو اکڑتا ہے۔ اُلٹی سیدھی باتیں بنا کر اپنا کوئی ممتاز مطالبہ ثابت کرنا چاہتا ہے۔ غور کر کہ یہ جانور اور یہ پنجرا تیری ہی خواہشوں کا برزخ ہے۔ تیرے ہی مطالبات کا ہیولیٰ ہے۔

بصیرت کیوں مانگتا ہے؟ کس کی دید کا طلبگار ہے۔ دیکھ کہ اس قفس میں سب کچھ نمودار ہے۔ یہ طائر سبز فام طریقِ حیات کا خضر ہے۔ اور عطائے ربانی کا مجازی برزخ ہے۔ جس طرح تیری دعا اس زبان سے تھی جو اصلی حسن نظامی کی نہیں۔ تیری طلب اس دل سے تھی جو حقیقی حسن نظامی سے خارج ہے۔ تیرے ارادے اس دماغ سے تھے جو واقعی حسن نظامی سے تعلق نہیں رکھتا۔ لہٰذا اس کا جواب۔ اس کا عوض۔ اس کا تبادلہ بھی اس صورت میں ہوا۔ جو تیری آنکھوں کو اجنبی اور غیر نظر آتا ہے +

وجود موجود کی گفتگو ختم نہیں ہوئی تھی کہ طائر سبز فام نے اپنی شیریں نوا بولی کو اُردو زبان میں آمیز کر کے یوں دُر افشانی شروع کی پہلے ثابت کر کہ تو ہی حسن نظامی ہے۔ پھر دیکھ کہ میں ٹھیک تیرا ہی مطالبہ ہوں۔ یا کچھ اور۔ ارے نادان۔ یہ سارا جہان وہ نہیں کہ جو تو دیکھتا ہے۔ وہ نہیں ہے جس کا تصوّر تیرے ظلماتی ذہن میں آتا ہے۔ یہ شکلیں حیوان و انسان کی۔ یہ صورتیں شجر و حجر کی دیکھنے میں کچھ اور ہیں اور حقیقت میں کچھ اور ہیں۔ ایسے ہی ان اجسام کی ارواح کے جذبات و خیالات اپنے اندر باہر کی جو شکلیں بناتے ہیں وہ سب بے معنی اور مہمل ہوتی ہیں۔

اول تو مسلمانوں کی قوم کو دیکھ۔ پھر دوسری قوموں پر نظر ڈال۔ بلندی و پستی۔ عروج و زوال۔ شہ زوری و بیچارگی۔ سرکشی و بے بسی کے دو کارخانے دکھائی دیں گے۔ جو ایک دوسرے کے بالکل برخلاف کام کر رہے ہیں۔ جب ایک فریق بلند ہوتا ہے تو جان لے کہ اُس نے خود اپنی بلندی کو بلند نہیں پایا۔ دوسرے اس کو بلند سمجھتے ہیں۔ اس کو رات دن اپنی پستی کا تصوّر رہتا ہے۔ جو عروج میں ہیں ان کو اپنی حالت زوال پر نظر آتی ہے۔ شہ زور کو ہمیشہ اپنی کمزوری کا احساس ہوتا ہے۔ سرکش دوسروں کو مرعوب کر لیتا ہے۔ تو خود اپنے نفس سے بھی مرعوب رہتا ہے۔ اور اپنی کم طاقتی کا صدمہ سہتا ہے +

لیکن میں جس کے پاس آتا ہوں اُسکو چند روز میں منتہائے مقصود کی اصلیت بتا دیتا ہوں۔ سمجھا دیتا ہوں۔ بلکہ آنکھوں سے دکھا کر ذہن و دماغ پر نقش کر دیتا ہوں +

دیکھ میں مدینہ کے گنبدِ خضرا برجِ سبز کا برزخِ ناسوتی ہوں۔ میری منقارِ سُرخ کے آگے گردن جُھکا۔ جس کو پروردگار کے لب بے لب نے چوما۔ اور میرے ہر بول کی صدا۔ اور میری ہر حرکت پر قدم اُٹھائے چلا جا کہ یہی میرا اُسوۂ حسنہ ہے۔ اور اسی کے اندر تو اپنے سب مطالبات مشاہدہ کرے گا۔ اور پائے گا +

تو ہی ہے اے خُدا

از اسوۂ حسنہ۔ اگست ۱۹۱۴ء

لوہے کے قلم کو لال نیلے آنسو دینے والے۔ لوہے کی توپ کو آگ کی آہ بخشنے والے تو ہی ہے جس کے نام سے ہر چیز شروع ہوتی ہے جس کے پرتوہ سے بڑھتی پہنچتی ہے۔ اور جس کے اشارہ سے نابود و فنا ہوجاتی ہے +

ہر صورت دوسری شکل سے نرالی ہے۔ یہ تیرے شجر قدرت کی ایک معمولی سی ڈالی ہے۔ آدمی آدمی سے جُدا۔ جانور سے جانور جدا۔ درخت سے درخت علیحدہ۔ پہاڑ ہے تو ہر ایک اپنی صورت میں سب پہاڑوں سے الگ۔ دریا ہے تو وہ بھی اپنے رنگ اور وضع قطع میں دوسرے دریاؤں سے انوکھا۔ ذرہ ذرہ میں فرق و امتیاز ہے۔ واہ مولیٰ تیرا کیا راز و نیاز ہے +

بولیاں رنگ برنگ کی بنائی ہیں، اور ہر بولی میں اپنی شانیں چھپائی ہیں۔ حرفوں کو عجیب عجیب وضع کے کپڑے پہنائے ہیں۔ کسی سے کہا اوپر سے نیچے آؤ۔ کسی کو حکم ملا دائیں سے بائیں کو چلو۔ کوئی بائیں سے دائیں کو ہانکا جاتا ہے۔ کسی کا نام عربی رکھا ہے۔ کسی کو چینی کہا ہے کوئی ہندی ہے۔ کوئی انگریزی ہے۔ غرض عجب ہنگامہ رنگا رنگی اختلاف ہے اور پھر ہر جگہ مطلب ایک صاف صاف ہے +

آسٹریا کا بوڑھا بادشاہ معلّم الملکوت بنکر لاکھوں کروڑوں انسانوں کی خونریزی کے لیئے تلوار میان سے کھینچتا ہے تو پہلے تیرا نام لیتا ہے۔ دلّی کا ناتوان گدا اُلفت آمیزی کے واسطے قلم ہاتھ میں لیتا ہے تو پہلے تیرا نام لیکر زبان کھولتا ہے +

میں کب تک کہوں تو ہی تو ہی۔ تو کب تک سُنے تو ہی تو ہی۔ کہنے اور سننے سُنانے کا وقت ہوچکا۔ اب فعل اور عمل میں جلوہ افروز ہو۔ اس پُرانی لفظی حمد و ثنا کے عوض نئی معنوی تعریفیں حاصل کر +

ذرا تو ہی دیکھ۔ کیسی چوڑی چکلی۔ صاف ستھری سڑکیں آدمیوں نے بنائی ہیں۔ جگہ جگہ سنگی پہرہ دار کھڑے کر دیے ہیں جو راستہ چلنے والے کو بتاتے ہیں کہ کتنا راستہ طے کیا اور کتنا باقی ہے۔ کچّی سڑکیں ہیں پکّی سڑکیں ہیں۔ لوہے تک کی سڑکیں بن گئی ہیں۔ مگر بتا کہ تجھ تک کون سی سڑک جاتی ہے۔ تیرا پتہ کس پتّھر پر لکھا ہے +

سمندر کہتے ہیں۔ ان کی موجوں اور کف آلود جوش و خروش میں تیرا نشان ہے۔ کنارے آواز دیتے ہیں ہماری بیچارگی و افتادگی میں تیری شان نہاں ہے۔ آہ سینہ سے نکلتی ہے تو کہتی ہوئی چلی جاتی ہے کہ اس طلجان کے اندر تو ہی ہے۔ واہ دہان پر آتی ہے تو تیرا نعرہ مارتی سُنی جاتی ہے +

روئی دُھنئے کے ہاں پاش پاش ہو جاتی ہے، اور تیرا گیت گاتی جاتی ہے۔ لوہا آگ میں تپتا ہتوڑوں سے کُٹتا پٹتا ہے مگر تیری سرمدی صوت اور تیری ابدی صوت کو فراموش نہیں کرتا +

اکیلے خُدا یہ تو نے رحمۃ للعالمین کا لقب کس بشر کو دیا ہے۔ وہ سورج ہے۔ چاند ہے۔ تارا ہے۔ یا مٹّی کا دیا ہے۔ سراجٌ منیر کس کی شان میں فرمایا ہے۔ اُس روشن چراغ تک ذرا ہم کو بھی پہونچا دے۔ ہم بھی اپنے بجھتے ہوئے چراغوں کو اس سے روشن کریں۔ وہ چاند۔ سورج۔ تارا نہیں۔ مٹی کا چراغ ہے۔ مگر دوسروں میں اپنی روشنی ڈال سکتا ہے۔ اس لیئے ان سب سے اعلیٰ و برتر ہے۔ ہم اس کو چاہتے ہیں جس کی زلفیں اندھیری رات کی طرح کالی تھیں۔ جس کا چہرہ صبح کی نورانی روشنی کی مثل منور تھا۔ وہ جو خلق عظیم کا درجہ لیکر اس دُنیا میں آیا تھا۔ جس نے عیش و راحت تیرے نام پر لُٹایا تھا۔ وہ جو میدانوں میں تلوار کھینچکر نعرۂ حق بلند کرتا تھا۔ برچھیوں

کو بہادروں کے سینے پر مارتا تھا۔ تیروں کو چٹکی بجاتے دل و جگر میں اُتار دیتا تھا۔ وہ جو خود بوریے پر بیٹھتا تھا اور دوسروں کو شاہانہ تخت دیتا تھا۔ وہ جو کمبل کا کُرتہ پہنتا تھا اور اپنے غلاموں کو سلطانی قبائیں بخشتا تھا۔ جَو کا آٹا کھاتا تھا اور ہمارے لیئے پلاؤ قورمے پکوا کر رکھتا جاتا تھا۔ وہ جو راتوں کو جاگا اور ہمارے لیئے پاؤں پھیلا کر سونے کا سامان کر گیا۔ وہ جو تیرے آگے آنسو بہاتا تھا کہ میری اُمت کو بخشتا رکھ۔ وہ جو بیماروں کی مزاج پُرسی کو خود اُن کے گھروں پر جاتا۔ گھر والوں کے ساتھ ہو کر گھر کا کام کرتا اپنا کام اپنے ہاتھ سے کرتا۔ یہاں تک کہ اپنی جوتی خود ہی گانٹھ لیتا تھا۔ اپنے کپڑوں میں آپ ہی پیوند لگا لیتا تھا۔ اس کو تو نے ہمارا آقا۔ مولیٰ بنایا ہے۔ اس واسطے ہمارا جی اُسی پر آیا ہے۔ ہم کو اجازت دے کہ اُس کا ذکر ادب سے کریں۔ اور پھر کہیں کہ وہ جو لڑکوں تک کو پہلے خود سلام کرتے تھے۔ غریبوں مسکینوں کو ساتھ بٹھا کر کھانا کھلاتے تھے۔ مفلس و بیمار کو حقیر نہ جانتے تھے۔ لاچار بیوہ عورتوں کے سودے بازار سے خرید کر اور اپنے کندھے پر رکھکر لاتے تھے۔ جنھوں نے کام کے وقت کبھی اس کی پروا نہ کی کہ دور جانے کے لیئے سواری موجود ہے یا نہیں۔ اکثر پیدل پا برہنہ۔ سر برہنہ چلے جاتے تھے۔ دینی لڑائی کے سوا کسی پر وار کرنے کی پہل نہ کرتے تھے اپنے اصحاب میں اس طرح مل جُلکر بیٹھتے تھے کہ اجنبی کو یہ معلوم کرنا مشکل ہوتا تھا کہ حضور کون سے ہیں۔ وہ جو لیٹنے کے لیئے بچھونے کا انتظار نہ کرتے تھے۔ اگر بچھونا نہ ہوتا تو بے تکلف زمین پر لیٹ رہتے تھے +

تو ہی اے خدا اُس حبیب کا راستہ بتا۔ اُس کا اُسوۂ حسنہ دکھا۔ تاکہ ہم سب تیری کھینچی ہوئی لکیر کے فقیر بنیں اور ہماری رفتار تیرے اور تیرے بھیجے ہوئے رسول کی رفتار گفتار و کردار پر ہو +

دُنیا جہان کے حالات معلوم کریں تو سِیۡرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ کا ارشاد سامنے ہو۔ علمی چرچوں میں آئیں تو طَلَبُ الۡعِلۡمِ فَرِیۡضَۃٌ عَلٰی کُلِّ مُسۡلِمٍ وَّمُسۡلِمَۃٍ کو سامنے لائیں۔ صنعت و حرفت کا خیال ہو تو اَلۡکَاسِبُ حَبِیۡبُ اللّٰہِ ذریعہ ہو۔ سیاست ہو تو وہ جو تیرے رسول نے بتائی۔ معاشرت ہو تو وہ جو تیرے فرستادہ نے بتائی۔ لکھنا پڑھنا۔ بولنا۔ چالنا۔ کھانا پینا۔ رہنا سہنا۔ لڑنا۔ جھگڑنا۔ غرض ہر حصۂ زندگانی میں حصہ لیں۔ مگر تیری اور تیرے رسول کی پیروی سے ایک قدم باہر نہ دھریں +

بندوں کی دعا

از اخبار خطیب دہلی۔ ۱۳ جنوری ۱۹۱۵ء

کاغذ کے ناتوان ہاتھوں کو توانائی دے۔ بیجان حروف میں اثر زندگانی بخش۔ انمٹ تقدیروں کو نہ بدل۔ مگر صبر کی تدبیریں تسلیم و رضا کی لکیریں دل کی تسلّی کے لیئے بھیج۔ تو نے حجاز کے جھلسے ہوئے بے رونق پہاڑوں میں دو پھول نرگس کے پیدا کیئے۔ اور ان پھولوں نے کائنات آخر کی بیمار آنکھوں کو صحت بخشی۔ ہم انہی شربتی جھکی ہوئی نظروں کو تیرے سامنے شفیع بناتے ہیں۔ ہمارے دین و دُنیا کے پہاڑوں میں عیش و راحت کے باغ لگا دے۔

اے خیالوں میں رہنے بسنے والے۔ اگر دانش و عرفان کی تمنّاؤں کو بیتاب رکھنے والے اگرچہ ہر ذرّہ میں موجود۔ مگر آفتاب تحقیق کی نظروں سے مخفی اے ٹوٹے ہوئے دلوں کو نشیمن بنانے والے۔ ہمارے پاش پاش دلوں کو بھی نوازے جا۔ اس فطرت کی مستیوں سے جی ڈرتا ہے۔ اپنی بستی میں پناہ دیدے

تجھ کو داتا کہیں۔ تجھ کو مولیٰ کہیں۔ تجھ کو داور کہیں۔ تجھ کو کیا کچھ کہیں۔ تو ہر ہے۔ اور ہر سے آزاد۔ رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ +

طائرِ سیاہ فام

از رسالۂ القمر دہلی جون ۱۹۱۵ء

کل رجب ۱۳۳۳ھ کی ۲۸ تھی۔ معراج کی رات سوتے گزر گئی۔ اس لیئے کل رونا حصّہ میں آیا تھا۔ رین بسیرے کے وسیع صحن میں بہت سے انسان پچھلی رات کی خنک ہوا کا لطف لے رہے تھے۔ اور بے خبر سوتے تھے۔ میری آنکھیں ان کی بیفکری اور بے خبری پر رشک کرتی تھیں۔ اور دل کی بھٹی آنسو گرم کر کرکے بھیج رہی تھی +

میں نے تکیہ کے نیچے سے بجلی کا لیمپ نکالا۔ اس کا کھٹکا دبایا۔ روشنی تڑپ کر باہر نکل آئی۔ غسلخانے میں لیجا کر اُس کو رکھ دیا۔ وضو شروع کیا۔ حبیب زبان نے کہا۔

اَللّٰهُمَّ نَوِّرْ وَجْهِيْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ۔ خیال لرز گیا۔ میں نے یہ کیا مانگا۔ کیا میرا چہرہ منوّر ہونے کے قابل ہے۔ برقی لیمپ نے اشارہ کیا کیوں خلجان میں پڑتا ہے۔ نور بھی کوئی چیز ہے۔ بارہ آنے کو نور کی بیٹری آتی ہے۔ خواہ مخواہ خدا کا احسان اُٹھاتا ہے۔

باہر آیا۔ تاروں نے اذان دی۔ اُفق نے حیران ہو کر کہا۔ نماز کا وقت نہیں ہوا۔ یہ کیسی اذان؟ تخت کا مصلیٰ آہستہ سے بولا۔ وقت تہجد کا مگر کل کی رات کیسی غفلت میں کٹ گئی۔ خیر آج بھی کچھ نہیں گیا۔ چاہتا تھا کہ نیت باندھوں اور دل کی گرہ کھولوں۔ کہ پھر کلیجہ میں اک تیر لگا۔ کوئی چیز سینہ کے اندر جوش مارتی مُنہ کی جانب اُبلتی ہوئی آئی۔ میں نے آہ آہ کہکر اس بخار کو باہر پھینک دیا۔ اور کہا۔

کم بخت۔ یہ کیا بلا ہے۔ میری ساری رات برباد کر دی۔

میرے سب وشتم نے کچھ اثر نہ کیا۔ سارے جسم پر اس نامعلوم زہر نے قبضہ کر لیا۔ میں بے قرار ہو گیا۔ میں نے نماز کے قانونی طریقے کو ترک کر دیا اور بغیر قیام و رکوع کے سجدہ کے آگے سر جُھکا یا۔

پیشانی کے نیچے خاک نہ تھی۔ تخت کی لکڑی تھی۔ اُس پر سر دجانماز تھی۔ میرا ماتھا اُس پر رکھا تھا۔ اور اُس کی پڑوسن آنکھیں بے اختیار رو رہی تھیں +

میں نے سبحان ربی الاعلےٰ نہیں کہا۔ میں نے ہندی میں اُس کی تعریف کی۔ اُس کی خوشامد کی۔ اُس کی بڑائی کی۔ جوں جوں میں اُس کو سجگت داتا جگت داتا پکارتا تھا ووں ووں دل کی آگ بھڑکتی تھی۔

اُس نے تو وعدہ کیا ہے۔ بندہ میری طرف ایک بالشت آتا ہے تو میں اُس کی جانب ایک ہاتھ بڑھتا ہوں۔ آج وہ کہاں چلا گیا۔ مجھے کیوں رُلاتا ہے۔ سامنے کیوں نہیں آتا ہے۔

ہوا کا ایک جھونکا آیا۔ شعلۂ غم کو زیادہ بھڑکا گیا۔ میں نے سجدے کو چھوڑ دیا۔ گردن کو اوپر اُٹھالیا۔ چشمِ تر کو آسمان سے لڑا یا۔ جب بھی جی کو قرار نہ آیا۔ رین بسیرے کا دروازہ کھولا۔ سب سونے والوں پر حسرت کی نگاہ ڈالی۔ قبرستان میں آیا۔ حور بانو کی والدہ خاکی چھپر کھٹ میں غریب گیاہ سبز کا چادرہ اوڑھے اپنے لاڈلے بچے حسن بصری کو آغوش میں لیئے سوتی تھیں۔

حدیث یاد آئی۔ ایک زمانہ ایسا آئیگا کہ تم قبروں کے مُردوں پر رشک کروگے۔ کاش ہم قبروں میں ہوتے۔ اور زندگی کی اُلجھن ہمکو نہ ستاتی۔ سچ فرمایا میرے رسول نے۔ دیکھو میری بیوی جو دس برس شریک بزم حیات رہکر جنّت کو سدھاریں۔ کیسی خوش نصیب ہیں اور آرام سے پڑی سوتی ہیں۔

اور آگے بڑھا۔ اب جنگل سامنے تھا۔ بڑے بڑے گنبد چُپ چاپ کھڑے تھے۔ درختوں پر اندھیرے نے سایہ ڈال رکھا تھا۔ دن کو جو سایہ مجھ نیچے نظر آتا تھا سو قت اُن کا اوپر سوا تھا

سگنل کی لال آنکھ

جی۔آئی۔پی ریلوے کی لائن آئی۔سگنل نے اپنی لال آنکھ دکھائی۔ اس کا پھیلا ہوا ہاتھ دیکھکر مجھے وہ آیت یاد آئی۔ کہ

ادعونی استجب لکم

میں اُس سے کیوں مانگوں کیا وہ حاضر و غائب کا عارف نہیں ہے۔ اتنے میں سگنل نے ہاتھ جُھکایا۔ لال آنکھ بند کی۔ سبز کھولی۔ کیا کوئی ریل آئی آگے بڑھا۔ سلطان سکندر لودھی کا مقبرہ استقبال کو کھڑا تھا۔ ہاتھ ملایا۔ ملاقات ختم نہیں ہوئی تھی کہ ایک گیدڑ برابر سے نکلکر بھاگا۔ اس کے فرار نے جسم میں گُدگُدی کی۔ بے اختیار ہنسی آئی۔ برقی لیمپ کی شعاع کو گیدڑ پر دوڑایا۔ غریب وحشی زیادہ گھبرایا اور کہیں بھاگ کر غائب ہو گیا۔

اب خدا خدا کر کے جی ٹھہرا۔ اُداس کھنڈر میں ذرا چین آیا۔ چار رکعت نماز ادا کی۔ ۱۴ بار ذکر جہر ادا کیا اور ہر ہو میں ایک مزا پایا۔

صبح صادق قریب تھی۔ چاہتا تھا کہ گھر چلوں کہ پیپل کے بے برگ درخت پر ایک شامہ نے نغمۂ حمد شروع کیا۔ بولی۔

سانچے پیر

کہیں دور ایک دیوار پر اس کا جوڑا بیٹھا تھا۔ اُس نے جواب دیا۔ سب پیر سانچے سانچے۔ بہت دیر تک ان کے سوال جواب ہوتے رہے۔ کیوں ری۔ کالی کلوٹی چڑیا۔ تو ہمارے پیروں کا مزاج بگاڑتی ہے۔ سانچا نام اللہ کا ہے۔ باقی سارا جہان جھوٹا ہے۔ شامہ بولی۔

کیسے پیر۔ سچّے پیر۔ کیسے

جوڑے نے جواب دیا۔

سانچے رب۔ سانچے۔ سانچے

ہاں۔ اب ٹھیک کہا۔ آخر تو کالے رنگ کی چڑیا ہے۔ سراپا ظلمت ہے مگر بات نورانی کہتی ہے۔ جتنے کالے بدشکل ہوتے ہیں ایسی ہی سفید بات کہا کرتے ہیں +

طائرِ سیاہ فام کے ظاہری الفاظ میں تو یہ تھا جو سُنایا۔ مگر اس طائری اسپرٹ کا سمجھنا آسان نہیں۔ جس نے اس کو سمجھ لیا وہ رات کا سونا بھول جاتا ہے۔ اُس کو رونے میں مزا آتا ہے۔ اور رونا ہی اُس کی دارین کی تسلی بن جاتا ہے جس کی ہر آدم زاد کو ضرورت ہے +

دوسری منزل

ذوق وشوق * عشق ومحبّت * سوز و گداز * ارادت وعقیدت

از رسالۂ مخزن ۱۹۰۴ء

(ٹھرڈ ِدلے۔ دو دِلے نفسانی عاشقوں کے نام)

جاں نثارِ قدیمی زلف کے مشرقی صوبے دار ذوقؔ دہلوی کو ہدایت کی جاتی ہے۔ کہ ظلِّ الٰہی کا حسبِ ذیل فرمان اُن عاشقوں کو پہنچا دو جن کی محبت ماجناب کی شانِ عالم آرائی میں بٹّہ لگاتی ہے +
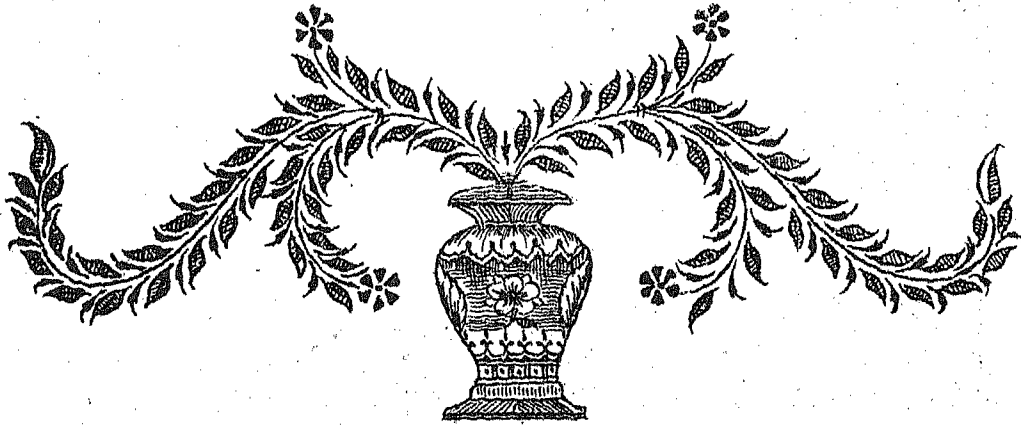
اُن کو بتایا جائے کہ ماجناب عرصۂ دراز سے ایک ایسے مُلک میں رہتے تھے۔ جہاں ہم کو سوائے ہمارے کوئی نہ جانتا تھا۔ اس مُلک میں ماجناب کی جیسی شان وجبروت تھی اُس کا اظہار ہماری قدرت میں داخل ہے۔ مگر تم کو اتنی طاقت نہیں دی گئی کہ کشفِ راز کی تاب لاسکو۔ ایک ذرّہ اگلی شان کا ظاہر ہوجائے تو نمایشی ہستی کا نشان باقی نہ رہے +

ایک دن ماجناب نے اپنی آن بان کا تماشا دیکھنا چاہا۔ خیال آنا تھا کہ خود بخود تماشا گاہ کی صورت پیدا ہوگئی۔ کیا دیکھتے ہیں کہ پہاڑ ہیں۔ دریا ہیں۔ جنگل ہیں۔ گلستاں ہیں۔ اور ایک انسانی صورت اُن کے بیچ میں بے حس وحرکت کھڑی ہے۔ یہ عالم ماجناب کو پسند آیا شانِ زیبائی کے تھوڑے تھوڑے جلوے چاروں طرف بکھیر دیئے۔ تصویر کی خاموشی ایسی بھائی کہ اس کو اپنے لیئے اختیار کرلیا اور اُس کی آنکھوں میں تختِ سلطانی بچھا دیا گیا +

یہیں سے ہماری حکومت کا زمانہ شروع ہوا۔ اور ماجناب کی کبریائی کونسل میں۔ ابرو۔ رُخسار۔ لب۔ دنداں۔ ذقن۔ گردن داخل کیئے گئے۔ گیسو کی سرحد قایم ہوئی۔ آواز اور زبان کے وزیر احکام چلانے لگے۔ ماجناب کی رعایا ویسی ہی وفادار ہوئی۔ جیسا ظلِّ الٰہی کا پہلا منشار تھا۔ کونسل کے بعض ممبر یا یوں خیال کرنا چاہیئے کہ بعض صوبے دار نادانی وشرارت سے کسی پر ظلم کرتے۔ جفا کاری سے پیش آتے تو اطاعت شعار رعیت بڑی خوشی سے اُن کی ستم آرائی برداشت کرتی۔ بارہا باڈی گارڈ کے سپاہی پلکیں نوکدار برچھیوں سے حضوری کے

لوگوں کو بتاتے، مگر کبھی نہیں دیکھا گیا کہ کسی نے اُف کی ہو۔ ماجناب کے کان اُن کی فریاد سے ہمیشہ ناآشنا رہے۔ اگرچہ ہم نے کبھی نہیں چاہا کہ بے زبان رعیت پر ظلم توڑے جائیں۔ مگر کیا کریں بعضی دفعہ شوخی کے لئے میں ایسا ہو جاتا تھا، اور بارگاہ احدیت مآب کو اس سے افسوس ہوتا تھا۔ بعض دفعہ رعیت کے بعض افراد نافرمان ہو جاتے۔ تو ماجناب ایک حسین ایلچی اُن کی ہدایت کے لیئے مقرر فرماتے چنانچہ یوسفؑ۔ موسیٰؑ۔ رام کرشن۔ محمدؐ جیسے خوبصورت لوگ وقتاً فوقتاً ہدایت کے لیئے مقرر کیئے گئے +

اب آج کل بھی ہم دیکھتے ہیں کہ رعایا میں ابتری پھیل گئی ہے۔ دو دِلے۔ تھُڑ دِلے اور نفس پرست لوگ ہماری حضوری کی طلبگاری کرنے لگے ہیں۔ اس لیئے ضروری معلوم ہوا کہ ایک فرمان کے ذریعہ اُن کو ہدایت کی جائے۔ اگر اُنھوں نے اس فرمان کو قبول کیا۔ نزول رحمت کے مستحق ہوں گے۔ ورنہ قہر کی بجلیاں گریں گی۔ اور اُن کی ہستی کو نیست و نابود کر دیں گی +

ماجناب احدیت کے خیالِ مقدس میں تھڑ دلا شخص جو ذراسی بدنامی و ملامت کے ڈر سے گھبرا جائے۔ یا ایسا دو دِلا کہ گاہے چنیں اور گاہے چناں کی حالت میں گرفتار ہو یا نفس پرستی اور جذبہ شہوانی کی تکمیل کی غرض سے ہماری رعیت بننا چاہتا ہو ہرگز اس قابل نہیں کہ ماجناب کی نورانی حکومت کو اپنی سیاہ کاریوں سے بدنام کرنے کے لیئے باقی رکھا جائے +

اگر تم لوگ ماجناب کی دل آرا حکومت میں باقی رہنا چاہتے ہو تو بدنامی کے فکر و تردد کو پس پشت ڈال دو۔ یکسوئی اور خلوص قلب سے اپنی پیشانیاں ہمارے سامنے جھکا دو۔ نیت اور ارادے کو نفسانی خواہشوں سے پاک رکھو۔ ہم تم میں وہ صفت دیکھنا چاہتے ہیں جو ہماری قدسی صفات سلطنت کی رعایا کے واسطے زیبا ہو +

نفسانی خواہش کی تکمیل ایک فوری لذت ہے جو دوسرے مُلکوں میں بھی حاصل ہو سکتی ہے۔ ہماری اقلیم کی جو بات ہے وہ دیرپا اور ابدی۔ اگر نفسانیت درمیان میں نہ لائی جائے تو عارضی سرور کے بدلے ابدی لطف کی کیفیت عطا کی جائے گی پس تمام طلبگاروں کو آگاہی دی جائے کہ وہ اس فرمان کی تعمیل کے لیئے تیار ہو جائیں +

یعنی

وفات الرسولؐ

کا سین

از نظام المشائخ۔ مارچ ۱۹۱۴ء

آسمان چُپ۔ زمین دل تھامے ہوئے۔ ہوا چلتے چلتے رُکتی ہے۔ اور خانۂ رسول میں غم کی گھڑی کو جھانکتی ہے۔ پرندوں نے چہچہانا چھوڑ دیا۔ کبوتر معصوم عائشہؓ کی بیکسی کو بھولپن سے دیکھ رہا ہے +

آفتاب رسالت پر موت کا ابر چھا رہا ہے۔ نورانی کرنیں پردے میں چھپ رہی ہیں +

اُمت کا سرتاج دُنیا سے سدھارتا ہے۔ باپ کی لاڈلی فاطمہؓ کا سہارا بیٹی کے سر سے ہاتھ اُٹھاتا ہے۔ عائشہؓ کا دل دھڑکتا ہے کہ سہاگ کی

منزل آخر ہوئی۔ حجرۂ رسولؐ کی رونق رخصت ہو رہی ہے۔ یاس و ہراس در و دیوار سے لگے کھڑے ہیں +

یا رسول اللہ! ابھی نہ جائیے۔ حسنؓ حسینؓ سے جدا نہ ہوجیے۔ ذرا دیکھئے یہ گیسو دراز سہمے جاتے ہیں۔ اب ان کو کون دوش پر بٹھائے گا۔ کس سے ان کے نازک دلوں کی دلداری ہوگی۔ انہیں کن پر چھوڑا۔ تلواریں ان کو گھور رہی ہیں اور ڈرا رہی ہیں۔ تیر ان کے بے کینہ سینوں سے اور خنجر ان کی صراحی دار گردنوں سے کچھ آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارے کر رہے ہیں +

علیؓ کی کمر ٹوٹی جاتی ہے۔ عقدہ کشا کی زندگی میں حسرت و رنج و محن کی گرہ لگا رہی ہے۔ سلجھے ہوئے ایام اُلجھ رہے ہیں۔ صدیقؓ کو بڑھاپے میں یارِ غار کا داغ رُلائے دیتا ہے +

اور ہاں۔ پتی کی ستی بی بی عائشہ رضؓ کی افسردگی دیکھی نہیں جاتی۔ ست پتا کی جائی۔ ست پتی کی من موہنی۔ برج کائنات کے سب سے بڑے شام سُندر کی منظورِ نظر صدیق رضؓ کی گود میں پلنے والی۔ آغوشِ نبوّت کے تخت کی ملکہ۔ کیسی اُداس۔ مایوس۔ نڈھال۔ سہرِ رسولؐ کو گود میں لیے بیٹھی ہے۔ آج اس کی راج دھانی ہاتھوں سے چھن رہی ہے۔ آج اس کا دھنی دُنیا سے مُنہ موڑ رہا ہے +

پتی کی ستی عائشہ رضؓ! ہم تیرے ست کے قائل ہیں۔ تو سچی صدّیقہ ہے۔ ایک دفعہ آگ میں جل کر مرجانا آسان ہے۔ مگر ساری عمر پتی کے کام میں لگا رہنا اور اس کو انجام پر پہونچانا تیرا ہی حصّہ تھا۔ رسولؐ کے خانگی معاملات بن پر اُمت کے ہزاروں کاموں کا انحصار تھا۔ تو نے ہی بتائے۔ اور پربھو پرشوتم کے پیارے شوہر کے نام پر اپنی زندگی کا عیش و آرام نثار کر کے جلا ڈالا +

عقل والے تدبیروں کے بادشاہ عمرؓ کو دیکھنا۔ سائیں کے فراق نے دیوانہ کر دیا ہے۔ ہوش و حواس قابو سے نکلے جاتے ہیں عثمانؓ غنی کا رسکوت میں ہیں۔ غم نے گم کر دیا ہے +

سب سے زیادہ جس دل پر قیامت آئی ہے وہ فاطمہ زہرا رضؓ کے سینے میں بھڑک رہا ہے۔ یہ ان کے باپ ہیں جو داغِ جدائی دیکر جاتے ہیں۔ زہرا بی بی۔ رسولؐ بابا کو نظرِ بے بسی سے دیکھتی ہیں۔ اور دل ہی دل میں کہتی ہیں۔ الٰہی! اب کیا ہوگا۔ کیا بابا جان مرجائیں گے کیا میری تشفی دینے والے پردیس کو چلے۔ اچھی بابا۔ فاطمہ رضؓ کو بھی لے چلو۔ لڑائیوں میں اپنی لونڈی کو نہ بھولے۔ اکثر ساتھ رکھا۔ میدانِ موت میں بھی یہ کنیز ساتھ رہے گی۔ ہائے میرے فقر فاقہ کے وقت اب کون دلاسا دینے آئے گا۔ بابا میں تمہاری بیٹی ہوں۔ بابا میں تمہاری فاطمہ ہوں۔ میں ضد کرتی ہوں کہ آپ نہ جائیے۔ میں ہاتھ جوڑتی ہوں کہ مجھ کو یتیم نہ بنائیے۔ اے خدا! تو ہی سُن۔ صدقہ اس کششِ الفت کا جو اپنے حبیب کو دُنیا سے کھینچ رہی ہے۔ صدقہ اس قابَ قوسین سے آگے والے مقام کا۔ طفیل اُس آنکھ کا جو اپنی بندہ کو خصوصیت سے پیار کرتی ہے۔ واسطہ اس مشیتِ لامتناہی کا جو سفید کو سیاہ اور سیاہ کو سفید کر سکتی ہے۔ میرا باپ مجھ سے جدا نہ ہو۔ میرا سیّد آنکھ بند نہ کرے۔ پروردگار! میں تیرے رسولؐ کی لختِ جگر ہوں۔ خداوند! میں اس آنکھ کی ٹھنڈک ہوں جس کو تو نے دُنیا کی ٹھنڈک کے لیے مقرر کیا تھا۔ الٰہی! میرا کلیجہ مُنہ کو آتا ہے +

سرکار استغراق میں تھے۔ رختِ سفر کا مشاہدہ فرما رہے تھے۔ عالمِ خاک سے آنکھ بند تھی۔ عالمِ پاک کی جانب کھلی ہوئی تھی۔ یکایک اہلِ بیت کی بیتیاں۔ اُمت کی بیتی کو ساتھ لیکر قدموں کو چمٹ گئیں۔ آنکھوں کو تلووں سے ملا۔ اور حضور کو متوجہ کر لیا۔ چشمِ گرامی وا ہوئی۔ بیقراروں کی غمناک صورتوں پر نگاہ ڈالی۔ اور رفیقِ اعلیٰ کے ان سب کو سپرد کیا گیا۔ رفیقِ اعلیٰ کو پکارا۔ رفیقِ اعلیٰ نے لبیک کہی۔ اور جھک کر اپنے کارگزار مقبول بندے کو اُٹھا لیا۔ قرب کے سب مقام ادب سے بعد ہو گئے۔ عزرائیل کا اسم صفت اسم ذات نے الگ کر دیا۔ رفیقِ اعلیٰ نے رفیقِ اعلیٰ کو خود منزلِ رفق میں لیجا کر پہونچا دیا +

جو کبھی نہیں ہنسا۔ جو کبھی نہیں ہنسے گا۔ جو ہنسی سے پاک ہے۔ اُس نے مُسکرا کر رسولؐ کے فرقت زدہ اصحاب کو۔ اہل بیت کو غم والم کی تصویروں کو دیکھا اور زبانِ بے زبانی سے ارشاد فرمایا۔ کیا یہ میرا ہمیشہ تمہارے پاس رہتا۔ کیا تمہارا دل مجھ سے زیادہ اس کا مشتاق تھا؟ تم کو اس کی خاطر نوازوں گا۔ اور نواز رہا ہوں۔ تم کو اس کی خاطر اُمتوں کا سرتاج بنایا۔ اور بناؤں گا۔ عائشہؓ ہراساں نہ ہو۔ میں تیرا محافظ ہوں۔ فاطمہؓ دلگیر نہ ہو۔ میں تجھ کو دلاسا دوں گا۔ اور جلدی اس سے ملاؤں گا۔ میرے بندے کے فدائیو! بےچین نہ ہو قیامت تک میں تم سے ماتم پُرسی کروں گا۔ اور دلِ زخم خوردہ پر مرہم پاشی ہوتی رہے گی +

لو صاحبو! آقا رخصت ہوئے۔ فاطمہؓ کی آنکھیں اُبل پڑیں۔ عائشہ رضؓ کے حجرے میں آفتاب چھپ گیا۔ جبرئیل جاتے ہیں۔ اب نہ آئیں گے دیکھو یہ تمہارے کملی والے شاہ لیٹے ہیں۔ اُمتی اُمتی پکارنے والے۔ اور آخر وقت تک اُمت کے خیال میں سرشار رہنے والے کو جی بھر کر دیکھ لو۔ اب یہ شکل بھی مٹی میں مُنہ چھپانے والی ہے +

منظر خیالی تیرہ سو تیں برس کے بعد دل کو نہ ستنا۔ کون مرا۔ کون گیا۔ کس کی وفات۔ وہ زندہ ہیں۔ زندہ خدا کا زندہ رسول۔ نہ مرے نہ مرنے دے۔ آؤ اس کے دین کی آس میں سانس کو قربانی چڑھائیں اور اُس تک پہونچیں۔ جس کی آرزو ان مناظر تخیلات میں لیکر آئی ہے۔ مرجاؤ اور اُس کو پاؤ +

اچھے بابل کیا لاڈلی بیٹی کو بھول گئے

اُمت کی سُسرال سے مدنی میکہ کو ایک خط

از توحید۔ ۱۶ر مئی ۱۹۱۳ء

بال بدھوا۔ چودھویں سال میں بیوہ ہو جانے والی دُکھیا۔ اُمتا کے چاہنے والے پتا۔ باداجان۔ اُمت تم پر قربان۔ آپ کی بدنصیب رانڈ اُمتا۔ پردیس میں بےکس۔ بےبس پڑی ہے۔ کوئی پُرسان حال نہیں۔ کیا آپ اپنی لاڈلی کو بھول گئے۔

ہائے بابل وہ دن یاد آتا ہے۔ جب میں آپ کی دل کی انگنائی میں کھیلتی پھرتی تھی اور آپ مجھ کو میٹھی میٹھی محبت بھری نظروں سے دیکھتے تھے۔ میں بگاڑتی تھی۔ آپ سنوارتے تھے۔ میں روتی تھی۔ آپ رومال سے آنسو پونچھتے تھے۔ میں ضد کرتی تھی آپ ناز برداری کرتے تھے۔ میری فکر میں آپ نے راتوں کو سونا چھوڑ دیا تھا۔ سات سات دن کے فاقے جس کے لیئے ہوتے تھے۔ وہ یہی پھوٹی قسمت کی کنیز ہے +

وہ زمانہ بھی یاد ہے۔ جب آپ کی لاڈلی کے بیاہ کی تیاریاں تھیں۔ قیصر و کسریٰ کی بادشاہتوں کا سامان میرے جہیز کے لیئے نکالا جارہا تھا، اور ہاتھوں کو ایسی مہندی لگائی گئی تھی جس کے رچاؤ نے پردیس میں سسرال جاکر بالم سیّاں کو بے اختیار کر دیا۔ اور وہ اُن ہاتھوں پر قربان ہو ہو گئے +

اور اُس گھڑی کو کیونکر بھولوں۔ جبکہ میکہ سے ڈولا چلا ہے۔ اور میں نے بچپن کے گھر بار کو چھوڑ کر پردیس کی راہ لی ہے۔ اپنے بگانے

روتے تھے۔ باواجان آپ بھی غمگین وافسردہ تھے۔ مجھ کو کالے کالے پہاڑ۔ اونچی اونچی کھجوریں۔ جنگل کی بیریاں۔ اور اُن پر کبوتروں کا غٹرغوں غٹرغوں کرنا۔ اور مدینہ کی سہیلیوں کی جدائی۔ سب پر طرہ آپ جیسے پریمی پتا کی چشم محبت کا فراق۔ غضب ڈھا رہا تھا۔ سُسرال میں اچھی گُزری۔ لال جوڑے والی مہارانی کہلائی۔ شوہر دلداریاں کرتا تھا۔ آنکھ کے اشارہ کو دیکھتا رہتا تھا۔ چاندنی راتیں تھیں۔ سمندر کا کنارہ تھا۔ اور کان میں موتی ہزارہ تھا۔ فوجیں تھیں۔ پہرے تھے۔ درودیوار سُنہرے تھے۔ تاج تھا۔ تخت تھا۔ سہاگ تھا۔ بخت تھا۔

مگر ہائے بابل قسمت لوٹ گئی۔ عمر کا چودھواں سال۔ اُمنگوں اور ارمانوں کا شباب پورا بھی نہ ہونے پایا تھا کہ شیام سُندر پیا رن میں کام آئے۔ دشمن نے دھوکے کی کٹاری خبر نہیں کہاں ماری۔ کام تمام کر دیا۔ میرا سہاگ لُٹ گیا۔ میری راج دھانی مٹ گئی۔ میں بے وارث رہ گئی۔ میری ہری ہری چوڑیاں اُتر گئیں۔ میں بیوہ اور دُکھیا رانڈ کہلانے لگی +

اچھی بابل ذرا اپنی اُمنا کو دیکھنے آؤ۔ اچھی میرے چاہنے والے باپو مجھ کو ساس نندوں کے طعنوں سے بچاؤ۔ وہ مجھ کو چھیڑتی ہیں۔ انہوں نے مجھ کو نکّو بنا رکھا ہے۔ اب اس گھر میں میری مٹّی خراب ہے۔

بیٹی اپنے مُنہ سے کیونکر کہے۔ بڑے شرم کی بات ہے۔ لیکن پتا۔ تجھ سے کیا پردہ ہے۔ اب مجھ سے رنڈاپے کے دن نہیں کاٹے جاتے راتیں مجھ کو ستاتی ہیں۔ گھٹائیں جب آتی ہیں۔ بجلی جب چمکتی ہے۔ بادل جب کڑکتا ہے۔ مور جب بولتا ہے۔ پپیہا پی کہاں کی صدا لگاتا ہے۔ سہاگنوں کے جھولے جب دیکھتی ہوں۔ پھول پہننے والیاں جب سامنے آتی ہیں۔ میری تمنائیں میرے ولولوں میں حشر برپا ہو جاتا ہے۔ کلیجے پر سانپ لوٹتا ہے۔ ننگی کلائیوں پر نگاہ جاتی ہے تو بے اختیار ٹھنڈا سانس نکل جاتا ہے۔ سُنتی ہوں آپ بدھوا کی شادی کے حامی ہیں۔ میرے لیے بھی کچھ فکر کیجئے۔ میری جوانی دیوانی کی خوشیوں کو بربادی سے بچائیے۔ پھر وہی پہلی سی مہندی منگائیے۔ سفید ہاتھوں کو لال لال بنائیے پھر دُلہن بنوں۔ پھر جہیز کا انتظام ہو۔ جیسی آپ کی لاڈلی بیٹی ہوں۔ ویسا ہی بیاہ رچائیے۔ ارمان کہتے ہیں۔ ابھی تیری عمر چودہ برس کی بھی نہیں باپ کی چہیتی ہے۔ جو ضد کرے تھوڑی ہے۔ جو دان مانگے کم ہے۔

اچھی بابل میرا بیاہ رچا دو۔

اچھی بابل مجھے مہندی منگا دو۔

اچھی بابل میرا منڈھا چھوا دو۔

سب پربتوں کے بانس کٹواؤ۔ سب باغوں کے پھول پتے منگواؤ۔ مجھے سہاگ کی چوڑیاں پہناؤ۔ اپنی لاڈلی کو بھول نہ جاؤ۔ وہ تم ہی پر آسرا رکھتی ہے +

کاگا! میرا یہ سندیسا مدینہ نگری پہنچا دے۔ بھونرے! کلیوں کے رس کو چھوڑ۔ اور ذرا میرے من کی بپتا باواجان تک لیجا۔ نسیم سحری میرے نامُراد گھر میں کیوں چلی آتی ہے۔ یہاں سب پھول مُرجھائے ہوئے ہیں۔ اُلٹے قدم جا۔ اور طائف کے چمن والوں کو یہاں کی خزاں کاریاں سُنا دے +

بجلی کے تارو۔ اگر تم میرے ہوم جا سکو تو "نائی ڈیر فادر" کو میری خبر دیدینا +

ہم ہیں بالک ایک پتا کی

از توحید۔ ۲۴ر مئی سنہ ۱۹۱۳ء

ہمارا باپ فقط آسمانی نہیں۔ زمین پر بھی وہی ہے۔ اوّل بھی وہی ہے۔ آخر بھی وہی ہے۔ دُکھ میں بھی ہمارا باپ ہی۔ اور سُکھ میں بھی ہمارا پدرِ بزرگوار۔ تیرہ سو اکتیس برس سے وہ ساری دُنیا کا باپ اور دُنیا والے اُس کے بچّے ہیں اسی واسطے اس کو رحمۃٌ للعالمین کا لقب دیا گیا ہے +

گورے کالے۔ نیلے پیلے۔ لمبے ترنگے۔ چھوٹے بَونے۔ بھوکے۔ پیٹ بھرے۔ خاک پر سونے والے۔ اور مخملی بچھونوں پر پاؤں پھیلانے والے سب **حجازی باپ** کے فرزند ہیں +

انجیل کا آسمانی باپ اُس کے قول کے موافق اپنے اکلوتے بچّے مسیحؑ کو سولی پر چڑھتا دیکھتا ہے۔ اُس کی فریاد سُنتا ہے جبکہ اُس نے ایلی۔ ایلی کہکر باپ کو پکارا۔ اور کہا۔ کیا تو مجھ کو بھول گیا۔ مگر اس کو اپنے لاڈلے پر ترس نہیں آتا۔ یہاں تک کہ اُس کا نورِ چشم سولی پر تڑپ تڑپ کر جان دیدیتا ہے +

ہمارا باپ آسمانی و زمینی خدا کا بھیجا ہوا رسول اور بندہ ہے۔ ہمارے باپ میں اس کے خدا کی صفت رحمت سر سے پاؤں تک جھپکتی نظر آتی ہے۔ ہمارا باپ اپنی اُمت کے پاؤں میں پھانس کی کھٹک کو بھی گوارا نہیں کرسکتا اور بے چین ہوجاتا ہے +

ہمارے باپ کو مدینہ کی گلیوں میں بچّے روک لیتے تو وہ کھڑا ہوجاتا تھا، اور جب تک بچّے ہاتھ نہ چھوڑتے ٹھہرا رہتا۔ ہمارا باپ دوجہان کا شہنشاہ تھا۔ مگر غریب لاوارث عورتوں کا سودا بازار سے لاتا۔ ان کے بوجھ کندھے پر اُٹھاتا۔ بیماروں کی خدمت میں رات رات بھر جاگتا۔ اور اپنے بچّوں کی خبرگیری کے لیئے آبادی میں رہتا تھا جنگلوں۔ پہاڑوں میں خلقت سے مُنہ چھپائے نہ پھرتا تھا۔ ہمارے باپ پر اُس کے بچّے عاشق تھے۔ جب کافر تیر چلاتے اور تاک تاک کر ہمارے باپ پر نشانے پھینکتے تو اس کے بچّے ستر ستر تیر ڈھال بنکر اپنے جسم پر کھاتے تھے۔ مسیحؑ کے بچّوں کی طرح نہ تھے جنھوں نے تیس روپئے لیکر اپنے باپ کو قاتل دشمن کے حوالے کر دیا +

ہمارا باپ آدمی تھا۔ ہمارا باپ بچّوں سے اُن کی سمجھ کے موافق باتیں کرتا تھا۔ مسیحؑ کی طرح نہیں جو مچھلی والوں کے سامنے فلسفہ اور الٰہیات کی مشکل مثالیں دیتا تھا +

ہمارا باپ بڑا۔ ہمارا باپ سب سے اچھا۔ ہمارا باپ سب کا باپ۔ اور ہم سب اُس کے بالک۔

تو آؤ۔ اپنے باپ کو پہچانیں۔ در در کی ٹھوکریں نہ کھائیں۔ اپنے باپ کے گھر پر چلیں۔ وہ ہم کو یاد کرتا ہے۔ ہم بھی اُس کو یاد کریں اُس کی محبت گود پھیلائے۔ ہندو مسلمان۔ عیسائی۔ موسائی سب بچّوں کو بُلاتی ہے۔ چلو باوا جان کے سینے سے چمٹ جائیں۔ پاؤں چُومیں۔ آنکھوں سے لگائیں۔ باپو۔ پتا۔ بابا۔ فادر۔ ابت کہکر جنّت کے میوے اور پھول مانگیں +

باپ کے گھر کا راستہ کدھر ہے۔ دیکھو کسی یتیم بچّے کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرو۔ اُس کی خبرگیری کرو۔ باپ کا گھر مل جائیگا۔ جھوٹ بولنا چھوڑ دو۔ باپ کے پاس جا پہنچو گے۔ لڑائی جھگڑے سے باز آؤ۔ مدنی بابا کا دروازہ ہاتھ آجائے گا۔ کسی سے نہ ڈرو۔ خدا کا خوف اپنے دل میں ہر وقت رکھو۔ اس کو ایک مانو۔ کسی کو اُس کا شریک نہ بناؤ۔ اور اس کو اور اپنے باپ کو ہر چیز سے اچھا اور بڑا سمجھکر محبت کرو۔ باپ تم کو اپنے گھر میں بُلالے گا +

ہم ہیں بالک ایک پتا کے۔ جس کا پیارا پیارا نام محمّد ہے۔ اور جو خدا کی طرف سے ہم دُنیا والوں کے لیئے رحمت کا پیام لیکر اور رسول بنکر آیا ہے +

سلام ہمارے باپ پر۔ سلام ہمارے رسول پر۔ سلام ہمارے پتا پر۔ سلام ہمارے فادر پر۔ اور اُس کے اصحاب اور آلِ باصفا پر۔ سلام اُس پر جس کی نسبت قرآن میں ما کان محمّد ابا احد من رجالکم ولکن رسول اللہ وخاتم النّبیّین ارشاد

ہوا۔ اور ہدایت کی گئی تھی کہ اپنے محمد کو زید بکر اور دنیا کے نسلی باپ کی طرح نہ سمجھو۔ بلکہ رسول اللہ اور پیغمبری ختم کرنے والا مانو۔ لہٰذا ہمارا اس کو باپ کہنا اور اپنے تئیں بالک سمجھنا محبت کا لفظ ہے۔ ورنہ وہ رسول ہم اُمتی۔ ہمارے ماں باپ اُس پر قربان ہوں +

مدنی شیام سندر کی مرلی

از توحید۔ یکم جون ۱۹۱۳ء

شیام نے مرلی بجائی کس طرح مچ گئی گھر گھر دہائی کس طرح
اُن کی مرلی ہر کے اندر باجتی ہر کی ہے ہر سے رسائی کس طرح

زلفوں والے۔ یتیم پیارے۔ یثرب باشی۔ موہن کنہیا کی بانسری کے بلہاری۔ حجازی پربت میں کھڑے ہو کر ایسی بجائی کہ جنم جنم کے دُکھ کلیش دور ہو گئے۔ روح۔ آتما۔ جیو۔ جسم۔ سریر۔ سب کو سرشار و پُر کیف بنا دیا +

مگر اب زمانہ گزر گیا۔ راتیں بیت گئیں۔ شیام سندر کی مرلی کی آواز سنائی نہیں دیتی۔ جنگل کے ہرن۔ باغوں کے مور۔ آم کی ٹہنی کی کویل۔ سب اُس پیاری اور سُریلی صدا کی راہ دیکھ رہے ہیں جس کی کوک کلیجہ میں ہوک پیدا کرتی ہے۔ برسات کا موسم قریب آیا۔ کالی گھٹائیں اُمنڈ اُمنڈ کر آئیں گی۔ اور کرشن کنہیا کی بانسری کو ڈھونڈھیں گی۔ کوئی چاتر سمجھدار سکھی سہیلی ایسی نہیں جو شیام سندر کو سندیسا پہونچائے۔ اس سہانے بن میں بُلا کر لائے۔ پریم روپ مورتی کانوں میں مُندرے ڈالے۔ بانسری لے کر پھونکے اور نفخت فیہ من روحی کا جلوہ ظاہر ہو۔ شیام کی مرلی سُننے کو جی ترستا ہے۔ رن کے بگل ترم۔ ہمارے حجازی موہن کی بانسری کے آگے ہیچ ہیں۔ کاش وہ پھر بجے۔ پھر گھر گھر دہائی مچے +

آہا۔ وہ دیکھو۔ شیام سندر مرلی لیئے بن سے نکلے۔ وہ ہمارے سینا پتی تیر کمان سنبھالے نمودار ہوئے۔ اب کوئی دم میں مرلیا باجے گی۔ اور نین کی بدلی برسنے گی۔ ندی نالے سوکھے تھے۔ گنگا جمنا پیاسی تھیں۔ گھٹ کے تیرتھ سونے تھے۔ بھگتی کا تھا کال پڑا۔ ست کے گلے جنجال پڑا۔ اب مرگ کی ترشنا دور ہوئی۔ اور چنتا من کا فور ہوئی۔ اب ہر کی آمد آمد ہے۔ اب ہر کی آمد آمد ہے۔ سنسار کا داتا آتا ہے۔ اور ہر کا جھنڈا لاتا ہے۔ بانس کی مرلی صور ہے یہ۔ اور لپتک کا مسطور ہے یہ +

حلقہ بگوش کا قلمی نذرانہ
خواجہ کے دربار میں

از توحید۔ ۸۔ جون ۱۹۱۳ء

شاہوں کے شاہ۔ عرش پائے گاہ۔ سلطان الہند۔ اجمیری خواجہ کے دربار میں حلقہ بگوشوں کی نذریں گذر رہی ہیں۔ فقیر بے نوا خالی ہاتھ۔ خانماں برباد۔ اس قابل کہاں ہے کہ جہاں پناہ کے حضور میں کچھ پیش کر سکے +

ہند الولی داتا جانتے ہیں۔ بندہ حسن گدڑی پوشوں میں پیدا ہوا مسکینوں میں پلا۔ گورِ غریباں میں جا کر سو جائے گا۔ زر و جواہر طلا و نقرہ کی نہ کبھی اس نے اپنے وجود کے لیئے خواہش کی نہ دوسروں کو ان کی حرص دلائی۔

خواجہ بابا اس شکل موہوم۔ معدوم۔ ہستی نما کو پہچانتے ہیں۔ پندرہ برس گزر گئے۔ اخباری میدان میں خواجہ کا نام بلند کرنے کے لیئے جس خیال سے نکلا تھا۔ اُس کی تعمیل میں کوئی دن۔ کوئی رات۔ کوئی گھنٹہ۔ کوئی ساعت۔ کوئی منٹ خالی نہیں جانے دیا۔ آج اگر وہ میدان میں یہ رجز پڑھے کہ خواجہ اپنے غلام کو دیکھیئے۔ جس نے قلم کی آگ سے لاکھوں آہنی دل موم کر دیے۔ بے شمار انکار کرنے والی ہستیوں کو درِ آستان پر جھکا دیا۔ تو ذرّہ نواز خواجہ اظہارِ قدر دانی فرمائیں گے +

اخبار توحید کا خواجہ نمبر بھی اُسی دیرینہ جانفشانی و خدمتگزاری کا نمونہ ہے۔ دُنیا والے جس قسم کا شوق رکھتے ہیں۔ اور جن طریقوں سے بات کو سُننا چاہتے ہیں تکلموا الناس علیٰ قدرِ عقولهم پر عمل کرکے اُسی پیرایہ سے گفتگو کیجاتی ہے +

نمبر کا لفظ خواجہ کے بزرگ اور پاکیزہ نام نامی کے ساتھ بھدّا اور بے جوڑ معلوم ہوتا ہے۔ مگر کیا کیا جائے۔ یہ نئی نئے زمانہ کی رسم ہو گئی ہے عہدِ انگلش میں ہے ہر چیز کے اندر نمبر +

لہذا لفظوں سے چشم پوشی کرکے اُن معانی کی طرف توجہ کی جاتی ہے۔ جن کی اشاعت اس دَورِ جدید میں لازمی اور ضروری ہو گئی ہے۔ خواجہ نمبر اخبار توحید کی اور اس غلام بے زر خرید کی قلمی نذر ہے +

بندہ حسن بصد زباں گفتہ کہ بندۂ تو ام — تو بزبانِ خود بگو بندہ نواز کیستی ؟

خواجہ اور اُن کے درباریوں میں یہ نئی روشنی کا نذرانہ لیجاتے ہوئے حجاب آتا ہے۔ مگر حقائق شناس بارگاہ۔ ضمائر آگاہ سرکار۔ اپنے حلقہ بگوشوں کی نیّت سے خبردار ہے۔ لہذا بکمال ادب و عقیدت کے ساتھ یہ قلمی گلدستہ پیشکش کیا جاتا ہے۔ پھول پراگندہ ہیں۔ افسردہ اور بے رنگ ہیں۔ لیکن خواجہ کے دربار میں اچھے بُرے سب کھپ جاتے ہیں۔ سب پر نظر الطاف رہتی ہے۔

عالم پناہ سلطان۔ اس ناچیز نذر کو قبول فرمایئے۔ اور اس میں ایسی برکت و تاثیر عنایت کیجیئے کہ جو دیکھے سیدھا معانی کی تہہ میں پہنچ جائے تاکہ خاکبوسِ آستانہ کی محنت ٹھکانے لگے۔ اور کسی کو وحدت کی ڈگر یاں مل جائے۔ اور

قُلزمِ مضموں سے بھے اخبار ہیں
ناؤ کاغذ کی سے چلے منجدھار ہیں

اَجمیری پہاڑ کا بُولنا

از توحید۔ ۸ر جون ۱۹۱۳ء

اجمیر کے اونچے پہاڑ نے جو رات دن خواجہ کے روضہ کو دیکھتا رہتا ہے۔ ہندوستان والوں کو خطاب کرکے زبانِ حال سے کہا :-

میں سنگدل پتھروں کا پہاڑ ہوں۔ مگر اے آدمی۔ میرا دل چشمے بہاتا ہے۔ میں سختی میں ضرب المثل ہوں۔ لیکن اے نرم مزاج کے مدّعی انسان! تجھ سے زیادہ دوسروں کے کام آتا ہوں۔ میں اجمیری ہوں۔ میری بات سُن۔ مجھکو حقارت سے نہ دیکھ +

طور میرا بھائی تھا۔ جس پر خدا نے حضرت موسیٰ کو بُلا کر پیغمبری دی۔ جُودی بھی میرا ہم جنس تھا۔ جہاں حضرت نوح کی کشتی نے قرار پکڑا

وہ میرے ہم قوم پہاڑ کا غار تھا، جہاں حضرت ابراہیمؑ نے چاند ستاروں اور سورج کو دیکھکر خدا کا عرفان حاصل کیا + بیت المقدس کا نورانی پہاڑ بھی مجھ جیسا پتھریلا تھا - جہاں حضرت عیسیٰؑ نے کلمۂ الٰہی کا وعظ کہا +

اس کے آگے کچھ اور کہوں تو سُن سکیگا - تجھ میں تاب اور برداشت ہے - حضرت موسیٰؑ کی طرح بیہوش تو نہیں ہو جائیگا اچھا تو آ - تجھ سے وہ بھی کہوں - حجاز کا نام سامنے لا - وہاں بھی میرا بھائی میرا ہمشکل - کالا کلوٹا - سوکھا پہاڑ ہے جس کی آغوش میں ایک تر و تازہ پھول کھلا - جس کی وادی میں ایک گیسو درازنے لکڑی کندھے پر رکھکر بکریاں چرائیں - جس کے اوپر چڑھکر اس نے اپنی قوم کو پکارا - اور خدا کے غضب سے ڈرایا - یہ وہی پہاڑ ہے جس کے نیچے اس نے گھر چھوڑ کر راستہ چلا - اور ہجرت کرکے مدینے پہونچا - اسی پہاڑ کے دامن میں اس نے حق کا پیام ختم کرکے آرام فرمایا +

ذرا آنکھ بند کرتا کہ دل کی آنکھ کھلے - اور دیکھ یہ سبز گنبد کس کا ہے - یہ اس کے چاروں طرف اونچی اونچی کالی دیواریں کس کی ہیں - یہ سب پہاڑ ہیں - مجھ جیسے پتھر ہیں - جن کی چوٹیوں پر خدا کی تجلیاں نازل ہو رہی ہیں - اس پہاڑ کی یاد میں مسلمان فاتحوں نے زمین کے سب بلند مرتبہ والے پہاڑ فتح کر لیئے - اور ہندوستان کا کوہ ہمالہ بھی ان کے آگے جھک گیا +

بس وہی میں اجمیری پہاڑ ہوں - مدینہ میں حجازی پہاڑ سبز گنبد دیکھتا ہے - اجمیر میں مجھ کو سفید گنبد اسی وضع قطع کا نظر آتا ہے - مدینہ میں حجازی پہاڑ کو لاکھوں مشتاق پروانہ وار

فانوسِ سبز

کے گرد چکر لگاتے نظر آتے ہیں - اجمیر میں میری آنکھ بے شمار فدائیوں کو حجاب سفید کے آس پاس بے قرار مشاہدہ کرتی ہے - جو مدینے میں ہے - وہی یہاں ہے - غفلت چھوڑ - آنکھیں کُل - مُنہ دھو - اور ہوش ٹھکانے کرکے دیکھ - کیا جلوے ہیں - کیا شانیں ہیں -

دیکھنے سے فارغ ہو تو **مدنی جبل** کی یاد میں تو بھی ہاتھ پاؤں ہلا - اور اپنے اجمیری پہاڑ کی عزّت کو بلند کر - میرے تارا گڑھ کو اُمید کا ستارا بنا - میرے چلّے کو کمان توڑ کر تیر اندازی کی کمان میں ڈال - اور نفس و خودی کے لشکروں پر تیر برسا - اِدھر آ - اُدھر جا - اِس کو دِکھا - اُس پر تیر چلا - کمان جس طرف چاہے کھینچ - مگر تیر کا نشانہ ایک ہی رکھ +

تاکہ خود فراموشی دشمن نفسانی چلا اُٹھے - اور کہے ؎

کمان جانب دیگرے می کشد ۔۔۔ ولے تیر بر جانِ ما می زند

آیار! چلکے دیکھیں برسات کا تماشا

از توحید - یکم جولائی ۱۹۱۳ء

والضحیٰ - واللیل - والرعد - والبرق - چمک - کڑک اور گھنگھور گھٹاؤں کی قسم - برسات کا موسم آگیا - جون کی گرمیاں

گئیں۔ جولائی کی سیرابیاں نمودار ہوئیں۔ سمندری مانسون ہوائی جہاز پر اُڑی چلی آتی ہے +

کیوں رے ابر تو آیا۔ میرے پیارے کو نہ لایا۔ تیری بوند بوند میں ایک روح ہے۔ تیرے قطرے قطرے میں ایک جان ہے اب مُردہ مٹی زندہ ہو جائے گی۔ کروڑوں جانور حرکت کرنے لگیں گے۔ چراغوں اور برقی لیمپوں پر ان کی یورش ہوگی چراغ کہے گا۔ پروانے! مجھ پر کیوں گرا پڑتا ہے؟ پروانہ جواب دے گا۔ کل جہاں تھا وہ نورانی مقام تھا۔ آج دُنیا میں آیا تو اس کو تاریک پایا۔ تجھ کو دیکھا تو سمجھا کہ تو میرے وطن، دشن کا نشان ہے۔ اس لیے تجھ سے گلے ملتا ہوں۔ ملنے دے۔ ناراض نہ ہو بادلو! ذرا ٹھہرنا۔ دیکھو۔ ایشیا میں۔ اور مسلم کے دل تشنہ کام میں بھی تم جا سکتے ہو یا نہیں۔ اگر نہیں تو جاؤ۔ میں تم کو نہیں مانگتا +

برسات وہ اچھی جس میں بُر ساتھ ہو۔ ورنہ ہیچ۔ قسم ہے گھونگر والے بالوں کی۔ بادلوں کے پیچ و خم مسلمانوں کے پیچیدہ احوال سے زیادہ نہیں ہیں۔ قسم ہے کوندنے والی بجلی کی۔ مسلمان کی بیقراری بہت بڑھ گئی ہے۔

کوئی یار نہیں۔ کس کو برسات کا تماشا دکھائیں۔ کون سمجھے کہ جولائی کی برسات میں کیا بہار ہے۔ مور بولتے ہیں۔ کوئل کی آواز آ رہی ہے۔ مینڈک نالابوں میں کچھ پکار رہے ہیں۔ میرا یار ہوتا تو وہ بھی ان کا مزا لیتا۔ نہیں بلکہ وہی اس کا لطف اُٹھا سکتا تھا +

یہ سب تماشائی بندۂ حرص و ہوس ہیں۔ اسیر مجاز ہیں۔ میں جس یار کو تماشا دکھانا چاہتا ہوں وہ مجذوب ہے۔ دیوانہ ہے۔ سالک ہے۔ ہوشیار ہے۔ وہ دیکھتا ہے۔ اور دکھاتا ہے۔ سُنتا ہے اور سُناتا ہے۔ آج وہ آ جائے تو بادلوں سے پانی نہ برسے۔ کچھ اور برسے کچھ اور بہار ہو۔ کسی دوسری چیز کی کیچڑ نظر آئے۔

پیاسی زمین کی قسم۔ گرمی اور گھمس کی قسم۔ دھوپ اور لُو کی قسم۔

اُفقِ حجاز

پر ایک بادل نظر آتا ہے۔ جو شاید گرج رہا ہے۔ اور ادھر کو بڑھ رہا ہے۔ میں اس میں حیات اور ممات کے کرشمے دیکھتا ہوں۔ مجھ کو اس کی آمد کا یقین ہے۔ وہ طوفانی رفتار سے سیلابی انداز سے غیبی پروں سے اُڑتا ہوا نظر آتا ہے۔

اگر یار سوتا ہے تو اُس کو جگا دو۔ اس کا تماشا دیکھے یہ برسات بار بار نہیں آتی۔ اور کہو۔ آ یار چلکے دیکھیں برسات کا تماشا دن رات کا تماشا۔ اسرار کا تماشا۔ اغیار کا تماشا۔ اک دار کا تماشا۔ اور سب ہل کے ترک کر دیں گھر بار کا تماشا۔

ٹھنڈا سانس
کھجور کی ٹہنی کے نیچے

از توحید۔ ۱۰ر جولائی ۱۹۱۳ء

میرٹھ میں شام تھی۔ ابر تھا۔ ہوا کا سکوت تھا آسمان اور زمین پر اُداسی تھی۔ جھینگروں کا شور تھا۔ مینڈک جگہ جگہ بول رہے تھے۔

میں نے ایک کھجور کے نیچے کھڑے ہو کر قدرت کے اس نظارے کو دیکھا۔ اور میرے سینے نے ایک ٹھنڈا سانس باہر بھیجا +
زمین کہتی تھی میں ٹھنڈی ہوں۔ بارش کے پانی نے مجھ کو سیراب کر دیا۔ دیکھو میرے جسم پر پانی بہنے کے نشان پڑے ہوئے ہیں
جو بل کھاتا ہوا مجھ پر سے گزرا ہے +
چھوٹی چھوٹی گھاس کے سبز تنکے خاک سے مُنہ نکالے مجھ کو دیکھ رہے تھے۔ ہرے درختوں کی شاخیں مستانہ شباب کے
عالم میں مخموری کی شان سے سر جھکائے کچھ سوچ رہی تھیں۔ کمپنی باغ کے تختۂ چمن میں لال۔ نیلے۔ سفید۔ رنگ برنگ کے پھول
شام کے ڈراؤنے وقت سے سہمے جاتے تھے۔ اور پتوں میں مُنہ چھپا کر تاریکی کی چادر بدن پر کھینچے لیتے تھے۔ ان سب کو دیکھکر
میری آنکھ نے پھر کھجور کی ٹہنی کو دیکھا جو

بانکی تلوار

کی مثل اونچے درخت کے گلے میں لٹکی ہوئی تھی۔ سینے میں پھر ایک شورش ہوئی اور اس نے ایک اور ٹھنڈا سانس نکالکر مجھ کو دیا +
ہاں۔ آج کے دن۔ اس موسم میں۔ سب مخلوق شگفتہ اور خوش حال ہے۔ مگر ابن آدم تنزل کی گرمی میں بھنا جاتا ہے۔ اس کو
باطنی سوز جلائے ڈالتا ہے +
جھینگر اور مینڈک نغمہ سنجی میں مصروف ہیں۔ اپنی زندگی کے مزے لے رہے ہیں۔ آدم زاد کیا کرے۔ جس کو یہ زندگی وبال معلوم
ہوتی ہے۔ وہ کیونکر واہ کہے۔ اس کو آہ کے مقام سے فرصت نہیں ملتی۔ میں نے کھجور کی ٹہنیوں کو نظر بھر کر دیکھا۔ اور کہا۔ تم اس
اجنبی مُلک میں کیوں؟ بہت دن نہیں گزرے مدینۂ حجاز میں باب رحمت کے سامنے والے گھر میں تم کو بعالم رویا دیکھا۔ تمہارے
سایہ میں میرا سلطان جس کا سکّہ دونوں جہان میں چلتا ہے کھڑا تھا۔ اُس کے بدن پر افغانی لباس تھا۔ اُس کے سامنے
شکستہ دلوں کے ڈھیر تھے۔ وہ تمہارے پتے توڑ توڑ کر اُن دلوں کو باندھ رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔
میری اُمّت کے دل ٹوٹ گئے ہیں۔ ان کو باندھتا ہوں۔ آ تو بھی باندھ +
یا وہ تھا۔ وہاں تھا۔ یا یہ اور یہاں؟ گرم سانس والے اب یہاں نہیں رہے۔ کھجور کی ٹہنی! میرے ٹھنڈے سانس پر
سایہ نہ ڈال۔ میں مسلم ہوں۔ جس کا سینہ گرمایا ہوا ہے۔ مگر ٹھنڈا سانس نکلتا ہے۔ میرا دل بھی ٹوٹا ہوا ہے۔ مگر اس کے زخم
کی بندش حجازی کھجور کے پتّے سے ہو سکتی ہے۔ تو میرٹھ میں ہے۔ کیونکر تیرا پتّا اس جراحت درونی کے کام آسکتا ہے؟
موسم برسات ہے۔ مخلوقات خدا کے دل اُمنگوں کے سانس لے رہے ہیں۔ دیکھو مینڈک کیسی بے فکری سے
گُن گُناتا ہے۔ جھینگر کس اطمینان میں گاتا ہے۔ مجھ کو قرار ہو تو میں بھی ایک نغمۂ مستانہ کی لے بلند کروں۔ مگر ٹھنڈے
سانس کا کیا علاج۔ وہ بار بار آتا ہے اور کہتا ہے کہ تیرا دل بے چین ہے۔ تو برسات کی بہار نہ دیکھ۔ پہلے اس کو ہاتھ
میں لے۔ اور حجازی شفاخانے میں لیکر جا۔ جہاں افغانی لباس والا

ربّانی سرجن

اس کی مرہم پٹّی کرے گا۔ اس کے بعد تو بھی شام کی دلگیری میں برساتی ترانے کا مزا دیکھیو۔ اب کیا ہے۔ اب تو فقط
تو ہے اور ٹھنڈا سانس۔ اُمید ہے اور اُس میں خوف و بیم کی پھانس +

عیدگاہِ ما غریباں کوئے تو

از توحید - ۱۳ ستمبر ۱۹۱۳ء

عید کے چاند نے کہا۔ مجھ کو دیکھو **مدنی محبوب** کے ابرو کا خم اسی شکل کا تھا۔ آسمانی ستارے کی شفق بولی۔ اور رخسار کی رنگت دیکھنی ہو تو مجھ پر نظر ڈال لو۔ اس میں کچھ اسی قسم کا روپ تھا۔ سامنے سے تاریکی دوڑ کر آئی۔ اور شرما کر کہنے لگی۔ گیسو مجھ سے ملتے جلتے تھے شام کے منظر اپنی کہہ چکے تو صبح کا نور بھی چمکا۔ اور زبان شعاعی میں گویا ہوا۔ اپنی تجلی کی قسم روئے محمدؐ کا میں آئینہ ہوں۔ اس کی زبان درازی بجلی کی طرح گری۔ وجود عشق باز بیتاب ہو گیا۔ اور کلیجہ تھام کر عید گاہ کی جانب چلنے لگا۔ وہاں کچھ سائل تھے۔ کچھ مسئول تھے کچھ اُجلے تھے۔ کچھ میلے تھے۔ آنکھ نے کہا۔ غریبوں کی یہ عید گاہ نہیں ہے۔ دل نے کہا نماز کا مقام تو یہی ہے۔ تو اگر نیاز کی عیدگاہ تلاش کرتی ہے تو حجاز میں جا۔ یثرب کو دیکھ۔ چند پیچیدہ گلیاں نظر آئیں گی۔ ان کی دیواروں پر راز و نیاز کے سائن بورڈ لگے ہوئے ہیں۔ اُن سے معلوم ہو جائے گا کہ مقصود کہاں دستیاب ہوتا ہے +

غریبوں کی عید گاہ مہربان ہوئی۔ اور اس کے امام نے جُھک کر گلے لگانا چاہا۔ مگر مشتاق سینے نے کہا۔ نیازمندی کا ناز قدموں سے ملنا چاہتا ہے۔ اس کی یہ مجال نہیں کہ سرکار کے سینے تک بڑھنے کی جرأت کر سکے۔ یہ ادب پسند کیا گیا۔ اور ارشاد ہوا۔ دیوانو یہ قدم ہمیشہ تمہارے رہیں گے۔ تم کو عید مبارک۔

بے قراروں نے جواب دیا ؎

عیدگاہِ ما غریباں کوئے تو　　　انبساطِ عید دیدن روئے تو

از نظام المشایخ - جون ۱۹۱۴ء

فطرت جس کو آج کل نیچر کہتے ہیں۔ قدرت جس کا نام اس زمانہ میں عادت طبعی ہو گیا ہے۔ اجمیری پہاڑوں میں ہست تھی۔ مگر مست نہ تھی +

نیچر کی مستی پہاڑوں کی ہستی میں سکوت ہے۔ سمندر اور دریاؤں میں شور و روانی ہے۔ جمادات میں پابندی ہے۔ نباتات میں شگفتگی اور سرسبزی ہے۔ حیوانوں میں حرکت خود اختیاری ہے۔ اور انسانوں میں ہوشیاری و دلفگاری۔ دلداری و جفاشعاری ہے +

اجمیر کے جمادات - نباتات - حیوان - انسان - سات سو برس پہلے ہست تھے - شکلیں رکھتے تھے - لیکن یوم الست کے مست خواجہ پیا کے قدم آنے سے مستی میں آ گئے -

مستی کے دم سے بستی ہے - چشتی خواجہ کا اُس ہُنسان خاکستان میں پاؤں رکھنا تھا کہ کوہستان کے ہر ننھے سے پھول میں دُنیا جہان کی آبادیاں نظر آنے لگیں - جو کلی کھلی - کھلکھلا کر ہنسی - اور اپنے اندر کی بستیاں نازک پتیوں پر دکھانے لگی -

چنبیلی کے پھول پر شبنم

خواجہ پیا - موہن سیّاں - کالی کملیا کاندھے پر ڈالے - وحدت کی بانسری ہاتھ میں لیئے جب اس بیابان میں جلوہ افروز ہوئے تو ایک چنبیلی کے پھول نے اپنی ہری بھری ٹہنی میں جھوم کر خواجہ پیا کے چرنوں پر سر جھکایا اور اپنے سینہ و گردن کے موتیوں کے شبنمی ہار کو ادب سے نذر چڑھایا - اور کہا - پالاگن مہاراج - ایک رات کی عمر والی ہستی آپ پر قربان - میری بپتا سُنتے جایئے +

میں ذرّات خاک کا مجموعہ ہوں - فطرت و نیچر نے ہست ہونا چاہا تو مٹی سے سر نکالا - شاخیں بڑھائیں - پتے پھیلائے کانٹے چُنے - اور پھر ایک دن شام کو سبز فام کچّی کلی کی صورت نمودار کی - وہ رات ارمانوں کی رات تھی - اندھیرا بڑھتا جاتا تھا تو کلی سبزی سے سفیدی کی جانب بڑھتی تھی - بند پتّوں میں سرگوشیاں ہوتی تھیں - ہر پتّی دوسری پتّی کے سینے سے لگتی اور کہتی ؎ غنیمت جان اس مل بیٹھنے کو + جُدائی کی گھڑی سر پر کھڑی ہے - اُس شب ہر ذرّۂ گُل میں خمار تھا - اور آپ جانتے ہیں کہ ہر پتّی میں کس کثرت سے ذرّے تھے - اور ان سب کی مخموری سے میرے سرور کا کیا عالم ہوگا +

میں نے سمجھا کہ زندگی بڑے مزے کی چیز ہے - کھلنے کا وقت آ رہا ہے - اور شباب اپنا گھر بنا رہا ہے - ابھی وجودِ گُل کی ہیکل پوری تیّار بھی نہیں ہوئی ہے - اور جذبات کی رنگا رنگیاں لذّتوں کا مینہ برسانے لگیں - جب سب کچھ تیّار ہو جائے گا تو خدا جانے کیا مزا آئے گا +

اسی اثناء میں مُرغ نے صدا بلند کی - مندر کا گھنٹہ بجا - نسیم سحر آنکھیں ملتی اور مستی میں لڑکھڑاتی نمودار ہوئی - اور ہمارے درخت کے بدن میں گدگدیاں کر کے آگے بڑھنے لگی +

مجھ کو بے اختیار ہنسی آئی - مگر ہنسنے کی دیر تھی - ایک ہی جنبش میں پتّیاں کلی کی ہم آغوشی سے جُدا ہو کر تھرتھرانے لگیں - اور صبح صادق کے اُفق کو سامنے دیکھکر شرمانے لگیں +

اب کیا تھا - آسمانی نور نے زندگی کا دوسرا دور دکھانا شروع کیا - آس پاس کی جھاڑیوں سے چھیڑ چھاڑ ہونے لگی - ہوا نے ہمارے شباب کی مستی کو اپنے دامنوں میں بھر کر چُپ چاپ جنگل میں بکھیرنا شروع کیا +

یہ زمانہ ختم نہ ہوا تھا کہ آسمان کی آنکھ کا آنسو قطرۂ شبنم کی شکل میں مجھ تک آیا - اور کہا - پھول! مجھ کو جگہ دے کہ فلک نے نظروں سے گرا دیا - میں نے ہاتھوں ہاتھ اُس کو لیا - مگر میرے ذرّات نے اُس کو جذب کرنے سے انکار کیا - بچارے کو اُدھر پتی کے کنارے ٹھیرائے رکھا +

اتنے میں سورج نکل آیا - کرنوں نے شبنم کو چھیڑنا شروع کیا - اور بچاری بوند کا گھڑی بھر ٹکنا دوبھر کر دیا - آخر وہ گھبرا کر موت موت پکارنے لگی - اور میرا دل موت کا نام سُنکر سہم گیا - میں نے خیال کیا تو کیا مجھ کو بھی موت آئے گی - اور ان ولولہ خیز خوشیوں کو خاک میں ملائے گی +

یکایک آپ کے جمالِ باکمال پر نظر پڑی - شبنم کا قطرہ جلدی سے آپ پر تصدّق ہو گیا - مجھے بتایئے کہ میں کیونکر قربان ہوں کہ اس موت کے کھٹکے

سے نجات پاؤں۔

خواجہ پیا نے گلابی مستانی آنکھ سے اِس فریادی پھول کو دیکھا۔ اور خبر نہیں نظروں ہی نظروں میں کیا کہہ دیا کہ پھول مستی میں آگیا۔ اور بولا۔ پالیا مِل گیا۔ یہ زندگی کیا چیز ہے۔ اس نگاہ پر سب کچھ نثار۔ میرے پیا۔ میرے سیّاں۔ تو ملا تو سب کچھ ملا۔

پیکرِ امکان کیوں دِلگیر ہے

از نظام المشائخ۔ دسمبر ۱۹۱۴ء

لامکان نہیں مکان۔ مکان نہیں مکین۔ مکین نہیں کُن کا حرف جس کو کون ویکون کہتے ہیں۔ جس نے اپنا گلا قوتِ ایجاد کی چھُری سے کٹوایا۔ اور پھر مخلوق کو آگے بڑھ کر انسان کہلایا۔ یہی پیکر امکان کائنات شادان و فرحاں میں اسیرِ پنجۂ دلگیری ہے۔ اسی کو وحدت نے ذرّت کی شکل بنکر ستایا ہے۔ یہی کہتا ہے الٰہی ہجر میں کلیجہ منہ کو آیا ہے۔ چیونٹی رفیق زندگی کے ساتھ زندگی بسر کرتی ہے۔ مکھی اپنے جوڑے کے ہمراہ اُڑتی پھرتی ہے۔ بگلا دریا کے کنارے دوئی کی بہار سے سفید ہے۔ کوّا گھر کی دیوار پر اپنے مونس کو لیئے بیٹھا ہے۔ اور کالی رنگت پر فخر یہ چہچہاتا ہے۔ ریل کے پہیئے آہنی ہم جنس سے گلے ملکر چلتے ہیں پھول ایک دوسرے کو دیکھکر کھلتے ہیں۔ پانی کے قطرے کیسے ملے ہوئے ہیں۔ ہوا کے ذرّے کس طرح آپس میں جُڑے ہوئے ہیں۔ پہاڑوں کی بلندی سنگی ذرات کی باہمی ہمنشینی سے ہے۔ دریاؤں کی روانی پانی کے میل جول سے ہے۔ چاند تاروں کو لیکر چمکنے آتا ہے۔ سورج شعاعوں کے حلقہ میں موج اُڑاتا ہے۔ خود اُس کو دیکھو جو خدا ہے۔ ہُو ہے۔ ہُو میں ہے۔ اور پھر کہنے کو سب سے جدا ہے۔ جس کی وحدت و یکتائی کی گھر گھر دھوم ہے۔ جو نہ مانے اُس کے لیئے خطاب احمق و شوم ہے۔ وہ بھی اکیلے پن سے اُکتاتا تھا۔ دیکھنے دکھانے کی ہوس میں خاک کے پُتلے بناتا تھا۔ آدم کو خلیفہ کہا۔ دیکھا دکھایا۔ نوحؑ کو۔ ابراہیمؑ کو۔ موسیٰؑ کو۔ عیسیٰؑ کو۔ اُن کے زمانے میں محرم راز بنایا۔ ابراہیم سے کہا میرا خلیل ہے۔ موسیٰؑ کو آگ کے بہانے پاس بُلایا اور کہا تو کلیم ہے۔ کچھ اور ترنگ آئی۔ دل لگی کی ٹھہرائی۔ بولا۔ جوتیاں اُتار دے۔ اور سانپ سے کھیل۔ جی بہلا۔ اور فرعون سے لڑ۔ مٹی کی مورت اپنے بنانے والے کی مہربانیاں دیکھکر اترائی۔ اور صورت دیکھنے کی صدا لگائی۔ کہا کہ تو دیکھ نہیں سکتا۔ اور پھر جلدی سے ناسوتی آنکھ کے سامنے لاہوتی جلوہ نمودار کر دیا۔ تاب کہاں سے آتی۔ پتلا سینہ تھام کر رہ گیا۔

عیسیٰؑ کو اپنی روح کہکر پکارا۔ عالمِ تعین میں پھنساکر مُردے جلائے۔ پھر کہا کہ تیرے بعد اُس کی باری ہے۔ جو محبوب حجاب کر دگاری ہے۔ محمدؐ نام۔ محمدؐ کام۔ محمدؐ سرانجام۔ رفیق اعلیٰ۔ رفیق ظاہر۔ رفیق باطن۔ معراج میں بُلایا۔ دو کمانوں یا اُس سے بھی تنگ فاصلہ پر ٹھیرایا۔ کچھ کہا۔ کچھ سُنا۔ کچھ دکھایا۔ کچھ دیکھا۔ اب تیرہ سو برس سے خبر نہیں کیا کرتا ہے۔ کہاں رہتا ہے۔ کس شغل میں مشغول ہے۔ مسرور ہے یا ملول ہے۔

مگر مجھے اس سے کیا۔ وہ خوش ہو یا ناخوش۔ وہ تو عین ذات میں سرشار ہے۔ مشکل میں میرا آزار ہے کہ عالم امکان وتعین کی تصویر ہوں۔ وحدت کے ہاتھوں ہجر و فراق میں اسیر ہوں۔ جب اُس نے اپنی واحد خوشی کو اکیلا نہ رہنے دیا۔ اور صفاتی شکلیں جی بہلانے کو بنائیں۔ جب اُس نے ہر موجود کو اُس کا ہمجنس وجود دیا۔ جبکہ اُس کی نیچر اس بات کی رفاقت میں دی گئی۔ جبکہ اُس کی قدرت حیلہ و وسیلہ کی دست نگر رہی تو میں کیوں اکیلا رہوں۔ میری دلگیری ختم کیوں نہیں ہوتی۔ مجھ کو میرا دلدار کیوں نہیں ملتا۔ حجاز کتنی دور ہے۔ کھجوروں کے باغ کتنے فاصلہ پر ہیں۔ وہ مقام کہاں ہے جہاں سرورِ عالم شکستہ دلوں کو کھجوروں کے پتّوں سے باندھتے تھے۔ میرا پاش پاش

دل کا مرہم اُنہیں کے پاس ہے۔ یہ زخم اُنہی کے نشتر سے چیرا گیا۔ وہی پٹی باندھیں گے۔ کوئی چارہ ساز ہو یا نہ ہو۔ کوئی دلنواز ہو یا نہ ہو۔ مدنی شیام سُندر کی یاد کافی ہے۔ جبکہ اُس کی آس ہے تو پھر کیا ہراس ہے۔ میری آنکھوں کے خالی کٹورے آنسوؤں کی بریں مانگتے ہیں۔ میرے سینے کے خالی بچھونے محمدی آرام جان چاہتے ہیں۔

میں نہیں۔ ایک اسیر دست بیداد۔ فریاد کرنے کھڑا ہوا ہے سب سہاروں کو قطع کر کے ایک سبز گنبد کے دروازے کی کُنڈی کھٹکھٹاتا ہے دیکھئے۔ دل کی گرہ کون کھولنے آتا ہے۔ درد بھی اُس حکیم کے گھر جانے کے وقت ملا تھا۔ علاج بھی یہیں ہوگا۔ فرقت بھی اس کوچہ کی گردش ہیں پالے پڑی تھی۔ وصال بھی اس گلی کی ٹھوکریں کھانے سے میسر آئے گا۔ اسیر ہوں۔ دلگیر ہوں۔ افتادہ پامالِ رہگیر ہوں۔ حیات کا مجاز ہوں۔ ممات کی حقیقت ہوں۔ حرکات کا عکس ہوں۔ بے اختیاری کا سایا ہوں۔ محمدؐ محمدؐ تیرے دروازہ پر آیا ہوں۔ یا اُس کو بلا۔ یا تو مل جا +

پردیسی پیتم دیکھی تہاری پریت

از نظام المشائخ جنوری ۱۹۱۵ء

اُس کے لیئے میں۔ میرے واسطے وہ۔ دونوں اجنبی اور پردیسی تھے۔ فاصلہ کچھ بڑا نہ تھا۔ بس اتنا کہ تین بار پلک جھپکے۔ میں اُس کا وہ میرا پیتم کہلایا۔ اُس نے مجھے میں نے اُس کو اپنا بنایا۔ اُن دنوں سورج مشرق ہی سے نکلتا تھا۔ اور دریاؤں میں خاک کی جگہ پانی ہی بہتا تھا جب تک سمندر میں آتشی طوفان کا ذکر سننے میں نہ آیا تھا۔ ہر چیز اپنی تھی کوئی بھی پرایا نہ تھا +

ایک رات کھجور کی ٹہنیوں میں ہوا جھولا ڈالنے آئی۔ اور بیری کی ساخوں میں مکھی بھنبھنائی۔ دل سرشار تھا۔ تخیل مستغرق۔ بجز نا پیدا کنار تھا ہوا کو مدد نہ دی اور مکھی کے سامنے پھولوں کی مستی نہ رکھی۔ اس بات سے خدا ناراض ہو گیا۔ اور اُس نے اپنے جہان کا رُخ میری طرف سے بے رُخ کر دیا +

میں نے کہا۔ دُنیا بے رُخ ہو جائے۔ میرا پردیسی پیتم رُخ نہ پھیرے۔ پیارے پیتم نے میرے قول کو چوم لیا۔ اور قول کے جسم کو سینے سے لگا لیا۔ خدا کو ہم دونوں کی محبت پسند آئی۔ اور اُس نے توبہ کے دروازے کھول دیے۔ سورج نے کہا۔ میں مغرب سے نکل آؤں گا۔ اس وقت یہ در بند کرنا پڑے گا۔ پردیسی پیتم نے اپنے رُخسار کو سورج کی جانب موڑا کہ کچھ کہے۔ سورج بن سُنے شرما کر پیچھے کو ہٹ گیا۔ میں نے کہا۔ پیارے تمہارا مُنہ ہے یا شمس الضحیٰ۔ اُس نے جواب دیا بر زخ کبریا۔ میں نے کہا تو لاؤ تم کو سجدہ کروں۔ بولا۔ خبردار اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ۔ میں نے کہا اور وَحْیٌ یُّوْحٰی۔ سنکر خاموش ہو گیا۔ شرما کر نظریں جھکا لیں +

کیا لطف کی راتیں تھیں۔ کیا مستی و سرور کی گھاتیں تھیں۔ کیا باہیں تھیں۔ کیا گردنیں تھیں جو ہم آغوش ہوتی تھیں۔ کیسا لمبے بال تھے جو اُلجھتے تھے +

مگر دیکھو تو۔ وہ پردیسی روٹھ گیا۔ میں تو لڑا نہ تھا۔ وہ کیوں خفا ہو گیا۔ اونٹوں کے قافلے میں کہیں چھپا ہے۔ چاند مسکراتا ہے۔ کیا اسی کے اندر گیا ہے۔ تارے کھلکھلا کر ہنس رہے ہیں اور ان میں ہو بہو اُس کی ضیا ہے۔ ہاں یہیں ہوگا۔ ان کو توڑ لو۔ آسمان سے جُدا کر دو۔ زمین پر رکھکر ہر ایک کو علحدہ علحدہ کر کے دیکھو +

نہیں۔ سُنو۔ یورپ کے میدانوں میں گرج کی آواز آتی ہے۔ اُس کو جنگ کی زمین بہت بھاتی ہے۔ شاید وہاں جا نکلا ہو۔ آدب سے پُکارنا۔ وہ فیلڈ مارشلوں کو نقشے بتاتا ہوگا۔ خندقیں کُھدواتا ہوگا۔ زخموں کی مرہم پٹی کرتا ہوگا۔ لاشوں کو دفنانے کی فکر میں مصروفیت ہوگی +

کیوں پردیسی تم یہاں ہو۔ اور ہو تو کس کیمپ میں۔ اتحادیوں میں یا بیدادیوں میں۔ جرمن میں یا انگریزی خرمن میں۔ بولو۔ من جاؤ۔ بس ناراضی ہو چکی۔ میں نے مانا کہ اُمت کی لاشوں کو یورپ میں دیکھنے گئے ہو۔ مگر اپنے اُس کو بھی ساتھ لیا ہوتا۔ جو ایک دم کو جدا نہ کیا جاتا تھا نہ بولو گے تو ہم بھی بولنا چھوڑ دیں گے۔ نہ آؤ گے تو ہمارا بھی آنا جانا بند ہو جائے گا +

پیتم۔ پیتم۔ پیارے۔ راج دُلارے۔ میاں کہاں ہو۔ ذرا تو ترس کھاؤ اور جواب دو۔ آسمان چہارم کے عیسیٰ تک تمہاری خاموشی سے بے قرار ہیں۔ فرشتے اُن کی آہ وزاری سے بیزار ہیں۔ مگر مجھے ان سے زیادہ اپنی فکر ہے۔ وہ تو اُمت کی سفارش کے لیئے تم کو ڈھونڈتے ہیں۔ اور میں فقط تمہاری دید چاہتا ہوں +

نہیں بولتے۔ دروازہ نہیں کھولتے۔ کیسے دلدار ہو۔ کیونکر کہوں کہ جفا شعار ہو۔ تم نے کبھی جفا نہ کی تھی۔ آج کیا ہو گیا۔

اُفوہ۔ میری بے صبری۔ میری بے چینی۔ کیا یہی اقرار تھا۔ کیا اسی سلوک کے قابل یہ گنہگار رہتا۔ اگر سر لائق دار تھا تو یہاں کسے انکار تھا۔ مگر جُدائی کی سزا اخلاف تہذیب قانون بین الاقوام عشق ہے۔ یہ بڑی وحشیانہ پاداش ہے۔ ہائے اب بھی رحم نہ آیا۔ نہ خود بولے۔ نہ کسی قاصد نامہ بر کو بھیجا + واہ۔ بس۔ پردیسی پیتم دیکھی تمہاری پریت +

رَسْ کے بھَرے تورے نیَنْ

از نظام المشائخ جنوری ۱۹۱۵ء

خونخوار آنکھیں۔ اشکبار آنکھیں۔ دلدار آنکھیں۔ دلفگار آنکھیں۔ میں کیا کہوں کہ وہ ہیں زہر دار آنکھیں +

آنکھ تھی یا نرگس کا پھول۔ پھول تھا۔ یا دل میں چھبنے والا کانٹا۔ نہیں کانٹا نہیں۔ یہ پھول ہے۔ وہ شامپین وحدت کا لبریز گلاس تھا۔ شاید اب بھی نشہ میں غلط کہا۔ وہ نشتروں کا پیکٹ نہ ہو۔ چھُری کی دھار نہ ہو۔ تیر کی نوک نہ ہو۔ مگر دل تو کہتا ہے وہ آنکھ رسیلی۔ کٹیلی نشیلی تھی۔ اُس میں سے نور برستا تھا۔ سُرور اُبلتا تھا۔ اُس نے اپنا رَس دو پیالوں میں مجھ کو بھی دیا تھا۔ دل کی گواہی معتبر نہیں۔ اُس کو جنون ہے۔ دماغ سے پوچھو کہ چشم زیر بحث کی نسبت بیان دے۔ حق کو جانکر سچی زبان دے +

جنابِ عالی! وہ مجاز کی بنی ہوئی دونالی بندوق تھی۔ ایک سکنڈ میں دس کروڑ فیر کرتی تھی۔ یا وہ بے تار کا تار دار اشارہ تھا۔ یا کھاری سمندر کا کنارہ تھا۔ مجھے خیال پڑتا ہے کہ وہ رو رہی تھی۔ اور ہنسا رہی تھی۔ اور آزاد ہستیوں کو جال میں پھنسا رہی تھی +

دماغ میں بھی خلل معلوم ہوتا ہے۔ اس کے اندر بھی کسی سودے کا دخل ہے۔ ارے کوئی تو کہے کہ وہ ٹھیک ٹھیک کیا تھا آنکھ تھی یا طلسم ہوش رُبا تھا +

جی ہاں۔ چھ معتبر اشخاص اس گھر میں ہیں۔ چار مرد۔ دو عورتیں۔ ان سے دریافت ہو تا کہ تحقیقات خلجان سے خودی سے واگزاشت ہو +

آپ کون۔ اسم شریف؟ ابوبکر بن ابی قحافہ۔ کچھ ان آنکھوں کے بارہ میں واقفیت ہے؟ کیوں نہیں۔ میرے یار۔ میرے

خلیل۔ محبوب خدائے جلیل کی آنکھیں ہیں۔ انہیں کو دیکھکر میں بوڑھا جوان ہوگیا۔ انہی آنکھوں نے مجھ کو چشم بصیرت عنایت فرمائی +

دوسرے صاحب تشریف لائیں۔ آپ کا اسم گرامی؟ عمر ابن الخطابؓ۔ ان آنکھوں کی نسبت کیا رائے ہے؟ میری رائے ان آنکھوں ہی نے چھین لی۔ اور خود میری رائے بن گئیں۔ میں کیا بتاؤں کہ وہ کیا ہیں۔ اتنا کہہ سکتا ہوں۔ فاتح ہیں۔ ملک گیر ہیں۔ قاتل ہیں اور سب مقتول انہیں کے اسیر ہیں +

تیسرے بزرگ کہاں ہیں۔ آپ کا اسم مبارک؟ عثمان ابن عفانؓ۔ ان آنکھوں کے متعلق کیا خیال ہے؟ کن آنکھوں کے متعلق؟ یہ جو سامنے ہیں۔ میری زبان شرماتی ہے۔ مجھے کچھ یاد آتا ہے۔ اور عقل چکراتی ہے۔ چوتھے صاحب کو بلایئے۔ اور مجھ سے کچھ نہ کہوایئے +

ان حضرت کو تکلیف دی جائے۔ صورت سے ذکی اور ذہین نظر آتے ہیں۔ دیکھئے۔ یہ کیا فرماتے ہیں۔ آپ کا اسم عالی مجھ کو علی ابن ابیطالبؓ کہتے ہیں۔ مگر میں ابھی کچھ نہ کہوں گا۔ پہلے ان دو عورتوں کا بیان سن لیجئے +

اچھا اوّل ان بی بی صاحبہ کو تکلیف دو۔ اور پردے میں یہ آنکھیں دکھاؤ۔ آپ اپنا نام نامی ارشاد فرماسکتی ہیں؟ مجھ کو عائشہ صدیقہ کہتے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ یہ آنکھیں کیا ہیں؟ -

بعد مدت کے ہوئی دید تری آنکھوں کی۔ یہ میری گود میں بند ہوئی تھیں۔ یہ مجھ کو محبّت سے دیکھتی تھیں۔ ان کو میں نے آسمانوں سے ٹکٹکی لگائے دیکھا۔ ان کو آنسوؤں میں غرقاب پاتی تھی۔ انہی کو دیکھ دیکھ کر میری تن بدن میں جان آتی تھی +

دوسری سیدہ کو بھی دکھاؤ۔ اور اُن کے فرمان کو قلمبند کر لاؤ۔ حضرت کا نام مبارک؟ مظلوم فاطمہ۔ بنت صاحب العیون۔ یہ میرے بابا جان کی آنکھیں ہیں جو مجھ سے خفا ہو کر کہیں چلی گئی تھیں۔ یہ میرے حسنؓ حسینؓ کو پیار کرنے والی انکھیاں ہیں۔ یہ میرے ہاتھوں کے چھالوں کو دیکھنے والی ہیں۔ مجھے دو۔ مجھے دو کہ مدت کے بعد میں نے پائی ہیں۔ میں تم کو آنکھوں پر رکھوں۔ دل میں چھپا لوں۔ میں کچھ نہیں کہتی۔ انہیں سے پوچھو کہ یہ کیا ہیں +

علیؓ نامدار۔ اب تو فرمایئے۔ اُلجھن کا خلفشار مٹایئے۔

دیوانوں کو ہوشیار کرنے والی ہیں۔ ایک طرف خونخوار ہیں۔ ظالموں کا قصہ پاک کرتی ہیں۔ ایک جانب اشکبار ہیں۔ خوف ذوالجلال سے تر رہتی ہیں۔ بے دلوں کی دلدار ہیں۔ دلوں کو قرار دیتی ہیں۔ سنگدلوں کا نشتر ہیں۔ گنہگاران کا کار ہے۔ یہ رس کے بھرے دو نین ہیں۔ انہی کی مٹھاس سے لب بند کو نین ہیں۔ خمار بخش ہیں۔ خمار شکن ہیں۔ یہ چشم محبت میرے بھائی محمدؐ کی ہے۔ یہ چشم فسوں ساز میرے مولا سرور کائنات کی ہے جس پر سحر کاری کا الزام لگایا گیا۔ یہ وہ ہیں۔ یہ وہ ہیں۔ یہ وہ ہیں۔ یہ وہ۔ یہ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آنکھ کھل گئی۔ منزل مل گئی +

از خطیب۔ ۲۲ مئی ۱۹۱۵ء

مت بھول۔ یہ اجمیری چنبیلی کا پھول ہے۔ اسکی دید میں ہر ارمان حصول ہے۔ ایک ہار خرید و۔ گلے میں اٹکا کر سینے سے لگاؤ +
کیوں جناب داتا چنبیلی! آپ نے آنکھ کھولی۔ کلی سے پھول بنے۔ ذرا ہماری کلی کے لیئے بھی تھوڑی سی صبا منگوا دو اس کی بند پتیوں کو کھلنے کی

اور کھلنے کی اجازت دلوادو۔ بھائی مقبول حبیب اِلٰہ ہو۔ تم چاہو تو تمہارے خواجہ بھی مہربان ہو جائیں۔ خواجہ کی نظر مہر ہو۔ تو اللہ میاں کی عنایت میں کیا دیر ہے۔ اسی خود غرضی کے لیئے اتنا چکر اتنا پھیر ہے۔

بندہ مشرک نہیں۔ تم کو اور تمہارے خواجہ کو خدا یا شریک خدا نہیں مانتا۔ مگر تمہارے وسیلے کے سوا کسی کو نہیں جانتا پہچانتا۔ دل کے لگاؤ کے واسطے ایک رشتہ درکار ہے۔ رشتہ کہاں سے لاؤں۔ قطع بُرید کا زمانہ ہے۔ رگ گل میں تمنّا کو پروتا ہوں۔ تم سے کہتا ہوں۔ تمہارے خواجہ کے آگے روتا ہوں +

کہنا۔ چمن حیات سے یقین کی بہار خفا ہو کر چلی گئی۔ وہم۔ شک۔ گمان نے ہر غنچہ کو گھیرا ہے۔ بلبل نہیں۔ زاغ چونچیں مارتا ہے۔ اور کہتا ہے یہ میرا ہے۔ یہ میرا ہے۔

باغ اُجڑ جائے گا۔ اس وقت آپ کو توجہ ہو گی۔ تو کیا ہاتھ آئے گا۔ اے اجمیری پھول اتنا کہہ دے گا تو بڑا اجر پائے گا +

زُلف کا ماجَرا

از خطیب ۲۲ مئی ۱۹۱۵ء

اندھیری رات میں سوائے اس کے میں اور کیا بیان کر سکتا ہوں کہ وہ سیاہ بال تھے۔ ان میں پیچ و خم تھے۔ کنگھی سے اُلجھتے تھے مُشکل سے سُلجھتے تھے +

شاعروں نے اُن کو گیسوئے عنبریں کہا۔ زلف پیچاں نام دھرا۔ میں نے یہ ماجرا سُن کر خلقت کی آہوں کو فراہم کرنے کا حکم دیا۔ کیونکہ سُنتا تھا۔ آہ بھی کالی ہوتی ہے۔ اس میں بھی پیچیدگی کا جنجال ہوتا ہے۔ لوگوں نے کہا دوسروں کی آہ مانگتے ہو۔ تم بھی تو سینۂ سوزاں رکھتے ہو ایک شرارہ آہ اپنا بھی دو +

میں گُل چمپا کی بوئے مست میں مشغول تھا۔ پبلک مطالبہ سے چونکا۔ چاہا کہ ایک آہ تاریک کھینچوں۔ مگر دل نہ مانا۔ پھول کی بو سے پیچیدہ کو آگے بڑھا دیا۔ خوشبو پلی کی لائی۔ غمزہ سے اترائی۔ اور بولی اکیلی نہ جاؤں گی۔ شمع کے دُھوئیں کو ساتھ بھیجو۔ خوشبو کی یہ ادائے محبوبانہ دل کو بھائی آہ کو بُلایا۔ شمع کے دُھوئیں کو سمجھایا۔ اور تینوں پیچیدگیوں کو اللہ بیلی۔ اللہ نگہبان کہا +

اب زلف کا ماجرا شروع ہوا۔ سارے جہان کی آہیں۔ دُنیا بھر کے پھولوں کی خوشبو۔ کُل بزم کائنات کی شمعوں کا دھواں مِل جُل کر گھر سے چلے۔ تو دیکھا عرب کے ایک شہر مدینے میں ایک کاکل دراز کھڑے ہیں اور سورۂ واللیل پڑھ رہے ہیں۔

اس مرد عرب کے گیسو دیکھ کر ہر پیچیدگی شرما گئی۔ اور بولی۔ آشفتہ می دارد مرا زلف سمن روئے شما +

زلفوں والے مُنہ سے نہ بولے۔ ایک دوسرے کمبل والے کے سر پر ہاتھ رکھا۔ یہ بھی گیسو دراز تھے۔ اور فرمایا:۔

جاؤ میرے حسن۔ ہندوستان سدھارو۔ سلطان الہند لقب دیا۔ وہ مُلک تاریکی شرک سے کالا ہے۔ وحدت کا نور لیجاؤ۔ اُجالا بانٹو۔ میرے بنو میرا بناؤ +

خبر نہیں اس ہاتھ میں کیا تاثیر تھی۔ زلف حسن جھومنے لگی۔ اور بل کھا کر چلائی۔ مجھ کو معین الدین حسن کا درجہ دیا۔ دین حسن کی اعانت میرا فرض ہے۔ اور ہندی دلوں کی اُلجھن سُلجھانا۔ دل کا ارمان۔ زُلف کا اتنا ہی ماجرا سُنا تھا۔ کہ رجب کا چاند نظر آیا۔ ہندو مسلمان کے گھر میں عید آئی۔ اجمیر۔ اجمیر کی دھوم مچی۔ ہر ہستی اپنی بستی چھوڑ کر گھر سے چلی۔ دیکھا پہاڑوں کی آغوش میں گنبد سفید کی وہی شان ہے۔ جو مدینے میں

گنبدِ سبز کی تھی۔ زبان سے نکلا ؎

در خواجہ یا رو درِ مصطفیٰ ﷺ ہے　　　سراسر مدینے کا نقشا کھچا ہے

ادب نے کہا خاموش۔ سلسلۂ زلف میں اسیر ہو۔ زبان بند کر۔ تقریر نہیں۔ تاثیر ہو۔ تاکہ دل کے الجھاؤ سلجھیں۔ من موہنی مُراد ہاتھ آئے۔

چارۂ تشنہ لبی

از خطیب ۲۲ مئی ۱۹۱۵ء

اجمیر کا عرس۔ مئی کا مہینہ۔ خلائق کا انبوہ۔ جس میں ہندو بھی مسلمان بھی۔ دانا بھی۔ نادان بھی۔ مگر ہر جان پانی کی خواہاں۔ اور پانی مثلِ حجاز خطّہ میں نایاب! +

اخباروں نے چھاپا۔ اس کا تدارک ضرور ہو۔ اہتمام کرنے والوں نے کمریں باندھ لیں۔ حضور نظام کے وعدے چشمہ کشائی بھی یاد آگئے مگر دل نے انگڑائی لیکر کہا۔ میری پیاس کا کیا انتظام ہوگا۔ اس کے لیئے کون سا ہمدرد ہے۔ جو کنڈی کھٹکھٹائے گا۔ تشنہ کامی سے جان لبوں پر آئی ہے۔ روح کی زبان خشک ہے۔ چہرہ پر مردنی چھائی ہے۔ کوثری خواجہ سے کہو۔ اس تشنہ لبی کا چارۂ کار نہ بنے تو اخبار العشق میں ریمارک چھاپے جائیں گے۔ نکتہ چینی ہوگی۔ پھر نہ کہنا۔ کہ یہ سخت نویسی حد سڈیشن تک پہونچتی ہے۔ پریس ایکٹ کے اشارے کنائے یا اور کسی انداز میں گرفتار کرو۔ اسیر پہلے ہی ہیں۔ صاف کہہ دیتے ہیں۔ اس پیاس کا انتظام کرنا ہوگا۔ خالی جام بھرنا ہوگا +

ایک میں ہوں۔ ایک میرا خاری ہے۔ مجھ میں اس میں اسی جام کی خاطر مدت سے یاری ہے۔ دودھ کی نہر نہیں مانگی۔ شہد کا چشمہ طلب نہیں کیا۔ سادی پانی کا ایک کٹورہ درکار ہے۔ بڑھا دو۔ منہ سے لگا دو۔ دل کی لگی کو بجھا دو۔ یللہ بجھا دو۔ میں قربان۔ کوچۂ شرابی سے بچاکر عشق کے اصلی واٹر خانہ تک پہنچا دو۔

اے دل مجھ پر آ!

از خطیب۔ ۲۲ جون ۱۹۱۵ء

تو اچھی صورتوں پر آتا ہے۔ میں بھی خدا کی صورت پر بنا ہوں۔ اچھی سیرتوں پر آتا ہے۔ تمام کائنات کی مخلوق سے افضل واشرف سیرت رکھتا ہوں۔ تو لباس پر۔ رفتار پر۔ گفتار پر۔ ادائے طرحدار پر جان دیتا ہے۔ دیکھ۔ مجھ میں کسی چیز کی کمی نہیں۔

پس میں درخواست کرتا ہوں کہ تو مجھ پر آ۔ یعنی مجھ سے محبت کر۔ میری الفت میں اسیر ہو +

تو مجھ کو کتنا پیارا ہے۔ سینے کے اندر۔ پہلو میں چھپا کر۔ سوائے تیرے کس کو رکھا ہے۔ اس جون کی گرمی میں تیری خاطر نیلوفر کا شربت پیتا ہوں۔ دریا کے ٹھنڈے ریت پر لوٹتا ہوں تاکہ تو خنکی سے راحت پائے۔ اور ہاں اپنے

سانس کا پنکھا

تجھ پر لگا رکھا ہے۔ جو دن رات چلتا رہتا ہے اور تجھ کو ہوا دیتا ہے +

میرے دل میں تیری مخفی خواہش کو ذرا سے اشارے سے تاڑ جاتا ہوں۔ اور جس طرح تو کہتا ہے کھاتا ہوں۔ پہنتا ہوں۔ چلتا ہوں۔ پھرتا ہوں تیری ہی آنکھوں سے دُنیا کو دیکھتا ہوں یعنی جس چیز کو تو چشمِ مسرت سے دیکھنا چاہتا ہے اُسی پر نظر ڈالتا ہوں۔ اور کسی پر نہیں۔ تیرے ہی کانوں سے

سنتا ہوں یعنی تیری مرضی کے خلاف کسی آواز پر کان نہیں دھرتا۔ تو پھر کیا شرط انصاف ہے کہ تو مجھ کو چھوڑ کر دوسروں پر آئے۔ مجھ سے
بے وفا بنکر غیروں کی وفا کا عہد باندھے +

خبر بھی ہے۔ میں اُس خدا کا بندہ ہوں جس کو شرک سے نفرت ہے۔ ہر گناہ کی اس کے دربار میں معافی ممکن ہے۔ مگر شرک کی نہیں۔
پس میں کیونکر گوارا کروں کہ تو اغیار کی الفت میں مبتلا ہو اور میرا حق دوسروں کو دے +

اے دل تیرا نام ایک مجاز ہے۔ حقیقت میں شکوہٗ راز و نیاز ہے۔ میری اس تحریر کو چشم حقیقت سے پڑھ۔ اور خدارا مجھ سے محبّت کر۔
اگر تو مجھ سے محبّت کرنے لگے تو خدا تک تیری رسائی ہو جائے گی۔ کیونکہ میری شناخت خدا کی شناخت ہے۔ چونکہ تو خود میرا دل ہے
جب میرے وجود کا عرفان حاصل کرے گا + عرفانِ رب حاصل ہو جائے گا۔ مَنْ عرف نفسہ عرف ربّہ۔ دلیل موجود ہے +

مگر ہائے تو مجھ کو بھول گیا۔ تو غیر کی چاہت میں میری وفا شعاریوں کو پسِ پُشت ڈال بیٹھا + مجھے تجھ پر غصّہ آتا ہے۔ چاہتا ہوں
اپنے سینے کو چیر ڈالوں۔ اور تجھ کو نکال کر پھینک دوں۔ لیکن یہ بھی محال ہے۔ نے تابِ وصل دارم۔ نے طاقتِ جُدائی۔ الٰہی یہ کیسی مشکل آئی۔

اچھا تو میں دُنیا والوں کو تیری کج ادائی سُناتا ہوں اور اُن سے کہتا ہوں کہ جس کو سینہ سے لگا کر رکھا ہو اُس پر بھروسہ کبھی نہ کرنا۔
وہ تمہارا نہیں غیر کا طلبگار رہے۔ بلکہ خود تجھ سے کہتا ہوں کہ خدا نے قدرت کا کارخانہ یوں ہی بنایا ہے کہ میں تجھ پر مروں اور تو دوسروں پر
لہٰذا تو جن پر مرتا ہے وہ بھی تجھ سے بے وفائی کریں گے۔ اور تجھ کو اسی طرح آتشِ فراق میں جلنا ہو گا۔ جس طرح میں جلا کرتا ہوں +

تو مجھ کو چھوڑ کر ماسوا پر فریفتہ ہوا۔ دیکھیو ایک دن ماسوا تجھ کو چھوڑ کر ایک دوسرے ماسوا کا اسیر ہو گا۔ پھر تو ہو گا اور درد بھری
آہیں۔ وہ آہیں جن کا کچھ نتیجہ نہ نکلے گا۔ کیونکہ دوزخ کا عذاب ابدی اور غیر فانی ہے +

سوہنے دی یاد وِچ

"ہچکی"

تو کیوں آتی ہے؟ میرا سجنا تو یاد نہیں کرتا؟ میرے من موہن سُندر کے دل میں میرا خیال تو نہیں آیا +

پھر آئی۔ ہچکی نہ ستا۔ میرا سینہ ناتوان ہے۔ اس میں جگہ جگہ بھالنسیں چُبھی ہوئی ہیں۔ تو آتی ہے تو سینے میں کھٹک ہوتی ہے
اس کے زخم دُکھنے لگتے ہیں۔ سانس رُکا جاتا ہے۔ جب تو آتی ہے گردن کو جھٹکا دیتی ہے۔ اور ناف سے سر تک پٹھوں اور رگوں کو ہلا
ڈالتی ہے۔ میرا جی سانس سے گھبراتا ہے۔ اور پیا پیارے کی یاد میں بے قابو ہوا جاتا ہے +

ہائے میں نے کیسے کیسے درد بھرے خط بھجوائے۔ لکھنا نہ آتا تھا دوسروں سے لکھوائے۔ مگر اُس نے کاغذ کا ایک پُرزا نہ بھیجا
دو حرفوں میں بھی بخیلی کی۔ کس سے کہوں میری نہ کوئی سکھی ہے نہ سہیلی ہے۔ اپنا ہے نہ پرایا ہے۔ کاش مجھ پر کوئی لعن طعن ہی کرنے
والا ہوتا۔ اسی بہانے سے دل بہلتا اور اس کا ذکر سُننے میں آتا +

میں نے اُس کی خاطر رُسوائیاں برداشت کیں۔ دُنیا نے کچھ نہ کہا۔ لیکن اُس نے اتنا نہ پوچھا۔ کہ میں بھی کوئی ہوں۔ اب یہ ہچکی
آئی ہے کیا (سوہنے ڈا سینہا) پیام یار لائی ہے۔ اگر یہ اُس کا خط ہے تو کس سے پڑھواؤں۔ خیال کی ڈاک میں سانس کا ڈاکیہ لایا ہے

وہی پڑھے گا۔ مگر آہ اس خط میں کیا لکھا ہے۔ پڑھنے والوں کی آنکھوں میں آنسو بھرے آتے ہیں۔ ملّھ (پیارے) مجھے بتا تو کیوں روندا (روتا) ہے ؟

میرا ساجن تو اچھا ہے ؟

یہ ہچکی موت کی خبر لاتی ہے۔ اس کے نہ دیکھنے کا ارمان دل میں رہا جاتا ہے۔ دُنیا کا آسمان اب تک اونچا نظر آتا ہے۔ زمین اسی طرح بچھی ہوئی ہے۔ چولھے کی آگ ویسی ہی زبانیں نکال نکال کر جل رہی ہے۔ میرا دل اب تک تڑپ رہا ہے۔ گواہ رہو۔ میرا خاتمہ دل وجان کے نام پر ہوتا ہے۔ جس کا ہمیشہ کلمہ پڑھا۔ مجھے قبر کا کچھ ڈر نہیں۔ اس کی تاریکی کا اندیشہ کیا کروں۔ فرقت کی رات سے زیادہ اندھیری نہ ہوگی۔ اور میں نے ساری عمر انہیں راتوں میں بسر کی۔ میں منکر نکیر کا کیا خوف کروں۔ پیارے کا نام یاد ہے۔ اس کی گلی کا پتہ یاد ہے۔ وہی میرا دین ہے۔ وہی میرا ایمان ہے +

زندگی کا چراغ بجھتا ہے۔ رُوح کا پروانہ دوسری شمع کے گھر جاتا ہے۔ اب گھر سے بستروں کو لپیٹو۔ آیئنے توڑ دو۔ کسی کو بلاؤ۔ جو میرے غم میں گریبان چاک کرے +

آخری ہچکی آنے سے پہلے مجھے بیان کر لینے دو۔ کہ میرا صنیا دڑا ہرجائی ہے۔ کائنات کے ذرّہ ذرّہ میں اُس کی سمائی ہے نہیں آتا۔ تو ایک میرے پاس۔ اس واسطے اے دُنیا کے لوگو! تم اگر اس کوچے میں آؤ۔ اور اُس سے جی لگاؤ جس کو خدا کہتے ہیں تو ذرا سوچ سمجھکر ایسا کرنا +

از نظام المشائخ نومبر ۱۹۱۴ء

آنکھوں نے رونا چھوڑ دیا۔ دلوں نے آہیں کھینچنی ترک کر دیں۔ اب کہیں سے سسکیوں اور ہچکیوں کی آوازیں نہیں آتیں۔ اب کوئی عشقبازی کے کوچے میں قدم نہیں رکھتا +

آج وہ وقت ہے کہ زلف وکمر کا خیال بدترین گناہ مانا جاتا ہے۔ جناب حالی اس کے مفتی اعظم ہیں۔ خدا اُن کو سلامت رکھے اُنھوں نے لاانتہا شاگرد وہم خیال پیدا کر دیے ہیں۔ ایک جانب مولانا اشرف علی اصلاح خیال کے درپے ہیں۔ ایک طرف خواجہ غلام الثقلین اصلاح تمدن کا ترانہ گاتے ہیں۔ انہیں کے پڑوس میں اسوۂ حسنہ کی صدا بلند ہوئی ہے۔ نظام المشائخ بھی لمبی لمبی آیات واحادیث واقوال متانت لکھنے لگا۔ حسن نظامی تک اس گلی میں نہیں آتا +

اب اس زندگی کا کیا انجام ہوگا جس کی روح خدا ہے۔ جس کو شیکسپیر نے مجسّم خدا کہا۔ اور جس کی حقیقت سمجھنے سے وہ عاجز ہوگیا جس پر مولانا رومؒ کو حال آتا تھا۔ جس کو دیکھکر حافظ شیرازؒ کا دم دُنیا سے گھبراتا تھا +

اب پروانوں کی پرستش نہیں ہے۔ اب شمع کی یادگاریاں مٹ رہی ہیں۔ اب بلبل کی بدمستیاں خواب وخیال ہوئی جاتی ہیں۔ اب شاخ گل کا جھومنا کوئی نہیں دیکھتا۔ اب گل کی چشم سُرمگیں سے کسی کی آنکھیں نہیں لڑتیں +

اور کیونکر یہ چرچے باقی رہتے۔ ہر وجود روٹی اور عزّت کے دام میں گرفتار ہے۔ ہر ہستی کو بال بچوں کی پرورش کا آزار ہے۔

جناب حافظؒ کے مطرب و مے کو کون پوچھے۔ رازِ دہر کا معمّا نوالے کھانے والوں نے حکمت سے حل کر لیا ہے +

کباب کھانے والے گذر گئے۔ شراب پینے والے گذر گئے۔ سرمدتک راہی عدم ہوئے۔ جو سوکھی روٹی پانی میں بھگو کر اوقات بسری کر لیا کرتے تھے + جرمن کی سالہاسال کی تیاریاں بھی جنگ میں آئیں اور گذر رہی ہیں۔ یورپ کی نبرد آزمائیوں کے دلولے نکلے چلے جا رہے ہیں۔ توپوں کے گولے بندوقوں کی گولیاں۔ سنگینوں کی نوکیں سب اپنی زندگی کے دن آگے بڑھ بڑھ کر پورے کر رہے ہیں +

مگر محبت کو دُنیا میں رہنے کی ممانعت کی جاتی ہے۔ اُلفت کو اس دورِ حیات میں آنے سے روکا جاتا ہے۔ مولانا رومؒ نے خمارِ گندم کا الزام لگا کر ہر مجاز کو خوفناک بنا دیا۔ کیا حقیقت والے گندم نہیں کھاتے۔ کیا اُن کے جذبات میں گندم کے دانے آگ نہیں لگاتے +

مجاز اور حقیقت دو لفظ ہیں۔ جو ذہن انسانی کے برزخِ خیالی ہیں۔ ورنہ نہ حقیقت کی کچھ ہستی ہے نہ مجاز کی۔ سوزِ لفظی کا کچھ نتیجہ ہے۔ نہ ساز کا +

آؤ محبت کی ایک نئی دُنیا آباد کریں۔ آؤ! عشق کا ایک نیا آسمان و زمین بنائیں۔ آؤ! اب وقت آگیا ہے کہ ان پیٹ پیٹ پکارنے والوں اور دولت و عزت کے متوالوں کو بائیکاٹ کریں۔ یہ ہمکو جینے نہ دیں گے۔ ان کو کالج و اسکول بنانے دو۔ ان کو انجمن و کانفرنس میں غل مچانے دو۔ یہ اور ان کے سب حالی موالی یہاں رہیں۔ ہم وہاں اُٹھ چلیں گے۔ ہم ان کے ساتھ نہیں رہ سکتے۔ ہم کو ایک سانس ان کے ساتھ لینا دوبھر ہے +

انھوں نے بہت لکھنے والے بنائے ہیں۔ جو بھاپ کی مشینوں کی طرح انجان اور بے خبر رہ کر چلتے ہیں۔ انھوں نے بہت سے بولنے والے تیار کیئے ہیں جو گراموفون کے ریکارڈوں کی مثل گاتے بجاتے ہیں۔ اور عالمِ بیچارگی میں دوسرے کے ہاتھ سے البم میں بند کر کے رکھ دیئے جاتے ہیں۔ ہم بیمار ہوں تو ان کو بنفشہ گاؤزباں یاد آتی ہے۔ سرسام کا خطرہ ہو تو سر کے بالوں کو نظر لگاتے ہیں۔ سردی آئے تو لحاف۔ توشک سے جی بہلاتے ہیں۔ گرمی آئے تو برف و پنکھے کے سامنے سر جھکاتے ہیں +

یہ مقدموں میں وکیلوں کے محتاج ہیں۔ یہ چلنے میں جانوروں اور کوئلہ پانی کے محتاج ہیں۔ ان کو لباس کے لیئے بھیڑ کی اُترن اون درکار ہوتی ہے۔ اِن کا سہارا جھوٹ و مکر ہے۔ اِن کی پُشت پناہ دغا و جفاکاری ہے +

یہ خدا کو کیا جانیں۔ یہ اُس کی امانت محبت کی کیا قدر کریں۔ منہ سے شرکِ خفی و جلی پکارتے ہیں۔ آنکھوں۔ ہاتھوں اور خیال و ارادہ سے خود ہی اس کا ارتکاب کرتے ہیں۔ اب ہم ان میں ایکدم بھی نہیں گزار سکتے۔ اب ایک لمحہ بھی ان میں رہنا دشوار ہے چلو چلو کہ علحدگی میں بیڑا پار ہے +

اِس دُنیائے جدید کی کیا بات ہے۔ عید قرباں کی مستانی رات ہے۔ ہوٹل کا اکیلا کمرہ ہے۔ سامنے کمپنی باغ ہے۔ میز پر آئینہ کے سامنے لیمپ جل رہا ہے۔ پُرانی دُنیا کا کوئی پروانہ نہیں ہے۔ نورجہاں اسی منظر کے لیئے کہہ گئی تھی۔ ع

سے نے پر پروانہ سوزد نے صدائے بلبلے

ہوا آتی ہے۔ مگر عاشق مزاج مچھروں سے گستاخی نہیں کر سکتی۔ مچھر آتے ہیں۔ گاتے ہیں۔ حال میں لاتے ہیں۔ آغوش کھلا ہوا ہے نہ تو غیری نہ من غیرم کی صدا ہے۔ اِدھر مچھر۔ اُدھر مچھر۔ نیچے مچھر۔ اوپر مچھر۔ دائیں مچھر۔ بائیں مچھر۔ ہر طرف مچھر۔ ہر سمت مچھر۔ خیال میں بھی وہی۔ عالمِ مثال میں بھی وہی +

آ میرے پیارے مچھر۔ میری آنکھوں پر۔ میرے رُخسار پر۔ میرے ہونٹوں پر۔ میری ٹھوڑی پر۔ تو اس نئی دُنیا میں عشق کا پروانہ ہے

تو شاخِ شجرِ محبت کا بلبلِ مستانہ ہے۔ آفاق ہا گردیدہ ام۔ بسیار خوباں دیدہ ام۔ لیکن تو چیزے دیگری +

میں شکل صورت کا پابند نہیں ہوں۔ میں سیرت کے حسن و قبح کو بھی دیکھنا خلافِ آزادی سمجھتا ہوں۔ جو دل کو بھا جائے جو تنہائی میں انیس و ہمدم بن جائے۔ جو سب کو چھوڑ کر میرا ہو جائے جو ہوائے دہر کے مخالفانہ جھونکوں کے باوجود میرے پہلو سے جدا نہ ہو۔ وہی میرا ہے۔ اُسی کا میں ہوں۔ باقی سب ہیچ +

اس نئی دُنیا کے قوانین کچھ بھی ہوں۔ لیکن محبت اور اُس کے رسول محمدؐ سے یہ آباد ہے۔ سُن لو۔ محبت کے پیام رساں نے کیا فرمایا +

جو تیری دوستی کو دوسروں کی دوستی پر۔ تیری بات کو دوسروں کی باتوں پر۔ تیری محبت کو دوسروں کی محبت پر ترجیح دے وہی تیرا دوست ہے۔ گویا اُن کے خلاف دوستی نہیں ہے۔ میرے دلدار محمدؐ کو دیکھ لو۔ سب اوصاف محمدؐ میں ہیں۔ میری بات سُننے آیا ہے۔ میری دوستی میں وطن سے ہجرت کی ہے۔ میری محبت کو تمام کائنات کی ہم نشینی سے مقدم جانا ہو۔ بس یہی میرا جاناں ہے۔ بس یہی میرا جاناں ہے +

میں محبت کے پیامبر کے قربان۔ کیا بات سُنائی ہے۔ کیا دل کی بیکلی مٹائی ہے۔ ساری رات آنکھوں میں گزری آنکھیں لال ہوگئیں۔ خمار کے ناسوت سے لاہوت تک پہونچیں۔ اندھیری رات نہ تھی۔ چاندنی نے لپک چمک کر بجلیاں گرائیں۔ گملوں کے سبز پودے شریر فتنے بنے۔ تشنۂ انتظار کو کسی کی آمد کی آہٹ کا سراب دکھایا۔ ہر لحظہ کلیجہ منہ کو آیا۔ آخر جنابِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس مخلوق بشر کی تسلی کا یہ تخیل پر ور سامان بھجوایا +

وہ میری ہر اُلجھن کے سلجھانے والے۔ وہ میری ہر دُشواری کو آسان کرتے ہیں۔ وہ شفیع اکبر ہیں۔ میری شفاعت کو دوسروں کے لیئے سُنتے ہیں۔ تو کیا خود میری نہ سُنتے +

نہیں اس نئی دُنیا میں مجھ کو صرف محبت کا شکریہ ادا کرنا چاہیئے۔ یہ پیمبر بھی اُسی کے ہیں۔ اُسی کے اشاروں سے کام کرتے ہیں۔ تو بتاؤ میں کیونکر آج کی تسکین کا شکرانہ بھیجوں۔ میں پُرانی دُنیا میں اُن کو خدا کہتا تھا۔ اللہ کہتا تھا۔ رحمٰن کہتا تھا۔ رحیم کہتا تھا۔ یہاں ان کو صفر

محبت کے ہم صفاتی

سے یاد کرتے ہیں۔ وہاں اُن کے ادب کی کچھ رسمیں تھیں۔ یہاں کے رواج سے میں واقف نہیں ہوں۔ تو اُنہیں کو سامنے کیوں نہیں بلا لیا جاتا۔ یہاں بھی پردہ قایم رہا تو بڑی مشکل ہوگی۔ انہی سے پوچھیں۔ انہی سے معلوم کریں کہ آپ کی مہربانیوں کی حمد و ثنا کیونکر ہوتی ہے۔ اور آپ کی دلنوازی کی داد کس طرح دی جاتی ہے +

حکم ہو تو آنسوؤں کے سمندر قدموں پر نثار کریں۔ ارشاد ہو تو ایک نعرۂ مجنونانہ بلند کرکے دُنیائے جدید کو آپ کے الطاف کی خبر دیں۔ کچھ تو بولو۔ ہم بھی تو موسیٰ سے ہمکلام ہونے والے کی آواز سُنیں۔ ہم کو بھی تو معلوم ہو کہ اُمتِ مرحومہ کے یہ درجے اور مراتب ہیں۔ آپ کے لحاظ و سکوت سے دم لبوں پر آگیا۔ ہم اور تو کچھ نہیں چاہتے۔ فقط آپ کی تعریف کا طریقہ دریافت کرتے ہیں +

ہاں یہ۔ آہ یہ۔ ربنا انت۔ مولانا انت۔ ہکذا۔ مثل ہذا۔ ارے تو۔ اُفوہ آپ۔ این قدر حضرت شما۔ نئی دُنیا کے دیوانو آئو دیکھو نقاب اُٹھ گئی۔ پہلے میرے جدید محرم راز مچھروں کو بلاؤ۔ جو راتوں کو ان کی یاد میں بلبلایا کرتے تھے۔ اور درد کے افسانے سُریلی صداؤں میں سُنایا کرتے تھے +

دیکھیں۔ وہ یہ ہیں۔ قربانی کے جانوروں کو پکارنا۔ جن کی خاطر آج کے دن انھوں نے سر کٹائے ہیں۔ دیکھو کھُلم کھُلا میرے گھر میں آئے ہیں۔ تم نے جان کھوئی اور یہ جان لینے سے کانوں پر ہاتھ رکھتے ہیں۔ کیا بیچارے انجان ہیں۔ دوسروں کی گردن پر چھُریاں پھر گئیں۔ اور آپ بے خبر بنے کھڑے ہیں۔ یہ تمہارے ہی کھلونے تھے۔ تم ہی پر صدقے ہوگئے۔ آؤ ذرا آنکھوں میں تو آؤ۔ ذرا کلیجہ کو تو ٹھنڈا کرو۔ منم عید و تو معبود۔ یا موجود۔ یا موجود ٭

تیسری منزل

سرِّ دلبراں در حدیثِ دیگراں

آنسو کی سرگزشت

از رسالۂ زمانہ ۱۹۰۲ء

جس دل میں درد نہیں اُس کو انسان کے سینے میں نہ رہنا چاہیئے۔ آنسو نشانِ درد ہے۔ اور مجھ کو اس کی سرگزشت بہت بھاتی ہے۔ زمانہ کی خاطر اس کو قلمبند کر دیا گیا۔ تاکہ سب دردآشنا دل دیدہ کا لطف اُٹھائیں۔

بچارا آنسو اُس گھر میں پیدا ہوا جہاں خوشی کی چہل پہل۔ اور شادی کی خوب گھما گھمی تھی۔ چاروں طرف سے مبارک سلامت کی آوازیں آرہی تھیں۔ مگر جس ننھے سے دل میں اس کا ڈیرا تھا اُس کو شکمِ مادر کی یاد نے گھیر رکھا تھا۔ آنکھیں بار بار اس وطنِ تاریک کو ڈھونڈتی تھیں۔ اور مایوس ہو کر رہ جاتی تھیں۔ آخر دل نازک کو تاب نہ رہی۔ اس میں درد کا ایک دھواں اُٹھا۔ اور آنسوؤں کو زبردستی آنکھوں تک کھینچ لایا۔ یہ کشمکش مدتوں آنسو کو درپیش رہی۔ اس کے بعد ایسا ہوا کہ بھرے پُرے گھر میں بربادی شروع ہوئی۔ پہلے باپ مرا اور پھر ماں بھی رخصت ہو گئی۔ ایک جوان لڑکی اور چھوٹا سا لڑکا زندہ بچا۔ باقی سب کا خاتمہ ہو گیا۔ لڑکی ہوشیار تھی۔ بار بار بیکسی و لاچاری کا خیال آتا اور غمزدہ دل پر ایک ٹھیس سی لگتی۔ آنسو اُمنڈ اُمنڈ کر آتے حسین و غمگین آنکھوں میں تیرنے لگتے۔ مگر یہ دُکھیاری ان کو زبردستی پی جاتی تاکہ معصوم بھائی نہ دیکھ لے۔ اور اُس کے شکستہ دل کو صدمہ نہ پہونچے۔

کچھ دن تو یوں ہی گزرے۔ اس کے بعد لڑکی کی شادی ہو گئی۔ لڑکی پڑھی لکھی تھی بتعلیمیافتہ خاوند کو بہت عزیز ہوئی۔ اور دونوں میں اخلاص و محبت کا رشتہ مضبوط قایم ہو گیا۔ یہ صورت دیکھکر آنسو خلوت میں سدھارے اور ان کی سرگزشت کا سلسلہ ملتوی ہو گیا یکایک زمانہ نے اپنی نیرنگی کا ورق اُلٹا اور پیاری کا پیارا ساجن طاعونی شکار ہو گیا۔ شوہر کیا مرا۔ یہ خود مر گئی۔ ہندو دھرم اور راجپوتی شرم کے پیام آنے لگے۔ کہ زندگی ختم ہوئی۔ اب اس آباد دُنیا میں تیرا کچھ حصّہ نہیں۔ اپنا جیت چتا کی سُلگتی آگ میں لگا دے ہی تیرے دُکھ کا خاتمہ کرے گی۔ چندرما کی سہانی چاندنی کو مت دیکھ اور برکھا رُت کی مستانہ ہوا سے اپنے دامن بچا۔ اور یقین کر کہ خوشی کے دن تیرے ساجن کے ساتھ چل گئے۔ بپتا کی ماری لڑکی۔ دم بخود چُپکی سُن رہی تھی۔ کہ دل میں ایک سناٹا سا آیا۔ درد کی ہلکی ہلکی چمک ہونے لگی۔ اور برسوں کے رُکے ہوئے آنسو اُبل پڑے۔ یہ آنسو نرالی شان کے تھے۔ اندرونی سوزش نے ان کی رنگت نکھار دی تھی۔ سیاہ پلکوں سے ڈھلک کر زرد رخساروں پر بہنا اور چمکنا ستم ڈھا رہا تھا۔ اب آنسوؤں کا دور دورہ تھا اور انہیں کا عمل دخل۔ اندھیری رات میں بیچاری جوان بیوہ کا کوئی ساتھ نہ دیتا۔

غریب اکیلی بڑی سسکیاں لیا کرتی تھی۔ مگر اُس کے اصلی رفیق آنسو اس سے ایک لحظہ کو بھی جدا نہ ہوتے تھے +

ایک دفعہ ہولی کے موسم میں ارمان بھری بیوہ اپنے رنگیلے پیتم کو یاد کرکے آنسو بہا رہی تھی۔ اور اُس کی سہاگن ہمجولیاں رنگ اُچھالتی کلیلیں کرتی پھرتی تھیں اور اُس کی حالت زار پر کسی کو بھی رحم نہ آتا تھا۔ یہ بے ترسی دیکھکر اسے خیال آیا کہ مہاتما بُدھ نے سچ فرمایا ہے کہ کُل سنسار خود غرض اور دُکھ کی پوٹ ہے۔ اس کی فانی خوبی پر نہ ریجھنا۔ اپنی ہستی کے مطالعہ میں دل لگانا۔ اصلی سُکھ اور انند ہے۔ یہ خیال آتے ہی بدنصیب لڑکی نے جی میں ٹھان لی کہ اب اُس جوتی سروپ سے دل لگانا چاہیئے جس نے ان نیرنگیوں کو ظاہر کیا ہو۔ یہ سوچکر ایک رات گھر سے نکل گئی اور گنجان جنگل میں آسن جماکر جا بیٹھی +

لیکن جوں جوں حجابات دور ہوتے جاتے تھے۔ دل میں میٹھا میٹھا درد ہوتا تھا اور آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکلے پڑتے تھے +

اس لڑکی کا بیان ہے کہ جو لطف اس درد اور اس گریہ میں آتا ہے۔ وہ دُنیا کی سب خوشیوں سے افضل ہے۔ یہی آنسو ہیں جن پر اس کی دلچسپ زندگی کا انجام ہوا +

از رسالۂ زبان سنہ ۱۹۱۰ء

اب ہر ملک میں چراغ اور شمع کے بدلے لمپ کا رواج بڑھتا جاتا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ انسان تاریکی دور کرنے کا کوئی ذریعہ نہ جانتا تھا۔ رات کے اندھیرے میں سب کام آسانی سے پورے کر لیے جاتے تھے۔ ہندوستان کی نسبت سُنا ہے کہ جب کسی رشی کو رات کے وقت کوئی تحریر پڑھنی ہوتی تو جنگل کی گھاس وغیرہ جلا کر پڑھتا تھا۔ یہی حال عرب کا تھا۔ وہاں بھی چراغ کا دستور نہ تھا۔ وہ لوگ بھی خاص ضرورت کے وقت لکڑیاں روشن کرکے کام نکال لیتے تھے۔ اس کے بعد انسان تمدّن میں آگے بڑھا اور مٹی کا چراغ بنایا۔ سیکڑوں برس خاکی چراغ نے خاکی انسان کے گھر کو روشن رکھا۔ اور اس کی روشنی میں بڑی بڑی ضخیم کتابیں لکھی گئیں۔ جب نفاست بڑھی تو مومی اور کافوری شمع بنائی گئی اور اُس کے لیئے مختلف وضع کے فانوس تیار ہوئے۔ تاکہ ہوا اور پروانوں کی آفت سے محفوظ رہے +

فانوس عموماً شمعوں کے لیئے بنائے جاتے تھے۔ چراغ کے واسطے بہت کم چیزیں تھیں جو بیچارے کو ہوا کے جھونکوں سے بچا سکتیں۔ ترقی کے زمانہ میں مٹی کے بدلے تانبے اور پیتل کے چراغ بنائے گئے مندروں مسجدوں اور خانقاہوں میں ان برنجی چراغوں کا بہت رواج ہوگیا۔ چنانچہ آج تک باوجود اعلےٰ ترقی کے مذہبی مقامات میں یہی پیتل اور تانبہ کے چراغ پائے جاتے ہیں۔ یورپ جس کو نئی روشنی کا اُستاد بیان کیا جاتا ہے۔ چراغچی کے فن میں بڑا کمال پیدا کیا ہے۔ اُس نے اوّل ٹین کی ڈبیاں روشن کیں۔ اُس کے بعد کانچ کی چمنیاں ڈھالیں اور لمپ تیار کیئے۔ کانچ کی چمنیاں ایک طرح کے فانوس ہیں جو روشنی کو بیرونی آفتوں سے محفوظ رکھتے ہیں +

انسان ذرا آسمان کی طرف نظر اُٹھا کر دیکھے۔ اُس کو پُرانے زمانے کے وہ چراغ چاند سورج نظر آئیں گے۔ جو اپنی قدیمی حالت پر جوں کے توں قایم ہیں۔ زمین پر مٹی کے چراغ سے لیکر برنجی چراغ۔ شمع کافوری۔ شمع مومی۔ مٹی کے تیل کا لمپ۔ گیس کا لمپ۔ یہاں تک کہ بجلی کا لمپ بن گیا۔ مگر آسمان پر وہی پُرانا قاعدہ جاری ہے۔ کیا مجال جو ذرا تغیّر و تبدّل ہو +

مگر زمین کی ترقی نے جو روشنی کے معاملے میں ہوئی۔ بجائے اِس کے کہ انسان کو فائدہ پہنچاتی اُلٹا نقصان پہونچایا۔ آج کل آدمی اس نئی روشنی کی

بدولت طرح طرح کے عذابوں میں مبتلا ہے - اوّل تو خرچ کی زیادتی - پہلے تھوڑے خرچ میں بہت سا کام نکل جاتا تھا - اب کروڑوں روپیہ نمائشی اور فضول روشنی میں برباد ہوتا ہے - غریب ہندوستان بھی امیر یوروپ ن دیکھا دیکھی ان فضولیات میں مبتلا ہوگیا + اور اپنی محنت کی کمائی یورپ کے لیمپوں کی نذر میں مُفت گنوا رہا ہے +

مسلمانوں کے مشہور پیشوا - اور حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دوسرے خلیفہ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نسبت مشہور ہے کہ جب وہ رات کے وقت ملک کا کام کرتے کرتے اپنے کسی کام کو باہر جاتے تو چراغ گُل کر دیا کرتے تھے اور فرماتے کہ میں نہیں چاہتا قوم اور مُلک کا تھوڑا سا تیل بھی بیکار جائے - اس واسطے چراغ گُل کر دیتا ہوں کہ فضول روشن نہ رہے +

بخلاف اس کے آج کل پبلک کے روپیہ کی جیسی قدر کی جاتی ہے - ظاہر ہے - میونسپل کمیٹیوں کی طرف سے شہروں میں روشنی کا انتظام کیا جاتا ہے - مگر اس میں ذرا سی ہمدردی بھی روا نہیں رکھی جاتی +

لمپ ایک ڈبیہ کا نام ہے - خواہ لوہے کی ہو یا کانچ کی اس میں تیل بھر دیتے ہیں اور بتی بیچ میں اٹکا دیتے ہیں - پھر اس پر کانچ کی چمنی لگا دی جاتی ہے - یہ روشنی کا حجاب ہے - اس کے اندر **بی بتی** - نئی روشنی کا تاج سر پر رکھکر ملک ظلمات فتح کرکے حکومت کرتی ہیں +

پروانے بیچارے اس روشن تاج کے دیوانے ہیں - دوڑ دوڑ کر جاتے ہیں اور کانچ کے سفید پردے سے ٹکرا کے گر پڑتے ہیں - پچھلے زمانے میں شمع کے رُخ پر جو حجاب لٹکایا جاتا تھا - وہ دور سے اور نزدیک سے پردہ ہی معلوم ہوتا تھا - مگر آج کل چونکہ دُنیا ہی دھوکے کی ہے یہ پردہ بھی دھوکے کی ٹٹی ثابت ہوتا ہے - ننھے سے پرندے کو روشنی بے حساب نظر آتی ہے - لیکن جب قریب جاتا ہے تو غریب مایوس ہو کر گر پڑتا ہے اور منزل تک نہیں پہونچ سکتا +

گورنمنٹ کی مہربانی ہے کہ اُس نے رعیت سے ہتھیار لے لیئے تاکہ لوگ خودکشی سے محفوظ رہیں +

اسی طرح ان دیوانے عاشق مزاج پرندوں کی حفاظت جان بھی سرکار کو منظور تھی اس لیئے سفید کانچ کے پہرہ دار کھڑے کر دیئے ہیں - اب ان طالبان مرگ کی آرزو کسی طرح پوری نہیں ہو سکتی - مگر کیا تعجب ہے کہ پروانے بھی انسانوں کی طرح دوری و حجاب کی کوئی نئی صورت نکالیں اور لقا و فنا کی منزلیں آسان ہو جائیں +

از رسالۂ زبان سنہ ۱۹۰۸ء

خاکساران جہاں را بحقارت منگر + تو چہ دانی کہ دریں گرد سوارے باشد

اللہ میاں نے اس دُنیا میں کوئی چیز ایسی نہیں پیدا کی جو بیکار ہو یا حقیر و ذلیل سمجھی جا سکے - چار عنصر آگ - ہوا - پانی - خاک میں سب سے زیادہ بے حقیقت خاک ہے جو تمام مخلوقات کے پاؤں میں روندی جاتی ہے - پانی کے زور کے ساتھ بہہ جاتی ہے - ہوا کے جھونکے سے اُڑ جاتی ہے - اور آگ کی تمازت سے جلا کرتی ہے مگر اُف نہیں کرتی - دیکھنے میں اسکی بیچارگی اور ذلت پر ترس آتا ہے - لیکن خود اس سے سوال کیا جائے تو خدا کا لاکھ لاکھ شکر کرے گی کہ میری شان سب سے بڑی اور نرالی بنائی - ہر چیز کا خمیر میرے وجود سے تیار کیا - خاصکر انسان جو اشرف المخلوقات ہے مجھ سے پیدا ہوتا ہے اور مجھی میں فنا ہو جاتا ہے +

اس ناچیز خاک کی تہہ میں وہ نایاب خزانے قدرت کے دبے ہوئے ہیں - جن کو کام میں لا کر انسان آدمی کہلاتا ہے - ورنہ جانوروں کی طرح

زندگی بسر کرتا۔ خیر اور بڑی چیزیں تو اپنی جگہ ہیں۔ مٹی کے بعض ٹکڑوں کی تہ میں ایک قسم کا چکنا بدبودار پانی ہوتا ہے۔ جس کو لوگ مٹی کا تیل کہتے ہیں۔ مقابلہ کر کے دیکھو تو چنبیلی کا تیل۔ موتیا کا تیل اپنی خوشبو کے سبب اس بدبودار تیل سے لاکھ درجے بہتر ہے۔ بڑے بڑے خوبصورت اور نازک دماغ لوگ چنبیلی وغیرہ کے تیل کو سر چڑھائے رکھتے ہیں۔ اور جہاں مٹی کا تیل آیا اور ناک ڈھکی۔ مگر ضرورت کے لحاظ سے یہ گندا سڑا پانی تمام تیلوں سے بڑھ چڑھ کر ہے۔ آج کل تمام دنیا میں اسی کے دم سے اُجالا ہے۔ اگرچہ گیس اور بجلی کی روشنی نے اب مٹی کے تیل کو بھی مات کرنا شروع کر دیا ہے۔ تاہم اس کا عالمگیر اثر ابھی تک باقی ہے۔ متوسط درجہ اور ادنےٰ درجہ کے آدمی جو دنیا میں زیادہ تعداد رکھتے ہیں۔ مٹی کے تیل کے سوا اور کچھ نہیں جلا سکتے۔ یہی تیل اپنی روشنی میں لڑکوں کو سبق یاد کراتا ہے۔ جوانوں کو حسن افروزی کے جلوے دکھاتا ہے اور بوڑھوں کو ٹھوکر دلانے سے بچاتا ہے۔ اسی کی روشنی میں نمازی نمازیں پڑھتے۔ پوجاری پوجا کرتے۔ وعظ اور کتھا کے جلسے ہوتے ہیں۔ یہی وہ تیل ہے کہ چور کو چوری میں مدد دیتا ہے اور پولیس کو چور پکڑنے میں لالٹین دکھاتا ہے۔ غم کی راتیں۔ جدائی کی راتیں جب مونس و غمگسار پاس نہ ہو تو مٹی کا تیل جل جلکر اپنا وجود فنا کر دیتا ہے۔ اور انسان کا شریک غم بنکر باعث تسلی ہوتا ہے +

امریکا کا "راک فیلر" اسی خاک کے نیچے رہنے والے تیل کی بدولت لاانتہا دولت کا مالک ہے۔ یہی تیل دوسرے ملک کے ہاتھ میں رہنے کے سبب ہندوستان کی دولت غیروں کو بانٹ رہا ہے۔ یہی تیل دنیا کی تمام کلوں میں کام آتا ہے۔ یہی وہ چیز ہے جس کے بل پر دنیا کی مشہور سواری موٹر کار زمین پر دوڑتی پھرتی ہے +

اے خاک نشین تیل! ہم کو تیری یہ ادا بھاتی ہے۔ کہ جہاں آگ قریب آئی اور تو مشتعل ہوا۔ خدا کی قدرت ہے کہ تجھ میں یہ صلاحیت ہے کہ تو آن کی آن میں شعلۂ راز بنکر مقبول ہو جاتا ہے۔ اور انسان کی یہ قسمت کہ برسوں ٹکریں مارتا ہے۔ پہاڑوں۔ دریاؤں میں حیران سرگرداں پھرتا ہے۔ مگر وہ تجلی نصیب نہیں ہوتی جو وجود خاکی کو جلا کر فنا کر دے +

تو اتنا بےغرض و بےتعلق کیوں ہے؟ تیری روشنی میں شراب خواری ہو۔ زناکاری ہو یا عبادت الٰہی۔ تجھے روشنی دینے سے کام۔ کیا تو محتسبی نہیں کر سکتا جو لوگوں کو گناہ سے بچائے۔ یا کم سے کم اُن کو گناہ کرنے میں مدد نہ دے۔ کیا تجھ میں اتنی طاقت نہیں کہ خدا کے نافرمان انسان کو اپنے آتشی طمانچے سے خبردار کر دے۔ بیشک تجھ میں سب طاقتیں خدا نے رکھی ہیں۔ مگر تو انہی طاقتوں کو کام میں لاتا ہے جس سے کسی کو تکلیف یا کسی کی دل آزاری نہ ہو۔ البتہ انسان اپنی نیک قوتوں کو بھول جاتا۔ اور بری طاقتوں کو کام میں لا کر خود تکلیف اُٹھاتا اور دوسروں کو تکلیف دیتا ہے۔ اگر وہ تیری صلح کل پالیسی پر عمل کرے تو دنیا میں ایسا ہی امن قایم ہو جائے۔ جس طرح لمپ کی روشنی میں سب لوگ خوشی و خرمی سے زندگی بسر کرتے ہیں +

عشقیہ آتشبازی

پھلجھڑی + انار + مہتابی

یہ شب برات آتشبازی کے دن آگ جلائے گی، ہستیاں ستائے گی۔ فنا کے پھول بہار دکھائیں گے۔ بچے پھلجھڑیوں کے لئے ضد کرتے ہیں۔ اُن دلوائی جاتی ہیں۔ آؤ ہم بھی نادان بنکر نار کے نورانی کھلونے مانگیں اور جی بہلائیں +

پھلجھڑی کیونکر بنتی ہے۔ کاہے سے بنتی ہے؟ یہ سب کو معلوم ہے؟ گندھک ہوتی ہے، تاکہ آگ قبول کرے، شورہ ڈالا جاتا ہے تاکہ تیزی

اور شورش پیدا ہو +
کوئلے جن کی ایک ہستی آگ پہلے بگاڑ چکی ہے پھلجھڑی کا جزوِ اعظم ہیں - اور یہ پھول لوہے کے بُرادے سے بنتے ہیں - اور اس لیئے اس کی آمیزش بھی ضروری سمجھی جاتی ہے +

بس یہ پھلجھڑی کی کائنات ہے - جس پر کاغذ کا خول چڑھا کر بازاروں میں پھولجھڑی کے نام سے بیچا کرتے ہیں - ہم ایسی پھولجھڑی چاہتے ہیں - جس میں گندھک نہ ہو تو اس جیسا آگ قبول کرنے والا مادہ ضرور ہو - نمکین شورہ نہ ملے تو کوئی اور چیز شوریدگی و اضطراب پیدا کرنے والی ملا دی جائے ' سوختہ کوئلہ دستیاب نہ ہو تو کوئی دوسری جلی بھنی چیز شامل کرلیں - اور ہاں وہ چون ' ذرات آہن - جن پر پھولوں کی ہستی کا مدار ہے - ڈھونڈھنا ضروری ہے + تو کیا پھول ایسی سخت دھات کے ذروں سے بنتے ہیں نہیں نہیں خاک کے ذرّے بھی چمک دمک دکھانے میں کم نہیں - وہی ڈال دینا +

آہا ہا - عشق کی دیاسلائی انسانی پھلجھڑی میں لگا دی - آنکھوں کی راہ پھلجھڑی کے اندر کا مسالہ جل جلکر نکل رہا ہو - آنسوؤں کے پھول جھڑ رہے ہیں - کوئی دم کا یہ تماشہ ہے - پھلجھڑی جل چکے گی - اس کا خول راکھ ہو کر گر پڑے گا - آہا ہا کا غل و شور خود بخود بند ہو جائے گا - اور جلی ہوئی راکھ اندھیرے میں زمین پر گر کر پامال ہونے لگیگی +

نہیں جناب ہم ایسی پھلجھڑی نہیں چاہتے - جس کے جلنے کے بعد اندھیرا ہو جائے - جس کا تماشہ تھوڑی دیر کا ہو جس کی بہار عارضی نظر آئے - ہماری ضد پوری کرنی ہے - ہمارا دل رکھنا ہے تو ایسی پھلجھڑی منگا کر دو جو ایک دفعہ سلگنے کے بعد کبھی نہ بجھے جس کے پھولوں کا مینہ ہمیشہ برستا رہے جس کی بہار کبھی ختم نہ ہو - دیکھو ہم کو منگا دو +

پھولجھڑی نہیں تو کوئی اور آگ کا کھلونا دلا دو - کہتے ہیں ' یہ دن آگ بازی کے ہیں - آج کی رات اللہ میاں پہلے آسمان پر آئیں گے - اچھا تو ہم اُن سے کہیں گے کہ ہم آپ کے بندے ہیں - سب کو آگ کے کھلونے مل گئے - ہم کو بھی دلوائیے دل کے انار میں بارود بھری ہوئی ہے - مگر ایسی آگ نہیں ملتی جس سے یہ انار چھوٹ جائے - آپ ہی کوئی چنگاری دیدیجیئے تاکہ انارِ قلب کی چند لمحہ بہار دیکھ لیں - مہتابی بھی خوب ہوتی ہے - روشن اور منوّر - ظلمت کو کافور کرنے والی - آسمانی ماہتاب کی مانند چاندنی - مگر اس میں بھی وہی عیب ہے جلکر خاموش ہو جاتی ہے - مہتابی وہ اچھی جو ہمیشہ چمکتی رہے ہر وقت نور افشانی کرے ظلمت کو فتح کر کے کبھی مفتوح نہ ہو - بھلا وہ گورا کس کام کا جو کالے کو فتح کر کے پھر اُس کا مفتوح ہو جائے - ہمارا نسخہ بن گیا تو دکھا دیں گے کہ جس وقت مہتابی روشن ہوئی تو پھر کبھی نہ بجھے گی - یہاں بھی نور وہاں بھی نور - اِدھر بھی نور - اُدھر بھی نور - جہاں سُنو یہی آواز آئے گی - اللہ نور السمٰوٰت والارض - خیر اگر اب کی شبِ برات میں یہ عاشقانہ آتشبازی میسّر نہ آئی تو آیندہ کی اُمید رکھنی چاہیئے +

از رسالہ زبان ۱۹۰۹ء

آپ کون - ناچیز تنکہ - اسم شریف؟ دیاسلائی کہتے ہیں - دولت خانہ؟ جناب دولت نہ خانہ - اصلی گھر جنگل ویرانہ تھا - مگر چند روز سے "احمد آباد" میں بستی بسائی ہے - اور سچ پوچھیئے تو یہ ننھا سا کاغذی ہوٹل جس کو آپ بکس کہتے ہیں اور جو آپ کی

اُنگلیوں میں دبا ہوا ہے۔ میرا موجودہ ٹھکانا ہے +

یہ "احمد آباد" ناروے۔ یا سویڈن کے پاس کوئی نیا مقام ہے؟ کیونکہ آپ کی بستیاں تو اُنھیں علاقوں میں سُنی جاتی ہیں +

نہیں جناب احمد آباد ہندوستان میں ہے۔ آپ دیکھتے نہیں میری رنگت کالی ہے۔ یہ اسی ملک کی نشانی ہے۔ ورنہ ناروی سویڈن کی دیا سلائی گوری چٹّی ہوتی ہے۔ مجھ غریب کو اُس سے کیا نسبت؟

آہا تو آپ ہمارے مُلک کی دیا سلائی ہیں۔ تب تو گو آپ کا رنگ سانولا ہے مگر ہماری نگاہ میں سب دیا سلائیوں کی رانی ہو

ذرا مہربانی کر کے مجھ کو "رانی" نہ فرمائیے؛ "بیگم" کہیئے۔ میں نے مسلمانوں کے گھر میں جنم لیا ہے۔

بہت اچھا میاں تنکے ناراض نہ ہو۔ اللہ اکبر تم کو بھی یہ دن لگے۔ کہ "رانی" اور "بیگم" میں تمیز کرتے ہو۔ کے آدمی کے پیر شُدی" وہ وقت بھول گئے کہ زنجیروں میں باندھ کر مشین کے آرے کے نیچے رکھے جاتے تھے۔ اگر آآن کی آن میں تمہارے ٹکڑے کر ڈالتا تھا۔ اس کے بعد جیسی گت بنتی تھی۔ وہ خود خیال کر کے گریبان میں مُنہ ڈال سکتے ہو۔ تمہارے تراشیدہ کندوں کا کھولاتی گرم چشمے میں ڈالا جانا۔ اور اُس کھولتے ہوئے پانی میں تمہارا تلملانا۔ کبھی سطح آب پر آنا۔ کبھی پھر تہ میں جا پڑنا۔ یہاں تک کہ اُسی دار و گیر اور پیچ و تاب میں تمہاری کھال تک اُتر جاتی تھی۔ اُس وقت کچھ دیر کے لیئے باہر نکال کر تم کو دم دیا جاتا تھا۔ اس کے بعد پھر مشین میں کس دیا جاتا تھا۔ اور مشین چھیل چھیل کے تمہارے لمبے لمبے پرت بنا دیتی تھی اور پھر وہ پرت دوسری کل میں ڈال کر کترے جاتے تھے۔ اس طرح اس حرکت میں تم جیسی ہزاروں ہستیاں عالم وجود میں آجاتی تھیں۔ زرد گندھک اور سُرخ مصالحہ کا لباس بھی کچھ عزت سے نہیں پہنایا جاتا تھا۔ بلکہ سرنگوں کر کے گرم گرم گندھک اور مصالح میں تمہاری ناک ڈبو دی جاتی تھی اس پہ یہ مزاج! کہ بیگم کہلانے کی آرزو۔ کھیچی کی ڈبیا میں رہتے رہتے یہ دماغ ہو گیا ابھی کوئی شخص بکس کی کالی مٹی سے مُنڈ یا رگڑ کر پھینک دے گا پھر جو آئے گا پاؤں میں مسلتا آئے گا +

حضرت! آپ کو تو غصہ آگیا۔ خفگی کی کیا بات ہے۔ جو چیز جہاں ہو اُسی سے منسوب ہوتی ہے۔ میں مسلمانوں کی خانہ زاد ہوں۔ اگر "رانی" کے مقابلے میں "بیگم" کے لفظ کو پسند کروں تو کیا گناہ ہے۔ یہ سب نام کی بحث ہے۔ کام دیکھنا چاہیئے۔ سو جیسا مسلمانوں کا کام کرتی ہوں بے کم و کاست ہندوؤں کا بھی بجا لاتی ہوں۔ یہاں تک کہ میرے مشرب میں دیسی بدیسی گورے کالے کا فرق بھی جائز نہیں۔ مندر میں میرے دم سے روشنی ہے اور مسجد میں بھی۔ راجہ اور نواب کے محل کی تاریکی بھی دور کرتی ہوں۔ اور ایک غریب کے جھونپڑے میں بھی میرے سبب اُجالا ہوتا ہے۔ رہی یہ بات کہ بے حقیقت ہوں اور بے بسی کے عالم میں انسانی کلوں سے عرصہ تک بے کل رہی ہوں تو یہ کچھ مجھی پر منحصر نہیں۔ آپ پر بھی یہ بپتا پڑ چکی ہے۔ بلکہ آپ کی مجھ سے زیادہ دُرگت ہوئی ہے۔ کیا یاد نہیں کہ پریم کی آری نے شجر راز سے کاٹا۔ اور نو مہینے شکم مادر کے چشمہ میں آپ بھی جوشش کھاتے رہے۔ اور پھر برسوں پرت در پرت کے چکّر میں گردش رہی۔ میرے "رانی" اور "بیگم" کے لفظ سے اتنے چونکے۔ ذرا اپنی ہٹ دھرمی کو دیکھیئے کہ فقط نام اور لفظ کے فرق سے آپ کے کاموں میں بھی فرق پڑ جاتا ہے۔ جو کالا کرتا ہے وہ گورا کرنا نہیں چاہتا۔ جو مسلمان کو پسند ہے۔ اُس سے ہندو کو نفرت ہے اور غریب و کمزور ہونا تو گویا دائرۂ آدمیت سے خارج ہو جانا ہے۔ اس کو دُنیا میں رہنے اور انسان کہلانے کا کوئی حق باقی نہیں رہتا ہے +

بس۔ بس۔ خاموش رہو بی فتنی۔ ہو تو اتنی ذرا سی۔ مگر زبان بارہ ہاتھ کی ہے۔ لگیں حد سے گزرنے۔ تم کیا جانو کہ آدم زاد

کی کیا عالی شان ہے ✦

مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہوئی ہو تو قرآن میں سُنا ہوگا کہ خدا نے آدمی کو زمین میں اپنا خلیفہ بنایا ہے۔ اور تمام اسرار کا علم اُس کو بخشا ہے۔ بس یہ جو کچھ کرتا ہے۔ عین منشائے الٰہی کے مطابق کرتا ہے۔ کیونکہ سب کاموں کی حقیقت اس کو معلوم ہے۔ اوہو! آپ کو یہ غرہ بھی ہے۔ بے شک آپ خلیفۂ خدا ہیں۔ مگر سب چیزوں کی حقیقت آپ کو معلوم نہیں۔ قرآن میں تو یہ آیا ہے کہ "آدمی کو سب چیزوں کے نام بتائے گئے ہیں"۔ یہ کہاں ہے کہ اصلیت بھی بتا دی ہے؟ اگر اصلیت اور حقیقت معلوم ہے تو بتاؤ "بجلی کیا چیز ہے" وہ تو غلاموں کی طرح آپ کی خدمت کرتی ہے۔ اور اُس کی تابعداری پر آپ کو گھمنڈ بھی بہت بڑا ہے۔ مگر آج تک آپ کو یہ خبر نہیں۔ کہ یہ کیا چیز ہے اور چند حرکتوں سے کیونکر ظاہر ہو جاتی ہے۔

خیر بجلی تو بڑی چیز ہے۔ تنکے کے اسرار سے بھی آپ ناواقف ہیں کہ ذراسی رگڑ میں یہ نورانی شعلہ کہاں سے آجاتا ہے محض غلط ارشاد ہے کہ آپ کے سب کام عین مرضیٔ الٰہی کے مطابق ہوتے ہیں۔ خدا کی ہوا عام ہے۔ پانی اور روشنی عام ہے۔ جنگل اور دریا عام ہیں۔ مگر آپ کی ذاتِ شریف اِن سب چیزوں کو اپنے لیے مخصوص کر لینا چاہتی ہے۔ آپ کی خواہش ہوتی ہے کہ روٹی۔ پانی ہوا۔ سب میرے قبضے میں ہوں جس کو چاہوں دوں اور جس کو چاہوں محروم کر دوں ایک آدمی کروڑوں روپئے خزانوں میں بند رکھتا ہے اور لاکھوں آدمی بھوک سے مرجاتے ہیں۔ مگر وہ خود غرض کچھ پروا نہیں کرتا۔ اپنی ہوس اور طمع کے جوش میں نام اور نشان کے شوق میں لاکھوں ہم جنسوں کو فنا کر ڈالتا ہے تو کیا خدائی خلافت کا ان ہی اعمال سے دعویٰ کیا جاتا ہے۔ اور کیا یہ باتیں منشائے پروردگار کے موافق ہیں۔ حضرت آپ ہزاروں لاکھوں سجدے کرتے ہیں مگر آپ کا سرکش وجود ویسا کا ویسا ہی باقی موجود رہتا ہے۔ مجھ کو دیکھیے کہ "ایک ہی سجدے میں مقبول ہو جاتی ہوں۔ اور تجلّی اس چھوٹی سی شکل کو جلا کر خاک کر دیتی ہے ✦

خدا تمہاری طرّار زبان کو چلتا رکھے۔ میں ہارا تم جیتیں۔ اچھا تو لاؤ اندھیرا زیادہ ہو گیا۔ میرے کلبۂ تاریک کو تجلّیِ راز سے روشن کر دو ✦

از رسالۂ صوفی سنہ ۱۹۰۹ء

لوگ کہتے ہیں زندگی وہ اچھی جس میں کسی بات کا کھٹکا نہ ہو۔ بلکہ ایسی زندگی کو بہشت سے تشبیہ دی جاتی ہے کیونکہ بہشت میں فکر و تردد کا کھٹکا نہ ہوگا۔ مثل ہے۔

بہشت آنجا کہ آزارے نباشد
کسے را با کسے کارے نباشد

ہر شخص کا اپنے کام میں مست و سرشار ہونا اور کسی سے کچھ علاقہ نہ رکھنا بہشتی زندگی ہے۔ مگر اس جہان کو اختلاف سے زیبائش ہے۔ ایسے آدمی بھی اس دُنیا کے پردہ پر رہتے ہیں جو بے کھٹکہ رہنا عیش سمجھتے ہیں اور ایسا

گروہ بھی موجود ہے جو

کھٹکہ اور گزران

کا شیدائی ہے۔ اُس کو جینا مرنا۔ چلنا پھرنا ہنسنا بولنا۔ کھانا پینا۔ الغرض کوئی بات ہو کھٹکے کے بغیر بے مزہ اور پھیکی معلوم ہوتی ہو اور انصاف یہ ہے کہ کھٹکہ پسند جماعت حق بجانب ہو۔ کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ دین و دُنیا کا کارخانہ کھٹکہ پر چل رہا ہے۔ موجودات۔ محسوسات ذرا اور آگے بڑھکر حیوانات وغیرہ کی تمام نوعیں کھٹکہ سے ظاہر ہوئیں۔ کھٹکہ سے قایم رہتیں اور کھٹکہ ہی سے فنا ہو جاتی ہیں۔ حیوانات میں انسان کو دیکھئے۔ کھٹکہ اس پر بھی محیط ہے۔ ہر سانس میں کھٹکہ کا سلسلہ موجود ہے ✤

کھٹکے کی خارجی مثالیں

کسی بڑے تارگھر میں چلے جائیے۔ ہزاروں کھٹکے سُنائی دیں گے۔ انسانی اُنگلیاں حرکت کر رہی ہوں گی اور کھٹکے کی گونج اُٹھ رہی ہوگی۔ آواز سب کی ایک۔ اُنگلیوں کی حرکت بھی یکساں۔ لیکن کاغذی نقوش کو ملاحظہ کیجئے۔ یہاں آکر یہ کھٹکہ رنگ برنگ کی صورتیں اختیار کر لیتا ہے۔ کہیں لکھا ہے "زید کو لاکھ روپیہ کا فائدہ ہوا"۔ کسی میں درج ہے "عمرو ہلاک ہوگیا"۔ الغرض ایک کھٹکہ کے مختلف ظہور اور نتیجے کاغذ پر ہویدا ہوتے ہیں۔ جن لوگوں کو اس

برقی کھٹکے کا عرفان

ہے وہ تو صرف آواز سُنکر نیک و بد کا فرق محسوس کر لیتے ہیں۔ مگر ناواقف حیران ہوتے ہیں اور بعض اوقات شک و شبہ کرتے ہیں کہ ایک ہی کھٹکے سے مختلف خبریں کیونکر بن گئیں۔ جو کھٹ کھٹ خوشی کے تار میں سُنائی دی تھی وہی غم کی اطلاع میں سُنی گئی۔ اتنا بیّن فرق کس طرح ہوگیا۔ حقیقت آشنا تار بابو ان نادان لوگوں کے شک و شبہ کی کچھ پروا نہیں کرتے۔ اور اپنے کام سے کام رکھتے ہیں ✤

اسی تار کے کھٹکے میں وحدت و کثرت کا سبق موجود ہے جس میں آج کل کے بعض کم فہم انسان اُلجھ رہے ہیں اور کہتے ہیں کہ واحد کثرت میں ظاہر ہو کر واحد کیونکر رہ سکتا ہے۔ حالانکہ وہ اگر ذرا سا غور کریں تو معلوم ہو جائے کہ دہلی سے کلکتہ تک دو سَو (۲۰۰) تارگھر ہیں۔ ایک بابو دہلی میں بیٹھکر کلکتے کو تار دیتا ہے۔ بس جس وقت اُس کی اُنگلی حرکت کر کے ایک کھٹکہ پیدا کرتی ہے۔ کلکتے تک ہر تارگھر میں وہ کھٹکہ پیدا ہو جاتا ہے۔ وہی کھٹکہ دہلی میں۔ وہی کلکتہ میں۔ اور وہی درمیانی تارگھروں میں۔ کسی کھٹکہ میں ذرّہ بھر کمی بیشی نہیں ہوتی ✤

نتیجہ یہ ہوا کہ ایک کھٹکے سے دو سو کھٹکے پیدا ہوگئے۔ مگر حقیقت میں وجود ایک ہی ہے۔ احمق سے احمق آدمی بھی جس کو تار کے معاملہ سے تھوڑی سی آگاہی ہے نہیں کہہ سکتا کہ کھٹکا تقسیم ہوگیا۔ اور اس کی وحدت میں کچھ فرق آگیا۔ پھر ذات واحد کے کثرتی ظہور سے اُس کی وحدت میں کیا نقصان ہو سکتا ہے ✤

گھڑی کا کھٹکہ

یہ سامنے والی دیوار کے سہارے دم لینے والی گھڑی بھی دیکھی۔ سانس کا کھٹکہ چل رہا ہے اور سوئی کی گردش وقت کاٹ رہی ہے۔ ہر کھٹکا فنر کی پیچیدہ طاقت کا ایک حصہ کم کر دیتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک دن یہی ننا مُنّا کھٹکہ گھڑی کی سب طاقت ختم کر کے اس کو خاموش کر دے گا +

رات کے اندھیرے میں جب کوئی مونس و غمخوار پاس نہ ہو کھٹکے دار گھڑی کو پاس رکھ لیجیئے۔ دیکھیئے یہ کھٹکا کیا لطف دیتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ گھڑی کی زندگی بھی کھٹکے سے معلوم ہوتی ہے۔ اور موت کا باعث بھی یہی کھٹکا ہوتا ہے۔ انسان کو گھڑی سے تشبیہ دی جائے تو مشابہت بہت ہی ٹھیک اور موزوں ہوگی۔ گھڑی کی بناوٹ اور کل پرزے سب انسانی اعضا کی ساخت سے نکلے ہیں۔ پھر بھلا نقل تو کھٹکے سے جیئے۔ کھٹکے سے مرے۔ اور اس کے کھٹکے سے لوگوں کو فائدہ پہونچے۔ اور اصل یعنی انسان کھٹکے سے محروم سمجھا جائے۔ اور بے کھٹکے زندگی کو بہشتی کہا جائے یہ کہاں کی عقلمندی ہے +

گراموفون کا کھٹکا

غیبی آواز سے خود بخود بولنے والا باجہ گراموفون جو نئے زمانے کی لاثانی اور عجیب ایجاد تصوّر کیا جاتا ہے۔ نوکدار کھٹکے سے بولتا ہے۔ ایک سوئی کی نوک ریکارڈ کی چکر لگانے والی تختی پر کھٹکے دار ضربیں لگاتی ہے اور مومی پیکر کی مخفی آواز کو عیاں کر دیتی ہے پھر دیکھیئے کہ کیا کیا عجیب و غریب صدائیں نکلتی ہیں۔ آج کل کے خوش باش انسان گراموفون کے بغیر زندگی بسر نہیں کر سکتے مگر اُن میں کسی کو اُس کھٹکے پر توجہ نہیں ہوتی جس کے طفیل باجے کا کاروبار چلتا ہے۔ حالانکہ ہر بار سوئی انسان خود ہی بدلتا ہے۔ اگر وہ ادھر توجہ کرے تو اپنے وجود کے کھٹکے کا حال بھی ایک دن معلوم کر لے +

انسانی کھٹکا

اِن خارجی مثالوں کے بعد خود انسان کے اندرونی کھٹکے کو دیکھنا چاہیئے کہ یہ نادان بے کھٹکے زندگی پر مرا جاتا ہے حالانکہ زندگی بغیر کھٹکے کے بالکل نکمی اور بیکار ہے۔ آدمی کے تمام دینی و دنیاوی افعال کسی سبب سے ہوتے ہیں۔ نوکری کرتا ہے تاکہ اپنا اور اپنے بال بچوں کا پیٹ پالے۔ اِسی طرح دُنیا کے سب دھندے کسی سبب کے ماتحت ہیں۔ تو یہ سبب اُس شخص کے لیئے ایک کھٹکا ہے۔ لہٰذا ہر تو یہ کھٹکا اُس کو ناگوار معلوم ہوتا ہے۔ مگر حقیقت میں یہ کھٹکا نہ ہو تو جاہل آدمزاد ہاتھ پر ہاتھ رکھکر بیٹھ جائے۔ اور کچھ کام نہ کرے +

دینی اُمور کا بھی یہی حال ہے۔ دوزخ کے خوف۔ بہشت کے لالچ۔ خدا کی رضامندی کی طمع۔ غرض اس کے اعمال کی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہوتی ہے۔ یہی اس کے لیئے کھٹکا ہے۔ جس کے بغیر یہ سب اعمال جن سے انسان کی روحانی زندگی وابستہ ہے چل نہیں سکتی +

کھٹکے کے باطنی اسرار

جو اسرار کھٹکے کے وجود میں پائے جاتے ہیں اُن تک رسائی ممکن ہے مگر اُن کا بیان کرنا بہت دُشوار ہے۔ کیونکہ ان کا تعلّق

زیادہ تر کیفیت اور حال سے ہے۔ جو قال اور الفاظ میں نہیں سما سکتی۔ اس لیئے ہم باطنی کھٹکے کا صرف ایک حصّہ بیان کرنے پر اکتفا کرتے ہیں +

زندگی کا مُسلسل لُطف

آدمی جگہ جگہ تلاش کرتا پھرتا ہے۔ اور اپنے اندر کی طلسماتی زنجیر کو حاصل نہیں کرتا۔ جس میں اس کو ساری دُنیا کی مزیدار کیفیتیں حاصل ہو سکتی ہیں۔ ہر سانس جو جسم کے اندر جاتا اور باہر آتا ہے اگر اُس کی قدر کی جائے تو لازوال نعمت ہے۔ بشرطیکہ اس میں لوچ دار کھٹکا بھی پیدا ہو جائے +

جوگی حبس دم وغیرہ طریقوں سے اس سانس کو اپنے قابو کا بنا لیتے ہیں اور پھر ساری خلقت سے بے پروا ہو کر جنگل میں منگل کرتے ہیں۔ اور انند کے تار بجایا کرتے ہیں۔ مسلمان درویش باوجود فقر و فاقہ کے مست و سرشار رہتے ہیں محض اُس سانس کی بدولت جس میں ذکر الٰہی لہرایا کرتا ہے اور اُن کو ہر وقت مسرور رکھتا ہے +

پوچھا جائے گا کہ کس طریق سے سانس میں لوچ پیدا ہوتا ہے۔ اور کیونکر یہ مزیدار کھٹکا حاصل ہو سکتا ہے؟ مگر یہ سوال بھی ایسا ہی ہے، جیسے باطنی کھٹکے سے بے خبری۔ اخباروں کے مضمون میں یہ باتیں لکھنی دُشوار ہیں۔ مختصر یہ ہے کہ ذکر جہر اور ذکرِ خفی جس کو پاس انفاس بھی کہتے ہیں سانس میں پُر لطف کھٹکا پیدا کر دیتا ہے اور پھر انسان مسلسل لطف کی زندگی میں داخل ہو جاتا ہے +

جس وقت یہ کھٹکا انسان کے دم سے وابستہ ہو جاتا ہے۔ پھر زندگی بے کھٹکے گُزرنے لگتی ہے جس کی اکثر لوگوں کو خواہش ہے۔

خُدائی گراموفون

از رسالہ صوفی ۱۹۰۹ء

مسٹر ایڈیسن کو دعوےٰ ہے کہ اُس نے گراموفون ایجاد کر کے ثابت کر دیا کہ انسان سب کچھ کر سکتا ہے۔ بیجان کا بولنا ایک زمانے میں معجزہ۔ اور دوسرے عہد میں کرامت شمار ہوتا تھا۔ آج ایڈیسن معجزہ و کرامت کا انکار کر کے یہ عجیب چیز پیش کرتا ہے اور کہتا ہے کہ "یہ محض عقل انسانی کا ظہور ہے۔ کسی غیبی طاقت کو اس میں دخل نہیں"۔

ہم ایڈیسن سے دریافت کرتے ہیں کہ عقل انسان کہاں سے آئی؟ جس نے یہ کرشمہ ظاہر کیا۔ اس کا دارومدار بھی ایک پُر اسرار طاقت پر ہے۔ پس کہہ سکتے ہیں کہ جس کرشمے کا نام ایک وقت میں معجزہ۔ دوسرے میں کرامت تھا۔ آج کل کے زمانہ میں اُس کا نام ظہور عقل یا سائنس کا تماشا ہے۔ تینوں ناموں کے باطنی معانی میں کچھ فرق نہیں۔

اصل میں خود انسان حضرت ایزد کا گراموفون باجہ ہے۔ جب اُس سراپا عقل و سائنس خدا کو منظور ہوا کہ آواز ہُو اپنے کان سے سُننے۔ اُس نے خاکی ریکارڈ بنائے۔ اور اُن میں نفخت فیہ من روحی کی صدا بھر دی اور پھر اُس کو ایڈیسن کے مومی ریکارڈ

کی طرح ایک گردش میں مبتلا کر دیا +

بعض ریکارڈ ہیں جن میں سنسکرت زبان سے روح الٰہی ظاہر ہوتی ہے۔ اور وید کے نام سے مشہور ہوئی ہے۔ بعض ہیں جو عبرانی و عربی کے ذریعہ سے انجیل و توریت و قرآن کہلاتے ہیں۔ غرض۔ خیر و شر۔ خشک و تر۔ مہذب و غیر مہذب۔ سب کچھ ان ریکارڈوں میں موجود ہے۔ خود میاں ایڈیسن بھی خدائی باجے کے ایک ریکارڈ ہیں۔ ذرا غور کریں تو اُن کو بھید مل جائے +

از رسالۂ صوفی سنہ ۱۹۱۰ء
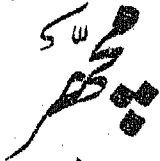
یہ بھنبھناتا ہوا۔ ننّھا سا پرندہ آپ کو بہت ستاتا ہے۔ رات کی نیند حرام کر دی ہے۔ ہند و مسلمان عیسائی۔ یہودی سب بالاتفاق اِس سے ناراض ہیں۔ ہر روز اس کے مقابلے کے لیئے مہمیں تیّار ہوتی ہیں۔ جنگ کے نقشے بنائے جاتے ہیں۔ مگر مچھّروں کے جنرل کے سامنے کسی کی نہیں چلتی۔ شکست پر شکست ہوئی چلی جاتی ہے +

اتنے بڑے ڈیل ڈول کا انسان ذرا سے بھُنگے پر قابو نہیں پا سکتا۔ طرح طرح کے مصالحے بھی بناتا ہے کہ ان کی بُو سے مچھّر بھاگ جائیں۔ لیکن مچھّر اپنی یورش سے باز نہیں آتے + آتے ہیں۔ اور نعرے لگاتے ہوئے آتے ہیں۔ بیچارا آدم زاد حیران رہ جاتا ہے +

امیر۔ غریب۔ ادنیٰ اعلیٰ۔ بچّے۔ بوڑھے۔ عورت۔ مرد کوئی اس کے وار سے محفوظ نہیں۔ یہاں تک کہ آدمی کے پاس رہنے والے جانوروں کو بھی اس کے ہاتھ سے ایذا ہے۔ مچھّر جانتا ہے کہ دشمن کے دوست بھی دشمن ہوتے ہیں۔ ان جانوروں نے میرے دشمن کی اطاعت کی ہے تو میں ان کو بھی مزا چکھاؤں گا +

آدمیوں نے مچھّروں کے خلاف ایجیٹیشن کرنے میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی۔ ہر شخص اپنی سمجھ اور عقل کے موافق مچھّروں پر الزام رکھکر لوگوں میں اُن کے خلاف جوش پیدا کرنا چاہتا ہے۔ مگر مچھّر اس کی کچھ پروا نہیں کرتا +

طاعون نے گڑبڑ مچائی تو انسان نے کہا کہ طاعون مچھّر اور پسّو کے ذریعہ سے پھیلتا ہے۔ ان کو فنا کر دیا جائے۔ تو یہ ہولناک بلا دور ہو جائے گی۔ ملیریا پھیلا تو اس کا الزام بھی مچھّر پر عاید ہوا۔ اس سرے سے اُس سرے تک کالے گورے آدمی غل مچانے لگے کہ مچھروں کو مٹا دو۔ مچھّروں کو کچل ڈالو۔ مچھروں کو تہس نہس کر دو۔ اور ایسی تدبیریں نکالیں جن سے مچھر کی نسل ہی منقطع ہو جائے +

مچھّر بھی یہ سب باتیں دیکھ رہا تھا۔ اور سُن رہا تھا۔ اور رات کو ڈاکٹر صاحب کی میز پر رکھے ہوئے "پائنیر" کو آکر دیکھتا اور اپنی بُرائی کے حروف پر بیٹھکر اُس خون کی ننھّی ننھّی بوندیں ڈال جاتا جو انسان کے جسم سے یا خود ڈاکٹر صاحب کے جسم سے چوس کر لایا تھا۔ گویا اپنے قاعدہ کی تحریر سے انسان کی ان تحریروں پر شوخیانہ ریمارک لکھ جاتا۔ کہ میاں تم میرا کچھ بھی نہیں کر سکتے

انسان کہتا ہے کہ مچھر بڑا کم ذات ہے۔ کوڑے۔ کرکٹ۔ میل کچیل سے پیدا ہوتا اور گندی موریوں میں زندگی بسر کرتا ہے اور بُزدلی تو دیکھو۔ اُس وقت حملہ کرتا ہے جب کہ ہم سو جاتے ہیں۔ سوتے پر وار کرنا۔ بے خبر کے چرکہ لگانا۔ مردانگی نہیں۔ انتہا درجے

کی کمینگی ہے۔ صورت تو دیکھو۔ کالا بھتنا۔ لمبے لمبے پاؤں۔ بے ڈول چہرہ۔ اس شان وشوکت کا وجود اور آدمی جیسے گورے چٹے۔ خوش وضع پیاری ادا کی دشمنی۔ بےعقلی اور جہالت اسی کو کہتے ہیں +

مچھر کی سنو تو وہ آدمی کو کھری کھری سناتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ جناب ہمت ہے تو مقابلہ کیجیئے۔ ذات صفات نہ دیکھیئے۔ میں کالا سہی۔ بدرونق سہی۔ ہیچ ذات اور کمینہ سہی۔ مگر یہ تو کہیئے کہ کس دلیری سے آپ کا مقابلہ کرتا ہوں اور کیونکر آپ کا ناک میں دم کرتا ہوں +

یہ الزام سراسر غلط ہے کہ بےخبری میں آتا ہوں اور سوتے میں ستاتا ہوں۔ یہ تو تم اپنی عادت کے موافق سراسر ناانصافی کرتے ہو۔ حضرت میں تو کان میں آکر "الٹی میٹم" دیدیتا ہوں۔ کہ ہوشیار ہو جاؤ۔ اب حملہ ہوتا ہے۔ تم ہی غافل رہو تو میرا کیا قصور۔ زمانہ خود فیصلہ کر دے گا۔ کہ میدان جنگ میں کالا بھتنا۔ لمبے لمبے پاؤں والا۔ بیڈول فتحیاب ہوتا ہے یا گورا چٹا آن بان والا +

میرے کارناموں کی شاید تم کو خبر نہیں کہ میں نے اس پردۂ دنیا پر کیا کیا جوہر دکھائے ہیں۔ اپنے بھائی نمرود کا قصہ بھول گئے۔ جو خدائی کا دعوی کرتا تھا۔ اور اپنے سامنے کسی کی حقیقت نہ سمجھتا تھا۔ کس نے اس کا غرور توڑا۔ کون اس پر غالب آیا۔ کس کے سبب اس کی خدائی خاک میں ملی۔ اگر آپ نہ جانتے ہوں تو اپنے ہی کسی بھائی سے دریافت کیجیئے۔ یا مجھ سے سنیئے کہ میرے ہی ایک بھائی مچھر نے اس سرکشی کا خاتمہ کیا تھا +

اور تم تو ناحق بگڑتے ہو اور خواہ مخواہ اپنا دشمن تصور کیے لیتے ہو۔ میں تمہارا مخالف نہیں ہوں۔ اگر تم کو یقین نہ آئے تو اپنے کسی شب بیدار صوفی بھائی سے دریافت کر لو۔ دیکھو وہ میری شان میں کیا کہے گا۔ کل ایک شاہ صاحب عالم ذوق میں اپنے ایک مرید سے فرما رہے تھے کہ میں مچھر کی زندگی کو دل سے پسند کرتا ہوں۔ دن بھر بیچارہ خلوت خانہ میں رہتا ہے۔ رات کو جو خدا کی یاد کا وقت ہے باہر نکلتا ہے۔ اور پھر تمام شب تسبیح وتقدیس کے ترانے گایا کرتا ہے آدمی غفلت میں پڑے سوتے ہیں۔ تو اس کو ان پر غصہ آتا ہے۔ چاہتا ہے کہ یہ بھی بیدار ہو کر اپنے مالک کے دلیے ہو کر اس سہانے خاموش وقت کی قدر کرے۔ اور حمد وشکر کے گیت گائے۔ اس لئے پہلے ان کے کان میں جا کر کہتا ہے۔ اٹھو میاں اٹھو۔ جاگو۔ جاگنے کا وقت ہے۔ سونے کا اور ہمیشہ سونے کا وقت ابھی نہیں آیا۔ جب آئے گا تو بےفکر ہو کر سونا۔ اب تو ہوشیار رہنے اور کچھ کام کرنے کا موقع ہے۔ مگر انسان اس سریلی نصیحت کی پروا نہیں کرتا۔ اور سوتا رہتا ہے تو مجبور ہو کر غیظ وغضب میں اس کے چہرہ اور ہاتھ پاؤں پر ڈنک مارتا ہے۔ پر واہ رے انسان۔ آنکھیں بند کیے ہوئے ہاتھ پاؤں مارتا ہے۔ اور بےہوشی میں بدن کو کھجا کر پھر سو جاتا ہے۔ اور جب دن کو بیدار ہوتا ہے تو بیچارے مچھر کو صلواتیں سناتا ہے۔ کہ رات بھر سونے نہیں دیا۔ کوئی اس دروغ گو سے پوچھے۔ کہ جناب عالی! کے سکنڈ جاگے تھے جو ساری رات جاگتے رہنے کا شکوہ ہو رہا ہے +

شاہ صاحب کی زبان سے یہ عارفانہ کلمات سنکر میرے دل کو بھی تسلی ہوئی کہ غنیمت ہے ان آدمیوں میں بھی انصاف والے موجود ہیں۔ بلکہ میں دل ہی دل میں شرمایا کہ کبھی کبھی ایسا ہو جاتا ہے کہ یہ شاہ صاحب مصلے پر بیٹھے وظیفہ پڑھا کرتے ہیں اور میں ان کے پیروں کا خون پیا کرتا ہوں۔ یہ تو میری نسبت ایسی اچھی اور نیک رائے دیں اور میں ان کو تکلیف دوں۔ اگرچہ دل نے یہ سمجھایا کہ تو کاٹتا تھوڑی ہے۔ قدم چومتا ہے۔ اور ان بزرگوں کے قدم چومنے ہی کے قابل ہوتے ہیں

لیکن اصل یہ ہو کہ اس سے میری ندامت دور نہیں۔ اور اب تک میرے دل میں اس کا افسوس باقی ہے +

سو اگر سب انسان ایسا طریقہ اختیار کر لیں جیسا کہ صوفی صاحب نے کہا تو یقین ہے کہ ہماری قوم انسان کو ستانے سے خود بخود باز آجائے گی۔ ورنہ یاد رہے کہ میرا نام مچھر ہے۔ لطف سے نہ جینے دوں گا۔ اور بتا دوں گا کہ کمین اور نیچ ذات اعلیٰ درجہ والوں کو پریشان اور بے چین کر سکتی ہے +

لا

از رسالہ نظام المشائخ جنوری ۱۹۱۱ء

انگریزی زبان میں اس سر بلند لفظ کے معنی قانون اور ضابطہ کے ہیں۔ عرب والے انکار اور نفی کے وقت اس کا استعمال کرتے ہیں۔ اہل اُردو تحکمانہ طلب کے موقع پر لا بولتے ہیں۔ مگر لام الف کے دو حرفی لفظ کی اصلی شان پر بہت کم لوگوں کو توجہ ہوتی ہے۔ لہٰذا ضرورت ہے کہ آج دو چار ساعت اس کی حقیقت پر غور کریں +

اوّل تو ذرا اس لفظ کی ظاہری صورت پر نظر ڈالیئے۔ کیسا مغرور اور متکبر وجود ہے۔ شاعرانہ مدح سرائی کرنی ہو تو سرو بالا قد کہکر جی خوش کر لیجئے۔ مگر حضرت لا میں سرو کی سی لچک کہاں۔ سرو گو خود سر درخت ہے تاہم ہوا کے جھونکوں سے اُس کے ننھے ننھے پتے جنبش میں آجایا کرتے ہیں۔ برخلاف لا کے کہ یہ کسی ہوا سے نہیں ملتا۔ اور مضبوطی سے بے حس و حرکت قدم جمائے کھڑا رہتا ہے۔ لا نہیں جانتا کہ اُس کے پیروں میں کون پڑا ہے۔ وہ ہمیشہ اپنا سر نخوت سے اونچا رکھتا ہے +

انگریزی زبان میں جس کام کے لیئے یہ مستعمل ہے اس کی ضد اور ہٹ کو کون نہیں جانتا۔ سارا زمانہ ایک مُنہ ہو کر چیخے چلّائے۔ مگر میاں لا کے حکم کے سامنے کسی کی نہیں چلتی۔ جو لوگ جناب لا کے حقایق و معارف سے آگاہ ہونا چاہتے ہیں وہ اوّل تو برسوں اسکول و کالج کی خانقاہ میں راتوں کو جاگ جاگ کر لا کے ذکر اذکار میں مشغول رہتے ہیں۔ اس کے بعد لندن کی سب سے بڑی خانقاہ میں جاکر وہاں کے حلقۂ ذکر میں تین سال گزارتے ہیں جب کہیں ان کو خرقۂ لا کا عرفان حاصل ہوتا ہے۔ یہ خرقہ اور سندِ خلافت لیکر اپنے ملک میں آتے ہیں اور آبادی سے الگ ایک خلوت خانہ لیکر رہتے ہیں +

اس کے بعد کیا ہوتا ہے یہ نہ پوچھیئے۔ ورنہ مسٹر لا کا نیا تازیانہ سامنے آجائے گا۔ اگر آپ اس کوڑے سے نہیں ڈرتے اور آزادانہ تحقیقات چاہتے ہیں تو سُن لیجیئے کہ خرقہ پوشانِ لا اپنے خلوت خانوں میں ہزاروں مکر و فریب کی کمندیں بچھاتے ہیں اور انجان بھولی بھالی چڑیوں کو جال میں پھانستے ہیں۔ لا کی قینچی سے جیبیں کترتے ہیں۔ لا کے اُسترے سے سر مونڈتے ہیں۔ اور ممکن ہوتا ہے تو لا کے پستول کی گولی سے بے زبان جانور کو شہید کر ڈالتے ہیں +

لا کے سیاہ خرقہ والے بزرگ کے کمالات اور کرامتیں اسقدر زبردست اور مستند ہیں کہ کوئی دہریہ اور ملحد ان کے انکار کی مجال نہیں رکھتا۔ سب مانتے ہیں کہ لا کے تصرفات باطنی بالکل سچے اور یقینی ہیں۔ لا دن کو رات اور رات کو دن بنا سکتا ہے۔ لا ظالم کو مظلوم اور مظلوم کو ظالم ثابت کر سکتا ہے۔ لا کے ایک ادنیٰ اشارۂ چشم میں بیگناہ پھانسی پر چڑھ جاتے ہیں اور لا ہی اگر چاہے تو اصلی مجرم کو دار سے اُتروا لے عرب کا "لا" صور اسرافیل ہے۔ انگریزی لا کی اس کے سامنے کچھ حقیقت نہیں۔ ایک ہی ضرب میں لا، انگلش کو نیست و نابود کر سکتا ہے انگریزی لا کی بساط ہی کیا ہے۔ جو عربی لا کے سامنے آسکے۔ عربی لا تو وہ بلا ہے جو خداؤں پر چوٹ کرتا ہے اور ہمیشہ کامیاب رہتا ہے کس خدا کی طاقت ہے جو لائے عرب کے مقابلہ میں ٹھہر سکے۔ خداوند لات خداوند منات خداوند عزیٰ تینوں ایک دفعہ مکہ حجاز کے میدان

ہیں اس بہادر لا کے سامنے آ گئے تھے۔ اور چاہتے تھے کہ اپنی خدائی کو اس کانٹے سے صاف کر دیں۔ مگر جونہی لا نے اپنی گرج دار آواز نکالی تینوں خدا سر کے بل اوندھے زمین پر گر پڑے +

کہتے ہیں عربی کے اس لا میں یہ طاقت غیبی خزانے سے آ گئی ہے۔ اور یہ وہ خزانہ ہے جو کنج وحدت میں مخفی ہے۔ اس خزانے میں لازوال اور بے شمار دولت ہے۔ جو الف کی تھیلیوں میں رہتی ہے۔ جب اس کنز مخفی کو لام مفرد میں زور پیدا کرنا منظور ہوا تو اس نے اپنے خزانہ کا ایک الف اس کے آخر میں لگا دیا۔ یہ اسی الف کی قوت ہے جس کے بل پر لائے عرب دُنیا کا بے مثل شہ زور مانا جاتا ہے۔ لائے عرب کو کنز مخفی کا حکم ہے کہ ہر وجود کو نابود کر دے۔ چنانچہ جب یہ حکم بجا لاتا ہے تو صلہ خوشنودی میں اس لا کو دوسرا الف عطا ہوتا ہے جو لا کی اوّل میں چسپاں کر دیا جاتا ہے۔ اور یہ لا سے اِلّا بن جاتا ہے۔ اور جونہی اِلّا بنا اس کے سامنے سے تمام حجابات اُٹھ جاتے ہیں۔ اور کنز مخفی اس کو اپنے ذاتی ظہور کے لفظ اللہ میں وصلت کا شرف عطا فرماتا ہے۔ اور لوگ اِلّا اللہ کے نعروں سے اس کی تشہیر کرتے ہیں +

آپ نے سُنا یہ ہے عرب کے لا کا فسانہ۔ عرب کے کلمہ گو اور دُنیا کے وہ سب آدمی جو اُن کی ہمنوائی پر ایمان رکھتے ہیں۔ اس لا کا ورد یوں کرتے ہیں۔ لا الٰہ الا اللہ۔ گویا ہر شخص لا کی ضرب سے سب خداؤں کی نفی کر کے ایک خدا کا وجود قایم کرتا ہے۔ اور فنا کے بعد بقا کا تماشا دیکھتا ہے +

اُردو کا نا سوائے تحکمانہ طلب کی شان کے اور کوئی شان نہیں رکھتا۔ اس کا ذکر کرنا فضول ہے۔ بس ان میاں کی تو اتنی ہستی ہے کہ ذرا کڑک کے بولے کہ ہم کو بھی لا کی بحث میں لا لے آئے۔ مگر لانے کا کچھ نتیجہ نہ نکلا۔ خیر الامور اوسطہا۔ درمیانی لا خوب تھا۔ یہ ہم کو بہت پسند آیا۔ اب خدا کرے۔ جس دن ہم سب کے جسم سے جان نکلے تو لا الٰہ الا اللہ سانس کے جھولے میں جھول رہا ہو۔ کبھی جھونٹا لیکر زبان پر آئے اور کبھی دل میں جائے اور چاروں طرف وحدت کے ترانوں کا شور ہو۔ آمین۔

از رسالہ صوفی اگست ۱۹۱۱ء

دیکھنے میں بھنبھناتا ہوا ذرا سا پرندہ ہے۔ بلکہ پرندہ کا لفظ بھی اس ننھی سی ہستی پر زیبا نہیں۔ یوں سمجھیے کہ ایک ناچیز و غلیظ و مکروہ بھنگا ہے مگر نظر تحقیق سے دیکھو تو عرفان قدرت کا بڑا اسرار نوشتہ ہے +

مکھیوں کی کئی قسمیں ہیں۔ ایک قسم شہد کی مکھیوں کی ہے۔ دوسری قسم وہ مکھیاں ہیں جو انسان کے ساتھ بود و باش رکھتی ہیں۔ تیسری قسم کی مکھیاں قبروں۔ قتل گاہوں۔ ذبح خانوں وغیرہ مقامات میں رہتی ہیں +

قسم اول شہد کی مکھی آدمی کو طریق تمدن سکھانے والی۔ اور بڑی عقلمند ہے۔ قرآن شریف میں ایک سورت اس کے نام سے منسوب ہے۔ اس مکھی کے ضابطے اور قانون انسان کو حیرت میں ڈالتے ہیں +

آدمی جوں جوں ترقی کرتا ہے۔ قدامت کے اُصول سے منحرف ہوتا جاتا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ تمام دُنیا میں شخصی حکومت کا دور دورہ تھا اب یہ وقت ہے کہ خود مختاری اور مساوات کی روح ہر شخص میں سرایت کر گئی ہے۔ جس کو دیکھیے "ہمچو من دیگرے

نیست" کا راگ گاتا ہے۔ یورپ میں ان خیالات کا بڑا زور ہے۔ وہاں کے باشندے آزادی کی ترنگ میں کسی کی برتری گوارا نہیں کرتے۔ اکثر مقامات ہیں جہاں بادشاہ کوئی چیز نہیں۔ ہر فرد بشر اپنا آپ حاکم ہے۔ اور اگر کہیں بادشاہ موجود ہے تو اس کا کچھ اختیار نہیں شطرنج کے مہرے کی مثل نام کا بادشاہ ہے +

اگرچہ اہل یورپ نے عملاً اس کو ثابت کر کے دکھا دیا کہ فرد واحد کی حکومت سے زیادہ مفید پنچایتی حکومت ہے۔ لیکن یہ عملدرآمد ہمیشہ ایک حال پر نہیں رہ سکتا۔ کیونکہ یہ اصول اُسی وقت تک کارگر ہے جب تک خلقت میں علم کا عام شوق ہے اور لوگوں میں اپنے فرض کا احساس باقی ہے۔ جس دن علمی جیسر جاکم ہوا۔ اور تعیش و آرام طلبی نے جہالت کا بازار گرم کیا۔ اُسی روز دیکھ لینا کہ جمہوریت کا سارا شیرازہ درہم و برہم ہو جائے گا۔ اور پھر وہ لوگ جن کے دماغ اور قوٰی قدرتاً شاہی و افسری کی قابل ہیں خود مختار بادشاہ بن جائیں گے +

شہد کی مکھی ابتدا سے خود مختار بادشاہ کی ماتحت ہے۔ آدمی کی طرح رنگ نہیں بدلتی۔ ان مکھیوں کے ہر چھتّہ میں ایک حکمران ملکہ ہوتی ہے جس کے حکم پر ہزاروں مکھیاں گردش کرتی ہیں۔ مکھی ملکہ کا فرمان اشاروں ہی اشاروں میں پورا ہو جاتا ہے۔ اس کو نہ گزٹ میں اعلان کرنے کی ضرورت ہے نہ وئسرائے اور ڈپٹی کمشنر کی معرفت کی تلاش۔ جب ذرا پروں کو حرکت دی۔ اور آنکھوں کو ساہنے کر کے بھنبھنائی۔ فوراً سب رعایا تعمیل کے لئے کھڑی ہو گئی۔ مکھی ملکہ کی خوش نصیبی میں کس کو کلام ہو سکتا ہے۔ اس کے ملک میں نہ کوئی باغی ہے نہ اناکسٹ شورش کنندہ مکھیوں کی شہزادی بڑی کم خوراک ہے۔ رعایا جس قدر شہد جمع کرتی ہے یہ اُس میں سے صرف اپنے اور اپنے بچوں کی خوراک لے لیتی ہے۔ باقی رعایا کا حصّہ رہتا ہے۔ اگرچہ اس کی رعایا ایسی اطاعت گزار ہے کہ ملکہ خواہش کرے تو سارا شہد اس کے حوالے کر دے یا کم سے کم چوزا ابد ٹیکس ان پر لگایا جائے اُس کو خوشی خوشی برداشت کر لے مگر ایسا نہیں ہوتا۔ ملکہ رعیت کے حصّے پر بُری نگاہ نہیں ڈالتی اور قناعت سے اپنے حصّے پر زندگی بسر کر لیتی ہے +

ذرا سُننا یہ پھولوں کی ڈالیوں سے کیسی گونج کی آواز آ رہی ہے۔ یہاں تو سوائے مکھیوں کے اور چیز نظر نہیں آتی۔ آہا سمجھ میں آیا۔ گونج انہی مکھیوں کے پروں کی ہے۔ مگر نہیں بہت سی مکھیاں پھولوں پر بیٹھی رس چوس رہی ہیں۔ پروں میں کسی قسم کی حرکت نہیں۔ اس پر بھی ان میں سے ایک آواز آتی ہے۔ یہ کس چیز کی صدا ہے۔ آپ کو خبر نہیں یہ مکھی کا ترانۂ حمد و شکر ہے۔ رزق کھاتی جاتی ہے اور رزاق کا شکرانہ ادا کئی جاتی ہے۔ اسی پر بس نہیں۔ اِن کے چھتّے میں جا کر دیکھ لینا صبح شام ایک خاص آواز سُنائی دے گی وہ ان کی حمد و ثنا ہوتی ہے +

گھریلو مکھی

اب قسم دوم گھریلو مکھی کو لیجیئے۔ جس کو آپ کی اصطلاح میں مگس بے حیا کہتے ہیں۔ کیسی ملنسار اور محبت کرنے والی چیز ہے۔ آپ دھکے دیتے ہیں دھتکارتے ہیں اور وہ دامن نہیں چھوڑتی۔ چہرے سے اُڑایا تو وہ ہاتھ پر آ بیٹھی۔ وہاں سے جھٹکا تو قدموں میں آن گری بہت ہوا تو طواف کرنے لگی۔ اور دو چار چکّر لگا کر پھر پہلو میں آ گئی۔

حدیث شریف میں آیا ہے کہ اس کے ایک پر میں زہر ہے اور دوسرے میں تریاق۔ کھانے میں گرتی ہے تو پہلے زہردار پر ڈالتی ہے اس لیئے حکم ہے کہ اس کو غوطہ دیکر پھینکا کرو۔ تاکہ تریاق کا اثر زہر کو معتدل کر دے۔ کون مسلمان ہے جو اس حدیث کے سُننے کے بعد بیچاری مکھی پر آنکھیں نہ نکالے گا۔ مگر اس میں اس غریب کا قصور نہیں۔ یہ تو قدرتی بات ہے کہ ایک پر میں زہر رکھا گیا اور دوسرے میں تریاق جب وہ گرتی ہے تو اپنے اختیار سے نہیں گرتی۔ بے قابو ہو کر غوطہ کھاتی ہے۔ ایسی حالت میں یہ محض قدرتی حکمت کا تقاضا ہے کہ زہر والا پر پہلے گر کر خبر گرائی جائے

ہندو مذہب سے مکھی کی عداوت

ایک ہندو فقیر نے جو چھوت چھات کی قید سے آزاد تھا۔ بڑی دلچسپ بات کہی کہ میاں ہندو مذہب والے خواہ مخواہ چھوت چھات کا غل مچاتے ہیں اور اپنے ہمسایہ مسلمان بھائیوں سے الگ تھلگ رہکر ان کے دلوں کو مکدر کرتے ہیں۔ پہلے کمبخت مکھی کا تو کچھ تدارک کریں جس نے چھوت کے تمام اصول میں گڑبڑ ڈال رکھی ہے۔ مسلمانوں سے تو اُن کی گوشت خوری کے سبب سے احتیاط کی جاتی ہے۔ مگر مکھی کا کیا علاج۔ جو گوشت پر بیٹھتی ہے اور اسی وقت اُڑ کر برہمن کی رسوئی اور دال بھات کی تھالی میں آجاتی ہے۔ اس پر بس نہیں۔ سارے جہان کے غلیظ اور میلے کچیلے مقامات میں مکھی کا گزر ہے۔ اور اسی حالت میں پاک صاف نہائے دھوئے ہندوؤں کے بدن۔ کپڑے۔ کھانے پر پہونچتی ہے۔ چھوت کہاں رہی۔ اس ناہنجار نابکار نے تو گندے ستھرے کو ایک کر دیا ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ کچھ علاج سمجھ میں نہیں آتا۔ مسلمانوں سے تو علیحدہ رہنا ممکن مگر اس موذی سے کسی طرح چھٹکارا اور بچاؤ ممکن نہیں۔

فقیر نے کہا سنتے ہیں کہ آدم کے بیٹے نے اپنے بھائی کی لاش کوّے سے سیکھکر دفن کی تھی۔ لہٰذا ہندو مکھی سے نصیحت حاصل کریں۔ اور چھوت کے خیال کو چھوڑ کر مسلمانوں سے شیر و شکر ہو جائیں +

مُردار خوار مکھی

مکھی کی تیسری قسم مُردار خوار ہے۔ یہ عموماً قبروں اور سڑی ہوئی لاشوں اور قتل گاہوں میں پائی جاتی ہے۔ اس کے زہر سے خدا بچائے۔ بڑی خوفناک چیز ہے۔ میں تو جب کبھی اس سبز رنگ کی مکھی کو دیکھتا ہوں تو موت کے بعد کا زمانہ یاد آجاتا ہے۔ اور خدا سے پناہ مانگتا ہوں کہ وہ مجھ کو اور سب بھائیوں کو مکھی کے عذاب سے بچائے +

مکھی کے صوفیانہ اوصاف

(۱) جس طرح صوفی لوگ انسان کی روحانی حفاظت کے لیے پیدا کیئے گئے ہیں۔ مکھی بھی جسمانی محافظ ہے۔ گھر والوں کی زہریلی چیزوں کو چوس چوسکر صاف کر دیتی ہے +

(۲) دل میں جذبۂ الفت رکھتی ہے۔ گو پروانہ کی مانند جل مرنا اس کو نہیں آتا۔ تاہم جس گھر میں پیدا ہوئی ہے اُس سے دلی محبت رکھتی ہے۔ ہر وقت پاک رہنا چاہتی ہے۔ ہزار تدبیریں اس کو جدا کرنے کی کیجیئے۔ مگر یہ دامن نہیں چھوڑتی +

(۳) متوکل ہے۔ جو مل جائے کھا لیتی ہے۔ در بدر ماری ماری نہیں پھرتی +

(۴) بہت سویرے بیدار ہوتی ہے اور اپنے محبوب انسان کو غافل دیکھنا گوارا نہیں کرسکتی۔ اس لیے سوتے میں بار بار چہرہ پر آتی اور بار بار پکارکر جگاتی ہے اور زبان حال سے کہتی ہے۔ اُٹھ پیارے آدمی یہ وقت خدا کی حمد کا ہے۔ دیکھ کیسا سہانا سماں ہے۔ بیدار ہو اور دوگانۂ شکر بجا لا۔ تو اب تک پڑا سوتا ہے۔ مجھ کو دیکھ بڑی دیر سے جاگ رہی ہوں اور خدا کی دی ہوئی ہواؤں میں اڑتی پھرتی ہوں۔

(۵) شہادت پسند ہے۔ یعنی دانستہ مکڑی کے مُنہ میں چلی جاتی ہے۔ تاکہ اس کا بھوکا پیٹ بھرے۔ اور یہ مرتبہ شہادت کمائے۔ آپ کہیں گے کہ اس میں مکھی کا کیا کمال ہے۔ مکڑی تو بے خبری میں چھاپا مارتی ہے۔ مکھی کی خوبی تو جب تھی کہ جان بوجھکر موت کے مُنہ میں چلی جاتی۔ یہ اعتراض درست نہیں۔ آج کل کے سائنیٹفِک ڈاکٹروں نے خوردبین آلات سے مشاہدہ کیا ہے کہ مکھی کے جسم میں ہزاروں آنکھیں ہیں تو بس جس کے دو نہیں ہزار آنکھیں ہوں وہ مکڑی کے داؤں سے بے خبر کیونکر رہ سکتی ہے۔

نہیں جناب یہ صرف مکھی کا ذوقِ قربانی ہے کہ اپنی ہستی کو مٹاکر دوسرے کو فائدہ پہونچاتی ہے۔ کاش ہم لوگ مکھی ہی سے جاں نثاری کا سبق سیکھیں۔ اور عشقِ حقیقی کے جالے میں گرفتار ہوکر فنائیت حاصل کریں +

اُلّو

از رسالۂ صوفی سنہ ۱۹۱۰ء

اُلّو ایک ایسے جانور کا نام ہے جس کی نحوست کو سب مانتے ہیں۔ ضرب المثل کے جملے بیچارے اس پرندے کے وجود پر بن گئے ہیں جب کسی گھر یا شہر کی ویرانی بیان کرنی منظور ہو تو کہتے ہیں کہ وہاں تو اُلّو بول رہا ہے یعنی وہ مقام بالکل اُجاڑ ہے آبادی کی چہل پہل بالکل نام کو نہیں۔ اور فقط نحوست اور ویرانہ پن ہی میں اُلّو بدنام نہیں ہے۔ حماقت و بے عقلی کے موقع پر بھی اُلّو ہی کا نام لیا جاتا ہے۔ اُلّو کی آواز سے بہت بدشگونیاں منسوب ہیں +

پس ایسے منحوس جانور کے ذکر اذکار میں کون جی لگائے گا کس کو رغبت ہوگی کہ بلبل ہزار داستان اور طوطی شکر مقال کے چرچوں کو چھوڑکر اس بدنام پرند کے بیان میں مصروف ہو۔ مگر دُنیا کے پردہ پر سب آدمی ایک مزاج طبیعت کے نہیں بنتے۔ ہزار اُلّو کو بُرا کہنے والے ہیں تو دو چار اس کی مدح سرائی کرنے والے بھی نکل آئیں گے۔ خاصکر وہ گروہ جو موجودات کے ہر نیک و بد کو صفات یزدانی کا مظہر تصور کرتا ہے۔ جو لوگ بلند آسمان۔ چمکدار ستاروں۔ روشن آفتاب ماہتاب۔ لہلہاتے باغوں میں۔ شانِ غیبی کا ظہور مشاہدہ کرتے ہیں جن کو چشم ستاں میں جلوۂ راز نظر آتا ہے۔ جو گل کی صورت میں حُسنِ ازل دیکھتے ہیں۔ جن کی زبان سے ان نظاروں کو دیکھکر "ربّنا ما خلقت هذا باطلا" نکلتا ہو۔ وہ پست زمین۔ اندھیری رات سنسان بیابان۔ نگاہ مغموم۔ اور نوکدار کانٹوں میں بھی حقیقت کی بو دیکھتے ہیں۔ اور "کلّ یوم هو فی شان" پڑھتے ہیں +

لہذا کوئی وجہ نہیں کہ اس جماعت کے رسالے میں جس کا مشرب ہمہ اوست ہے اور جو خیر و شر دونوں میں محمل لیلے کے جرس کی صدا سُنتے ہیں۔ اُلّو کی سرگزشت نہ لکھی جائے۔ صوفی کی روش یہ ہونی چاہیئے کہ ہر اچھی بُری چیز میں منزل مقصود کو تلاش کرے۔ یہ رسالہ صوفیوں کا ہے۔ اس لیئے اس میں بھی جہاں عام پسند عنوانوں پر مضامین لکھے جاتے ہیں وہاں اُن عنوانوں کو بھی زیر بحث لایا جائے جن پر توجہ کرنا قاعدے اور دستور کے قانون میں قابل نفرت ہے +

اُلّو کے اوصاف

اُلّو کی زندگی۔ بود و باش۔ ایک باخدا۔ تارک الدنیا درویش کی سی ہے۔ وہ آبادی سے گھبراتا ہے۔ اُس کو خلوت تنہائی بھاتی ہے۔ عام پرندوں کی طرح رونق دار شہروں اور غل شور کے مقام پر آشیانہ نہیں بناتا۔ سرسبز درختوں کی شاخوں پر بیٹھکر نغمہ سنجی

نہیں کرتا۔ جس سے فرحت پسند انسان جی بہلائے۔ اُلّو سارا دن حریص پرندوں کی مثل پیٹ کی خاطر دربدر مارا مارا نہیں پھرتا۔ بلکہ وہ اُجاڑ اور غیر آباد کھنڈروں میں نشیمن بناتا ہے۔ جہاں کوئی غیر مانوس آواز اس کی مشغولی میں خلل انداز نہ ہو۔ دن بھر صائم رہتا ہے۔ اور شام کو سورج چھپنے کے بعد رزق کی تلاش میں نکلتا ہے اور جوں ہی نکلا خدا تعالےٰ شکار کے چند لقمے دلوا دیتا ہے جن سے روزہ افطار کرکے کسی ٹوٹے ہوئے گنبد یا جھکی ہوئی دیوار پر آ بیٹھتا ہے اور ہو ہو کے نعرے لگانے لگتا ہے۔ اسی ذکر و شغل اور یاد الٰہی میں صبح ہو جاتی ہے اور یہ پکّا اور سچّا صوفی، ریاکاری کے ڈر سے خاموش ہو کر اپنے حجرے میں گھس جاتا ہے اور حبس دم کرکے مراقبہ میں بیٹھ جاتا ہے۔ پھر شام تک باہر نہیں آتا +

یہ خود پسند آدمی بادشاہی کا تاج پہنکر۔ نوبت نقارے بجواتا ہے۔ نوبت خانوں کے لیئے اونچے اونچے مکان تیّار کراتا ہے اور سمجھتا ہے کہ یہ نوبت ہمیشہ بجیگی۔ لیکن زمانے کا چکر چند ہی روز میں اس سرکش کو خاک میں ملا دیتا ہے۔ دنیا والے اُس کو اور اُس کی نوبت نقاروں کو بالکل بھول جاتے ہیں۔ مگر اُلّو نہیں بھولتا۔ مٹنے والے تاجدار کے خاکی ڈھیر پر جاتا ہے اور نقیب و چوبداروں کی آواز کو صدائے عبرت میں مرنے والے کے وجود خاکی کو سُناتا ہے اور اُس کے نوبت خانے پر بیٹھ کر ٹھیک رات کے بارہ بجے **کل من علیہا فان** کی نوبت بجاتا ہے۔

ایک دفعہ گرمی کے موسم میں راقم الحروف درگاہ حضرت خواجہ قطب صاحب میں حاضر تھا۔ پچھلی رات جبکہ چاند غروب ہو رہا تھا جی چاہا کہ قطب مینار کا نظارہ کروں اُس وقت عجب پُر اثر وقت تھا چاروں طرف تاریکی چھائی ہوئی تھی رات سائیں سائیں کر رہی تھی درگاہ شریف سے نکلکر مقبرہ ادہم خاں کے قریب آیا تو دسویں رات کے چاند کی صورت سامنے آ گئی۔ بیچارہ ماندگی کے عالم میں اُفق تنزّل پر جھک رہا تھا۔ اور اپنی افسردہ شعاعیں ویران در و دیوار پر ڈال رہا تھا۔ ملگجی روشنی میں شاہی کھنڈرات کی صورت ایسی ہیبتناک اور ڈراؤنی معلوم ہوئی کہ کلیجہ کانپنے لگا۔ تاہم ہمت کرکے ذرا اور آگے بڑھا۔ جوگ مایا کا مندر دور سے نظر آ رہا تھا۔ دوسری طرف جو پھر کر دیکھا تو غیاث الدین بلبن۔ محمد خاں شہید کے شکستہ مقبرے اور سینکڑوں اونچی نیچی ٹوٹی پھوٹی عمارتیں نظر آئیں جن پر پھیکی پھیکی چاندنی اور رات کی خاموشی نے خبر نہیں کس بلا کا اثر پھیلا رکھا تھا کہ بے اختیاری کی سی حالت پیدا ہو گئی۔ لیکن ارادہ قطب مینار دیکھنے کا تھا۔ ان نظاروں میں تھوڑی دیر مصروف رہکر آگے بڑھ گیا اور علاؤ الدین خلجی کے مقبرے کے پاس پہونچ گیا۔ دیکھا کہ بیچارہ سلطان خلجی اکیلا تنہا۔ خوفناک کھنڈر کی گود میں پڑا سوتا ہے۔ کوئی پہرہ دار نہیں۔ پاسبان نہیں۔ جو اس سکندر ثانی کی خوابگاہ کے قریب جانے سے مجھ جیسے کو روکے۔ زندگی کی تو خبر نہیں۔ مرنے کے بعد جب ابن بطوطہ نے اس مقبرے کو دیکھا ہے تو عجب شان تھی۔ زرّیں مخملی غلاف پڑے ہوئے تھے۔ اگر اور لوبان کی خوشبو سے مقبرہ مہک رہا تھا۔ عالی شان گنبد کے قریب بہت بڑا مدرسہ تھا جہاں کڑوں طلبا رہتے تھے +

آج کی رات نہ گنبد باقی تھا۔ نہ غلاف نہ خوشبو۔ نہ مدرسہ نہ طلبا۔ یہاں تک کہ قبر کا نشان بھی ناپید تھا۔ چونے اور پتھروں کے انبار میں خبر نہیں کہ سکندر ثانی سلطان علاؤالدین خلجی کی ہڈیاں۔ پڑی تھیں۔ اس منظر نے میرے پاؤں پکڑ لیئے۔ بدن ساکن کر دیا۔ آنکھوں کو دریائے عبرت میں غرق کر دیا۔ محو عبرت بنا کھڑا تھا کہ سامنے کی شکستہ دیوار پر سے اُلّو کی صدا کان میں آئی جو سلطان کی گذشتہ شان و شوکت کا نوحہ رُک رُک کر پڑھ رہا تھا +

ان سب پُر اثر نظاروں سے زیادہ میرے دل پر صدائے بوم کی چوٹ لگی۔ نہیں کہہ سکتا کہ اُس وقت کیا حالت ہوئی اور اب جب اُس کا خیال کرتا ہوں کیا کیفیت دل کی ہو جاتی ہے۔ تو کیا ایسے ناصح اور بیکسوں کے دمساز جانور کو آپ بُرا کہہ سکتے ہیں

اگر اس کی محل شناسی پر غور کیا جائے تو بے ساختہ داد دینی پڑتی ہے۔ جن کو سب بھول گئے۔ سب نے چھوڑ دیا اُن کو اُلّو نے نہیں بھلایا۔ اور ساتھ نہیں چھوڑا۔ اُلّو کی آواز کو منحوس ناحق کہتے ہیں۔ ذرا دھیان سے سنو اللہ ھو صاف سمجھ میں آئے گا۔ بعض دفعہ محض ہُو ہُو بھی کہتا ہے۔ اور بعض وقت پورا اللہ ھو پکارتا ہے۔ بنگالی مینا۔ ہیرامن طوطا۔ اور یہ ننھی ننھی خوبصورت چڑیاں میٹھی میٹھی بولیوں سے آپ کا جی خوش کرتی ہیں۔ مگر اُلّو اپنے نعرۂ حق سے آپ کے دل کو لرزا دیتا ہے۔ اس لیۓ آپ اس کو منحوس کہتے ہیں۔ نہیں نہیں ایسا خیال نہ کرو۔ یہ خوش نوا پرندے دل کو یادِ حق سے ہٹا کر تکلفاتِ دُنیا میں مصروف کرتے ہیں اور اُلّو کی جگر خراش فریاد انجام کار یادِ حق دلاتی ہے۔ اور کہتی ہے ؎

جگہ دل لگانے کی دُنیا نہیں ہے ✤ یہ عبرت کی جا ہے تماشا نہیں ہے

آج سے آپ کو چاہیۓ کہ اُلّو کی نحوست کا خیال چھوڑ کے اُس کی خوبیوں پر غور کیا کیجیۓ۔ اور اُلّو پر کیا منحصر ہے۔ عالم موجوداتِ عالم میں نظر سے گذرے اچھی ہو یا بُری اُس کے اچھے معنی نکالنے چاہئیں ✤

رَسُولْ کی مَنْ بَھاتی غذا

جَوْ

از اخبار زمیندار ۱۹۱۲ء

میرا چاہیتا زرد پوش جَو کیسا پیارا پیارا۔ پیدا ہوتے ہی عشقبازی کا بسنتی لباس پہن لیتا ہے اور مرتے دم تک اُس کو تن سے جدا نہیں ہونے دیتا۔ یہاں تک کہ موت کی چکّی میں پس کر نابود ہو جاتا ہے۔ اس نکیلے دانے سے نفرت نہ کرنا۔ بھائی یہ تمہارے رسول کا مُنہ چڑھا دانہ ہے۔ یہی وہ ہستی ہے جس کے آگے کسی کھانے کو سرکارِ رسول تک رسائی نہ ہو سکتی تھی۔ اس کی تعریف کون کرے خلقت تو دیوانی ہو گئی ہے۔ جس کو دیکھیۓ

گَنْدم گنہگار

پر جان دیتا ہے۔ روٹی تو روٹی۔ محبوب بھی گندمی رنگ کا تلاش کیا جاتا ہے۔ یہ وہی میاں دانۂ گندم ہیں جن کو نوش کر کے آدم جنت سے نکلے اور عتابِ الٰہی کے سزاوار ہوئے۔ یہ وہی چیز ہے جس کو مولانا رومؒ ہوس پرست عشاق کی بوالہوسی کا سبب قرار دیتے اور کہتے ہیں کہ ؎ ایں خمار از خوردن گندم بود ✤

نہیں جناب ہم کو تو اپنے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی من بھاتی غذا جَو مرغوب ہے اُس کا تن بھی اچھا اور من بھی مزے دار

پالیسی کی تلاش

لوگ کہتے ہیں کہ مسلمانوں کو ایک نئی پالیسی بنانے کی ضرورت ہے۔ اگر واقعی یہ سچ ہے تو بھی میرے نزدیک پالیسی یہ ہونی چاہیۓ کہ

جَو کھاؤ اور جَو کی رنگت بن جاؤ

لیگ و کانگریس۔ اسکول و کالج۔ ہوش و خرد۔ سب کو آگ لگا دو۔ گردش سے یہ وقت آ گیا کہ پیٹ بھرنے کو جَو کے چار دانے بھی نہیں ملتے۔ تو بس یہی پالیسی بہتر ہے کہ دیوانہ وار جَو کا چھلکا اُتارنے کی کوشش کرو۔

خیر نہیں۔ میں نے کیا کہا اور آپ کیا سمجھے۔ یہ کوئی معمّا نہیں ہے۔ جَو کو چاہتا ہوں۔ جَو پر مرتا ہوں۔ اسی کا نام بار بار زبان پر آتا ہے۔ مدینہ شریف سے واپس آکر دونوں وقت جَو کی روٹی کھاتا ہوں۔ اس میں صحت ہے۔ تندرستی ہے۔ طاقت ہے۔ لذت ہے اور وہ یاد ہے جس کے بھولنے نے قوم کو تباہ و برباد کر دیا۔ یاد رکھ۔ بھول مت۔ رسول جَو کھاتے تھے۔ صحابہ جَو کھاتے تھے تلوار چلانے والے ہاتھ اور ملک چلانے والے دماغ کو وہ معدہ خوراک دیتا تھا جس میں جَو کی روٹی کے سوا تو س مکھن کا نام نہ تھا ذرا کھا کر تو دیکھو کیسی مزے کی چیز ہے۔ ذرا سا خمیر ملا لیا کرو۔ روٹی نرم ہو جائے گی۔ اور ہضم میں دیر نہ ہو گی۔ سُنا ہو گا۔ دلّی میں دربار تھا۔ اُنہی دنوں کا ذکر ہے مرنے والے بہادر شاہ بادشاہ کے خاندان کی چند شہزادیاں اپنے ٹوٹے ہوئے بوریے پر بیٹھی جَو کی روٹی کھا رہی تھیں۔ چراغ ٹمٹما رہا تھا۔ سردی چمک رہی تھی۔ سب سے چھوٹی سات برس کی عمر والی لڑکی اپنی ماں سے مخاطب ہو کر بولی۔ کیوں بی امّاں۔ یہ انگریزوں کے بادشاہ بھی جَو کھاتے ہوں گے۔ کیونکہ تم نے پرسوں کہا تھا کہ سب بادشاہ اور اُن کے بچے جَو کھایا کرتے ہیں۔ ماں اس معصومانہ سوال کو ٹالنا چاہتی تھی۔ مگر بچّی نہ مانی۔ اور بولی۔ ابھی بی بتاؤ۔ جواب ملا۔ نہیں جو دربار کرتے ہیں وہ جو نہیں کھاتے۔ میں نے پرسوں تم سے یہ کہا تھا کہ بادشاہ اور اُن کے بچے جَو کھایا کرتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ جن بادشاہوں کا نام فقط بادشاہ رہ جاتا اور کام چھن جاتا ہے اُن کو جَو کے سوا اور کچھ کھانے کو نہیں ملتا۔ بیٹی یہ جَو کا ٹکڑا میسر آ جاتا ہے اس کو بھی غنیمت سمجھو۔ تقدیر تو اس قابل بھی نہیں۔ آج لاکھوں روپیہ آتشبازی اور خبر نہیں کن کن بازیوں میں سرکار انگریزی کا خرچ ہو جائے گا۔ مگر اُس سے کون کہے کہ ہم تیمور کے گھر والے جَو کی روکھی روٹی سے بھی محتاج ہیں۔ ایک بازی ہمارے نام کی بھی۔ دلّی میں تخت بچھا ہے۔ ایک نظر اس پر بھی ڈالو جو کل کے دن اس تخت کے مالک تھے۔ اور آج فرشِ خاک پر ذلیل پڑے ہوئے ہیں۔ مگر ہُوا۔ کس کا کہنا۔ کس کا سُننا۔ میں تم سے کہتی ہوں کہ شاہوں کے شاہ سلطانِ کونین محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی جَو کی روٹی کھاتے تھے۔ ہم اور کسی بادشاہ کو کیوں دیکھیں۔ اپنے آقا و مولا کی مثال کیوں نہ دیں۔ کہتے ہیں دانہ دانہ پر مُہر ہوتی ہے۔ "رسولنما" میں جَو کے دانہ پر قبولیت کی مُہر لگنی چاہیئے۔ دیکھوں کتنے عاشقانِ رسول گندم ترک اور جو اختیار کرتے ہیں۔ یقین مانو کہ مسلمانوں کو غذا کا فیشن فوراً بدلنا چاہیئے۔ سفید چپاتی پر مرنا چھوڑ دو۔ تم کالے ہو۔ گوری چیز سے رشتہ جوڑو گے تو قانون گھور کر دیکھے گا۔ اگر دس بیس خدا کے بندے جو کھانے کا عہد باندھ لیں تو میں سمجھوں گا۔ روحانی حکومت کی زندگی میں جان پڑ گئی۔ کیونکہ بزرگوں سے مروی ہے کہ روح کا رنگ زرد ہے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ روحانی حکومت کو دُنیاوی حکمرانوں سے کچھ سروکار نہیں۔ ذوق شوق کی اقلیم پر قبضہ کرنا اور اُس میں اپنا سکّہ وخطبہ رائج کرنا مقصود ہے تو اس خواہش کو زرد خطرہ نہ بنا لیا جائے۔ جیسے کہ چین و جاپان کی زرد قوموں سے بعض ولایتی مضمون نگار زرد خطرہ کا عنوان قایم کر کے ڈرایا کرتے ہیں۔ میرا جَو اندیشہ کی چیز نہیں۔ صاف ہے۔ چکنا ہے۔ ایسے ہی ہم اس کے چاہنے والے بھی پالٹیکس سے علٰحدہ اور کسی دوسری دُھن کے شیدائی ہیں۔

پھولوں کی شکوے
قسمت و تقدیر کی شکایتیں!

ازتوحید - ۱۶؍اپریل ۱۹۱۳ء

سیرٹھ کی نوچندی میں راقم فقیر نے پھولوں کی نمایش دیکھی۔ یہی سارے مجمع کی جان تھی۔ ادھر پھول۔ اُدھر پھول۔ نیچے پھول۔ اوپر پھول۔ چاروں طرف گل خانے ہی گل خانے نظر آتے تھے۔ آراستہ خیمے میں سفید فرش پر میزیں سجی ہوئی تھیں۔ جن پر جداگانہ سلیقہ و ترتیب سے چینی اور شیشے کے گملوں میں رنگ برنگ کے پھول لگائے گئے تھے۔ نمایش اس کی تھی کہ کسنے نیچرل اور موزوں طریقے سے پھولوں کو چنا ہے۔ چھننے والیاں بھی جن کو انگریز مس بابا اور مدم کہتے ہیں جگہ جگہ موجود تھیں اور فرش کے متحرک پھول ثابت ہو رہی تھیں۔ فقیر اس عالم "گل و گل" کی سیر کرتا پھر رہا تھا۔ کہ یکایک ایک جھاڑو کی ٹوکری پر نگاہ پڑی جس میں چند نہایت خوشرنگ و خوبصورت پھول رکھے ہوئے تھے اور یہ ٹوکری زمین پر دھری تھی۔ ان کو دیکھکر آگے بڑھا ہی تھا کہ تصور کے کان میں ایک شیریں آواز نے کچھ کہا۔ یہ صدائے گل تھی۔ جو اپنی قسمت و تقدیر کا شکوہ کرتی تھی ✤ جب میری اور میز کے سامنے والے گلدستہ کی ایک ذات ہے ایک رنگت ہے ایک بو ہے تو پھر اس کی کیا وجہ کہ اس کو شیشے کے گملے میں شاندار میز پر لگایا گیا اور مجھ کو جھاڑو کی ٹوکری میں زمین پر ڈال دیا ✤

پھول کے اس شکوے سے دل پر چوٹ لگی۔ اور ڈاکٹر اقبال کا شکوہ یاد آگیا۔ جو انھوں نے خدا سے کیا تھا۔ کہ اتنے میں دوسرے کان میں صدائے مخفی نے اس کا جواب دیا۔ اور کہا۔ کہدے۔ اے سننے والے۔ ٹوکری کے پھول گوشہ اور خلوت کی امن میں ہیں۔ دیدار بازوں کی یورش میز پر ہے۔ مگر یہ سب ہوس پرست ہیں۔ پھول کی ظاہری خوشنمائی کو دیکھتے ہیں۔ لیکن ٹوکری کے پھول کو دیکھنے کے لیئے نظر عرفان بھیجی جاتی ہے۔ یہ ایسی بڑی عزت ہے جو میز کے پھول کو نصیب نہیں۔ پس اے ٹوکری کے غریب گلدستے! تجھ کو بشارت ہو کہ تیری شان کو دوام ہو اور میز کے پھول کو زوال ✤

دوسری طرف پھلوں کی میزیں تھیں۔ ہمہ قسم کے میوے اور پھل چنے ہوئے تھے۔ ان میں بعض پھلوں کو تراشکر دکھایا گیا تھا۔ ایک ترشے ہوئے پھل نے کہا۔ مجھ کو زخمی کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ جواب آیا۔ تاکہ تیرا باطن اہل ظاہر کو نظر آجائے اور وہ بھی اپنے اندرون کو چیر کر دیکھیں کہ اس میں اور ظاہر میں کچھ فرق تو نہیں ہے ✤

ازتوحید ۱۹؍مئی ۱۹۱۳ء

کل رات کو ۹ بجے جمادی الاوّل کا چاند شب اوّل کے ہلال کی مثل ستاروں میں جھلملا رہا تھا۔ یہ آخری تاریخ تھی۔

اب دو روز تک یہ چاند مخفی رہے گا۔ اور ۲۹ یا ۳۰ تاریخ کو نمودار ہوگا۔ مگر جمادی الاول کے نام سے نہیں۔ جمادی الآخری نام لیکر۔

راقم فقیر آسمانوں والے۔ زمینوں والے۔ پہاڑوں اور سمندروں والے۔ نور و ظلمت کے رکھوالے خدا سے کچھ مانگ رہا تھا کہ احساس و ادراک کے کان میں ایک نطق۔ ایک خطبہ۔ ایک لیکچر۔ ایک تقریر کی آواز آئی۔ ہوش نے اپنے گوش اُدھر لگائے اور سُنا ✣

افسردہ اور اُداس چاند ستاروں سے کچھ کہہ رہا تھا۔ ستارے دل لگائے سُن رہے تھے۔ بیان ہولناک تھا۔ لہجہ اندیشہ خیز تھا۔ دل نے کہا۔ زمین کے قانون بنانے والے سُنتے نہ ہوں۔ صوت سرمد نے جواب دیا نہیں وہ سب سوتے ہیں۔ خفیہ نویس کارِ خاص کے اہلکار نسیم سحر کی آغوش میں پڑے ہوئے مدہوش ہیں۔ پہرہ پر کوئی نہیں۔ چاند نے کہا۔

ستارو! سُنتے ہو۔ اب ہم تم چند ساعت کے مہمان ہیں۔ آفتاب اُفقِ مشرق سے طلوع ہونے والا ہے۔ نور کو انوار زیر و زبر کرنے آتے ہیں۔ آج کی رات ہم نے تاریکی کا مقابلہ کیا۔ اُس سے لڑے۔ اُس کو شکست دی۔ مگر اہلِ جہان سوتے رہے۔ ہماری معرکہ آرائی کی سیر نہ دیکھی۔ اب سورج کی جنگ دیکھنے کے لیئے سب کی آنکھیں کھُل جائیں گی ✣

میرے درخشندہ بھائیو! آسمان کی خاموشی دور ہونے والی ہے۔ زمین کا سکوت ختم ہونے کے قریب آگیا۔ اس لئے میں اپنے مہینے بھر کی روشن گوہائی کو تمام کرتا ہوں۔ اور حجرۂ خلوت میں جاتا ہوں۔ کل کی رات اور پرسوں کی رات اور شاید اس کے بعد ایک اور رات مجھ کو میدانِ فلک میں نہ پاؤ گے۔ تمہارا کمانڈر غروب ہوتا ہے۔ تمہارا سردار تلوار میان میں کرتا ہے۔ تنہائی میں ہمت نہ ہارنا۔ ظلمتِ شب کا مردانہ وار مقابلہ کرنا۔ وہ دیو ہیکل ہے۔ تم نازک اندام ہو۔ ڈر نہ جانا۔ سیاہ باطن کو دیدہ کا فتح کر لینا دشوار نہیں۔ جب تاریکی کے لشکر۔ سمندروں۔ پہاڑوں اور زمینوں کے غاروں سے نکلکر آسمان کے کناروں پر حملہ آور ہوں۔ تو مریخ اپنا منوّر دستہ لیکر میمنہ کو سنبھالے۔ مشتری میسرہ کو روکے۔ زحل قلب میں جم جائے۔ زہرہ عطارد کمسریٹ کی نگرانی کریں۔ باقی افسر کمینگا ہوں میں رہیں ✣

شہاب ثاقب کی سرچ لائٹ سے دیکھ بھال رکھنا۔ بےخبری بڑی بلا ہے۔ اور اس کے بعد فائر ہو ✣

نورانی گولے اندھیرے پر برسائے جائیں۔ شعاع کی سنگینیں چلیں۔ کرنوں کی گولیاں سَن سَن کرتی نکلیں ✣

جب دشمن کا پاؤں ڈگمگائے۔ شکست کے آثار نمودار ہوں۔ سب سپاہی چمکیں۔ دمکیں۔ اور ایک آخری حملہ کرکے اس کا کام تمام کر دیں ✣

جب آسمان کا ملک صاف ہو جائے گا۔ تاریکی کا کوئی حصہ باقی نہ رہے گا تو فرشتے فتح کا جشن رچائیں گے۔ پروردگار کی نصرتِ غیب کا ترانہ گائیں گے۔ تم بھی اپنی زبان کھولنا۔ سبحان ذی الشان میں فرشتوں کی شرکت کرنا ✣

ستاروں نے کہا:۔

اے عشائی ہلال کی صورت کے قمر! ہم کیا۔ ہماری بساط کیا۔ غریب غروب ہونے والے تارے ہیں۔ تو بھی چھپ جانے والا کرۂ نور ہے۔ دن کا صف شکن آفتاب ہم سب میں بڑا۔ ہم سب سے زیادہ شہ زور ہے۔ مگر شام کو ناپید ہو جاتا ہے اس پر کیا گھمنڈ اور غرور کریں۔ تاریکی بھی خدا کی پیدا کردہ ہستی ہے۔ اس سے کیوں لڑیں۔ خوں ریزی وسفاکی اپنا کام نہیں۔ خاموشی میں پیدا ہوئے۔ خاموشی میں مرجائیں گے۔ پھر اس غُل شور۔ فتنہ فساد سے کیا سروکار۔ کچھ اور سُنا اور کوئی بات کہہ۔ زہرہ کا ایک گیت سُن۔ نغمۂ ربّانی میں جی لگا۔ گور میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہے۔ ایسی نصیحت کر

جو یادگار زمانہ رہے ⁂

چاند مسکرایا۔ اپنی جگہ سے سرکا۔ اور جھک کر ستاروں کے کان میں کچھ کہا۔ اس پر وہ سب کھلکھلا کر ہنس پڑے تلواریں میانوں سے کھینچ لیں۔ اور ایک ایک کرکے نابودی کی رزمگاہ میں گھس گئے اور ان کے پیچھے چاند بھی کن انکھیوں سے دُنیا کے سونے والوں کو دیکھتا ہوا آہستہ آہستہ چلا۔ اور آخر کہیں غائب ہو گیا ⁂

خاکی جام

فنا کے بعد بقا

عشق کی خیالی داستان!

از توحید یکم جولائی ۱۹۱۳ء

جب فراق کی بے چینی آدم زادے سے برداشت نہ ہو سکی جب ہجر کی بے قراری انسان کے وجود خاکی کی تاب و توانائی سے بڑھ گئی تو مایوس ہستی نے زہر کا ایک پیالہ ہاتھ میں لیا۔ آسمان کو دیکھا۔ اور کہا۔ پیدا کرنے والے خدا۔ یہ مُشت خاک اتنی بڑی امانت کے قابل نہیں ہے۔ اپنی امانت واپس لے۔ میرے بازوؤں کو اس بوجھ سے ہلکا کر۔ اور اگر تو ایسا نہیں کرے گا۔ یا نہیں کرنا چاہتا۔ تو میں خود اس بار سے سُبکدوش ہوتا ہوں۔ یہ کہکر زہر کا پیالہ پی لیا اور تھوڑی دیر میں تڑپ تڑپ کر جان دیدی۔ اس کے بعد رسموں کے پابند لوگ آئے۔ بے جان لاش کو نہلایا۔ اور سفید کفن کا جوڑا پہنا کر جنگل بیابان میں ایک گہری قبر کے اندر لیجا کر دفنا دیا۔ کسی نے یہ خیال نہ کیا کہ ہمارے اس ہمجنس پر کیا گزر گئی۔ اور ہم کیوں اس معدوم ہستی نما پیکر کو خاک میں ملاتے ہیں ⁂

(۲)

بڑے زور کی آندھی آئی۔ بادل کڑکے۔ بجلی چمکی۔ طوفانی بارش ہوئی جنگل میں پانی زور شور سے بہنے لگا۔ پہاڑی ندی میں سیلابی کیفیت پیدا ہوئی۔ جس کی زد میں پرانا قبرستان بھی آ گیا۔ "شہید محبت" کی قبر ذرا اونچے مقام پر تھی سیلاب سے بچ گئی۔ تاہم سامنے کے غار میں کچھ دن کے بعد مع پٹاؤ کے یہ بھی گر پڑی۔ اور گڑھے کے اندر مٹی کا انبار بنی رہی۔ اس کو بھی ایک سال گزر گیا۔ اتنے میں ایک اور طوفان آیا۔ سردی کا موسم تھا۔ اس زور سے اولے برسے کہ تمام صحرا سفید ہو گیا۔ قاعدہ ہے کہ اولے جب برستے ہیں تو پانی ان کو سمیٹ سمیٹ کر نشیبی مقامات میں جمع کر دیتا ہے۔ چنانچہ جس گڑھے میں ہمارے مردہ عشق کی خاک پڑی ہوئی تھی۔ وہاں بھی اولوں کا انبار لگ گیا۔ یہ قصہ رات کا ہے صبح کو جب کہ اولے گھل کر اور پگھل کر مٹی میں جذب ہو چکے تھے۔ ایک کمہار اپنے گدھوں کو لیئے ہوئے اولوں کی مٹی کی تلاش میں آیا۔ یعنی جن گڑھوں میں اولے جمع ہوئے تھے وہاں کی مٹی کھود کھود کر بوروں میں بھر لی۔ ہمارے مرحوم

عاشق کی مٹی بھی ایک بورے کے حصہ میں آئی۔ اور کشاں کشاں کمہار کے گھر میں پہونچی۔ مشہور ہے کہ جس مٹی میں اولے ملے ہوئے ہوں اُس کے برتن میں پانی بہت ٹھنڈا ہوتا ہے۔ اور گرمی کے موسم میں دُنیا والے اُس کی بہت قدر کرتے ہیں۔ چنانچہ کمہار نے اس مٹی کے بہت سے برتن۔ مٹکے۔ ٹھلیاں۔ گلاس۔ صراحیاں وغیرہ بنائیں +

(۳)

برسات کا موسم تھا۔ سخت گھمس اور گرمی کے بعد ابر گھر کر آیا تھا۔ ٹھنڈی ہوا اور درختوں میں لہرا رہی تھی۔ سبز ٹہنیاں آبادیوں میں ہوا پاشی کر رہی تھیں۔ یکایک دیکھا ایک آراستہ کمرہ ہے جس میں ایک پری جمال جو رقاصہ نشۂ شباب میں مخمور انگڑائیاں لیتی ہوئی اُٹھی۔ اور نوکر کو حکم دیا کہ کمہار کے یہاں سے ایک صراحی اور جام لیکر آئے۔ مگر یہ صراحی اور جام اولوں کی مٹی کے ہوں۔ تعمیل کی گئی۔ گنہگار ہاتھوں سے شراب کی بوتل کھولی۔ صراحی میں پانی بھرا اور اس میں وہ شراب ڈال دی گئی۔ اس کے بعد پانی ملی ہوئی شراب گلاس میں نکالی گئی۔ اور ایک انداز ستانہ سے وہ گلاس ہونٹھوں تک پہونچا جس وقت لب جاں بخش جام خاکی سے ہم آغوش ہوئے۔ ایک صدائے غیب نے یہ شعر پڑھا +

پس مردن بنائے جائیں گے ساغر مری گل سے
لب جاں بخش کے بوسے ملیں گے خاک میں مل کے

او مغرور بے خبر۔ جفا کار۔ ستانے شرابی۔ میں اُس آدمی کی خاک ہوں جو تیری یاد میں پھڑک پھڑک کر مر گیا میرا جسم۔ میری ہڈیاں۔ میری آنکھیں جو تجھ کو دیکھنا چاہتی تھیں۔ میرا وہ دل جس میں تیرے ملنے کی آرزو تھی۔ میرا وہ دماغ جو تیرے وصال کے تخیلات میں سرشار رہتا تھا سب خاک ہو گئے۔ لیکن پوری بربادی۔ کامل تباہی۔ اور آخری فنا کے بعد آج یہ مقام بقا حاصل ہوا۔ اور میرے ہونٹوں کی خاک گلاس کے کنارے میں پیوست ہو کر تیرے لب سراپا حیات تک پہونچی۔ اور وصال کی گھڑی نصیب ہوئی۔ اگر یہ وصل جسم کی زندگی میں میسر آتا۔ تو ہرگز ہرگز وہ دوامی لطف حاصل نہ ہوتا جو آج کے دن محسوس ہو رہا ہے۔ اور جو یقیناً ہمیشہ قایم و برقرار رہیگا +

(۴)

عشق کی اس داستان کو سُنکر راقم درویش نے کہا۔ او مسلمان! تو ہراساں اور پریشان نہ ہو۔ دورِ حاضر کی مصیبتیں تیری ابدی بقا۔ اور پائدار زندگی کی نشانیاں ہیں۔ غور کر اور خوش باش ہو +

دُوربین اور مکاشفاتِ غیب

(از توحید۔ یکم جولائی ۱۹۱۵ء)

تمہاری آنکھ دور کی چیز نہیں دیکھ سکتی۔ تو ایک دُوربین منگا لو۔ بُعد کی منزلیں قریب آجائیں گی +
دوربین کیا چیز ہے؟ سب جانتے ہیں۔ آدمی نے ہنر اور علم کے زور سے ایک شیشہ ایجاد کیا ہے۔ جہاں اس شیشہ کو آنکھ کے سامنے لگایا۔ بس یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا گنبد کے در و دیوار چہرہ کے پاس آگئے +

بعض دوربینیں لاکھوں کوس کی چیز دکھا دیتی ہیں۔ آج کل یوروپ والوں نے ایسی دوربین ایجاد کی ہے جس سے چاند سورج اور آسمان کے سب تاروں کی حقیقت نظر آجاتی ہے۔ لوگوں نے اس دوربین کے ذریعہ حساب لگا کر بتا دیا ہے کہ سورج کتنا بڑا اور ہم سے کس قدر دور ہے۔ چاند اور مریخ زمین سے کتنے فاصلے پر ہیں۔ اور ان کی اندرونی حالت کیسی ہے۔ انہی دوربینوں سے قدرت کے نامعلوم بھید بھی کھل گئے۔ مثلاً پہلے زمانہ میں فقط ایک چاند سورج کا علم تھا۔ اور نادان خلقت پیغمبر اسلام صلّی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد پر ہنستی تھی کہ اس دُنیا کے علاوہ اور بھی متعدد عالم ہیں۔ جہاں یہاں کی طرح چاند سورج اور مخلوق آباد ہے ؎

مگر اب دوربین نے یہ دعویٰ سچا کر دکھایا۔ اور یوروپ والے مان گئے کہ اس سورج کے علاوہ جو ہم کو نظر آتا ہے اور جس کے طلوع و غروب سے دُنیا کے رات دن کا حساب مقرر ہے اور بھی بہت سے سورج ہیں اور ان کے ساتھ بھی اسی طرح ایک عظیم الشان نظام اور کائنات گردش کر رہی ہے جس طرح ہمارے سورج کے ساتھ ہے۔ گویا دوربین نے غیب کی باتوں کو عیاں کر کے دکھا دیا۔ اور مسلمانوں کے ایمان بالغیب کی تصدیق ہو گئی ؎

ان بڑی دوربینوں کے علاوہ میدان جنگ میں ایک اور دوربین استعمال کی جاتی ہے یعنی جنگی جہازوں اور خشکی کے لشکروں کے پاس ایک دوربین ہوتی ہے۔ جس سے سیکڑوں کوس کے حالات معلوم ہو جاتے ہیں کہ دشمن اس وقت کس حال میں ہے۔ اور اس کے پاس کیا کیا ساز و سامان ہے ؎

بہرحال دوربین ایک عجیب طلسم کشا لوح ہے۔ جب آنکھ کے سامنے آتی ہے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا دور کی چیز بالکل سامنے کھڑی ہے۔ لیکن درحقیقت وہ وہاں نہیں ہوتی ؎ دیکھنے والے کو صرف ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ چیز قریب آگئی۔ تو کیا دوربین

دھوکہ کی ٹٹی ہے؟

نہیں یہ بات نہیں ہے۔ دوربین صداقت کا آئینہ ہے۔ وہ جو کچھ دکھاتی ہے بے کم و کاست سچ اور واقعی ہوتا ہے۔ لیکن دوسرے آدمی جن کی آنکھ پر دوربین نہیں ہوتی۔ اس میں شک کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ ہماری عقل میں یہ بات نہیں آتی کہ اتنی دور کی چیز آنکھ کے پاس آگئی ؎

چنانچہ صوفیائے کرام کے مکاشفات غیب پر ایسے ہی لوگ جو ظاہری دوربین کے کمال سے بے خبر ہیں لعن طعن کیا کرتے ہیں۔ کیونکہ ان کو یہ بات بالکل عقل کے خلاف اور عجیب معلوم ہوتی ہے۔ ایسی ہی معراج رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نسبت وہ لوگ جن کی آنکھیں بصیرت کی دوربین سے محروم ہیں اعتراض کرتے ہیں کہ یہ کیونکر ممکن ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم آن کی آن میں ساتوں آسمانوں کو طے کر کے عرش عظیم پر پہونچ گئے۔ پروردگار عالم سے ملاقی ہوئے۔ دوزخ جنّت کی سیر دیکھی اور واپس آئے۔ تو بستر گرم تھا۔ دروازہ کی کنڈی ہل رہی تھی۔ یعنی اتنے عظیم الشان سفر میں چند سکنڈ سے زیادہ عرصہ نہ لگا ؎

مگر اس کو نہیں دیکھتے کہ دوربین کے اندر سے نگاہ آن کی آن میں لاکھوں کوس کیونکر پہونچ جاتی ہے اور

بڑے بڑے مقامات کی سیر کر کے چند سکنڈ میں واپس بھی آجاتی ہے۔ تو آیا یہ مشاہدہ عقل کی موافق ہوتا ہے یا خلاف؟ ◆

اصل یہ ہے کہ نئے زمانے کی تمام ایجادیں اور سائنس کے آلات بظاہر تو لوگوں کو خدا سے بے خبر کر رہے ہیں۔ لیکن اگر کوئی شخص ان کے باطنی حقائق پر غور کرے تو یہی چیزیں مذہبی عقائد کی مستحکم دلیلیں اور خدا پرستی کے

سگنل

بن جائیں اور پھر حیات انسان کی سب ریل گاڑیاں دُنیا کے سٹیشن سے بے خطر پاس ہو کر منزل آخرت تک پہنچ جائیں۔

گلاب تمہارا کیکر ہمارا

از توحید ۴ جولائی ۱۹۱۳ء

ان سب شاعروں کو سامنے سے ہٹاؤ۔ جو گلاب کے پھول پر مرتے ہیں۔ سینکڑوں برس سے ایک ہی چہرے کے طلبگار ہیں۔ یہ سب لکیر کے فقیر ہیں۔ مقلد ہیں۔ سنی سنائی۔ تقلیدی باتوں پر جان دیتے ہیں ◆

میں کچھ اور دیکھتا ہوں۔ مجھ کو ایک اور آنکھ ملی ہے جو ان سب سے اونچی ہے۔ میرے دل کی ہمنشینی و ہمسری کے ان میں سے ایک بھی قابل نہیں۔ میں بندہ ہوں۔ سب بندوں کی مثل ہوں۔ میں بشر ہوں۔ تمام بنی آدم کے برابر درجہ لیکر آیا ہوں۔ میں نبی نہیں ہوں۔ ولی نہیں ہوں۔ مہدی اور عیسیٰ نہیں ہوں۔ دعوی خود نمائی و خود ستائی سے بھی انکار ہے۔ مگر میں عالم تعین و ہستی مثالی کی ایک تصویر ہوں جس میں رنگ فطرت کی قلمکاریاں ہیں۔ اس واسطے میں خود اپنے وجود کا طلبگار ہوں۔ اور اسی لیئے یہ تعلّی یہ خود آرائی ہے تاکہ میں خود کو اپنی خودی دکھاؤں اور خطاب کروں کہ یہ جتنے تک جوڑنے والے شاعر ہیں، سب نے گلاب کے پھول کو تختۂ مشق بنایا ہے۔ کوئی اس کی بھینی بھینی بو پر فدا ہے۔ کوئی اس کی نازک نازک پتیوں پر نثار ہے۔ کسی کو اس کے رنگ سے رخسار محبوب کی یاد پیدا ہوتی ہے کسی کا دل اس کے کھلنے اور مرجھانے کے انقلاب میں اسیر ہے۔ بعض ہیں کہ جو گلاب کے خار سے خار کھائے بیٹھے ہیں۔ خیر یہ جتنی باتیں ہیں ان میں، تو شکایت کا کوئی موقع نہیں ہے۔ کہنا یہ ہے کہ انھوں نے خدا کی بے شمار

مخلوقات کی حق تلفی

کی۔ ایک ہی دروازے پر ڈیرے ڈال دیئے۔ ایک ہی آئینہ کی دید میں مدہوش ہو کر رہ گئے اور ان بے شمار جلوؤں کو نہ دیکھا

جو اُن کے لیئے صفحۂ ہستی پر نمودار کیئے گئے تھے۔ یہ اُنھوں نے بہت بڑا گناہ کیا۔ اس میں اُن سے ایسی خطا سرزد ہوئی ہے جس کی سزا نہایت ہولناک ہونی چاہیئے۔ گلاب کی الفت میں باغ لگائے۔ چمن بنائے۔ مالی محافظ بسائے۔ پانی کھچوائے اور زمین کے تختوں کو سیراب کیا۔ پھولوں کی ٹہنیوں کے سامنے اپنے تخیّل کے ذوق کو سجدے کرائے۔

یہ نصیب نہ ہوا کہ جنگل میں نکل جاتے۔ خودرُو پھولوں کو دیکھتے۔ جن کا مالی خدا ہے۔ جن کا چمن صحرا ہے۔ جن کی سیرابی قدرتی سیلابی سے ہے۔ ان میں ایک

کیکر تھا

کیا چُپ چاپ تھا۔ کیا مضبوط و توانا تھا۔ اس کی شاخیں دیکھی ہوتیں۔ اس کی پتّیوں پر غور کیا ہوتا۔ گلاب کی ٹہنی میں کیا رکھا ہے۔ ایک کمزور لچکنے اور ٹوٹ جانے والی شاخ ہے جس کو آج کل کے

شہزورِ زمانہ

میں بقول ڈارون رہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ یہ وقت اُن کی زندگی کا ہے جو حوادث ایّام کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ جنکے اعضاء دوسروں کے کام آتے ہیں۔ کیکر کی چھال مفید۔ جس سے کپڑے رنگے جاتے ہیں۔ اور مختلف رنگ تیار ہوتے ہیں۔ کیکر کی لکڑی سیکڑوں کام میں انسان کی مدد کرتی ہے۔ کیکر کی پتیاں بکریاں کھاتی ہیں۔ اور آدمی کو دودھ دیتی ہیں۔ کیکر کی پھلیاں بھی چارہ اور رنگ بنانے میں کام آتی ہیں۔

یہ میاں گلاب کس مرض کی دوا ہیں۔ پیٹ میں درد ہو تو گلقند کھلاؤ۔ ہیضہ ہو جائے تو گلاب پلاؤ۔ مرجاؤ تو قبر پر چڑھاؤ۔ اور بھی کوئی کام اس منحوس وجود سے نکلتا ہے۔

گلاب کے کانٹوں کو دیکھو۔ کیسے دھوکہ باز ہیں۔ دکھائی نہیں دیتے۔ ہاتھ لگاتے ہی چُبھ جاتے ہیں۔ کیکر کے کانٹے دور سے نظر آتے ہیں۔ کیا مجال کہ بے خبری میں کسی کو ستائیں۔

گلاب کے کانٹے سوکھ جائیں تو پھینکدینے کی قابل۔ کیکر کے کانٹے سوکھکر گھروں اور کھیتوں کی حفاظت کریں۔ اسی طرح یہ کہ کیکر کا کانٹا کیسا سیدھا سادہ اور نکیلا ہوتا ہے۔ رنگ دیکھو تو وہ بھی انوکھا۔ نرالا۔ شاعروں کے گلاب کو یہ بات کہاں میسّر +

گلاب کے درخت میں پتّے بالکل بدشکل اور بیکار۔ کیکر کی پتیوں کے کیا کہنے۔ کیسی چھوٹی چھوٹی ننھی ننھی ہستیاں ہیں کہ بے اختیار پیار کرنے کو جی چاہتا ہے +

کیکر کا پھول گلاب کے پھول سے لاکھ درجہ اچھا۔ گلاب کا پھول ایک دن کی تیز دھوپ میں کُملا اور مرجھا جاتا ہے اور کیکر کا پھول ہفتوں سورج کا مقابلہ کرتا ہے۔ اور آج کل تعریف اُسی کی ہے جو دشمن کے مقابلہ میں زندہ سلامت رہے

گلاب کا پھول سُرخ یا سُرخی مائل۔ اور ایسا کچّا کہ مالیوں کی اُستادی سے رنگ بدل دیتا ہے۔ مالی جس کو چاہیں سُرخ رکھیں۔ جس کو چاہیں سفید بنا دیں +

کیکر کا پھول اپنے رنگ میں پختہ۔ سارے جہان میں ایک ہی زرد رنگ۔ کیا مجال جو کوئی شخص اُس کے رنگ کو بگاڑ سکے +

شاعر کہتے ہیں۔ گلاب کے پھول سے معشوق یاد آتا ہے۔ میں کہتا ہوں۔ کیکر کے پھول سے عشق یاد آتا ہے جس سے انسان کی رنگت زرد ہو جاتی ہے ٭

اب بتا عشق اچھا یا معشوق۔ عشق نہ ہوتا تو نہ عاشق کو کوئی پوچھتا۔ نہ معشوق کی کچھ وقعت رہتی۔ یہ عشق ہی کی بدولت سب بستیاں آباد ہیں۔

ارے نادان تجھے شاعروں سے کیا کام پہلے اپنے ● د کے تخیلات کو درست کر۔ ان میں فطرت شناسی کا ملکہ پیدا ہونے دے۔ آج گلاب کو چھوڑ کر کیکر کے آگے جھومتا ہے۔ کل اس کو بھی چھوڑ دیو۔ کسی اور کیکر کے جلوہ میں دھیان جما دیو۔ ساری دنیا میں کانٹے پھیلے ہوئے ہیں۔ کس کس جگہ جھاڑ دے گا۔ خود جوتی پہن لے۔ اور راستہ چلنے لگ۔ ہاں تو حق پر ہے ہاں یہی صراط مستقیم ہے۔ یہی وہ راہ ہے جو منزل جاناں تک جاتی ہے۔ من و تو کا حجاب اٹھا۔ اس کے بعد خود اپنی خودی کا پردہ کھول کر اندر گھس جا۔ پھر یہ آواز نہ آئے گی کہ

گلاب تمہارا اور کیکر ہمارا

از توحید۔ ۸ر اگست ۱۹۳۱ء

میں شبنم نہیں کہتا۔ یہ فارس والوں کا لفظ ہے۔ فارس پر ادبار کی اوس پڑ چکی۔ وہ وقت اب کہاں ہے جب ایران کے چمن آباد تھے سعدی و حافظ کی حقیقت شناس نظریں پھولوں کی ڈالیوں اور گھاس کی پتیوں پر شبنم کی بہاریں دیکھتی تھیں۔ اب تو روسی ظالموں کے ستم و جور سے بیوہ اور یتیموں کی آنکھیں قطرات شبنم کی مثل آنسوؤں کی اوس پلکوں پہ جماتی ہیں ٭

برسات کے موسم میں کوئی ٹھنڈی سی ہوا کے جھونکے کا خواستگار ہے۔ کسی کو اودی اودی کالی کالی گھٹائیں پسند ہیں۔ کسی کا دل بادلوں کی کڑک اور بجلی کی چمک سے مست ہو جاتا ہے۔ مجھ کو تو برسات کی یہ ادا بھاتی ہے کہ مینہ برس کر کھل جاتا ہے۔ اور صاف آسمان کی رات گزر جاتی ہو تو صبح کے وقت درختوں۔ پھولوں اور جنگل کی گھاس کی عجیب شان ہوتی ہے۔ اوس کے قطرے پھولوں کی پتیوں پر ایسے چپ چاپ نظر آتے ہیں جیسے رات کو آسمان کے تارے تھے۔ کیا خبر ہے کہ رات کے وقت تارے ٹوٹ پڑے ہوں۔ یہ انہیں کی گل افشانیاں ہیں۔

کہتے ہیں کہ اوس میں سونا۔ اوس میں پھرنا جسم انسان کے لیئے مضر ہے۔ خبر نہیں۔ یہ کیوں کہتے ہیں۔ خدا کی ساری مخلوق تو اوس باری سے تر و تازہ اور نہال ہو جاتی ہے۔ انسان بھی ایک مخلوق ہے اُس کو اس سے کیوں نقصان پہنچتا ہے ٭

یہ تو سائنس والے بتائیں گے کہ اوس کیا چیز ہے۔ کہاں سے آتی ہے کیوں آتی ہے۔ فقیر تو اتنا جانتا ہے کہ اوس قدرت ربانی کا ایک عجیب و غریب جلوہ ہے۔ جن کی آنکھ بہت سویرے بیدار ہونے کی عادی ہے وہ صبح کے وقت سورج نکلنے سے پہلے اوس میں ذات الٰہی کے ہزاروں جلوے مشاہدہ کرتے ہیں۔ ایک شخص کو دیکھا باغ میں جوئی کے پھولوں کے پاس جھکا ہوا کچھ دیکھ رہا تھا اور ایسا مستغرق تھا کہ دنیا و مافیہا کی خبر نہیں تھی۔ درحقیقت جوئی کے پھول پر اوس کا انداز قیامت کا

ہوتا ہے۔ چھوٹا سا پھول۔ نازک نازک پتیاں۔ اور اُس پر اوس کی ننھی ننھی بوندیں جس و حرکت کرنے والے دل کے لیئے دور محشر سے کم نہیں۔ اوس کی عمر بہت تھوڑی ہے۔ رات کو پیدا ہوتی ہے۔ اور سورج نکلتے وقت مرجاتی ہے۔ اوس کی سیرابی باران رحمت کی طرح ہر خاص و عام چھوٹے بڑے نیچے اونچے کے لیئے یکساں مفید ہے گرمیۂ سورج کا مقابلہ کرتا ہے۔ بادلوں کے لشکر لاتا ہے۔ تو آفتاب کو پوشیدہ ہونا پڑتا ہے۔ مگر اوس بیچاری بڑی ڈرپوک صلح کل ہو۔ آسمان پر جب سورج کا عمل دخل نہیں رہتا۔ اور بادل بھی اپنے گھروں میں چلے جاتے ہیں اس وقت یہ نمودار ہوتی ہو۔ اور سورج کے نکلتے کے ساتھ ہی جان دیدیتی ہے۔

اوس کی شکایت

انسان اگر یہ شکایت کرے تو حق بجانب ہے کہ اوس تمام در و دیوار کو شجر و حجر کو تر کر دیتی ہے۔ مگر کسی پیاسی زبان کی تشنگی دور نہیں کر سکتی۔ اُردو زبان میں ایک مثل ہے کہ اوس جب پڑتی ہے تو ہاتھی بھیگ جاتا ہے۔ گویا ہاتھی اوس میں نہا لیتا ہے۔ مگر چیڑیا کی پیاس نہیں بجھتی۔ یہ قدرت کا ایک نہایت گہرا راز ہے۔ اس میں اوس کی کچھ شکایت نہ کرنی چاہئے بہرحال اللہ تعالےٰ کی نشانیوں میں سے اوس بھی ایک نشانی ہے۔ جس کو دیکھ کر دلِ حق پرست میں عرفان یزداں کے جذبات پیدا ہوتے ہیں ۔

رمضان میں سیاہ و سفید ڈورے کی رہنمائی

(از توحید ۱۰ اگست ۱۹۱۳ء)

دُنیا کی سب سے بڑی کتاب میں رمضان کی نسبت خدا نے لکھا کلوا واشربوا حتّٰی یتبیّن لکم الخیط الابیض من الخیط الاسود من الفجر۔ کھاؤ پیو جب تک کہ صبح کا سفید ڈورا کالے ڈورے سے نمایاں نہ ہو جائے۔ اہلِ فقہ کہتے ہیں کہ صبح کاذب کے بعد جب صبح صادق نمودار ہونے لگے تو کھانا پینا ترک کر دینا چاہیئے۔ ایک جماعت نے اس آیت کی تفسیر میں یہ بھی بیان کیا ہے کہ صبح صادق جب ہوتی ہے کہ نور سحر کے سبب آنکھ کالے سفید ڈورے میں تمیز کرنے لگے ۔

یہ تو اہلِ علم کے مسائل ہیں۔ گدڑی پوش بنیوا کو یہ بحث مقصود نہیں ہے۔ وہ تو قرآن بھیجنے والے کی اس ادا کو دیکھنا اور دکھانا چاہتا ہے۔ جو خیط ابیض اور خیط اسود یعنی سفید کالے ڈورے کے الفاظ میں نظر آتی ہے ۔

اگر زخمی دل والوں اور تیر خوردہ اہلِ جگر کو معلوم ہو جاتا کہ روزے کی سحری میں انوار و ظلمات کے کرشمے دکھائے جاتے ہیں اور رُخ و زلف کے جلووں سے رہنمائی ہوتی ہے تو ساری عمر روزہ ترک نہ کیا جاتا۔ اور غالباً یہی وجہ ہے جو بعض مست الست بارہ مہینے لگاتار روزے رکھتے ہیں۔ ان پر انہی کالے سفید ڈوروں نے ڈورے ڈالے ہیں۔ بخلقت ولایتی گھڑیوں۔ گولوں اور نقاروں پر آسرا جمائے بیٹھی رہتی ہے۔ ہزار میں شاید ایک آدمی کو بھی سحری کے وقت خدا کی بتائی ہوئی گھڑی کا خیال نہ آتا ہوگا ۔

اگر وہ مجازی حیثیت سے ہی صبح کاذب اور صبح صادق کو محض وقت سحری معلوم کرنے کے لیئے دیکھا کرتے تو وقت سحر کے ہزاروں جلوے آسمان پر نظر آئیں +

چشم حقیقت ان سیاہ و سفید ڈوروں میں رات دن کی سیاہی سفیدی سے علحدہ ایک چیز دیکھتی ہے۔ اس لیئے اس کو رمضان کی سحری۔ میونسپل کمیٹی کی ممبری۔ چھوٹے لاٹ کی کونسل کی ممبری۔ بڑے لاٹ کی کونسل کی ممبری بلکہ اس سے بھی آگے عہدۂ ججی اور اگر میسر آئے تو منصب وایسرائے یا وزیر ہند اس سے بھی بڑھکر ہفت اقلیم کی بادشاہی سے بھی اچھی معلوم ہوتی ہے +

دُنیا کے حریص بادشاہوں اور امیروں سے کہو کہ اپنی طمع کاریوں کو چھوڑ دیں۔ اور پچھلی رات بیدار ہو کر کالے سفید ڈوروں کی بہار دیکھیں۔ کہ کیونکر رات کی تاریکی میں نور کی سپیدی نمودار ہوتی ہے۔ اور اس ظہور کے وقت دل کو اگر اس میں حس ہو۔ کیسی لذت آتی ہے۔ اگر وہ اس لذت کا ایکبار بھی معائنہ کریں تو دُنیا کے یہ تمام جھگڑے فساد مٹ جائیں۔ مگر وہ سیاہ سفید ڈورے والے جناب تو خیر و شر کے قبضہ دار ہیں۔ وہ کب گوارا کریں گے کہ یہ آنکھ ان کی شان کو دیکھ کر لُطف اُٹھائے +

گیان کتھا

از توحید ۱۶ ستمبر ۱۹۱۳ء

اپنے گیانی دیس ہندوستان کو کیا کہوں۔ بدیسی سنگت سے اگیانی ہو گیا۔ یونیورسٹی کی کتابوں میں صبر و سنتوش شانتی و اطمینان کا رستہ ڈھونڈھتا ہے +

کل پچھلی رات آکاش بانی صدائے ہتو میرے کان میں آئی۔ کہا۔ علم کاغذی کتاب میں نہ دیکھ۔ سنسار کائنات۔ ہستی موجود کا ورق کھول۔ اس میں دھیان کر + اور گیانی بن۔ میں نے کہا۔ تو آ۔ اور مجھ کو پڑھا۔ میرے پرم گیان پربھو۔ عالم اسرار خداوند نے اس کو مانا۔ اور مجھ پر نازل فرمایا +

پانی دیکھنے میں ایک۔ مگر مزا سمندر کا کھاری۔ کنوئیں۔ دریا کا میٹھا۔ گلاب کی جڑ اور تخم ایک۔ لیکن پھول۔ پتے کانٹے میں جدائی۔ پانی کی افراط درخت کو گلا دیتی ہے مگر کنول کے پھول کی زندگی لبریز پانی سے ہے +

تو دیکھ۔ بگلا سفید ہے۔ کوئل کالی ہے۔ طوطا سبز ہے۔ تو سُن۔ انجن کی سیٹی کان کو ناگوار ہے اور پپیا کے نغمے دلنواز۔ تو چکھ۔ اِملی کھٹی ہے۔ نیم کڑوا ہے۔ گھر سے نکل پہاڑ اونچے ہیں۔ زمین نیچی ہے۔ دریا بہتے ہیں۔ کنارے ساکن ہیں۔ غور کر۔ سورج روز نکلتا اور روز چھپ جاتا ہے۔ رات دن کے چوبیس گھنٹوں میں نور و ظلمت کی دو حکومتیں پلٹ جاتی ہیں +

یہ کیوں ہے؟

تیرے صبر و قرار کے لیئے سنسار بے قرار ہے۔ شعلے بھڑکتے ہیں۔ دریا بہتے ہیں سمندر موجیں مارتا ہے۔ ہوا چلتی ہے

بادل آتے جاتے برستے برساتے ہیں۔ بجلی چمکتی کڑکتی ہے۔ بوندیاں اعلیٰ سے اسفل ہوتی ہیں۔ تاکہ تیرا وجود انقلاب ایام سے گھبرا نہ جائے۔ اور جانے کہ گردش ہر موجود کی ڈیوٹی ہے۔ بدلنا ہر حالت کا اقتضا ہے۔ سمندر ملتا۔ اور نشیب و فراز کے عالم اپنی صحت کی خاطر برداشت کرتا ہے۔ ورنہ اس کا پانی سڑ جائے۔ دریا اپنی زندگی کے لیے رواں دواں ہے۔ ورنہ تالاب کا گندہ پانی کہلائے۔ ہوا نہ چلے تو کمزور زہریلی اور بھاری ہو جائے۔ شعلۂ آتش نہ بھڑکے تو دھوئیں کی تاریکی میں نابود رہے۔ بادل نہ برسیں تو دوسرے سال سمندر میں ابخرے پیدا نہ ہوں اور اُن کی نسل قطع ہو جائے۔ بجلی چمکنا گرجنا چھوڑ دے تو فلک کے اعیان و اشراف میں بے آبرو ہو جائے۔ بوندیاں خاک کی پامالی سے انکار کریں تو ابر رحمت کے خطاب سے محروم کر دی جائیں۔

انسان! آدمی!! خیال کر۔ جب ہر چیز اپنی غرض اور ذاتی مطلب کے لیے متحرک ہے۔ تو تو کیوں پریشان ہوتا ہے۔ کرم کر۔ عمل کر۔ گیان۔ موکش۔ نجات۔ سرور ابدی۔ عمل و حرکت میں ہے +

دُنیا کی بُنیاد خوشی و راحت پر ہے

دیوانہ ہوا ہے۔ زندگی کو آلام و مصیبت کی پوٹ سمجھتا ہے۔ تو کیسا نادان ہے۔ میں نے نیچر و فطرت کی بنا خوشی و راحت پر رکھی ہے جب تو بیمار ہوتا ہے۔ ابر سورج پر آجاتا ہے۔ دریا کنارے سے اُبل پڑتا ہے۔ تو تو صحت۔ روشنی اور سیلاب سے سلامتی مانگتا ہے اور کہتا ہے کہ میں تکلیف میں ہوں۔ مگر بیماری کے جاتے رہنے۔ بادل کے پھٹ جانے۔ طوفان کے تھم جانے سے کیا کوئی نئی چیز حاصل ہوتی ہے۔ بیماری گئی تو وہ ہی تندرستی آئی جو پہلے تھی۔ بادل پھٹا تو وہ سورج چمکا جو پہلے اسی طرح چمکا کرتا تھا۔ طوفان رُکا۔ دریا سمٹا تو وہی کنارہ نظر آیا جو ہمیشہ خشک رہا کرتا تھا۔ کوئی نئی چیز تجھ کو حاصل نہیں ہوئی۔ اس کو سوچ۔ میں نے تجھ کو تندرست بشاش مطمئن پیدا کیا ہے۔ تیرے اعمال۔ تیرے کرم تجھ کو تکلیف دیتے ہیں۔ جو عارضی ہوتے ہیں۔ اور اس کا دور ہونا اور اصل بنیاد کا از سر نو نمودار ہونا میرا اٹل قانون ہے۔ اس واسطے عارضی تکلیفات سے مضطرب اور مایوس نہ ہوا کر +

پھانس نکلنے کو چبھتی ہے۔ پیاس بجھنے کو لگتی ہے۔ بھوک پیٹ بھرنے کے لیے پیدا ہوتی ہے۔ جب کانٹا چبھے تو سمجھ لے کہ اس کو ایک وقت نکلنا ہے۔ بھوک پیاس کی خواہش ہو تو خیال کر کہ کھانا پانی ملنا لازمی ہے۔ بیماری آئے تو یقین کر کہ تندرستی بھی اس کے ساتھ ہے +

میں نے آدم کو اپنے وجود محیط الکل کا آئینہ بنایا ہے۔ اس میں میری کبریائی دیکھ۔ میری رعنائی اور قہاری مشاہدہ کر۔ میری رحمدلی و ملنساری کو محسوس کر۔ اسرار مخفی کے نمود و ظہور کی خاطر یہ کارخانہ بنا ہے۔ ان کو نمودار ہونے دے۔ جب تو آئینہ ہے تو میرے ہاتھ میں رہ۔ اور جو کچھ تجھ میں نظر آئے اُس میں دخل انداز نہ ہو +

معبود و عبد نواز کے اس القا کے بعد میں نے اپنے جسم۔ اپنی قوم کے جسم۔ اپنے ملک کے جسم۔ اعضا سے خطاب کیا۔ جو حوادث ایام سے آشفتہ تھے۔ اور روح سے نادانی کے مطالبات کر رہے تھے۔ اور کہا ظہور صفات کے کرشموں سے ہراساں اور مایوس نہ ہو۔ اور اپنے رب پر توکل و اعتماد سیکھو۔ جس میں راحت و ایمان ہے +

ہردوارِ گنگا کے کنارے چنتامن مورتی

از توحید ۱۳ ستمبر ۱۹۱۲ء

کیسا اچھا وقت تھا۔ جب اس مضمون کا لکھنے والا۔ ننگے پاؤں۔ ننگے سر۔ بغل میں جھولی۔ کندھے پر کمبل۔ ہاتھ میں ڈنڈا لیئے۔ ہردوار میں ہر کی پیڑی کے سامنے گنگا کے عالمِ آب کی بہار دیکھ رہا تھا ۔

دریا لہریں مارتا۔ نہانے والوں کے میل کچیل کو صاف کرتا۔ پختہ سیڑھیوں کو گلے لگاتا۔ اٹھکھیلیاں کرتا ہوا جا رہا تھا ۔

مجھ کو عالمِ محویت و استغراق میں دیکھ کر ایک سادھو مورتی اُدھر آن نکلی۔ میں سمجھا کوئی پوجاری ہے۔ اس لیئے توجہ نہ کی۔ اور مُنہ پھیر لیا۔ کیونکہ تین روز سے پوجاریوں نے میرے اطمینان کو غارت کر رکھا تھا۔ اجنبی دیکھکر نذرانے مانگتے تھے۔ اور سکوت کے لُطف کو برباد کرتے تھے ۔

سادھو داتا تاڑ گئے اور بولے۔ گنگا جی کی لہروں میں دُکھ سُکھ دونوں ہیں۔ دُکھ سے گھبرانا سُکھ سے ہاتھ اُٹھانا ہے۔

کانوں کو اس مزیدار بات نے متوجہ کر لیا۔ مُڑ کر دیکھا۔ عجب مستانی صورت تھی۔ ساٹھ ستّر برس کی عمر۔ مگر آنکھیں عہدِ شباب کی مستی سے مخمور۔ چہرہ ماہتاب کی مانند پرنور میں بولا۔ جا بابا اپنا کام کر۔ یہاں دُکھ سُکھ سے غرض نہیں۔ ہر کا نام سُننا تھا۔ دوار کے لفظ نے بیتاب کیا تھا۔ اِدھر بھی آ گئے۔ دُکھ سُکھ کا قصہ اُن کو سُنا۔ جنھوں نے یہ سامنے کا کتبہ لگایا ہے۔ جس میں گنگا جی کے مناقب ہیں۔ سادھو نے مُنہ پھیر کر اُس پتھر کو دیکھا۔ جس پر اُردو زبان میں گنگا کی تعریف کے اشعار کندہ تھے۔ اور ہنسکر میری طرف متوجہ ہوا۔ اور کہا۔ ان لکیروں سے تو مجھ کو بھی کچھ سروکار نہیں۔ اپنی جھولی کو ٹٹولو۔ اس میں کیا ہے ۔

میں نے کہا۔ اس کو نوٹ بُک کہتے ہیں۔ جی چاہتا ہے تو اس میں کچھ لکھ لیتا ہوں۔ کہنے لگا۔ اس کے پانچویں ورق میں کیا یادداشت لکھی ہے؟۔ اس سوال نے متعجب کیا۔ نوٹ بُک نکالی۔ دیکھا۔ لکھا تھا۔ ہردوار یا رشی کیش میں کوئی کام کا فقیر ملے۔ تو اُس سے خواب کا بھید دریافت کرنا چاہیئے ۔

سادھو کے مکاشفے سے حیرانی ہوئی۔ مگر اطمینان کے لہجہ میں کہا۔ میں نے وہ ورق دیکھا۔ آپ اس کا جواب دے سکتے ہیں ؟۔

بولے۔ ہاں۔ میں اسی لیئے آیا ہوں۔ تم ابھی بیدار رہو۔ اور دُنیا کے بیدار کرنے کا گھمنڈ دل میں ہے۔ اس کو چھوڑو۔ آنکھیں بند کرو تاکہ نیند کا طلسم کھُل جائے ۔

میں نے کہا۔ کس کا سونا۔ کیسا جاگنا۔ بات کو چکّر میں نہ ڈالو۔ میں نے بہت سی آنکھیں دیکھی ہیں۔ جو کہنا ہو صاف صاف کہو۔ فرمایا۔ گنگا میں اشنان کیا ؟ عرض کی کئی بار۔ فرمایا۔ کچھ دیکھا ؟ کہا۔ کچھ نہیں۔ ارشاد ہوا اب نہاؤ۔ دل میں خطرہ گذرا کوئی چور نہ ہو کمر کی نقدی کو بھانپ کر کپڑے اُتروانے چاہتا ہو۔ اس لیئے عذر کیا کہ اس وقت نہیں نہاؤں گا۔ بولے۔ اچھا جانے دو۔ دل کو شبہ کے گناہ سے بچاؤ۔ اور لو سُنو۔ کان میں کچھ کہوں۔ میں نے سر جھُکا دیا۔ اور سادھو داتا نے خواب کی نسبت کچھ کہا ۔

بات معمولی تھی۔ جس کو میں اکثر سوچا کرتا تھا۔ مگر اس انداز کی تھی کہ جی بے قرار ہو گیا۔ فرمایا۔ لو جاتے ہیں۔ اور اُٹھکر چلنے لگے میں نے بے اختیار ہو کر دامن پکڑ لیا۔ اور عرض کی نام بتاتے جائیے ٹھکانے کا نشان فرمائیے تاکہ پھر درشن ہو جائیں۔ بولے چنتامن اس مورت کا نام ہے۔ اور مقام کا کچھ ٹھیک نہیں۔ آج یہاں۔ کل وہاں۔ ہردوار میں دھوکہ بازوں سے بچنا۔ رشی کیش جاؤ

تو وہاں بھی ہر اچھی صورت پر فریفتہ نہ ہو جانا۔ بہت سے دوکاندار فقیری لباس میں ملیں گے۔ مگر جو بات کان میں کہی ہے اُس کو یاد رکھوگے تو گنگا کنارے آنے کا پھل مِل جائے گا +

گنگا جس کا نام ہے۔ وہ یہ دریا نہیں جو پانی کی صورت میں رواں دواں نظر آتا ہے۔ گنگا کی عظمت کو اس خیال سے کیا سروکار جو نئی روشنی کے لوگ مادی صورت میں پیش کیا کرتے ہیں۔ گنگا کی حقیقت بڑے سوچ بچار سے معلوم ہوتی ہے۔ یہ کہا اور چل دیے +

اُنگلی کا کشف

از نظام المشائخ مئی ۱۹۱۲ء

دل۔ دماغ اور روح کا کشف سب نے سنا ہوگا۔ اُنگلی کا کشف عجیب ہے۔ مگر اُن کے لیے جو انسانی اسرار سے بے خبر ہیں۔ اور نہیں جانتے کہ اس بولتی چالتی مورت میں اللہ میاں نے کیا کیا بھید رکھے ہیں +

کشف کے منکر تو یہاں تک کہتے ہیں کہ کسی انسان میں کشف غیب کی طاقت نہیں یہ جو اولیاء اللہ کی نسبت کہا جاتا ہے کہ اُن کو کشف کے ذریعہ اُمور مخفی معلوم ہو جاتے ہیں۔ سب غلط اور توہم پرستی ہے۔

لیکن ہمیں انکار اقرار سے کیا سروکار۔ ہم تو کشف پر عقیدہ رکھنے والے لوگ ہیں۔ جو قصہ اس قسم کا سنتے ہیں ایمان تازہ ہوتا ہے۔ اور اسرار ربانی کی عظمت بڑھتی ہے +

دہلی میں میرے ایک دوست ڈاکٹر سراج الدین نامی ہیں۔ حبش خاں کے پھاٹک میں مطب کرتے ہیں طبی اور جراحی قابلیتوں میں اپنی نظیر نہیں رکھتے۔ باعتبار مشرب اہلِ حدیث یعنی غیر مقلد ہیں۔ لیکن ان کی عادات و خصائل سچے اور پکے درویشوں کی سی ہیں۔ یعنی بے طمع۔ سادگی پسند۔ فقیر دوست۔ صلح کُل۔ ہزاروں غریب ان سے فیض پاتے ہیں۔ قصہ مختصر چار صدی اوّل کے درویشوں کا نمونہ ہیں +

میں بیمار تو زیادہ ہوتا ہوں۔ مگر علاج زیادہ نہیں کرتا۔ اور کرتا ہوں تو اس غیر مقلد درویش کا۔ خدا تعالےٰ نے بھی ڈاکٹر صاحب کی صادق بندگی کو محروم نہیں رکھا۔ اور ہاتھ میں وہ اثر دیا ہے کہ ان کے بیمار عموماً اچھے ہو جاتے ہیں اور سب سے عجیب کمال یہ عطا ہوا ہے کہ ان کی اُنگلیوں کو کشف ہوتا ہے۔ جسم کو ٹٹولکر بتا دیتے ہیں کہ یہاں پھوڑا ہے۔ اتنا بڑا۔ اتنا گہرا۔ اور اتنی پیپ اس کے اندر ہے اتنے عرصہ میں اس کا مواد پُختہ ہو جائے گا۔ بظاہر یہ امر ایک معمولی معلوم ہوتا ہے۔ ہر جرّاح اور تجربہ کار ڈاکٹر اس قسم کی باتیں بتا سکتا ہے۔ مگر تعجب تو اس کا ہے کہ کبھی ان کی رائے غلط نہیں ہوتی۔ بڑے بڑے سند یافتہ ڈاکٹروں کے مقابلہ میں ان کی رائے درست نکلتی ہے اور ایسی درست کہ ذرّہ بھر فرق نہیں رہتا۔ دہلی و بیرونجات میں جن لوگوں کو ان سے سابقہ پڑا ہے وہ ایسے سیکڑوں واقعے جانتے ہونگے لیکن ابھی حال میں جو معرکہ پیش آیا ہے وہ سب سے عجیب ہے۔ دہلی میں ایک مشہور و معروف ڈاکٹر زیڈ احمد صاحب ہیں جن کو شاید سرکار سے ہزار روپیہ کے قریب ماہوار پنشن ملتی ہے۔ سُنا ہے اُن کے جسم میں کہیں پھوڑا ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر سراج الدین کو بُلایا گیا۔ اُنھوں نے بتایا کہ پیپ پڑ گئی ہے۔ نشتر لگانا چاہیئے۔ انگریز سول سرجن اور چند دیگر ڈاکٹر بلائے گئے۔ اُن سب کی رائے ہوئی کہ پیپ نام کو نہیں۔ نہ ابھی پھوڑا پکّا ہے۔ آخر بڑی حجت اور پورے غور و خوض کے بعد چیرا دیا گیا تو ڈاکٹر سراج الدین کی رائے صحیح نکلی +

رمزِ حقیقت

ڈاکٹر سراج الدین کی یہ قابلیت رمزِ حقیقت ہے۔ خدا تعالےٰ دکھانا چاہتا ہے کہ کسب اور کوشش سے اُنگلی تک کاشف حقیقت بن جاتی ہے۔ روحانی کشف تو اس سے بھی بڑھکر کشافِ حقیقت ہوتا ہوگا +

ڈاکٹر سراج الدین ناراض نہ ہوں اُن کے عقیدے پر حملہ کرنے کی نیت سے یہ نہیں لکھا جاتا۔ وہ اگر اپنے مشربِ اہلِ حدیث کے سبب کشف کے قائل نہ ہوں تو مضائقہ نہیں۔ ہم اُن کی اُنگلی کے کشف کے دل سے قائل ہیں۔ اور قدرت ایزدی کے کرشموں پر سر ہلاتے والے ستانوں کی اطلاع کے لیئے اس خبر کو درج کرتے ہیں۔ امید ہے کہ اس بات کا علم بہت لوگوں کے باطنی لطف وطرب کا باعث ہوگا +

اینٹ چونے کا وصال

از نظام المشائخ جون ۱۹۱۲ء

ایک دن کا ذکر ہے انبالہ شہر میں کسی شان دار مکان کے اندر آدم کی اولاد جوق جوق جمع ہو رہی تھی۔ ہر ابن آدم کا چہرہ بشاش تھا۔ آنکھیں شگفتہ تھیں۔ گویا وہ کسی ایسی چیز کے دیکھنے کو آئے تھے جو اُن کے دل و دماغ پر شوق و اشتیاق کے عالم میں چھائی ہوئی تھی +

ایک آدم زاد ان میں ایسا بھی تھا جو مکین سے پہلے مکان کے تماشے میں محوِ حیرت تھا۔ اور کہتا تھا۔ او مکان! تو مجھ سے قد میں بھی بڑا جسم بھی تیرا بہت چوڑا چکلا۔ مگر زبان بالکل نہیں۔ مجھ کو دیکھ سوا دو گز اونچا ہوں لیکن زبان بارہ ہاتھ کی رکھتا ہوں میرے پاس اتنے آدمی مہمان آتے تو خوب جی کھولکر باتیں کرتا۔ اپنی کہتا اُن کی سُنتا۔ تیری طرح ساکت و صامت رہکر یہ نہ کہواتا کہ میزبان مُنہ سے نہیں بولتا۔ شاید اس کو مہمانوں کا آنا ناگوار ہوا ہو۔ آدمی کے اس اعتراض کا مکان نے تو کچھ جواب نہ دیا۔ البتہ خود اُس کے دل نے اُس سے کہا۔ من عرف کل لسانہ جو پہچان لیتا ہے اُس کی زبان گونگی ہو جاتی ہے۔ اور کبھی بھید کی بات لب تک نہیں آنے پاتی۔ اس مکان کے جتنے اجزا ہیں سب نے اپنے مقامات فنا سے گزر کر یہ مقام بقا حاصل کیا ہے اب اس کو کیا ضرورت ہے کہ باتونی آدمی کو مُنہ لگائے۔ وہ آدمی جو دعوئے اشرف المخلوقات کے باوجود امتحانات فنائی سے دم چُراتا ہے اور بغیر امتحان دیئے بقا کی ڈگری مانگنے پر آمادہ ہے۔

آدمی اپنے دل کی اس گفتگو سے خفا ہوا۔ تیوری چڑھائی اور دل ہی دل میں کہنے لگا۔ اللہ میاں نے انسان کو سب طاقتیں دیں۔ مگر ایسی کوئی قوت نہ دی جس سے یہ آستین کا سانپ خیال قابو میں آجاتا۔ میں چاہتا ہوں کہ میرے ذہن میں وہی بات پیدا ہوا کرے جو مجھ کو اچھی معلوم ہو۔ یہ نہیں کہ میاں خیال رہیں تو میرے دل و دماغ میں۔ اور تعریف کریں دوسروں کی میں ہاتھ سے کماتا ہوں۔ پکاتا ہوں۔ کھاتا ہوں۔ دانت سے چباتا ہوں۔ اور پیٹ سے ہضم کرکے دل اور اُس کے تخیلات کو غذا پہونچاتا ہوں۔ پھر اُس کو کیا حق ہے کہ کھائے پیئے میرے دسترخوان پر اور مدح سرائی دوسروں کی کرے۔ بسا ایسا ہوا ہے کہ میں اپنی کوئی حسرت پوری کرنی چاہتا ہوں تو یہ خیال دامن پکڑتا ہے۔ اور دوسری طرف لے چلنے کی ضد

کرتا ہے۔ بس عالم تصور میں ایک نقشہ جمانا چاہتا ہوں۔ یہ اُس کا رنگ بگاڑ کر دوسرے رُخ متوجہ ہو جاتا ہے۔ کوئی ایسی مشین نہ نکلی جس کے ذریعہ سے دل و دماغ کے باشندے خیالات قبضہ میں آجاتے اور آزاد انسان اُس نظر نہ آنے والی ہستی کی قید سے رہائی پا جاتا۔

آدمی اتنا ہی سوچنے پایا تھا کہ اس کو صوت سرمدی میں ایک قہقہے کی آواز آئی۔ کہنے والے نے کہا۔ تسخیر تخیل کی مشین مدت سے موجود ہے۔ تو کہاں تھا۔ کس حال میں تھا۔ جو آج تک اس کی خبر نہ ملی۔ ارے نادان۔ اگر تو ایک دروازے کو مضبوط پکڑ لے۔ دربدر مارا مارا پھرے تو تیرا دل اور اُس میں رہنے والا خیال بھی ہر جائی پنا چھوڑ دے۔ اس مکان کو نظرِ غور سے دیکھ۔ جس پر بحث کا سلسلہ شروع ہوا ہے۔ کہ جب اس کے منتشر اجزاء۔ اینٹ۔ چونہ۔ شہتیر ایک مرکز پر جمع ہو گئے۔ کثرت کا نام فنا ہو گیا۔ (یعنی اب کوئی اینٹ چونے کا علیحدہ نام نہیں لیتا۔ سب کے مجموعہ کو مکان کے نام سے پکارتے ہیں) تب اس کو یہ درجہ حاصل ہوا کہ اشرف المخلوقات آدمی اس کی دید کو جمع ہوئے۔ تو بھی اگر اپنے ارادے و خیال پر قبضہ حاصل کرنا چاہتا ہے تو حرص و ہوس۔ بغض و نفاق کی ہستی کو آتش عشق سے جلا ڈال۔ اور اپنے جذبات پراگندہ کو ایک بُنیاد پر چُن لے۔ پھر دیکھ کہ خیالات قابو میں آتے ہیں یا نہیں ٭

ذرا پھر غور کر۔ اس مکان میں لکڑی ہے۔ اینٹ ہے چونا ہے۔ لوہا ہے۔ لکڑی کو فنائی امتحان کے کتنے درجے طے کرنے پڑتے ہیں۔ اولی ہرا بھرا درخت تھا۔ جنگل میں آزادی و خود مختاری سے ٹھنڈی ہوا کھاتا۔ اور پاؤں کے ذریعہ زمین کا پانی پیتا تھا۔ جب داخلۂ امتحان کا وقت آیا۔ کلہاڑی سے کاٹا گیا۔ آری سے چیرا گیا۔ برمے سے برمایا گیا۔ رندے سے چھیلا گیا۔ جب کہیں یہ رتبہ ملا کہ ایک شاندار مکان کا حصۂ ارزینت ہے۔ اینٹ کو دیکھو۔ زمین کا سینہ چاک کر کے کدال اور پھاوڑے مار مار کر مٹی باہر نکالی گئی۔ پانی ملا کر خوب روندی اور مسلی گئی۔ سانچے میں ڈھال کر اُس کی ایک شکل مرتب ہوئی۔ مٹی نے ہر چند کہا کہ سب کچھ منظور۔ مگر میرے ہمجنس ذرات خاک کو باہم جدا نہ کرو۔ ایک ہی جگہ رہنے دو۔ الگ الگ اینٹیں بنائی جائیں گی تو خانۂ وحدت کے ذرّے جلاوطن اور خانہ ویران ہو جائیں گے۔ لیکن اس کی فریاد کسی نے نہ سُنی۔ یہاں تک کہ وہ دھوپ سے تپ تپ کر خشک ہو گئی۔ اس کے بعد بے چاری آگ کے گھر میں بھیجی گئی۔ یا یوں کہیے کہ ناری قبر میں دفن کی گئی۔ لوگ اس آتشی مقام سے گذرتے تھے مگر کسی کو خیال بھی نہ آتا تھا کہ اس کے اندر کون جل رہا ہے۔ جب اینٹ پر یہ بے کسی۔ کس مپرسی اور سوختت کامل کا وقت گذر گیا تو امتحان کی سند دی گئی۔ خاکی پیراہن کے بدلے سُرخ رنگ کا لباس مرحمت ہوا۔ ٹھیلے پر سوار کر کے شہر میں لائی گئیں۔ حوض میں غسل دیا گیا۔ اور ان سب کو جو امتحان سے پہلے ہم جنس کی فرقت سے پریشان تھیں۔ ہم آغوشی کی گھڑی نصیب ہوئی۔ کنکر زمین کا لخت جگر کدال کی نوک سے پارہ پارہ ہو کر باہر کھنچا۔ آگ میں بھُنا۔ چونہ کہلایا۔ چکی میں پیسا۔ پھر کہیں یہ نوبت آئی کہ عرصۂ دراز کی فرقت کے بعد اپنی ہموطن اینٹ سے وصال یابی نصیب ہوئی۔ اسی طرح لوہا بھی جلنے کُٹنے پٹنے کی متعدد منازل کے بعد اس قابل ہوا جو اس مکان میں جگہ پائے ٭

جب یہ بے جان اشیاء کوفت و سوخت کے بغیر مرکز وحدیت و طمانیت پر نہیں آسکتیں تو پھر تو اشرف المخلوقات کہلا کر ان امتحانوں سے کیونکر محفوظ رہ سکتا ہے۔ تو نے سُنا بھی۔ کہنے والا کہتا ہے۔ خام بودم۔ پختہ شدم۔ سوختم۔ پہلے کچا تھا۔ پھر پکا اس کے بعد جلکر منزل حاصل کی۔ یہی کیفیت۔ اینٹ۔ چونے۔ لوہے کی ہوئی کہ ابتدا میں وہ بھی کچے تھے۔ پکے اور جلنے کے بعد وصال نصیب ہوا۔ جس کی خوشی منانے آج اتنے آدم زاد جمع ہوئے ہیں۔ اسی طرح آدمیوں میں جو لوگ خامی سے گزر کر پختگی و سوختگی حاصل کر لیتے ہیں تو اُن کی قبروں پر بھی لوگ جمع ہوتے ہیں۔ اور اس اجتماع کو عرس کے نام سے پکارتے ہیں۔ عرس کا لفظ عروس سے ہے جس کے معنی شادی و خوشی کے ہیں۔ گویا عرس منزل رسیدہ لوگوں کی اصطلاح میں اُس موت کی یادگار ہے جو پختگی و سوختگی کے

بعد مقام وصال ولقا تک لی جاتی ہے +

نتیجہ

آدمی اور اس کے دل کی گفتگو سے یہ نتیجہ نکلا کہ جب تک امتحان فنائی کی تکلیفات، ومصائب کو برداشت نہ کیا جائے۔ یوم الوصال میسّر نہیں آتا۔ اور خیالات مرکز توحید پر جمع نہیں ہوتے +

لہٰذا ہم سب کو بھی اسلامی خدمت کے معاملے ہیں۔ اس بے جان مگر معصوم ہستی کی مثال بغرض تقلید پیش نظر رکھنی چاہیئے اور مردانہ وار آگے بڑھ کر دکھانا چاہیئے کہ ابن آدم اینٹ چونے سے گیا گزرا نہیں ہے +

دوا کی شیشی کی باطنی اشارے

آنکھ نے دیکھی کان نے سنی

از نظام المشائخ اگست ۱۹۱۲ء

جب ڈاکٹر انصاری نے اپنے کان میں وہ آلہ چڑھایا۔ جس کو کان کی عینک کہنا چاہیئے۔ اور حسن نظامی کے سینے کو دیکھنا شروع کیا تو حسن نظامی کی آنکھ نے ڈاکٹری ساز وسامان سے باتیں شروع کیں۔ اور ان سے کچھ سُنا۔ گویا ڈاکٹر صاحب کے کان نے دیکھا۔ اور حسن نظامی کی آنکھ نے سُنا +

ڈاکٹر نے کہا معدہ وجگر میں ورم ہے۔ پھیپھڑہ اپنے غنیم امراض کا مقابلہ کرتے کرتے تھک گیا۔ اس کو سکون کی ضرورت ہے۔ دماغ ترک مشاغل کا خواستگار ہے۔ یہ نسخہ استعمال کرو اور چُپ چاپ ہو کر بیٹھو +

کان کی تشخیص سے ڈاکٹری زبان تقریر کر رہی تھی۔ مگر اُس کے جواب میں حسن نظامی کی آنکھ نے دخل نہ دیا۔ وہ برابر اُن اشیا کو دیکھتی رہی جو میز پر مراقبۂ ربّانی میں مصروف تھیں +

قلم آزادی سے دوات کے پہلو میں بیٹھا تھا کہ ڈاکٹری ہاتھ نے اُس کو گرفتار کیا۔ اور کہا لکھ۔ اُس نے تعمیل کی۔ اور کاغذ پر حرکت کرنے لگا۔ پوچھا گیا کیا لکھتا ہے۔ بولا۔ کچھ خبر نہیں۔ ہاتھ کا تابعدار ہوں۔ جو چاہتا ہے لکھواتا ہے۔ ہاتھ کی آواز آئی نہیں میرا اس میں کچھ دخل نہیں۔ آنکھ کے اشارے سے لکھ رہا ہوں۔ آنکھ نے بگڑ کر کہا۔ کان نے مرض کی شناخت کی ہے۔ وہی لکھواتا ہوگا۔ کان نے کہا نہیں جناب مجھے بھی کچھ خبر نہیں۔ یہ تو کسی اور طاقت کا کام ہے +

حسن نظامی اس عجیب انکار یہ بحث کو سُن رہا تھا کہ نسخہ تیار ہو گیا۔ کاغذی پُرزا تھا۔ دوا فروش نے پڑھکر دو شیشیاں دیدیں۔ جن پر ولایتی لاکھ کی سُرخ مُہر لگی ہوئی تھی +

جب یہ شیشیاں گھر میں آئیں۔ کاغذی خرقے سے برہنہ ہوئیں۔ واحدی صاحب نے بستر بیمار کے قریب لاکر رکھا۔ چاقو منگایا تاکہ بھید کی مُہر شیشی کے مُنہ سے تراشیں۔ تو ایک صدائے سرمدی آنکھ میں آئی۔ پہلے مجھ کو دیکھو اور میری سُنو۔ کانچ کی معمولی شیشی ہوں۔ دیکھنے میں چھوٹا سا ظرف رکھتی ہوں۔ مگر انسان اشرف المخلوقات سے زیادہ صاحب تحمّل وبرداشت

ہوں۔ اگر آدمی وہ سب دوا ایک ہی دفعہ پی جائے جو میرے اندر ہے تو مرجائے۔ مگر میں خود زندہ ہوں۔ اور دوسروں کی زندگی میرے ہاتھ میں ہے +

یہ تمہارے مُنہ پر مُہر کیسی ہے ؟

ہائیں تم نہیں جانتے۔ باطنی تاثیر کے لیئے یہ لازمی شرط ہے کہ سربمہر ہو۔ درویش کے مُنہ پر سکوت کی مُہر اسی غرض سے لگائی جاتی ہے کہ وہ امراض روحانی کی دوا ہے۔ مُنہ کھُلی شیشی کی دوا قابل اعتبار نہیں +

اچھا تو کاغذی لباس تم کو کیوں پہنایا گیا تھا ؟

اس کا جواب بھی سُن لو۔ النّاس باللباس۔ آدمیت کی پہچان لباس سے ہوتی ہے۔ تو میں دائرۂ شائستگی سے کس طرح باہر رہتی۔ خرقۂ مکتوبی پہنکر نمودار ہوئی۔ تب معلوم ہوا کہ میں کس مرض کی دوا ہوں +

کیوں بی شیشی! تمہاری شکل تو گوری ہے۔ اگر تم کالی ہوتیں تو دوا کی تاثیر میں کچھ فرق پڑجاتا یا نہیں؟

واہ۔ کیا مجکو یورپین خیال کرلیا۔ گو میری نمود یورُپ میں ہوئی۔ لیکن ہوں اصل نسل مسلمان۔ اور اس پر صوفیانہ عقائد رکھنے والی میرے ہاں گورے کالے کی بحث گناہ ہے۔ میں تو یہ جانتی ہوں کہ باطن صاف ہونا چاہیئے۔ رنگ سفید ہو یا سیاہ۔ اگر میرا تن سیاہ ہوتا تو دوا کی تاثیر کو کیا نقصان پہونچاتا۔ اصلیت ہم دونوں کی کانچ ہوتی ہے۔ دوا دونوں میں یکساں ہوتی ہے۔ پھر سیاہ سفید کی حجت سے کیا حاصل +

درویش کی مُہر سکوت ٹوٹ جائے تو پھر وہ کسی کام کا نہیں رہتا۔ تمہاری لاکھی مُہر دور ہوجائے تو بیکار ہوجاتی ہو یا نہیں۔ میری مُہر سکوت کھُلتی ہے تو دوسرے کے فائدہ کے لیئے کھُلتی ہے۔ ایسا ہی درویش اگر دوسرے کی فائدہ رسانی کی خاطر سکوت کی مُہر توڑ ڈالے تو ہرج نہیں۔ بلکہ مُہر لگتی اسی واسطے ہے کہ کسی کے فائدے کے لیئے ٹوٹے۔ میرے مُنہ پر مُہر نہ ہوتو کوڑی کے کام کی نہیں۔ کوئی ہاتھ بھی نہ لگائے۔ مثلاً اگر کسی حادثہ سے میرا مُنہ کھُل جائے تو دوا فروش مجکو پھینک دیتا ہے کیونکہ اُسے یقین ہوتا ہے کہ اب بازار میں اس کا کوئی خریدار نہ ہوگا۔ اِس کے علاوہ اندیشہ ہے کہ بیرونی زہریلا اثر اس میں نہ ہوگیا ہو جو بیمار کو نقصان پہونچائے۔ اسی پر درویش کو قیاس کرنا چاہیئے کہ جب اس کا مُنہ نفسانی و دُنیاوی خواہشات کے لیئے کھُل جاتا ہے۔ تو روحانی اسپتال میں وہ پھینکنے کے قابل ہوجاتا ہے +

واحدی کو دیکھو۔ ابھی باتیں ختم نہ ہونے پائی تھیں کہ اُنھوں نے شیشی کا مُنہ کھولکر چمچہ میں دوا نکال لی۔ اور اُس زبان و حلق کو تلخ کردیا۔ جس کے پڑوسی آنکھ کان شیشی کے باطنی اشاروں کا مزیدار لطف اُٹھا رہے تھے +

وحدت سر دکام

برف

از نظام المشائخ اگست ۱۹۱۲ء

تشنگی آلود ایام کیسی بہار کے ہیں۔ جو لوگ حبس دم کے بھید سے واقف نہیں قدرت اُن پر موسمی حبس طاری کرتی ہے۔ اسکے

بعد ٹھنڈی ہوا کا ایک جھونکا بھیجکر دیکھتی ہے کہ آزادی جبیں سے اُن کی زبان پر شکر الٰہی جاری ہوا یا نہیں۔ مگر یہ غافل ہستیاں شکریہ ادا کرنے کے بجائے اور غفلت کی طرف جھکتی ہیں۔ یوں تو ہر موسم شانِ یزدانی کا ایک کرشمہ ہوتا ہے۔ مگر گرم ملک ہندوستان میں ایک بے بہا نعمت ہے جہاں ہمیشہ سردی رہتی ہے۔ یا گرمی تیز نہیں ہوتی۔ وہاں کے باشندے اس لطف سے ناآشنا ہیں کہ لو کی گرم بازاری پر پسینے بہہ رہے ہیں۔ یکایک کسی گھنے درخت کے سایہ میں پہونچے اور خنک ہوا بدن کو لگی۔ بس اُس وقت جو کیفیت چشم و روح دیکھتی ہے وہ زبان یا قلم سے ادا ہونی محال ہے۔ اللہ میاں نے ہر چیز ایک حکمت سے پیدا کی ہے۔ موسم گرما میں بھی ہزاروں اسرار ہیں۔ جن کو چشم بصیرت عطا ہوتی ہے۔ وہ ان چیزوں کی حقیقت پر غور کرکے ذات باری کی حمد وثنا کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا +

اور تو اور ذرا گرمی کے تحفے برف کا خیال کرو۔ کیا صاف۔ شفاف۔ پیاری صورت والی چیز ہے۔ مگر آپ تو اس کو پی جانا جانتے ہیں کبھی اس پگھلنے والے وجود کے رموز پر غور نہیں کرتے۔ آیئے آج دو گھڑی اس میں جی بہلائیں +

برف کیا چیز ہے؟

اس کی دو قسمیں ہیں۔ ایک آسمانی۔ دوسری مصنوعی۔ آسمانی برف اونچے مقامات پر از خود نازل ہوتی ہے۔ سائنس والے کہتے ہیں کہ وہ ابخرے جو سمندر و زمین سے اُٹھ کر اوپر جاتے ہیں ابر میہنہ کی صورت بنکر دوبارہ زمین پر برستے ہیں وہی ابخرے شانِ الٰہی سے پہاڑوں پر برف کی شکل اختیار کرکے گرتے ہیں۔ اور جم جاتے ہیں +

نئے زمانہ والوں نے قدرتی برف پر غور کرتے کرتے بناوٹی برف کا بھید معلوم کر لیا۔ مشین کے ذریعہ سے معمولی پانی کے وہ اجزا نکال لیئے جاتے ہیں۔ جن کے سبب پانی میں نرمی اور پتلا پن ہے۔ ان اجزا کے نکلتے ہی پانی سخت اور پتھر ہو کر ایسا ٹھنڈا ہو جاتا ہے کہ گرمی کے موسم میں ہر شخص اس پر جان دیتا ہے +

برف میں صوفیانہ نکات

اس مختصر بیان کے بعد جس سے برف کی ظاہری حقیقت معلوم ہوئی۔ اس کی باطنی کیفیت پر توجہ کیجیئے +

جب تک پانی کے اندر نفسانی وکثیف اجزا شامل تھے اُس کے جسم کو قرار و یکسوئی میسر نہ تھی۔ بہتا تھا۔ ہلتا تھا۔ ذرا سی گندگی سے میلا اور بدبودار ہو جاتا تھا۔ جو رنگ اس میں ڈالا جاتا۔ فوراً اُس کا اثر قبول کرکے وہی رنگ اختیار کر لیتا تھا۔ لیکن مجاہدہ مشین نے اس کے متفرقہ انداز اجزا کو فنا کرکے ایسا پکا متحد کر دیا کہ جس رُخ سے دیکھیئے۔ ایک ہی شکل نظر آتی ہے۔ اوپر بھی پانی۔ نیچے بھی پانی۔ اندر بھی پانی۔ باہر بھی پانی۔ اور سب خنک و سرد۔ اس کو کہتے ہیں وحدت کا کمال۔ اب اس پر گندگی ڈالیئے تو پھسل کر بہہ جائیگی رنگ ڈالیے تو وہ بھی اوپر اوپر اُڑ جائے گا +

صوفی بھی جب برف کی طرح اپنے باطن کو مجتمع کر لیتا ہے۔ تو پھر وہ خواہ کیسے ہی بدنما مقام میں جائے۔ اُس پر کسی بُرائی کا اثر نہیں ہو سکتا +

اور یہ بھی سُن لیجیئے کہ برف میں ایسی خنکی کہاں سے آگئی کہ انسان اُس کو ہاتھ میں نہیں لے سکتا۔ حالانکہ جب تک وہ پانی کی شکل میں تھی۔ ہر شخص آسانی سے اُس میں ہاتھ پاؤں ڈالتا تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب نفسانی کثافت دور ہو جاتی ہے تو قدرت ایک ایسا جوہر پیدا کر دیتی ہے کہ پھر ہر کس و ناکس اُس پر آسانی سے قبضہ نہیں پا سکتا +

رہی یہ بات کہ پھر انسان اس کو کاٹ کر اور کچل کر شربت میں ملا کر کیوں پی جاتے ہیں۔ اس کا جواب صاف ہے کہ جس طرح صوفی دوسروں کی فائدہ رسانی اور تسکین کے لیئے پیدا ہوا ہے اسی طرح برف بھی پیاسوں اور تشنہ کاموں کو تسلی دیتی ہے اور طرّہ یہ کہ اپنی

ہستی قربان کرکے تسلی دیتی ہے +

ہائے غفلت شعار آدمی شیشے کے گلاس میں برف کا ٹکڑا ڈال کر گھونٹ لے رہا ہے۔ اور یہ نہیں سوچتا کہ پارۂ برف تیری خاطر اپنی چمک دار ہستی مٹا رہا ہے۔ گھلا جاتا ہے اور پانی کو سرد کا م کر رہا ہے۔ مگر ابن آدم اس ذات ترحم صفات کا شکرانہ نہیں بھیجتا۔ جس نے کائنات کے بے شمار جلوے اس کے لیئے پیدا کیئے۔ اوّل اوّل تو پروردگار ڈھیل دیتا ہے اور دیکھتا ہے کہ شاید یہ بندہ مجھ کو یاد کرلے۔ مگر جب وہ بے خبری سے باز نہیں آتا۔ تو پھر وہ تماشہ دکھاتا ہے جو ابھی حال میں پیش آیا +

گہ ٹٹانک نامی جہاز اہل مغرب نے بنایا۔ اور سمجھا کہ اب اس سے بڑا کوئی جہاز دُنیا میں نہیں ہے۔ اس میں ہوائی کمرے بنائے تاکہ وہ پانی کے طوفان سے محفوظ رہے۔ اور ڈوبنے نہ پائے۔ لیکن قدرت نے خیال کیا کہ یہ سرکش آدمی یوں نہیں مانیں گے اس واسطے اُس نے اس جہاز کو برباد کرنے کے لیئے برف کا ایک ٹکڑا بھیجا۔ جس نے دنیا کے سب سے بڑے جہاز کو ایک ہلکی سی ٹکّر مار کر ٹکڑے کر دیا +

اب انسانوں کی آنکھ کھُلی کہ جس برف کو سوڈے کے پانی میں گھولکر پی جاتے تھے۔ جس برف کو موگری سے کُچل ڈالتے تھے۔ اس برف کے ٹکڑے نے سیکڑوں قیمتی جانوں کو سمندر کے کھاری سوڈے میں ملاکر نوش جان کرلیا +

جلال وجبروت والے کی ثنا

برف کی یہ گرم کہانی سُنکر ان لوگوں کا فرض ہے جو جنگل میں درختوں کے پتّوں پر معرفت آلہی کے دفتر لکھے دیکھتے ہیں کہ اپنے جلال وجبروت والے خدا کی حمد وثنا کریں۔ اے ربّ العزّت۔ اے ربّ الحکمت۔ اے ربّ الاسرار۔ جان تجھپر صدقے۔ دل تجھ پر واری۔ +

برف سے گرنے والے ٹھنڈے قطروں کی قسم۔ ہم اُن میں تیرے فیضان کی بہار دیکھتے ہیں۔ یہ قطرے زبان کی پیاس کو بجھاتے ہیں۔ ایسا قطرہ عنایت فرما۔ جو دل کی تشنگی کو سیراب کرے +

برف ہوا سے بچائی جاتی ہے۔ گرم کمبل میں چھپائی جائے۔ تو جلد ہی نہیں پگھلتی۔ ہم کو اپنی گلیم معرفت کے دامن میں ڈھک لے۔ تاکہ حوادث ایام کی ہوا ہماری روحانی ہستی کو برباد نہ کرنے پائے۔ آلہی برف کے عذاب سے بچا۔ اور اس کو ہمارے جسم و روح کے لیئے عذب و شیریں کام بنا +

دِل ہاؤس

از نظام المشائخ ستمبر ۱۹۱۲ء

میاں سُنتے ہو؟ دہلی میں گورنمنٹ ہاؤس بنتا ہے۔ دن رات کام ہو رہا ہے۔ آنکھیں جاگتی ہیں اور جگائی جاتی ہیں تم بھی اپنا دل ہاؤس بناؤ۔ ویرانے کو آباد کرو۔ گورنمنٹ ہاؤس کا راتوں رات بننا ایک غیر معمولی جلدی کا سبب ہے۔ ورنہ ظاہری عمارات کے بنوانے والے صرف دن کو کام لیا کرتے ہیں۔ لیکن دِل ہاؤس ایک ایسی عمارت ہے کہ یہ رات کو

اندھیرے میں ہی چُھپی جاتی ہے جس وقت سارا سنسار سوتا ہے۔ اُس وقت پروردگار اور اُس کے وہ بندے جو دل ہاؤس کی تعمیر کے طلبگار رہیں۔ جاگتے ہیں۔

گورنمنٹ ہاؤس کی تعمیر میں بجلی کی روشنی ہے۔ غُل ہے شور ہے۔ مگر دل ہاؤس کی تعمیر کے واسطے تاریکی اور سکوت کی ضرورت ہے۔ جب گورنمنٹ ہاؤس بن جائے گا اُس کے دروازوں پر پہرے ہوں گے کہ کوئی شخص اندر نہ آنے پائے لیکن دل ہاؤس ایک ایسا وسیع مکان ہے۔ جس میں کائنات کے تمام جلوے بے روک ٹوک آسکتے ہیں۔ گورنمنٹ ہاؤس کی تعمیر میں اگر قبریں کُھدوا کر پھینک دی جائیں۔ مسجدوں اور مندروں کی مسماری ہو۔ وہ تاریخی مقامات جن سے دہلی کا چپہ چپہ معمور ہے۔ بے نام ونشان ہو جائیں۔ تب بھی تم اُس کی تقلید میں کسی کی دل آزاری نہ کرنا۔ کیونکہ دل ہاؤس کی تعمیر دل داری و دلجوئی کی بُنیاد سے شروع ہوتی ہے۔ یہ ہاتھ سے گئی تو مکان بننا دشوار ہو جائے گا۔ اوّل تو گورنمنٹ ہاؤس کے بنوانے والے بھی ایسے ستم شعار نہیں ہیں جو خواہ مخواہ کسی کے دل کو دُکھائیں اور مذہبی یادگاروں کو مٹا کر اپنا گورنمنٹ ہاؤس بنائیں۔ اور بالفرض محال کوئی ایسی جگہ آ بھی جائے تو کافی معاوضہ دیا جائے گا۔ لیکن تمہارے گھر کے دل کی بُنیاد ادنےٰ سی دل شکنی میں بے بُنیاد ہو جاتی ہے۔ یہاں معاوضات سے کام نہیں چلتا +

گورنمنٹ ہاؤس کے رہنے والے زمین اور اہلِ زمین کے جسموں پر حکمرانی کرتے ہیں۔ دل ہاؤس کی جہانداری اس سے وسیع ہے۔ اس کا حکم جسم و روح دونوں پر چلتا ہے۔ گورنمنٹ ہاؤس کے اہلکار اور شہریار بھی دل ہاؤس کے تابع فرمان ہیں +

دل ہاؤس دو لفظوں سے مرکب ہے۔ ایک دیسی اور ایک بدیسی۔ دل بے چارہ ایشیا میں رہتا ہے۔ ہندوستان میں رہتا ہے۔ علے الخصوص مسلمانوں کے سینہ میں رہتا ہے۔ اور یہ وہ مقامات ہیں جہاں اس کی خوب خاطر داریاں ہوتی ہیں اور اس کے جذبات کی بہت بڑی قدر کی جاتی ہے۔ یہی دل گو یوروپ والوں کے سینے میں بھی رہتا ہے۔ مگر وہاں یہ اپنے گھر کے کام دھندے میں ایسا مصروف ہوتا ہے کہ دوسرے دل سے سروکار نہیں رکھتا۔ اسی واسطے ایشیا والے کہتے ہیں کہ یوروپ کا ہر دل خود غرض اور بکار خودی مصروف ہے۔ لیکن ہمیں اس سے بحث نہیں۔ کوئی خود غرض ہو یا نہ ہو۔ ہم تو اس کو دیکھتے ہیں کہ دل میں اپنے پیدا کرنے والے کی بھی کچھ یاد ہے یا نہیں۔ اگر ایشیا والوں میں یہ بات یورپ سے زیادہ ہے تو ہمیشہ اُنہیں کا بول بالا ہو گا۔ اور اگر اہلِ یوروپ کے دل واقعی اس نعمت سے محروم ہیں تو اُن کے علاقے اُجڑ جانے کے قابل ہیں۔ ہاں خوب یاد آیا۔ دیسی کے بعد بدیسی ہاؤس کو دیکھئے۔ خبر نہیں لوگوں نے یہ دیسی بدیسی کا کیا جھگڑا لگایا ہے۔ ہاؤس کے معنی انگریزی زبان میں گھر کے ہیں۔ خانۂ دل نہ کہا۔ بیت القلب نہ پُکارا۔ دل ہاؤس کہہ دیا۔ مفہوم و مقصود و حقیقت تینوں کی ایک ہی ہے۔ فرق صرف زبان اور بولی کا ہے +

ایک زمانہ تھا۔ دہلی کو دل لی کہتے تھے۔ یعنی دل لینے والی بستی۔ اب وہ وقت کہاں۔ نہ دل ہی رہا۔ اور نہ دل لینے والی ہی رہی۔ وہ اُجڑ گیا۔ یہ مٹ گئی۔ وہ برباد ہو گیا۔ یہ تباہ ہو گئی۔ شکر ہے کہ انگریزی سرکار نے جھاڑو ہاتھ میں لیکر اس کی صفائی شروع کی ہے۔ شاید کوڑے کرکٹ کے دور ہونے سے اس کی حالت کچھ سنبھل جائے۔ لیکن ابھی تک تو دل لی کا نام اسم صادق آنے کا کوئی سامان نظر نہیں آتا +

خدا بخشے میری بیماری کو جس کے طفیل ڈلہوزی پہاڑ پر جانا ہوا تھا۔ ایک انگریزی داں نے کہا ہوز اور ہاؤس ایک ہی چیز ہے

جس کے معنی گھر کے ہیں۔ گویا یہ پہاڑ دل ہاؤس یا بیت القلب تھا۔ کانوں کو یہ نام بہت بھلا معلوم ہوا۔ اور اس لفظ میں اسرارِ حقیقت کے کرشمے نظر آنے لگے۔ جب اس پہاڑ کی صورت دیکھی تو معلوم ہوا کہ بہشت کا ایک ٹکڑا ہے۔ وہ بہشت جس کی مومن اور نیکو کار لوگوں کے نام رجسٹری نہیں ہوئی۔ اس میں ہندو مسلمان نیک و بد ادنٰے اعلٰے بغیر روک ٹوک کے آسکتے ہیں۔ امتحان صرف اتنا ہوتا ہے کہ باون میل کے پل صراط سے گزرنے کے بعد یہ بہشت نصیب ہوتی ہے۔ اس کا نام رحمتِ خداوندی ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ اُس کے کافر و سرکش بندے قیامت کے بعد ابد الآباد دوزخ میں رہیں تو دُنیا میں بھی اُن کو پہاڑوں کی ٹھنڈی ہوا اور ہوٹلوں کے باراحت عیش سے محروم کر دے +

کیسی بہار ہے۔ اونچے اونچے پہاڑ جبر نہیں کتنی مدّت سے اپنے پروردگار کے سامنے پاؤں باندھے کھڑے ہیں آنسوؤں کے چشمے سے وضو کرکے اور حضوری قلب کے ساتھ نماز پڑھتے ہیں۔ خدا نے بھی ان کے دل کو آباد کیا ہے۔ جدھر دیکھو ہرے بھرے درخت لہلہا رہے ہیں۔ پرندے ٹہنیوں پر بیٹھے نغمہ سنجیاں کر رہے ہیں +

آدمی بھی جب کوہ وقاری سے یکسو ہو کر خدا کے سامنے حاضر ہوتا ہے تو اُس کے دل میں بھی خنکی۔ یہ سرسبزی۔ یہ شادابی پیدا ہو جاتی ہے جس کو انگریزی اصطلاح میں دل ہاؤس کی آرائش کہنا چاہیئے۔

اور ہاں اس پر بھی توجہ کی؟ پہاڑوں میں انسان کو نشیب و فراز کے راستوں سے کیسی تکلیف ہوتی ہے۔ جب بلندی پر چڑھتا ہے سانس پھول جاتا ہے۔ ہانپتا ہے۔ لڑکھڑاتا ہے۔ اور دیکھتا ہے کہ اب کتنا راستہ باقی رہ گیا اور جس وقت بلندی سے پستی کی طرف آتا ہے۔ اُس وقت بھی یہ خیال رکھنا پڑتا ہے کہ کہیں زور و تیزی رفتار میں آس پاس کے کسی کھڈ یا غار میں نہ گر پڑوں +

ڈاکٹروں کی رائے میں پہاڑوں پر ترقی صحت کا یہی راز ہے۔ جو لوگ نشیب و فراز کی مشکلات میں شریک نہیں ہوتے۔ گھر میں آرام سے بیٹھے رہتے یا سواری پر چلتے پھرتے ہیں اُن کی صحت ہمیشہ خراب رہتی ہے۔ اسی طرح دل ہاؤس کے معماروں کا خیال ہے کہ نفی اثبات کے نشیب و فراز میں چڑھنا اُترنا صحت باطن کے لیئے لازمی ہے۔ اس کی تکلیفات کا خیال کرکے جو لوگ گھبراتے ہیں ہمیشہ روحانی امراض میں مبتلا رہتے ہیں +

چڑھو لاَ اِلٰہ کی بلندی پر۔ اور اُترو اِلّا اللہ کی وادی میں۔ دل ہاؤس کی تعمیر کے لیئے موسم رمضان خوب زمانہ ہے جذبات یکسو۔ ارادے پاکیزہ۔ نفسانیت کی سرد بازاریاں۔ ان دنوں میں تم بھی اپنا دل ہاؤس بنا لو۔ پھر خبر نہیں کل کیا پیش آنے والا ہے +

دل ہاؤس کا فرنیچر روزہ نماز۔ اور ذکرِ الٰہی ہے۔ گورنمنٹ ہاؤس کے لیئے میز کرسی چاہیئے۔ دل ہاؤس کے لیئے ایک سجدہ با اخلاص اور حمد کا ایک سچّا جملہ درکار ہے۔ روزے سب رکھتے ہیں۔ مگر جسم کی زبان بھو کی پیاسی رہتی ہے۔ اور نفس کی زبان کھانے پینے سے باز نہیں آتی۔ ایسا روزہ کس کام کا۔ دل ہاؤس کی آرائش چاہتے ہو تو ہوا و ہوس کی زبان بند کرو۔ اس کو روزہ رکھواؤ۔ مسجدیں خوب آباد ہیں۔ نمازیوں کی صفیں بھی بُنْیَانٌ مَّرْصُوْصٌ کی جگہ کوہ ہمالہ کی صفوں کی مثل ہوتی ہیں۔ لیکن ان میں اکثر لوگ۔ میز۔ کرسی۔ کالر۔ ٹائی۔ بوٹ۔ سوٹ۔ چُھری کانٹا۔ نوکری و خدمتگاری غلامی و اطاعت شعاری۔ ممبری اور مجسٹریٹی۔ خان بہادری و شمس العلمائی کے نشہ میں چور ہو کر اس وعید کے مستحق ہو رہے ہیں جو لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوۃَ وَ اَنْتُمْ سُکَارٰی کے پردے میں مخفی ہے۔ پروردگار نہیں چاہتا کہ اُس کے بندے غیریت کے

نشہ سے مخمور ہو کر حضوری ہیں آئیں۔ اس واسطے ارشاد فرماتا ہے کہ ایسی حالت میں نماز نہ پڑھو۔ یعنی میرے سامنے نہ آؤ جب کہ تم نشے میں مدہوش ہو۔ سرکش انسان نے سمجھ لیا کہ نشہ نماز سے چھٹکارے کا نام ہے کیونکہ خدا خود کہتا ہے کہ مخموری میں نماز کے قریب بھی مت جاؤ۔ کاش وہ ارشاد ربانی کے ناز محبوبیت تک رسائی پا سکتے۔ اور معلوم کرتے کہ نماز محبوب کی نزدیکی کا نام ہے۔ غیریت کا نشہ پیئں گے تو ہجر و فراق میں پھینک دیے جائیں گے۔ پس اگر دل ہا وَسس کی بنا کو مستحکم کرنا اور اس کی آرائش و زیبائش کو مکمل دیکھنا چاہتے ہو تو رمضان شریف میں ایسی ترشی سے روزہ افطار کرو جو غیریت کے تمام نشے اُتار دے۔ اور تمہارے دل کو خدا کا گھر بنا دے۔ ورنہ جناب اکبر الہ آبادی کا یہ شعر تم پر صادق آئیگا

خدا کا گھر نہ رکھا دل کو بنگلوں میں مکیں ہو کر
بھلایا عرش کو اس قوم نے کرسی نشیں ہو کر

از نظام المشائخ اکتوبر ۱۲؁ ۱۹ء

معدوم و نابود چیز کو صفر کہتے ہیں۔ نقطہ بھی اسی شکل کا نام ہے۔ حساب اور اُقلیدس و ہندسی رموز والوں کو خبر نہیں کہ وہ اس محیط بے سر و پا ہستی کی نسبت کیا خیال رکھتے ہیں۔ فقیر کو علم و فضل کی باتیں یاد نہیں، اس کو تو یہ بے تعلق و التعلق دار نقطہ نکات سے لبریز نظر آتا ہے +

کسی نے حرف بے سے کہا۔ مجھ میں اور تے ثے میں کیا فرق ہے؟ صورت تینوں کی یکساں ہے۔ تفاوت فقط اس کا ہے کہ بے کے نیچے ایک نقطہ اور تے کے اوپر دو نقطے۔ ثے پر تین نقطے۔ بے نے جواب دیا۔ یہی سوال میں نے الف سے کیا تھا کہ جب تو اکیلا تھا تو تیرا مطلب بھی ایک نکلتا تھا۔ لیکن جس وقت تیرے پہلو میں ایک نقطہ بڑھا یا گیا تو معانی دس گنے ہو گئے۔ دوسرا نقطہ اور زائد کیا تو ایک سے سو ہو گئے۔ تیسرا بڑھا تو ہزار بن گئے۔ یہ کیا بھید ہے +

الف نے جواب دیا۔ خاموش۔ کائنات کی پیدائش کا راز اسی کے اندر مضمر ہے۔ الٰہی گورنمنٹ نے لارڈ کرزن کی سرکار سے پہلے اس راز کو قانون راز داری کی مُہر سے مخفی کر دیا ہے۔ زبان سے افشا کا ایک حرف بھی نکلا تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے +

حروف کی باتیں سُن کر حسن نظامی نے کہا۔ میں نے لارڈ کرزن کے قانون راز داری کو ہمیشہ بام سے نیچے گرتے دیکھا اس کی تشبیہ یزدانی قانون سے ناجائز ہے۔ مادہ پرست آدمیوں کے قوانین دو چار دن کے مہمان ہیں۔ اقبال کی آنکھ دیکھتی ہے۔ مگر وہ لب پر نہیں لا سکتے۔ میری آنکھ دیکھتی ہے۔ زبان بولتی ہے۔ اور ہاتھ حرکت کرنے کو تیار ہے +

سُنو۔ میں تم سے کہوں۔ یہ صفر جس کو عنوان میں دیکھا۔ ایک ہولناک انقلاب کا علم دار ہے۔ بسم اللہ اُس کتاب کی ابتدا ہے اور حروف و الفاظ کی سب کتابوں سے افضل ہے۔ لیکن اس بسم اللہ کی بھی ایک ابتدا ہے۔ اور وہ بے کا نقطہ ہے۔ اس نقطہ کی تشریح آج کے دن کرنی مقصود ہے۔ جس دن تم اس کو پڑھو گے عید الفطر کو سات آٹھ دن گزر چکے

ہوں گے۔ خوشی کا کمال زوال میں ہوگا۔ لہذا اس مشکل اور باریک مضمون کو ذرا غور سے پڑھنا +

اللہ ہمارا معبود۔ اس کے لفظ میں کوئی نقطہ نہیں۔ محمدؐ ہمارے رسول۔ اس ہیئت میں بھی نقطہ معدوم۔ آخری نجات اور روح جس ذات پر منحصر ہے وہ امام ہے۔ وہ بھی بے نقط +

دل کہتا ہے تم میرے مقصود کے مفہوم تک اتنے کم لفظوں میں نہیں پہونچ سکتے۔ کہوگے۔ کیا لکھا ہم نہیں سمجھے دماغ میں کچھ خرابی تو نہیں ہے۔ اس کا جواب یہ ہے۔ کہ قرآن شریف سب سے آسان کتاب ہے۔ مگر اس کے شروع میں الم کلام مبہم کو عام فہم کیوں نہ ہونے دیا۔ پس انسان کی طاقت اتنی ہی ہے۔ کہ دور سے اشارہ کر دے یہ تو ہوا خاص فہم حصہ +
اب عام دلچسپی کی باتیں سنیئے ع

بے کارم و باکارم چوں مد بحساب اندر

حساب کی رقموں میں میاں مد کی ہستی بیکار بھی ہے اور باکار بھی۔ تاہم یہ مسلم ہے کہ اصل رقم سے اس کے وجود کو کچھ سروکار نہیں۔ ایک دن ایک مُرید نے حسن نظامی کے ہاتھ پاؤں کو چوما۔ اور سمجھا کہ میں نے حسن نظامی کے متبرک جسم سے برکت حاصل کر لی۔ لیکن جسم میں برکت کہاں۔ وہ تو حساب کی رقموں کا مد ہے۔ ذات اور روح کے لین دین کا حساب کتاب ہو۔ اور جسم کمبخت کی مفت میں کھینچا تانی کی جائے۔ ہمیشہ اپنے ہاتھ کو دیکھتا ہوں کہ وہ دماغ کے کہنے سے کاغذ پر کچھ لکھا کرتا ہے۔ دُنیا کی خلقت ہاتھ و دماغ کے عمل کو کتاب و اخبار میں پڑھکر حسن نظامی کو اس کا ذمہ دار تصور کر لیتی ہے۔ اور یہ نہیں جانتی کہ مد کو حساب کتاب سے کچھ سروکار نہیں ہوتا۔ صفر اور نقطہ کا بھی یہی عالم ہے۔ کہ سب کچھ ہے اور کچھ نہیں +

قربان اس دائرۂ حقیقت کے۔ کیا کیا تماشے پردۂ کائنات پر برپا کیئے ہیں۔ اعلیٰ سے اعلیٰ مخلوق آفتاب اور ادنے سے ادنے ہستی ذرّے کو دیکھیئے۔ یہ بھی حساب کے مد اور صفر و نقطے کی طرح بے کار بھی ہیں اور باکار بھی۔ آفتاب گرم ذرات کا مجموعہ زمین کے سب کارخانوں میں دخیل ہے اس لیئے باکار ہے۔ لیکن رات کو جب یہ غروب ہو جاتا ہے تو دُنیا کے کارخانے بند نہیں ہو جاتے اس واسطے بے کار ہے۔ ذرّہ عالم مرکب کا انتہائی اور آخری نقطہ ہے۔ اس کی جنس نہ ہو تو ساری کائنات بے کار ہے۔ لہذا اس کا وجود باکار۔ مگر ایک ذرّے کا ہونا نہ ہونا کوئی چیز نہیں۔ پھر اس کے ناکارہ ہونے میں کس کو کلام ہو سکتا ہے۔ اسی پر نقطہ اور صفر کو قیاس کرو عنوان میں اس کی صورت دیکھکر کوئی مطلب سمجھ میں نہ آئے گا۔ اور بے کار چیز معلوم ہوگی۔ لیکن جس وقت جسمی تعلّقات کو یکسو کر کے اس کے حقایق و معارف پر غور کروگے تو یہی ننھی مُنّی چیز محیط الکل نظر آئے گی +

نظام المشایخ کے مضامین اور حلقہ کی تمام تحریروں کے شروع میں ۷۸۶ کے نیچے دو لکیریں لکھی جاتی ہیں۔ خیال ہوتا ہوگا کہ یہ ایک بیکار فعل ہے۔ پر جو اس بھید سے واقف ہیں وہ ان کو باکار اور میکسم گن سے زیادہ کارگر پاتے ہیں۔ جس تحریر پر یہ نشان ہوگا۔ خدا نے چاہا تو وہ کبھی بے اثر نہ رہے گی۔ یہ دو لکیریں نہیں ہیں۔ تاثیر تحریر کے قوام کے لیئے ایک قوت دار معجون ہے +

نقطہ اور صفر بھی ان ہی اسرار و مفاد سے لبریز ہے۔ اگر تم اس کی روحانی اور فلسفیانہ باریکیوں پر غور نہیں کر سکتے تو ایک کاغذ پر نقطہ کی گول شکل بناؤ اور تنہائی میں اس پر نگاہ جماؤ۔ اور اپنے خیالات کو نقطے کے چاروں طرف پھیلا دو۔ پھر دیکھو کیا لطف اور مزہ آتا ہے۔ بشرطیکہ چند روز تک اسکی مسلسل مشق کرتے رہو +

اس مضمون کی سُرخی پر نظر جماؤ - اور سوچو - یہی سب کا مرکز اور محیط ہے - ہر دُکھ - غم اس کے اندر فنا ہو رہا ہے - اٹلی کی فوجیں - روس کے لشکر اس غار جہنم میں گر رہے ہیں - اب اس کو گردش ہوگی تو گردو پیش کے تمام مستحکم قصر متحرک ہوں گے - اوہام - خوف - رعب کو شکست ہوگی +

موسیٰؑ نے درخت اور پہاڑ کی آڑ میں دیدار دیکھا تھا - مسلم دیدار دیکھنا چاہتا ہے تو نقطہ اور صفر کو سامنے لائے جو کرۂ خاک کی خیالی پیکر ہے - جو قلب جسمانی کی تصویر ہے - جو ازل و ابد کے درمیان بے تار کا محکمۂ پیام رسانی ہے +

بندوق کی گولی نقطہ اور صفر کی شکل سے مشابہ ہے مگر گولی پیام مرگ ہے - اور نقطہ و صفر رشتۂ زندگانی - زندگی کو پُرلطف بناؤ - اور اس محیز و بانہ بڑ کو سمجھو +

آنکھ کی پُتلی - خالِ رُخِ یار - اور اُن تمام صورتوں کی قسم جو نقطہ و صفر کی ہمشکل یا قریب الشکل ہیں - نقطہ کے وجود میں نکات کا خاموش دریا موج میں آنا چاہتا ہے - جب یہ لہر آئے گی تو میں تم کو عید کی مبارکباد دوںگا

یا عرفان کی لکیر

از نظام المشائخ دسمبر ۱۹۱۳ء

یا عباد اللہ الصّٰلحین! آج کل دُنیا کہتی ہے میں پریشان ہوں - آشفتہ خاطر ہوں - زندگی سے بیزار ہوں - میرا چین آرام جاتا رہا - مصائب و آلام نے چاروں طرف سے گھیر رکھا ہے - کیونکہ جدھر نگاہ جاتی ہے - خود غرضی - حرص و ہوس کا دور نظر آتا ہے - اخلاق و مروّت کا نام نہیں - رحم و انصاف مفقود ہو گئے - ایک قوم دوسری قوم کو ایک مُلک دوسرے ملک کو ایک شہر دوسرے شہر کو - ایک کنبہ دوسرے کنبے کو - یہاں تک کہ ہر آدمی دوسرے آدمی کو نہیں دیکھ سکتا - سب آپس میں ایک دوسرے کے درپے آزار ہیں - طاقتور کا خیال ہے - کمزور کو اس زمین پر رہنے کا کوئی حق نہیں اُسے مٹا دو - فنا کر دو - ناتوان چاہتا ہے - اوروں کی توانائی بھی جاتی رہے - سارا عالم یکساں ہو جائے - فقیر نے سوچا - کیا یہ شکایت ٹھیک ہے - دل نے جواب دیا "کچھ صحیح اور کچھ غلط" اللہ تعالےٰ نے انسان اور اس جہان کو اس لیے پیدا کیا تھا کہ وہ پہلے اپنی ہستی پر غور کرے - اور وجہ پیدائیش کو پہچانے - مگر بھول چوک کا پُتلا آدم زاد دوسروں کو دیکھنے لگا - ان کے نیک و بد میں مصروف ہو گیا - اور اپنی ذات کو پس

پشت ڈال دیا۔ کیا آپ نے نہیں سُنا۔ یورپ کی طاقتیں ایران و مراکو۔ طرابلس و ترکی پر حملہ آور ہوئی ہیں کہ ان مُلکوں کی تہذیب کو بزور تلوار درست کریں۔ مگر خود اپنی ذاتی اصلاح و اندرونی خرابیوں کی درستی کی طرف سے ان کی آنکھیں بند ہیں۔ اور یہی وجہ تکلیفات وصعوبات کے بڑھنے کی ہے۔ اگر ہر آدمی پہلے اپنی ذاتی اصلاح وبہبودی کی طرف متوجہ ہو تو خدا کی بنائی ہوئی زمین فتنہ و فساد اور غم والآم سے چھٹکارا پا جائے۔ انسان خدا کی حکمتوں کا ایک خزانہ ہے۔ کون انسان ؟ وہ جو کوٹ پتلون پہنتا ہے۔ کالر نکٹائی لگاتا ہے۔ پاؤں کو بُوٹ سے آراستہ کرتا ہے اور چرُٹ مُنہ میں دبا کر نیم فرعونی شان سے اکڑتا ہوا سڑک پر چلتا ہے۔ اور وہ جو ٹخنوں سے اونچا پاجامہ۔ بوسیدہ میلا کُرتہ پہنا مُنڈے ہوئے سر پر ڈھائی گز کا دوپٹہ لپیٹ لیتا ہے اور وہ جس کی ٹانگیں گھٹنوں تک دھوتی سے برہنہ نظر آتی ہیں۔ اور ہاتھ کے بنائے ہوئے معبودوں کے آگے سر جھُکاتا ہے۔ یہ سب زمین پر حرکت کرنے والی مورتیں خزانۂ الٰہی کی تھیلیاں ہیں۔ ان سب کے اندر دولت لازوال بھری ہوئی ہے۔ لیکن غافل ہستیاں اس کی قدر نہیں کرتیں۔ اور نفسانی وشیطانی خواہشوں پر خدا کی بخشی ہوئی نعمتوں کو برباد کر رہی ہیں۔ ان بادشاہوں سے پوچھو۔ جب تم لاکھ آدمیوں کا لشکر لیکر اپنے دشمن پر حملہ کرتے ہو اور بے شمار جانوں کا نقصان کر کے صرف اپنی ناموری کماتے ہو تو وہ ناموری تمہارے کس کام آتی ہے۔ جاڑے کا گرم لحاف اچھا۔ یا تمہاری یہ ناموری۔ اگر سردی کے وقت لحاف اور کمبل میسّر نہ آئے تو یہ ناموری تمہارے جسم کو سردی سے بچا سکتی ہے ؟ مگر بادشاہوں سے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔ ختم اللہ علیٰ قلوبھم وعلیٰ سمعھم وعلیٰ ابصارھم غشاوۃ۔ وہ اس کا جواب نہیں دے سکتے۔ اُن کے خیال میں زندگی اسی کا نام ہے کہ ایک انسان اپنی فانی عزت وشان کے لیئے لاکھوں انسانوں کو قربان کر دے۔ اور اُن قیمتی وجودوں کو موت کے گھاٹ اُتار دے جن کو برسوں کی مشقت کے بعد مامتا بھری گودوں نے پالا پوسا تھا ❊

دایاں ہاتھ ان خیالات کو قلمبند کر رہا تھا کہ بائیں ہاتھ کے انگوٹھے نے کچھ اشارہ کیا۔ اُس نے کہا مجھ میں کیا لکھا ہے ؟ اس کو پڑھو۔ میں ربّانی دستاویز کی شہادت ہوں۔ خدا نے فرمایا تھا۔ قیامت کے دن آدمیوں کے ہاتھ پاؤں سے گواہی لوں گا۔ اور وہ انسان کے اعمال کی شہادت دیں گے۔ قیامت تو دور ہے۔ اس کا نمونہ زمین کے اس دورِ پُر آشوب میں جو درحقیقت محشر ہی زمانہ ہے۔ اعضائے جسم گواہی کے لیئے طلب کیئے جا رہے ہیں۔ ایک وقت تھا جبکہ دستاویز کی تکمیل مُہر و دستخط سے ہوئی تھی۔ اب قیامت قریب آ گئی۔ مُہروں اور دستخطوں میں جعلسازیاں ہونے لگیں اس واسطے خدا نے ایک نیا ذریعہ تکمیل صداقت کا پیدا کیا۔ اور وہ انگوٹھے کا نشان ہے۔ تمام معاملات جن کا عملدرآمد تحریر میں آتا ہے انگوٹھے کے نشان سے مکمّل کیئے جاتے ہیں۔ دائیں ہاتھ کے فخر کو قرن گزر گئے تھے۔ وہ کہتا تھا کہ جو کچھ ہوں میں ہوں۔ میرے بل پر سب کام ہوتے ہیں۔ خدا کو انانیت کسی کی نہیں بھاتی۔ آج دایاں ہاتھ بیکار ہے اور بائیں ہاتھ کے کرتب کا سارے جہان میں دور دورہ۔ اس میں نصیحت ہے اُن لوگوں کے لیئے جو غرور وتکبّر وخود پرستی کے متوالے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہماری لنترانیاں ہمیشہ برقرار رہیں گی۔ دوام اور ہمیشگی صرف خدا کی ذات کو ہے۔ باقی ہر ایک کے لیئے انقلاب وزوال ہے ❊

اللہ کے بندو ! اپنے جسم پر غور کرو۔ تمہارے رونگٹے رونگٹے میں اسرار ربّانی کے نوشتے ہیں۔ تمہارا بال بال یزدانی رموز میں بندھا ہوا ہے۔ انگوٹھے کی لکیریں جس طرح تمہارے معاملات دُنیاوی میں کام آتی ہیں اسی طرح ان سے

عرفانِ الٰہی کا کام نکالو۔ لین دین کے کاغذات پر انگوٹھے کا نشان کرتے وقت ذرا یہ بھی سوچ لیا کرو کہ تم کس انگشت حقیقت کا نشان ہو۔ کھانے۔ پینے۔ لڑنے جھگڑنے۔ خود بینی و خودستائی کے لیئے تم کو پیدا نہیں کیا گیا۔ پروردگار کو تمہاری پیدائش سے اپنی طاعت و عبادت مقصود ہے۔ وماخلقت الجن والانس الّا لیعبدون کا ارشاد اس کا شاہد ہے۔ کائنات کی دستاویز قلم تکوین سے جب لکھی گئی تو کُن کہنے والے نے مخلوقات کے کاغذ پر ایک انگوٹھے کا نشان لگایا۔ تاکہ سند ہو اور وقت ضرورت کام آئے۔ وہ سند کیا ہے اور وہ ضرورت کیا ہے۔ اور وہ انگوٹھے کا نشان کس سے مُراد ہے۔ نشانِ انگشت وجود انسانی ہے۔ سند خلافت رحمانی ہے۔ ضرورت موت کے بعد وہ گھڑی جو سب کو پیش آنی ہے۔ ذٰلِکَ الْکِتٰبُ لَا رَیْبَ فِیْہِ۔ صوفیوں کا عقیدہ ہے کہ کائنات کے باطنی و اندرونی انتظام کے لیئے پروردگار کی جانب سے ایک شخص مقرر ہوتا ہے جس کے عہدے کا نام قطب عالم یا قطب مدار ہے قطب عالم کے دائیں بائیں دو وزیر ہوتے ہیں۔ دستِ راست کے وزیر کا نام عبد الملک اور دستِ چپ کے وزیر کا عبد الرّب۔ عبدالملک کا یہ کام ہے کہ خدا پرستوں کے معاملات کو قطب عالم کے حضور میں پیش کرے اور عبد الرب اُن لوگوں کی مہمات بارگاہ قطب عالم میں پیش کرتا ہے۔ جو دائرہ توحید خدا پرستی سے بھٹکے ہوئے ہیں ؞

اس زمانے میں جو ہم دیکھتے ہیں کہ دشمنان توحید تمام دُنیا پر چھائے چلے جاتے ہیں اور خدا پرست ہر جگہ مغلوب ہو رہے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالےٰ نے دستِ چپ کے وزیر کے لیئے اپنی نعمتوں کا دروازہ کھول دیا ہے۔ مگر صفات الٰہی کی مختلف شانیں ہیں۔ آج ہمارے شامت اعمال کے سبب صفت قہاری کا ظہور ہے اور قطب عالم کے وزیر دستِ چپ برسر حکمرانی ہیں جس کی وجہ سے دُنیاوی دستاویزوں پر انگوٹھے کا نشان بھی بائیں ہاتھ کا لگایا جاتا ہے۔ تو کل ہماری توبائیں قبول ہوں گی صفت رحمت توجہ فرمائے گی اور وزیر عبد الملک برسر حکومت ہوں گے۔ اس کو انگریزی پارلیمنٹ کی دو شاخوں لبرل اور کنسرویٹو کے تحت میں نہ لائیے ؞ ربّانی حکومت جمہوریت سے اسی قدر تعلق رکھتی ہے کہ کبھی قہر کا دور ہے اور کبھی شان رحم کا دور۔ لیکن قہر ایک کے لیئے زہر ہوتا ہے اور دوسرے کے لیئے آب حیات۔ اس کی سرکار میں لبرل اور کنسرویٹو حکومتوں کی طرح پالیسیاں نہیں ہیں۔ اس کی حکومت کا مدار محکوموں کے اعمال پر ہے۔ جیسے اعمال سرزد ہوتے ہیں۔ اسی قسم کی حکمرانی کی جاتی ہے۔ اُس کے دربار میں دائیں ہاتھ کے نشان کی دستاویز مقبول ہے۔ وہ ارشاد فرماتا ہے کہ فمن اوتی کتٰبہ بیمینہ فسوف یحاسب حسابا یسیرا۔ جس کے پاس دائیں ہاتھ کی دستاویز اعمال ہے اُس کا محاسبہ آسان اور سہل ہوگا۔ یعنی جس طرح دُنیاوی عدالتوں میں بائیں ہاتھ کے انگوٹھے کے نشان سے دستاویز قبول کی جاتی ہے۔ عدالت دین میں قبول نہیں کی جاتی۔ اُس کے ہاں دائیں ہاتھ کی دستاویز پیش کرنے سے نجات ہے۔ لہٰذا اے آدمیو! اگر تم خدا کو چاہتے ہو۔ اگر تم اس کی توحید کے قائل ہو تو دائیں ہاتھ کی دستاویز تیار کرو۔ دایاں ہاتھ تم سے اپنا حق مانگتا ہے میدان جہاد میں تمہارے بہت سے بھائی قبضۂ شمشیر اور کھٹکۂ تفنگ سے دائیں ہاتھ کا حق ادا کر رہے ہیں۔ تم اس امن کی ملک میں جیب میں ہاتھ لے جاؤ اور اس کا حق ادا کرو۔ تمہارے دائیں ہاتھ کی لکیریں بھی اگر تم غور کرو اس عظیم الشان معاملہ کی تصدیق کرتی ہیں جو سب خدا پرستوں کو خوشی و خرّمی کے ساتھ عنقریب پیش آنے والا ہے۔ لکیر عرفان کو پہچانو تاکہ لکیر کے فقیر اور عارف حق کا رتبہ پاؤ۔

لال ٹین

از نظام المشائخ مارچ ۱۹۱۳ء

"لال ٹین" ہاتھ میں رہنے والی روشنی کا نام ہے۔ شیشے کے اُس قفس کو کہتے ہیں جس کے اندر شعاع آتشیں قید ہے۔ ایک زمانہ تھا آندھیاں۔ پروانے۔ اور چلنے پھرنے والوں کے دامن۔ چراغوں کے دشمن تھے۔ بھرے پُرے چراغ ہوا کے جھونکے سے گُل ہو جاتے تھے۔ پروانے اپنی عاشقانہ پر اندازی سے اس غریب روشنی کی ہستی کو بے جان کر دیتے تھے۔ بے احتیاط دوپٹوں کے آنچل کبھی تو ایسا ہوتا کہ نورِ چراغ ان کے صدمہ سے بُجھ جاتا اور کبھی دوپٹہ خود چراغ بجھاتا تھا۔ اور بے احتیاط اوڑھنے والے کو سزائے سوختنی مل جاتی تھی۔

آج وہ وقت ہے کہ روشنی کو سب سے زیادہ ترقی اور امن و امان نصیب ہے۔ کیا مجال جو آندھی آنکھ ملائے۔ پروانہ قریب آئے۔ اور آنچل کا دامن حملہ آور ہو۔ روشنی اطمینان و بے فکری سے چمنی کے گنبد میں رات بھر پاؤں پھیلا کر سنّ سناتی ہے۔

اس نئی روشنی کے زمانہ میں کائنات کی ہر چیز کا ظاہر روشن ہے۔ مگر باطن تاریک۔ بجلی کی روشنی کانچ کے ہنڈول میں ظاہر ہو کر چمکتی ہے۔ اور تار کے باطن میں تاریک رہتی ہے۔ گیس کی روشنی کا بھی یہی عالم ہے۔ مگر ہمیں اس سے کیا بحث۔ سیاہ باطن ہو یا سفید باطن۔ ہمیں تو یہ ہماری لال ٹین پیاری ہے۔ چلتا پھرتا نور ہے۔ اور اس زمانہ میں برکت وہیں ہے کہ جہاں حرکت ہو۔ ایک رات میں نے لال ٹین سے پوچھا "کیوں بی! تم کو رات بھر کے جلنے سے کچھ تکلیف تو نہیں ہوتی ہے؟" بولی۔ آپ کا خطاب کس سے ہے؟ بتّی سے، تیل سے، ٹین کی ڈبیہ سے، کانچ کی چمنی سے۔ یا پیتل کے اُس تار سے جس کو ہاتھ میں لیکر لالٹین کو لٹکائے پھرتے ہیں؟

لال ٹین کے اس سوال سے دل پر ایک چوٹ لگی۔ یہ میری ایک بھول تھی۔ اگر میں پہلے اپنے وجود کی لالٹین پر غور کر لیتا تو ٹین اور کانچ کے پنجرے سے یہ سوال نہ کرتا۔ میں حیران ہو گیا کہ اگر لال ٹین کے کسی ایک جزو کو لال ٹین کہوں تو یہ درست نہ ہوگا۔ اور اگر تمام اجزا کو ملا کر لالٹین کہوں تب بھی موزوں نہ ٹھہرے گا۔ کیونکہ لال ٹین کا دم روشنی سے ہے۔ روشنی نہ ہو تو اس کا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔ مگر دن کے وقت جب لال ٹین میں روشنی نہیں ہوتی اُس وقت بھی اس کا نام لال ٹین ہی رہتا ہے۔ تو پھر کس کو لال ٹین کہوں۔ جب میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ تو مجبوراً لال ٹین ہی سے پوچھا۔ میں خاکی انسان نہیں جانتا کہ تیرے کس جُز کو مخاطب کروں۔ اور کس کو لالٹین سمجھوں۔ یہ سُنکر لال ٹین کی روشنی لرزی۔ ہلی۔ کپکپائی۔ گویا وہ میری ناشناسی دنا دانی پر بے اختیار کھلکھلا کر ہنسی۔ اور کہا اے نور خدا کے چراغ آدم زاد سُن لال ٹین اُس روشنی کا نام ہے جو بتّی کے سر پر رات بھر آرا چلایا کرتی ہے۔ لال ٹین اُس شعلے کو کہتے ہیں جس کی خوراک تیل ہے۔ اور جو تاریکی کے دشمن سے تمام شب کڑتی بھڑتی رہتی ہے۔ دن کے وقت اگرچہ یہ روشنی موجود نہیں ہوتی۔ لیکن کانچ اور ٹین کا پنجرا رات بھر اُس کی ہمنشینی کے سبب لال ٹین کہلانے لگتا ہے۔ تیرے اندر بھی ایک روشنی ہے اگر تو اس کی قدر

جانے اور اُس کو پہچانے۔ تو سب لوگ تجھ کو روشنی کہنے لگیں۔ خاک کا پُتلہ کوئی نہ کہے۔ دیکھ خدا کے ولیوں کو جو رات بھر اپنے پروردگار کی نزدیکی و قربت کی خواہش میں کھڑے کھڑے گزار دیتے ہیں تو دن کے وقت اُن کو نور خدا سے علیحدہ نہیں سمجھا جاتا۔ یہاں تک کہ مرنے کے بعد اُن کی قبروں کی بھی وہی شان رہتی ہے۔ پہلے چمنی کو صاف کر یعنی اپنے لباس ظاہری کو گندگی و نجاست سے آلودہ نہ ہونے دے اس کے بعد ڈبیہ میں صاف تیل بھر۔ یعنی حلال کی روزی کھا اور پھر دوسرے کے گھر کے اُجالے کے لیئے اپنی ہستی کو جلا جلا کر مٹا دے۔ اس وقت تو بھی قندیل حقیقت اور فانوس ربّانی بن جائے گا۔

بے تار کا تار

از نظام المشائخ مئی ۱۹۱۳ء

تم نہ کہتے تو میں بھی خاموش رہتا۔ بادہ فروش اور بادہ نوش کے ہاتھ میں اپنا بھید دیدیا۔ میں بھی دنیا پر تمہارے راز کو فاش کر دوں گا۔

پہلے تم نے یہ کیا کہ بجلی کے اسرار کو طشت ازبام کیا۔ اس سے گاڑیاں کھچوائیں۔ پنکھے جھلوائے۔ سڑکیں کٹوائیں ہرکارے کا کام لوایا۔ پھر بے سلسلہ و بے تعلق نشان بھی اُن کے قبضے میں دیدیئے۔ بے تار کے تار کا علم بتا دیا۔ اور وہ بھی کس کو جو تمہاری شان میں گستاخ ہے۔ بے ادب ہے۔ مغرور ہے۔ چور ہے۔ ڈاکو ہے۔ دغا پیشہ اور جفا کار ہے۔ میں پوچھتا ہوں تمکو بندہ نوازی کا اتنا شوق کیوں ہو گیا ہے۔ اب دیکھنا اس راز کے زور سے یہ لوگ تمہارے پسندیدہ گھر پر چڑھکر جائیں گے۔ گولے۔ گولیاں برسائیں گے۔ تمہارا کیا جائے گا۔ تکلیف تو ہم کو ہوگی۔ جن کے دلوں میں اپنے گھر کی محبت بھر دی ہے۔

نادان و ناسمجھ بندہ بگڑتا ہے۔ ارے بے خبر تو کیا جانے۔ پروردگار کی حکمت پروردگار ہی خوب جانتا ہے۔ علم و ہنر کے آم کا رس تو تجھ کو دیا ہے۔ چھلکے ان گستاخوں کو مل گئے۔ اسی تیرا یہ کہنا سراسر بے بنیاد ہے۔ چور کو چوری کرنے کے اوزار دیئے ہیں تو اُس کو یہ بھی بتا دیا ہے کہ چوری کے بغیر بھی ہم تجھ کو رزق دے سکتے ہیں۔ یہ اوزار امتحان کے لیئے ہیں۔ اگر تو نے چوری کے کام میں ان کو استعمال کیا۔ تو ہاتھ کاٹے جائیں گے۔ اور اگر دوسروں کو آرام دینے کے کام میں لایا تو انعام پائے گا۔ کردگار عالم جانتا ہے کہ یہ گو مغربی دُنیا گستاخ و ناسزائی ہے۔ مگر اس کو یہ بھی علم ہے کہ انہیں میں بہت سے میرے دروازے پر سر جھکائے آنیوالے ہیں ایک وقت پر جرمن اسلام قبول کرے گا۔ انگلستان مسلمان ہو جائے گا۔ فرانس میں بھی نور وحدت کی روشنی نمودار ہو گئی۔ ابتدا کو دیکھکر بے قرار نہ ہو۔ ازل کے حالات سے مایوس نہ بن۔ انجام وابد میں دیکھیو۔ کیا ہوتا ہے۔ کیا کیا جاتا ہے۔ آج دیا ہے کل لے لیا جائے گا۔ آج سرفراز کیا ہے۔ کل برباد کر دیا جائے گا۔ اگر نہ مانے اور گمراہی کی چال چلتے رہے۔ بے تار کا تار تو تم لوگوں کی دلیل بنا یا گیا ہے۔ اس کو دیکھو۔ سوچو۔ سمجھو۔ اور دشمن سے کہو۔ یہ بھی ہمارے مولیٰ کی شان کا ایک ظہور و نمونہ ہے۔ مراقبہ میں کیا ہوتا ہے۔ مکاشفہ کسے کہتے ہیں۔ لاکھوں کوس کی خبر آن کی آن میں دل کی لوح پر کس طرح

نقش ہو جاتی ہے۔ اس کا جواب بے تار کے تار میں ہے۔ چند اونچی اونچی لکڑیاں کھڑی کر دیں۔ برقی ذخیرہ کا خرقہ ان کھمبوں کو پہنا دیا۔ اس کے بعد اشارے کنائے شروع کر دیے۔ ایک لندن میں ہے۔ ایک دہلی میں۔ دونوں کو آواز آنے لگی۔ لیکن کس کو؟ اُس کو جو تار کے بھید سے واقف ہے۔ ہر ایک کو نہیں۔ خواہ ہزاروں آدمی تار کی بلّی سے لگے بیٹھے رہیں۔ جیسے مراقبہ کرنے والے کے پاس بیٹھنے والے بے خبر رہتے ہیں +

مگر یاد رکھو۔ بے تار کی خبر راستہ میں گرفتار بھی ہو جاتی ہے۔ یعنی جب وہ بجلی کے کندھے پر سوار جا رہی ہو۔ اور راستہ میں کوئی اور کھمبا مل جائے تو وہاں کے رہنے والے خبر کے بھید کو پکڑ سکتے ہیں۔ بس اس میں بھی انسان کو عاجز رکھا گیا ہے۔ اور وہ پوری اور کامل قدرت نہیں دی جو مراقبہ کرنے والے کو عطا ہوئی ہے۔ مراقبہ کرنے والے کا کشف کوئی گرفتار نہیں کر سکتا۔ تو پھر تو خدا کی ان مکمّل طاقتوں کو بھی سیکھ اور ان کو حاصل کر کے دشمنوں کی ان چھچھوری۔ ناقص قوتوں کو حاصل کر لے۔

میں تو تیرا ہوں۔ ذرا آگے تو بڑھ۔ سب کچھ دوں گا۔ ہاتھ پاؤں تو ہلا۔ سب کچھ بخشوں گا۔ گھر میں بیٹھا بیٹھا کوستا ہے۔ تیوری چڑھاتا ہے۔ اور بھولے بچوں کی طرح ایڑیاں رگڑتا ہے۔ اس سے کیا فائدہ۔

ہاں سچ ہے، حسن نظامی۔

از نظام المشائخ جون ۱۹۱۳ء

سل اور دق دو دو حرف کے دو لفظ یا دو نشتر ہیں جو انسان کی رگ حیات کو چپکے ہی چپکے بے خبری میں زخمی کر کے اُس کا کام تمام کر دیتے ہیں۔ اولادِ آدم گوری ہو یا کالی۔ ان بیماریوں کے نام سے کانپتی ہے۔ لرزتی ہے۔ اور ڈھونڈھتی ہے کہ اپنی عقل اور علم کے زور سے ان موذی اور نامراد بیماریوں کا علاج مل جائے۔

انگریزوں کے شاہی خاندان میں یہ امراض موروثی ہو گئے ہیں۔ دولت نے ڈاکٹروں نے مل جُل کر مہینوں برسوں ان کا وجود اگر موجود۔ بود مگر نابود امراض کی تحقیقات میں سر کھپایا۔ غیب کا بھید ہاتھ نہ آیا۔ کسی نے کہا قہقہہ مار کر ہنسنا اس کا علاج ہے کوئی بولا کھلی ہوا میں رہنا۔ فکر کو پاس نہ آنے دینا ان کی دوا ہے۔ کوئی اپنے سر کو پکڑ کر بیٹھ گیا اور کہا عقل کچھ کام نہیں دیتی علم کی رسائی موت کی ان ہولناک مشینوں کے پرزوں کی حقیقت تک نہیں پہنچتی۔ گویا ان سب مادّہ پرست ہستیوں کو اقرار ہے کہ سل اور دق کے امراض کا دُنیا میں کوئی علاج نہیں۔ یعنی شرطیہ اور حتمیہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا۔ جیسا کہ بعض باتوں میں یہ مادّہ پرست لوگ لن ترانی سے دعویٰ کیا کرتے ہیں +

خدا کی شان ہے۔ خدا کے وجود سے انکار کرنے والی عقلیں۔ معمولی معمولی باتوں میں کس طرح عاجز اور لاچار ہو جاتی ہیں۔ آؤ۔ ذرا آج صوفیانہ نقطۂ نظر سے ان پیارے پیارے چھوٹے چھوٹے لفظوں پر غور کریں۔

سِل اُس بیماری کا نام ہے جو پھیپھڑے کو غموں کی چھری سے زخمی کر دیتی ہے۔ اور آدمی خون تھوکتا تھوکتا مر جاتا ہے۔ دِق ایک خفیف اور باطنی حرارت کو کہتے ہیں۔ جو جسم کے خون کو جلا دیتی ہے۔ پھیپھڑہ اس کی ہلکی ہلکی آنچ سے جلکر کباب ہو جاتا ہے دونوں حالتوں میں مریض کا ظاہری چہرہ اندرونی اور باطنی سوختہ کاری کو ظاہر نہیں ہونے دیتا۔ جس طرح عشق کی آگ جب خانۂ باطن میں بھڑکتی ہے تو انسان کے اعضائے ظاہری پر اس کا ظہور بس اتنا ہوتا ہے کہ ہونٹ خشک ہو جائیں۔ چہرہ زرد نظر آنے لگے۔ ٹھنڈے ٹھنڈے سانس ہوں۔ آنکھیں آنسوؤں سے لبریز رہیں۔ اسی طرح سل اور دق چہرے کو افسردہ اور فکرمند بنا دیتی ہیں۔ مگر ہلاکت اور فنا کا بھید صفحۂ رُخ پر ظاہر نہیں ہونے پاتا۔ سیاست شناس لوگ کہتے ہیں۔ چالبازوں کی حکومت سل اور دق کا مرض ہے۔ جو قوموں اور ملکوں کا اندر ہی اندر کام تمام کر دیتی ہے +

ہم کہتے ہیں آدمی ان معمولی جسمانی بیماریوں سے تو اتنے پریشان اور آشفتہ خاطر ہیں۔ جن کا علاج اور جن کی تشخیص چنداں دشوار نہیں۔ کبھی انھوں نے روحانی سل اور دق پر بھی توجہ کی۔ جو روح کے جوہر زندگی کو اندر ہی اندر فنا کر دیتے ہیں اور وہ نفس کی حرص و ہوس ہے۔ حرص ایک سل ہے اور ہوس ایک دق ہے۔ جب یہ عارضے روح کو لاحق ہوتے ہیں تو انسان نفس اور شیطان کے القا سے یہ سمجھتا ہے کہ حرص و ہوس درحقیقت انسانی ترقی اور حصول کمالات کے لیئے لازمی چیزیں ہیں جو قومیں صابر اور قانع ہوتی ہیں۔ اُن کو ترقی اور کمال میسّر نہیں آتا۔ ایک ہی جگہ ٹھٹھری کی ٹھٹھری رہ جاتی ہیں۔ اور جب کوئی شخص بیماری کو بیماری نہ سمجھے۔ بلکہ امراض کو زندگانی خیال کرے تو ظاہر ہے کہ وہ خود ہلاکت اور موت کے گڑھے میں گرنے کی کوشش کرتا ہے۔ حدیث شریف میں آیا ہے۔ آخر زمانے میں مکّاریاں۔ دغابازیاں عقلمندی اور ہنر شعاری سمجھی جائیں گی۔ وہ زمانہ آج کل ہے۔ جو شخص دُنیاوی اُمور اور فانی دولت کے حاصل کرنے میں عیّارانہ جوڑ توڑ کرنے کی زیادہ صلاحیت رکھتا ہو۔ اُس کو بہت بڑا عاقل اور دانا مانا جاتا ہے۔ اور جو چالاکیوں اور فریب کاریوں کو ناجائز خیال کر کے صبر و قناعت سے خدا و رسول کے احکام کی پیروی اور تعمیل کرتا ہو وہ اعلیٰ درجہ کا بے وقوف۔ احمق۔ وحشی۔ بے تہذیب اور فلسٹین کہلاتا ہے۔ مگر بے وقوفوں اور احمقوں کی روحیں جن کا اوپر ذکر آیا ہمیشہ تندرست اور زندہ سلامت رہتی ہیں۔ اور عقلمندوں اور ہوشیاروں کی ارواح سل اور دق کی مریضوں کی طرح افسردہ اور اُداس اور بے چینی کی زندگی بسر کرتی ہیں۔ ذرا سے صدمے اور دُنیاوی پیچیدگی سے صبر و استقلال کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے۔ اور خودکشی کے سوا اتنے لمبے چوڑے آسمان و زمین میں تسلّی اور اطمینان کا کوئی چارۂ کار نظر نہیں آتا +

پس جن لوگوں کی روحیں سل اور دق کے امراض میں مبتلا ہیں اُن سے کیا توقع ہو سکتی ہے کہ وہ جسم کی سل اور دق کا علاج معلوم کر سکیں۔ یہ حصّہ اُن لوگوں کا ہے جن کی ارواح توکل ربّانی سے حقیقی مضبوطی اور توانائی اور وہ قوت رکھتی ہیں جن کے آگے مادی سائنس اور فلسفہ کے مکاشفات کمالیہ ہیچ ہیں۔ جس شخص کی روح کو اللہ تعالےٰ نے اپنے علوم مخفیہ کی بصیرت عنایت فرمائی ہے وہ جسمانی سل اور دق کے امراض کا علاج اچھی طرح جانتی ہے۔ اس کو مرض کی حقیقت اور اصلیت کا بھی بھید معلوم ہوتا ہے۔ اور ان اسباب کا بھی علم اُن کو دیا جاتا ہے

جن سے جسم کے یہ عارضے دور ہو جائیں۔

سل اور دق پھیپھڑے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور پھیپھڑے کی زندگی سانس پر منحصر ہے۔ اور سانس فضائے عالم کی ہوا سے تعلق رکھتا ہے اسی لئے مادی فلسفیوں نے نتیجہ نکالا کہ دق اور سل کے مریضوں کے لئے صاف ہوا ہونی چاہیئے۔ تاکہ صاف سانس پھیپھڑے میں جائے اور اُس کی کدورتیں دور ہو جائیں۔ لیکن جب پھیپھڑے میں زخم پڑ چکے ہوں تو وہ لوگ کہتے ہیں کہ پھر صاف ہوا کچھ فائدہ نہیں پہونچا سکتی۔ یعنی جب سل اور دق کا درجہ ابتدائی مقامات سے آگے بڑھ گیا ہو تو مرض لاعلاج ہو جاتا ہے۔ یہ اُن لوگوں کی بڑی بھول ہے۔ تندرست روح کو بتایا گیا ہے کہ ہر مرض کا ایک علاج ہے۔ ہر زہر کا ایک تریاق ہے۔ پھول کے ساتھ کانٹا۔ اندھیرے کے ساتھ روشنی ہے +

کسی چیز کا عرفان اُس کی ضد سے ہوتا ہے۔ اور ہر چیز کی ایک ضد پیدا کی گئی ہے۔ یہ کہنا کہ جب پھیپھڑہ زخمی ہو جائے اور زخموں کا گھراؤ بڑھ جائے تو پھر اندمال کسی صورت سے ممکن نہیں۔ ڈاکٹروں کی روحانی سل و دق کی مرضیین رائے ہے اور بالکل غلط اور جھوٹ ہے +

ایک دفعہ راقم فقیر بیمار ہوا۔ کلکتہ کے سب سے بڑے انگریز ڈاکٹر نے کہا۔ پھیپھڑہ خراب ہو چکا۔ اب کوئی علاج فائدہ نہ دے گا۔ باطنی ڈاکٹر بولا۔ اور اپنے فکر مند مریض کو سمجھایا کہ ڈاکٹر پر ایمان نہ لاؤ۔ پاس انفاس کا شغل کھلی ہوا میں جا کر کرو۔ سارا پھیپھڑہ بھی گل گیا ہوگا تو اچھا ہو جائے گا۔ میں نے اس پر عمل کیا اور آج پانچ برس سے زندہ سلامت ہوں +

عزیزم مُلّا محمد الواحدی اڈیٹر نظام المشائخ کو آج کل کسی ایسے ہی ڈاکٹر نے کہہ دیا ہے کہ تم کو سل ہے جلدی علاج کرو ورنہ خیر نہیں۔ سُنتا ہوں بشریت کے تقاضے سے واحدی مُلّا پر اسکا اثر ہوا۔ اور وہم کے نشتر نے اچھے پھیپھڑے کو زخمی بنا دیا۔ حالانکہ وہ جانتے ہیں کہ سانس پر حیات جسم کا مدار ہے۔ سانس ہی وہ چیز ہے جس سے زندگانی کی کامرانیاں تعلق رکھتی ہیں۔ سانس پر قابو پا جانا صحت روحانی و جسمانی کے لئے ازحد مفید ہے۔ وہ آہستہ آہستہ ذکر الٰہی سانس کے اندر جائیں۔ کھلی ہوا میں خوب چہل قدمی کریں۔ خدا کا ذکر ہمارے سب ظاہری باطنی جراحتوں کا مرہم ہے سانس کے ذریعہ اس مرہم کے پھائے پھیپھڑے پر لگائے جائیں۔ اور اطمینان کے لئے دوا کا استعمال بھی ہو تو مضائقہ نہیں +

سل اور دق کی اصل جڑ تفکرات خانگی ہیں۔ عارف کو دُنیا کے نشیب و فراز کے ترددات و تعیشات سے متاثر نہیں ہونا چاہیئے۔ اس دُنیا کی خوشی و تکلیف سب عارضی ہے۔ لہٰذا ہر حال میں خوش اور ہشاش بشاش رہنا چاہیئے۔ لیکن یہ بات حاصل نہ ہوگی۔ جب تک کہ خدا تعالیٰ کی ذات پر کامل بھروسہ اور اعتماد پیدا نہ ہو جب توکل اور صبر و رضا کا مقام حاصل ہو جاتا ہے تو دُنیا کی کوئی تکلیف اذیت نہیں دیتی۔ اور جب مصائب میں ایذا کا احساس باقی نہ رہے تو اُن کا اعضائے جسم پر یعنی دل۔ دماغ پھیپھڑہ وغیرہ پر کوئی نقصان رساں اثر نہیں پڑنے پاتا۔ اور اگر بشری کمزوری سے اثر پڑ جائے تو بہت جلد ہی اُس کی اصلاح ہو جاتی ہے +

سانس کا ذکر سینہ اور پھیپھڑے کے امراض کو بہت جلد ہی دور کر دیتا ہے۔ تم کو چاہیئے۔ صبح نماز پڑھکر سورج نکلنے سے پہلے کھلے میدان میں نکل جاؤ اور وہاں ایک مطمئن مقام پر بیٹھکر قابل برداشت وقفہ سے لمبا سانس اندر لیجا کر

روکے رکھو۔ اور آہستہ آہستہ باہر نکالو۔ اور اس سانس میں لفظ اللہ کو جماؤ۔ یعنی جب سانس اندر جائے تو تمام سینہ اور شکم کو اس سے بھر دو۔ اور خیال کرو کہ لفظ اللہ باطن کی ہر سمت پر چھایا ہوا ہے۔ اور جب باہر کا سانس لو تو ھو کہو اور آہستہ آہستہ سانس کو خارج کرو۔ اس طرح سل دق کی تمام جسمانی و روحانی کثافتیں دور ہو جائیں گی۔ والدعا۔

از نظام المشائخ اگست ۱۹۱۴ء

جون ۱۹۱۴ء میں بمقام احمد آباد گجرات راقم درویش دیا سلائی کے ایک نئے کارخانے کے افتتاح میں شریک کیا گیا تھا۔ جلسہ بہت شاندار اور عظیم تھا۔ پیر صاحب بغدادی اور کلکٹر احمد آباد صدارت کی کرسی پر بازو سے بازو ملائے خبر نہیں کس قسم کا قرآن پہنے بیٹھے تھے۔ ایڈریس بازی اور اسپیچ نوازی ہو رہی تھی۔ اس وقت میرے تخیل نے عرب و انگریز و گجرات کو مخاطب کر کے چند الفاظ جوڑ لیئے۔ ناظرین دیکھیں۔ یہ جوڑ توڑ کیسا ہے۔ (حسن نظامی)

الکبریت ما الکبریت۔ وما ادراک ما الکبریت۔ میچز۔ ویج میچز۔ ہوٹول یوواٹ میچز۔ آر یو اسٹری۔ کیوی دیو اسٹری۔ تم نے شی کھیر کہ دیو اسٹری شوں تھے ۔

دیا سلائی۔ کیسی دیا سلائی۔ تمھیں کیا خبر کہ دیا سلائی کیا ہوتی ہے ؟ ۔

وہ ایک تنکا ہے جو جلنے اور مرنے کو پیدا ہوا۔ وہ جنگل کے ہرے بھرے درختوں کا لخت جگر ہے۔ جو انسان کی خاطر ملیا میٹ ہونے گھر سے باہر نکلا۔ کٹ کر آیا۔ گرم چشمہ میں اُبلا۔ کھال کھنچی۔ مشین کی قینچیوں نے پرت پرت کترے تنکے بنائے۔ اور مسالہ میں غوطہ دیکر بکس بنائے۔ جب یہ میاں تنکے دیا سلائی کہلائے ۔

ناروے۔ سوئیڈن۔ جاپان کی دیا سلائی گوری۔ ہندوستان کی کالی۔ مگر دونوں کالے گورے کے لقب سے آزاد کبھی نہیں سُنا کہ کالے تنکے کو گورے تنکے نے کینیڈا اور ساؤتھ افریقہ کے گوروں کی طرح اپنے ملک میں آنے سے روکا ہو ۔

یہ بیچارہ تو ہند و مسلمان عیسائی۔ موسائی۔ نیک و بد کا فرق بھی نہیں کرتا جس کے ہاتھ میں جاتا ہے خدمت بجا لاتا ہے۔ مندر۔ مسجد۔ گرجا میں اسی کے دم سے روشنی ہے۔ مسٹر کلکٹر اور پیر صاحب بغدادی کے سگریٹ یہی سُلگاتا ہے ۔

آج اس کی مشین کھولی جاتی ہے۔ یہ اس کا یوم الست ہے۔ سب تنکوں کی روحیں بتائیں ان کا عارف کون ہے خدا کا اقرار تو وہ ازل کے دن بلیٰ کہکر کر چکے۔ اب اپنے واقف اسرار کو سمجھیں ۔

وہ کون ہے ؟ اس جلسے میں کوئی نہیں۔ بیچارے پیر بغدادی بھی کبریت کے رموز سے بے خبر ہیں۔ سگریٹ جلانے کے سوا کبھی اس غریب کو ہاتھ میں نہیں لیتے۔ مسٹر کلکٹر کو صدارت کی کرسی اور اسپیچ بازی سے فرصت نہیں۔ مجمع عام میں بھی جس میں ہندو مسلمان۔ پارسی۔ یہودی۔ عیسائی۔ گورے کالے سب ہی موجود ہیں کوئی نہیں جانتا کہ دیا سلائی

کی اصلی شان کیا ہے۔ وہ کیوں ایک ہی سجدہ میں مقبول ہوجاتا ہے۔ کہ بکس کے پہلو میں بچھی ہوئی خاکی جانماز پر سر جھکایا اور شعلۂ غیبی دوڑ کر آیا۔ غریب تنکا جل کر گر پڑا۔ اور ہمارا گھر روشن ہوگیا +

یہ شعلہ کہاں سے آیا۔ کس نے بھیجا۔ کوئی ہے جو بتائے۔ نہیں تو۔ کوئی ہے جو بتانے والے سے یہ بھید سُنے۔ مگر نہ کوئی بتانے والا ہے۔ نہ کوئی سُننے والا ہے۔ آسمان اپنے اشاروں کو دل کے پردوں میں چھپا رہنے دے۔ ورنہ یہ شرمائیں گے جو میری سی شکل وصورت لیکر آئے ہیں۔ مگر تجلّی حق سے محروم ہیں +

لوہے کی طریقت

از طریقت جولائی ۱۹۱۴ء

خاک کی مورت۔ مٹنے والی صورت۔ اور زور کا یہ عالم کی سمندر کی چھاتی پر مونگ دلنے کو تیار۔ بجلی و ہوا کے سر پہ سوار جنات و حیوانوں کی تو کیا مجال کہ اس سے آنکھ ملائیں۔ فرشتے اس کے آگے سر جھکاتے ہیں۔ خدا کے سامنے اس کی طاقت کا لوہا مانتے ہیں +

ذرا دیکھنا۔ اس خاکی پُتلے کو۔ زمین پر پاؤں نہیں دھرتا۔ لوہے کی نہریں بناتا ہے اور ان میں کاٹھ کی ناؤ چلاتا ہے۔ کاغذ کی شریعت پر لوہے کے قلم سے آہنی طریقت کی گلکاریاں دکھاتا ہے +

عشق کا انکس نہ ہوتا تو یہ مست ہاتھی خبر نہیں کیا خون خرابے کرتا۔ کن کن نیم جانوں کو پاؤں کے نیچے دلتا۔ خدا کی شان ہے۔ محبّت کی ننھی سی چیونٹی اس دیوانے ہاتھی کے اوسان باختہ کر دیتی ہے +

یہ موسم برسات خاک کے ہر ذرّہ میں ایک جان پیدا کر دیتا ہے۔ آسمان سے جو بوند زمین پر آتی ہے اپنے اندر ایک روح لاتی ہے۔ مگر آدمی کے لیئے یہ زمانہ قیامت ہے۔ وہ اپنے کلیجہ کو مسوستا ہے۔ اور بے قرار ہوکر آسمان کو دیکھتا ہے۔ اور کہتا ہے۔ اے ابر تو آیا۔ میرے پیارے کو نہ لایا۔ کبھی کہتا ہے۔ برسات بھی۔ برسا تھ نہیں۔ خیال کرنا۔ اس ابلیسانہ نخوت کی حالت کا۔ جو بارش سے پہلے فلسفۂ الہیات پر غور کر رہا تھا۔ اپنی غیر معمولی قوتوں پر اترا رہا تھا۔ اور کہتا تھا میں سمندر کو خشک کر سکتا ہوں۔ پہاڑ میرے ہنر سے خاک بن جاتے ہیں۔ میں ہوا کے اوپر اپنے بنائے ہوئے پروں سے پرواز کر سکتا ہوں۔ بجلی میری تابعدار ہے۔ بھاپ پر میری حکمرانی چلتی ہے۔ مجھ میں ہر بڑی طاقت کے مسخّر کر لینے کا مادہ موجود ہے۔ میں اپنی کوشش سے آسمان کو زمین پر لا سکتا ہوں۔ اور زمین کو فلک پر پہونچا سکتا ہوں +

اور اب جوں ہی کالی گھٹا نمودار ہوئی۔ ہلکی ہلکی گرج کی آواز آئی اور بجلی نے بادلوں سے جھانکنا شروع کیا جنگل کے مور جھاڑیوں سے نکلکر میدان میں آئے۔ اور جھوم جھوم کر بولنے لگے۔ حضرت ابن آدم نیم وحشیوں کی طرح مجنونانہ حرکتیں کر رہے ہیں۔ کبھی داغ کا دیوان اُٹھاتے ہیں۔ کبھی تھیٹر کا کوئی گیت گُن گُناتے ہیں۔ سامنے کے چمن میں گلاب اور چنبیلی کی ٹہنیوں میں خیالی جھولے ڈال رہے ہیں۔ اور یہ خیال نہیں کرتے کہ ان نازک اندامون میں اتنی سہار نہیں۔ سُننا۔ دل سے کیا مزے کی باتیں ہو رہی ہیں +

وہ اس باغ میں کیونکر آئیں گے۔ راستہ خراب ہے۔ فقط ایک بٹیا ہے۔ اس پر کیچڑ ہوگی۔ اُن کا پاؤں نہ پھسل جائے آس پاس گھاس ہے۔ کوئی جانور نہ نکل آئے۔ کالی چھتری پر بجلی نہ گر پڑے۔ وہ بہت ڈرپوک ہیں۔ بجلی کے ڈر سے آنا موقوف نہ کر دیں۔ رقیب کا گھر پکی سڑک کے پاس ہے۔ اُس کے ہاں نہ ٹھہر جائیں۔ میں نے بڑی غلطی کی۔ باغ کا راستہ پہلے سے درست نہ کرالیا۔ میں یہاں لوہے کی پٹری بچھوا دیتا۔ تاکہ وہ آج کی رات اسپیشل ٹرین میں چلے آتے۔ موٹر خریدنے کا ارادہ ہی کرتا رہا۔ آج ہوتی تو کام آتی +

کہتے ہیں ایسے موقع پر خدا کو پکارنا چاہیئے۔ وہ بھی کبھی نہ کبھی کام آجاتا ہے۔ میں نے تو آج تک اُس کا احسان نہیں اُٹھایا ہے۔ تو کیا اُسی کو آواز دوں۔ مگر وہ بھی کیونکر آئے گا۔ اُس کے پاس ہوائی جہاز تھوڑی ہی ہے +

اتنے میں بادل پھٹ گیا۔ سورج نکل آیا۔ تخیلات کا سیلاب اُترنے لگا۔ جذبات کا طوفان تھمنے لگا۔ ہوش ٹھکانے آئے تو جنگل کی جھونپڑی میں رہنے والے شاہ صاحب کے پاس پہونچے۔ اور اپنی تازہ حالت کا استفسار کرنے لگے +

شاہ صاحب نے کہا۔ بابا۔ مٹی کی طریقت رکھنا اور عشق کا دم بھرنا عقلمندی نہیں۔ محبوب سنگدل ہے۔ اُس کے لیے لوہے کی سڑک بنا پڑے۔ پیارا پارہ ہے تو آگ بنکر اُڑاؤ۔ لکڑی کا قلم توڑو۔ لوہے کے قلم سے رشتہ جوڑو۔ یہ قلم ہر سنگی لوح میں نقش کندہ کر دیتا ہے +

میاں۔ شریعت علم ہے۔ اور طریقت عمل۔ اور معرفت اس عمل کا نتیجہ۔ برسات کی ہوا نے عشق کو جگایا۔ اور ایک طلب دل میں پیدا کی۔ یہ شریعت تھی۔ مطلوب کو حاصل کرنے کے لیئے گھر سے نکل پڑتے۔ سڑک۔ چمک۔ کیچڑ۔ پانی کی پروا نہ کرتے تو سالک طریقت کہلاتے۔ در جاناں تک رسائی مل جاتی۔ جس کے لیئے ہاتھ ملتے ہو وہ ہاتھ آجاتی۔ تو مقام معرفت میں حق الیقین کا درجہ پاتے۔ کتابوں کے کاغذ۔ طریقت کی کاغذی سڑکیں ہیں۔ ریل کی پٹریاں آہنی راستے ہیں۔ ان کو دیکھو اور سمجھو انسانی ارادہ قلم و دوات کی مدد سے حروف کی شکل میں کاغذ پر نمودار ہوتا ہے۔ اور پڑھنے والے کے سلوک کے لیئے طریقت بنتا ہے۔ ریل کی پٹریاں زمین پر بچھ جاتی ہیں۔ اور اپنے سینے پر رات دن گاڑیوں کی آریاں چلاتی ہیں۔ تب دور کی منزلیں قریب ہوتی ہیں اور فراق وصال کی شکل اختیار کرتا ہے +

بھائی یہ زمانہ لوہے کا زمانہ ہے۔ اگلے وقتوں میں زبان نصیحت کرتی تھی۔ اب توپ کا مُنہ لکچر دیتا ہے۔ سُنا نہیں ؎

شاہ جرمن نے کہا ہنسکر جناب پوپ سے   وعظ ہم بھی کہتے ہیں لیکن دہانِ توپ سے

توپ کا لفظ جلدی اثر کرتا ہے۔ اور جلدی منزلِ مقصود تک پہونچ جاتا ہے۔ خاکی طریقت کے مقابلہ میں آہنی طریقت یعنی سڑک سواریوں کو جلدی مقام مطلوب تک پہونچا دیتی ہے۔

طریقت کا کوچہ بڑا سخت ہے۔ اس میں لوہے کے چنے چبانے پڑتے ہیں۔ آج کل کی آہنی ایجادیں ہم کو اشارہ کرتی ہیں کہ ہم بھی اپنے دینی راستہ کو پختہ اور آہنی بنائیں۔ اور اپنے سلوک کی گاڑی جلدی اس دور ظلمات سے گزار کر لے جائیں +

مگر لوہے کی طریقت آسانی سے حاصل نہیں ہوتی۔ بہت سی گرم بھٹیوں میں جلنا۔ گُٹنا پڑتا ہے۔ اہل لوہے کی طریقت کے بھی درجے ہیں۔ جو باطنی طریقت کے درجوں کو ثابت کرتے ہیں۔ پہلا درجہ فولادی ہے۔ اس کے اندر کوئلہ کی کثافت نہیں ہوتی۔ یہ بہت نازک تن اور نازک آواز چیز ہے۔ ذرا سے صدمے سے ٹوٹ جاتی ہے۔ اس کو توڑو تو ننھے ننھے ذرّے چمکتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ دوسرے درجے کا لوہا ظلماتی اثر زیادہ رکھتا ہے۔ اس کو توڑو تو لکڑی کے سے ریشے نکلتے ہیں۔ تیسری

قسم اس سے بھی زیادہ سخت ہے۔ قدرت نے ہر درجے کی ایک لوکری رکھی ہے۔ جس میں وہ مصروف رہتا ہے۔ پانی لوہے کا ملک الموت ہے۔ پانی کے اندر اس کو ڈال دو اور کچھ دن کے بعد نکال کر ہوا میں رکھ دو۔ زنگ کی چادر چھائی ہوئی ہوگی۔ یہ چادر اندر ہی اندر لوہے کے جسم میں گھستی چلی جاتی ہے۔ اور آخرکار لوہے کو خاک کر دیتی ہے۔ یہی حال باطنی طریقت کا ہے۔ اس کے بھی مختلف درجے اور حصے ہیں۔ مگر ہر حصّہ کو خام خیالی اور بے اعتقادی کا پانی فنا کر دیتا ہے۔ تم اگر سمجھتے ہوتے اور آہنی طریقت سے واقف ہوتے تو خدا تعالیٰ کی نسبت ایسی بے سر و پا باتیں خیال میں نہ لاتے جس نے تم کو اور تمہارے علم و ہنر اور طاقت خیال کو پیدا کیا ہے +

پتھر کی طریقت

از طریقت۔ ستمبر ۱۹۱۴ء

یہ رسالہ جس کا نام طریقت ہے۔ کیونکر چھپا۔ اس کا خیال بہت کم لوگوں کو ہوتا ہے۔ ڈاک میں پیکٹ آیا۔ کھول کر پڑھنا شروع کر دیا۔ اور رائے زنی شروع ہوگئی۔ کاغذ ذرا خراب ہے۔ چھپائی بھی چندی چندی آنکھوں سے دیکھتی ہے لکھائی بھی بہت خوبصورت نہیں +

ہاں۔ مضامین کی ترتیب اچھی ہے۔ جذبات عوام و خواص کو یکساں ملحوظ رکھا گیا ہے۔ یہ کہا اور پرچہ رکھ دیا۔ مگر کسی نے یہ نہ سوچا کہ کاغذوں پر یہ حروف کس طرح نقش ہوئے۔ اور کن کن منزلوں کو طے کر کے ہم تک آئے اور ان کے اندر کیا کیا معانی پوشیدہ ہیں +

یہ غور کس کے حصے میں ہے۔ اُس کے جو پہلے خود اپنے وجود پر فکر کرنے کا عادی ہو۔ جُز سے پہلے کُل۔ شاخ سے پہلے جڑ پر خیال لے جاتا ہو۔ وہ جب رسالہ طریقت کو دیکھے گا تو کہے گا کہ اس کا آنا پتھر کی سڑک سے ہوا ہے +

پہلے کاپی نویس نے لوگوں کے خیالات کو قلمبند کیا۔ اور زرد رنگ کے کاغذ پر لکھا۔ زرد رنگ اس لیے منتخب کیا کہ ہر چیز کی بنیاد عشق و محبت پر ہے۔ اور زردی شانِ الفت ہے۔ عشق عاشق کو زرد بنا دیتا ہے۔ لہٰذا ان حروف کو جو آخری منزلوں میں اپنی شکل کے سیکڑوں ہزاروں حرف بننے والے تھے۔ زرد کاغذ پر لکھا گیا +

اس کے بعد پتھر کی طریقت کا سلوک درپیش ہوا۔ پتھر کی طریقت یعنی چھاپہ کا پتھر بلایا گیا۔ اور اُس سے کہا گیا کہ ان حروف کو جو کاپی کے کاغذ پر شانِ یکتائی میں ہیں رنگِ کثرت عنایت کر۔ پتھر نے کہا۔ توبہ توبہ۔ میری کیا مجال ہے جو کسی کو کچھ دوں۔ یہ قدرت تو کسی اور ہی کے قبضہ میں ہے۔ اس کے علاوہ ابھی تو میرے سینے پر نقش غیر کندہ ہیں جب تک یہ نہ مٹ جائیں کوئی سلوک کامیاب نہیں ہو سکتا +

یہ سُنکر دستِ غیبی آگے بڑھا۔ دو پتھروں کو سینے سے ملا کر رگڑنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ تھوڑی دیر میں نقش غیر فنا ہوگئے +

جب پتھر سے نقشِ غیر مٹ گیا تو کہا گیا کہ لے ان نئے حرفوں کو سینے میں جگہ دے۔ پتھر نے آہ سرد بھر کر کہا

کہ ابھی ایک امتحان اور باقی ہے۔ امانتِ عشق کو سینے میں رکھنا آسان نہیں۔ پہلے آتشِ شوق سے سینہ گرما لوں۔ مہمان کے قابل گھر کو بنا لوں۔ تو لبیک کہکر خیر مقدم کو آگے بڑھوں +

پتھر کو آگ سے سینکا گیا۔ سوز و ساز کا مزا چکھایا گیا۔ اُنگلیوں نے اس کے بدن کو چھو کر دیکھ لیا کہ ہاں نارِ ذوق اس کے اندر خوب سرایت کر چکی۔ تو کاپی کا کاغذ منگایا گیا۔ اور پتھر کی چھاتی سے اُس کو چمٹایا گیا۔ کاغذ گرمی کی تاب نہ لایا اور پتھر و حروف کے اسرارِ وصال میں شرکت کو برداشت نہ کر کے کہیں غائب ہو گیا۔ اب جو حرفوں نے آنکھ کھولی تو اپنے سوا کسی کو نہ پایا +

باہر والوں نے غلیظ کثافتوں کو صاف کیا۔ اور لو ہے کے قلم لیکر حروف کی نوک پلک تراشنے بیٹھے۔ اس وقت دیکھا تو حروف اُلٹے نظر آئے۔ گھبرا کر پوچھا۔ تمہارا کیا حال ہے۔ حروف نے جواب دیا۔ جس کا باطن سیدھا ہے۔ اُس کا ظاہر اُلٹا نظر آتا ہے۔ بندہ اس کو نہیں سوچتا۔ اس واسطے تغیراتِ عالم سے گھبراتا ہے +

تزکیۂ ظاہری ہو چکا تو پتھر کو مشین کے اوپر رکھا گیا۔ اور اس پر سیاہی کا بیلن پھیرا گیا اور اوپر ایک کاغذ ڈھک کر مخفی حُجرے میں دھکیل دیا گیا۔ اور فوراً باہر بُلا لیا گیا۔ دیکھا تو حروف کا ایک دوسرا ہمشکل اوپر کے کاغذ پر موجود تھا +

اسی طرح سینکڑوں ہم شکل بنتے چلے گئے۔ اور اُن سے یہ رسالۂ طریقت تیار ہوا +

گویا یہ طریقت پتھر کی طریقت ہے۔ منزلِ سنگ کو طے کر کے ہم تک آئی ہے۔ دیکھیئے پتھر کی طریقت آئندہ زمانہ میں کیا گل کھلاتی ہے۔ ابھی تک تو اطمینان ہے۔ کیونکہ ڈاکٹر اقبال کا بیان ہے کہ فقیر اور طریقت آپ لوگ پالٹیکس میں حصّہ نہیں لیا کرتے۔ اگر یہ ڈپلومیسی کا اظہار نہیں ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ میں سنگ لرزاں بنا رہوں +

از طریقت۔ جنوری ۱۹۱۵ء

تانبے کا مدوّر چھوٹا سا ٹکڑہ۔ جسے عام طور پر پیسہ کہتے ہیں اپنے عجز و فقر کا خاکی جامہ پہنے ہوئے نظامی کچکول سے نکلا اور کسی کی زبانِ رنگین سے یہ الفاظ ادا ہونے لگے۔

اسلامی مُلک کا ایک پیسہ اپنے پاس بھی رکھیئے!

اللہ رے اسلامی شغف و محبت۔ کہ اسلامی ملک کا پیسہ جو اپنے مُلک میں کوئی بڑی چیز نہیں سمجھا جاتا۔ ایک ایسے مقدس نام کی یادگار بنایا جا رہا ہے۔ ایسے پیسے بازاروں میں نگاہِ عقیدت محسوس کرا رہی ہے۔

اے تانبے کے گول ٹکڑے۔ تو ایک دراز قد سیاح صوفی کی حیثیت میں کچکول کے کب سے مست و محو پڑا ہوگا۔ وہاں رہنا تیرے لئے موجبِ سکون تھا۔ تیری نقل و حرکت مسدود ہو چکی تھی۔ لیکن افسوس تجھے کیا خبر تھی کہ تو دامانِ استغنا کے بسیط گوشے چھوڑ کر کہاں دستِ ہتھیلی میں آ پڑے گا۔ جس میں تیرے ہمجنسوں کو آج تک کبھی قرار و قیام

نصیب نہیں ہوا +

اے اسلامی مُلک کی یادگار! تجھ پر جو حروف کندہ ہیں وہ حقیقتاً جان سے زیادہ گرانمایہ ہیں۔ اور تیرا رواج ایک حد تک تبلیغ کلمۃ اللہ کا ایک چلتا ہوا ذریعہ ہے۔ تو سیماب وار ایک جگہ قرار نہیں لیتا۔ اس لیئے میں تجھے ہرجائی کہوں تو میرا کیا قصور ہے۔

او خاموش ہرجائی! کیا یہ بے وفائی نہیں ہے کہ تو اپنے ہمجنسوں کو چھوڑ کے ایک جوگی کے ساتھ ہو لیا۔ جو سب کو اپنا کر لیتا ہے۔ لیکن کسی کا ہو کر نہیں رہتا۔ تجھے اُس سے وابستگی کی اُمید۔ اور نباہ کی توقع ہوگی۔ لیکن دیکھ وہ تجھے چھوڑ کر خدا جانے کہاں چلا گیا۔ اور تو آج اُس فقیر کے کاسۂ حقیر میں پڑا ہوا ہے۔ جس میں رہنے سے ٹھیکریوں اور کوڑیوں کو بھی شرم آتی ہے۔

لیکن اے تحفۂ مسکوک! تو نہ گھبرا۔ میرے پاس آکر افسوس نہ کر۔ میں تجھے اپنے دل کے داغوں اور اپنے تلووں کے چھالوں سے زیادہ عزیز سمجھوں گا۔ تجھے بحفاظت ایک لکڑی کی محفوظ چار دیواری میں رکھوں گا۔ وہ تیرا چوبی قلعہ ہوگی۔ اور تو اُس قلعۂ خاموش میں سکون کے ساتھ بادشاہی کرے گا۔ اطمینان رکھ اور شاد ہو جا کہ تیری نقل و حرکت اب قیامت تک کے لیئے بند ہوگی۔ اب تو ہر کس و ناکس کے ہاتھوں میں نہیں جا سکتا۔ تو بظاہر ایک تانبے کا گول ٹکڑا ہے۔ لیکن حقیقت میں میرے لیئے اشرفی سے زیادہ ہے +

میں کبھی کبھی تیری زیارت کو اپنا فخر سمجھا کروں گا اور تجھے دیکھکر میری چشمناک میں وہ سرسری نظارہ پھر جایا کریگا جب کہ دہلی کے رنگیلے اور متوالے صوفی نے تجھے میرے سپرد کیا تھا +

بس اب تو میرا ہے۔ لیکن افسوس میں تیرا نہیں ہو سکتا۔ میری دلی تمنا ہے کہ میں جس کا ہوں۔ وہ بھی اسی طرح ایک دن میرا ہو جائے۔ اور وہی ہاتھ جس نے تیری ہستی کو میرے سپرد کیا ہے اُسے بھی میرے سپرد کر کے میرا بنا دے + اللہ بس باقی ہوس ؎

شب دیجور کا کافورا اندھیرا ہو جائے جو کسی کا نہیں اے کاش وہ میرا ہو جائے

"ا"

الف خالی

از رسالۂ صوفی دسمبر ۱۹۱۴ء

حرفوں کی فوج کا کمانڈر۔ سب کے آگے کیسا تنا ہوا سیدھا کھڑا ہے۔ اس کا نام الف ہے اور بچے اس کو الف خالی پڑھتے ہیں +

حرف جتنے ہیں سب اپنے اپنے حال میں مبتلا ہیں۔ ایک دوسرے کا کوئی شریک نہیں۔ الف کو بے سے غرض نہیں بے تے سے سروکار نہیں رکھتی۔ ثے جیم اور دال سے بے تعلق ہے۔ لیکن معانی کا مقابلہ پیش آتا ہے تو یہ سب حرف آپس میں مل جاتے ہیں۔ اور موقع موقع کی کمینگاہوں میں پرے جما کر نمودار ہوتے ہیں +

حروف کا حال اور ہے اور قال اور۔ حال تو یہ ہے کہ ان کی شکل مفرد نظر آتی ہے۔ اور قال میں ہر حرف کسی حروف کا مرکب ہے۔ مثلاً اس مضمون کے عنوان کو دیکھئے۔ سب سے اوپر ایک صورت "ا" کی ہے۔ اس کو دیکھو۔ اور زبان سے نہ پڑھو۔ تو ذہن میں مفرد پیکر ہے۔ لیکن جب زبان سے پڑھو گے تو الف۔ لام۔ فے۔ تین حرفوں کی ترکیب سے ایک ذات مرکب معلوم ہوگی +

ایک دن میں نے سپہ سالار افواج حروف سے دریافت کیا کہ "ہو آر یو؟" تم کون ہو۔ الف نے جواب دیا۔ "آئی ڈونٹ نو" میں نہیں جانتا کہ میں کون ہوں +

میں نے کہا۔ کیا تم نہیں جانتے کہ تمہاری ایک شکل و صورت ہے۔ تم سے دُنیا کی بول چال میں زندگی پیدا ہوتی ہے ہر حیوان ناطق تمہارا محتاج ہے۔ تم نہ ہوتے تو سارا جہان گونگا ہوتا +

الف بولا۔ جناب عالی! آپ کو میرے وجود کی تحقیقات کا فکر ہے۔ اور میں دردِ عشق سے تڑپ رہا ہوں۔ اس بیکلی میں کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ اور بے اختیار یہی زبان سے نکلتا ہے۔ کہ میں آپ کے سوال کے متعلق کچھ نہیں جانتا +

یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ مکتب کے ایک بچے نے پڑھا۔ الف خالی بے کے نیچے ایک نقطہ۔ مجکو تو یہ صدا معمولی معلوم ہوئی۔ مگر الف آہ کہکر بلبلا اُٹھا +

تعجب۔ حیرت۔ تو کیوں بے قرار ہوگیا۔ بے کے نقطے نے تجھ پر کیا اثر ڈالا +

نہیں مجھے بے کے نقطے سے تکلیف نہیں ہوئی۔ مجھ کو اس کا ملال ہے کہ میں خالی ہوں۔ ہائے میں خالی نہ تھا۔ مگر اب خالی ہوں۔ میں اکیلا نہ تھا۔ مگر اب تنہا ہوں۔ تم نے وصل کی لذت ہی نہیں چکھی تو فراق کی تلخی کیا سمجھو گے۔ میں وصال کی بہار دیکھ چکا ہوں۔ مجکو یہ زمانہ میسّر آچکا ہے +

آہ اب خالی ہوں۔ بچے بھی خالی کہہ کر پکارتے ہیں۔ ہجر بُری بلا ہے۔ اس کی دو قسمیں ہیں۔ پہلی قسم اس ہجر کی ہے جس میں آرزوے وصل ہوتی ہے۔ اور دوسری وہ ہے جو وصل کے بعد پیش آتی ہے۔ یہ بہت سخت ہے۔ ناقابل برداشت ہے۔ پہلی قسم میں صرف شوق و اشتیاق ہوتا ہے۔ ارمانوں کے ولولے طوفان اُٹھاتے ہیں۔ آنکھوں کو رُلاتے ہیں۔ آنسو برساتے ہیں۔ دل میں تڑپ ہوتی ہے۔ اُمیدیں بھڑکتی ہیں۔ مگر یہ تکلیف نہیں ہوتی جو وصل کے بعد پیش آتی ہے۔ وصل کے بعد جو ہجر ہو۔ وہ گزشتہ ذوق شوق کو سامنے لاتا ہے۔ تخیلات و تصورات سے نقشے بنواتا ہے۔ ان کے ہاتھوں میں چھریاں دیتا ہے اور دل و جگر پر چرکے دلواتا ہے +

میں مدت مدید تک لطف یکجائی اُٹھا چکا ہوں۔ میں اُس کا بن چکا ہوں۔ وہ میرا بن چکا ہے۔ جس کی یاد میں آج آگ کے بستر پر لوٹ رہا ہوں +

الف! جی کو سنبھال تو اتنا کیوں بے چین ہوتا ہے۔ ہم نے تو ہمیشہ تجھ کو خالی ہی پایا۔ کبھی کسی کو تیرا شریکِ زندگی نہ دیکھا۔ خبر نہیں تو کس کو یاد کرتا ہے۔ کس کی یکجائی کا قصہ کہتا ہے +

کیا وہ بھی کوئی الف تھا۔ یا وہ کوئی نقطہ تھا۔ یا اور کوئی ایسی چیز تھی۔ جس کی فرقت تجھ کو ستاتی ہے۔ اور یہ فریاد زبان سے نکلواتی ہے +

ہاں تم نے اُس کو نہیں دیکھا۔ ہاں کسی نے بھی اُس کو نہیں پایا۔ وہ حَسِین نہ تھا جس کو دوسرے حُسن پرست دیکھ سکتے اُس میں رعنائی و ناز و انداز نہ تھے جس پر کسی غیر کی نظر پڑتی +

تو پھر وہ کیا تھا۔ بتا کہ وہ کب تھا۔ اور اب کہاں ہے۔ سیدھے سادے الف۔ کیا تیرا دماغ کچھ خراب ہو گیا ہے یہ تو کیسی بے سر و پا باتیں کرتا ہے +

الف چُپ ہو گیا۔ اُس کی حیرت خیز خاموشی عالم تصویر بن گئی۔ اور اس کے آگے سے سب حروف اس مینار سکوت کو غم کی نگاہوں سے دیکھنے لگے +

سُنو۔ الف خود بخود کچھ کہہ رہا ہے۔ دیوانوں کی طرح بہک رہا ہے۔ اور بڑ مار رہا ہے +

"میں ایک ہوں۔ میرے معنی بھی ایک ہیں۔ میری شکل بھی واحد ہے۔ میں مثالِ وحدت ہوں۔ میں خیال یکتائی ہوں۔ مگر آہ کثرت کے جھلجاسے کا قیدی ہوں۔ دور ہوں۔ مہجور ہوں۔ رنجور ہوں +

پیاری بے۔ نقطے والی بے۔ اپنے نقطہ کو دور کر دے تو حرف موہوم اور خط بیکار رہ جائے۔ میں جب سے اپنے پیارے نقطے سے جُدا ہوا ہوں۔ جوں کا توں موجود ہوں۔ فنا نہیں ہوا۔ نابود نہیں ہوا۔ کاف۔ نون میرے رقیب ہیں۔ کُن بنکر آئے اور میرے پیارے کو بہکا کر لے گئے +

اُس کا وعدہ تھا۔ میں تیرا بنکر رہوں گا۔ وہ اقرار کر چکا تھا۔ مگر حمد و محمود کی اُلجھاؤ نے کُن کو نمودار کیا۔ اور کُن نے آتے ہی سب اقرار بھلا دیئے +

آہ۔ وہ بھولتا نہیں تھا۔ بھول چوک سے پاک تھا۔ ہر چیز پر قادر تھا۔ وہ مجھ سے کیوں جدا ہو گیا۔ یہ کیا اُس کے جی میں آ گئی +

میں الف ہوں۔ وہ بھی الف تھا۔ کُن سے پہلے وہ میرے ہاں تھا۔ میں اُس کے ہاں تھا۔ میں وہ تھا۔ وہ میں تھا میں تن تھا۔ وہ جان تھا۔ میں جان تھا۔ وہ تن تھا۔ تم نے کہا۔ میں اور میرے ماتحت حروف انسان کی زبان ہیں۔ وہ ہمارے ذریعے بولتا ہے۔ حرفوں کی ترازو میں مطالب تولتا ہے۔ تم نے غلط کہا۔ نہیں تم نے صحیح کہا۔ بتانا میں نے کیا کہا +

میں دیوانہ ہوں۔ مستانہ ہوں۔ تم اے آدمیوں میرے ذریعے بولتے ہو۔ میں کس کے سہارے بولوں؟ میرے پاس حرف نہیں ہیں۔ میں کس کے الفاظ بناؤں۔ اور کس چیز سے اپنے مطالب کو اُس کے سامنے لیکر جاؤں اگر وہ حرفوں اور لفظوں کا محتاج ہے۔ تو میرا مطلوب کیوں بنا ہے۔ خالی ہاتھ والے کے دل میں کیوں آیا ہے +

اور اگر وہ ان ذریعوں کی پروا نہیں رکھتا تو اقرار پورا کرنے کیوں نہیں آتا۔ مجھ کو اپنے پاس کیوں نہیں بُلاتا یہ دیوار کیوں چنوائی ہے۔ یہ کیا اُس کے جی میں آئی ہے +

الف ہوشیار ہو۔ لام کو دیکھ۔ میم کو دیکھ واؤ کو دیکھ سب خالی ہیں۔ ک۔ ع۔ ص۔ س۔ د۔ ر۔ ط بھی تیرے

جیسے مہجور ہیں۔ تو اکیلا خالی نہیں ہے۔ اور بھی ہیں +

ہاں اور ہیں۔ مگر اُن کی تنہائی اور میری تنہائی میں فرق ہے۔ وہ بلبل ہیں۔ میں پروانہ ہوں۔ وہ حصار میں محفوظ ہیں۔ میں دروازے کے تیروں کا نشانہ ہوں +

الف کی یہ بے معنی غیر مفہوم مگر مزے دار باتیں سُنکر میں نے بڑا تعجب کیا کہ تصوف سے تعلق رکھنے والی بے نتیجہ باتیں بھی اتنا کیف رکھتی ہیں۔ تو بانتیجہ حالات میں کیا سرور ہوگا۔ طالبوں سے کہو اندر آکر دیکھیں۔ اور اُس تک پہونچیں۔ جس کے سایہ اور عکس کی یہ ادنےٰ سی کیفیت ہے +

از رسالہ صوفی جون ۱۹۱۴ء

سفید سورج کی رُوح حرارت۔ کالی رات کی رُوح برودت۔ بہتے پانی کی رُوح حیات۔ کھڑے کنارے کی رُوح نظر بازی۔ حیوان کی رُوح نادانی۔ انسان کی رُوح دانائی +

دیکھنا۔ آپس میں کیا سرگوشی کرتی ہیں۔ کس شاندار مُہم کے لیئے سازش کر رہی ہیں۔ تلک الایّام نداولہا بین النّاس کا خدا بھلا کرے جس نے اس مخفی جوڑ توڑ کی خبر دیدی۔ ورنہ خبر نہیں کس قیامت کا سامنا ہوتا۔ سورج کی رُوح نے کہا۔ میں نے اجسام زمین۔ قمر۔ مریخ۔ مشتری۔ زہرہ وغیرہ کی پرورش میں عمر تمام کردی مگر مادی پُتلوں نے میرا ایک گُن نہ مانا۔ ہے شرط کہ ان سب کو نظر قہر سے فی النار کر دوں۔ شب تاریک کی رُوح بولی۔ میں اصل بنیاد کل کائنات کی ہوں۔ اجسام کی پردہ پوش ہوں۔ لیکن اب اجساد کی شیطنت حد سے بڑھتی جاتی ہے کیوں نہ میں اُن کا پردہ فاش کردوں +

رواں دواں پانی کی روح نے بہتے بہتے آواز دی۔ کُلّ شیءٍ حَیٍّ من المآء مادیات کی مورتوں سے کہہ دینا کہ احسان فراموشی کی تو زندگی وبال جان بنا دوں گی +

کھڑے کنارے کی نظر باز روح چنگھاڑی اگر بدن وقت منتظر سے انکاری ہے تو اُس کا ملیامیٹ کردینا مجھے کیا بھاری ہے +

حیوان کی نادان روح پکاری۔ مجھ میں عقل نہیں۔ جو تمہاری رائے وہ میری۔ انسان کی دانا روح گویا ہوئی " انا امرُ ربکم الاعلےٰ " میں نے امانت خاص کو دوش پر رکھا۔ میں کُن کی عملدار بنی۔ قفس خاکی میں رہی تو کیا یہ اجسام مجھ کو بھولکر سلامت رہ سکیں گے۔ کہدو۔ ناممکن۔ ناممکن +

اس مشورت کا انجام۔ نتیجہ۔ حاصل۔ ایک یورش ہوگی یلغار۔ خونخوار۔ اور حملہ پُرخروش ہوگا +

اے بدنو! اے دُنیا کے مادّی جسمو! تم نے اپنے بچاؤ کی کیا صورت اختیار کی ہے ؟ -

امریکہ کا جواب:۔ "سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے" ورنہ میں نے تو مادہ پرستی اور تن پروری کو چھوڑنا شروع کردیا ہے۔ اُمورِ روحانی کے آگے میرے باشندے سر جُھکاتے جاتے ہیں +

یورُپ کا اظہار کچھ پروا نہیں۔ ارواح سوہوم کی یورش کو دیکھ لیا جائے گا۔ میرے اندر سُپر ہے۔ اور وہ کاریگری ہے جس سے ہر روح اسیرِ نتیجۂ مادّی ہوسکتی ہے +

چین کا بیان۔ میرا تو رنگ ہی زرد ہے۔ جو پرتوِ روحانی کی شہادت دیتا ہے۔ میں نے تو عیسائی مذہب کے لیئے خدا سے اسی لیئے دعائیں مانگی تھیں کہ برکت روحانی میری مشکلات کا خاتمہ کردے۔ آیندہ بھی کسی حکم روحانی کی تعمیل سے انکار نہیں +

ایران کی فریاد:۔ دیکھنا۔ میں پہلے ہی ویران ہوں۔ ایران نہیں ہوں۔ بلبل کی روحانیت تلے جیتا ہوں۔ مجھ پر تو نظرِ کرم ہی رکھنا +

افریقہ و عرب کی گفتگو:۔ مت گھبراؤ۔ اے روحو! ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ تمہارے دشمنوں کا مقابلہ سب سے پہلے ہم کریں گے +

ہندوستان کا جواب:۔ ست گُرو کے چرنوں کی قسم! میں پرماتما کا جوگی بردگی ہوں۔ لڑنے جھگڑنے کا تو عدہ نہیں کرتا یہ جگرا تو عرب و افریقہ کا ہے۔ ہاں دل سے تم سب ارواح کا ساتھی ہوں۔ پرماتما تمہاری بھلی کریں +

فیصلہ عالم جبروت میں یہ حکم کلام کرچکا۔ تو صدائے ہاہوت نے ارشاد فرمایا کہ دو سب ناسوتیوں سے۔ ارواح ہوں یا اجسام۔ کہ ہم منتقمِ حقیقی ہیں۔ ذرّہ ذرّہ کے اقرار و انکار کو تول رہے ہیں۔ لینے دینے کا وقت بھی قریب آگیا ہے۔ آپس میں دست و گریبان نہ ہو۔ ہماری ترازو کا کام ختم ہولینے دو + **ڈراپ** +

پلکیں تھرتھرائیں۔ پُتلیاں اشکبار ہوئیں۔ کان وجد میں آئے۔ دل و دماغ محو ہوگئے۔ جب یہ سب دیکھا۔ سُنا۔ او۔ ڈراپ سین کو گرنے سے نہ روکا + فقط۔

از اخبار خطیب دہلی ۶ر جنوری ۱۹۱۵ء

تین سیڑھی کے ممبر قدیم پر زبان بولتی تھی۔ اور خطیب کہلاتی تھی۔ آج ممبر جدید کی شکل تو ویسی ہی تثلیثی ہے مگر اس پر کاغذ فام خطیب قلم کی زبان سے چہچہاتا ہے +

جن کو لغت کی بحث کرنی آتی ہے وہ کہیں گے کہ خطیب عربی کا ایک جامع لفظ ہے جو ہر اچھی بات کے دہنِ فصیح سے نکلنے پر صادق آتا ہے۔ اس لیئے اخبار خطیب۔ مذہب۔ تمدن۔ ٹراؤنی اور ان کہنی چیز پر جس کو کان میں سُنا جائے تو سیاست و پالیٹکس کی آواز

آگے بحث کر سکتا ہے +

میں نہیں جانتا کہ ان اخبار فروشوں نے خطیب کے کیا کیا مقاصد تجویز کیے ہیں۔ اور جو بھی ہوں۔ مجھے اس سے کیا۔ میں تو اپنے کاغذ فام گلفام کو ایک بیشگی بوسہ بھیجنے کے لیے حرفوں کا توڑ جوڑ کرنا چاہتا ہوں +

خطیب کاغذ فام نے نہ ابھی جوانی کی راتیں دیکھی ہے۔ نہ مرادوں کے دن پائے ہیں۔ ابھی تک خدا نے بُری نیت کے شاعروں سے اس کے دامنوں کو آلودہ نہیں ہونے دیا۔ مگر کب تک؟ ٹبت ہرجائی انگشت نمائی سے محفوظ رہے گا۔ شمع بنے گا تو بے شمار پروانے فدا ہونے نکل ہی آئیں گے +

کیوں! پیارے گلفام۔ ابھی تو تم فتنہ نہ ہو۔ فتنوں کے زمانے میں غدار کھے پروان چڑھتے نکلے ہو۔ جب قیامت ہو گے اُس وقت تو بھلا ہم غریبوں سے کہاں آنکھ ملاؤ گے۔ پر آج تو ایک نگاہِ طفلی سے اِدھر دیکھو اور ننھے ننھے ہونٹوں سے کچھ گل افشانی کرو +

ہاں ہاں۔ میں نے سُنا۔ واہ کیا بات ہے کیا گھات ہے۔ ماشاء اللہ سبحان اللہ۔ مگر ان نذیر بے لوگوں کو تمہاری زبان میں نہ سننے دوں گا۔ اپنی زبان میں صدائے بازگشت کے طور پر سُناؤں گا۔ تاکہ تمہاری کنواری آواز میرے ہی لیئے مخصوص رہے +

صاحبو! دل جان خطیب تم سے یوں خطاب کرتا ہے۔ پروانو مستانو۔ دیوانو۔ ہوشیار باش۔ بیدار شوید۔ سمندر میں فضائے آسمانی بہنا چاہتا ہے۔ تو وہ خاک اپنے ذرّوں کو موجوں میں لانے آتا ہے۔ اس کام میں اُس کا ہاتھ ہے جو جگ داتا ہے +

اب کاغذ کی جنس میں ایک نوع خصوصی جلوہ افروز ہوتی ہے۔ اس کی ہر ادا گوش ہوش کے لیئے انمول موتی ہے۔ وہ علم کے دریچوں میں عمل کے فانوس روشن کرے گا۔ وہ سنسان ویران محفلوں میں طوطی مشکر مقال بنے گا۔ اور اس کی پہلی صدا یہ ہو گی +

حق ہے باری تعالےٰ۔ حق ہے کبلی والا۔ حق ہے سب کا حق۔ حق نے حقوق کو پیدا کیا۔ اور بندوں کو اُن کی شناخت اور گرفت پر مستعد کیا۔ حق ہی نے کہا۔ کون اس امانت کا حق دار ہے۔ حق ہی نے جواب دلوایا کہ یہ بندۂ آدم اس نعمت کا سزاوار ہے۔ وہ امانت اُن کو مل گئی۔ جو سر تا سر حقوق میں غرق تھی۔ اور عشق اس گھٹا کی برق تھی +

آدم نے خالقِ دم کی امانت کو سینے سے لگایا۔ حقوق کے جو اہرات سے جڑے ہوئے زیور کو گلے کا ہار بنایا۔ جب آدم کہلایا۔ ہر حق میں طلب کی جھلک تھی۔ اور ہر جھلک کی ایک پلک تھی۔ اور ہر پلک میں ایک نوک تھی۔ اور ہر نوک میں ایک کھٹک تھی۔ ہر کھٹک میں تلخی و شیرینی تھی۔ اور اسی تلخی و مٹھاس پر دُنیا کے کاروبار تھے +

کبھی دیکھا کہ حقوق اللہ کے مطالبے ہیں۔ اور نفس و شیطان اس کی کڑواہٹ سے مُنہ بناتے ہیں۔ کبھی سُنا کہ حقوق العباد کی پکار ہے اور نا حق شناسوں کی حالت زار و نزار ہے +

حقوق اللہ کہتے تھے۔ پہلے حقوق بندگان کی حفاظت کرو۔ کہ ہم بھی اسی پیکر کی روح رواں ہیں۔ حقوق العباد آواز لگاتے ہیں۔ کہ نہیں۔ ہم بھی سایۂ رب کے اُمیدوار ہیں +

خبر نہیں ان دونوں میں کسر نفسی کون کرتا تھا۔ مگر سچ یہ ہے کہ ہر ایک صداقت و راستبازی کا پُتلا تھا +

خطیب کاغذ فام حقوق فریقین پر نظر ڈالے۔ تو اس کو رفتار۔ کردار۔ گفتار کے بے شمار میدان مل جائیں۔ اور ہر گھر کے نیک و بد انسان اس کی بات سُننے باہر نکل آئیں۔ مگر صاف بات ہے۔ میں اس وقت اس کے پاس کبھی نہ جاؤں گا۔ ہرجائیوں کی بیوفائیاں دیکھ چکا ہوں۔ بھلا میں اس کے قابو میں آؤں گا۔ وفا اور یک دِرگیری ایک حقِّ مشترک ہے جس کو عبد و معبود دونوں اپنا بتاتے ہیں۔ کیا یاد نہیں کہ برٹش سرکار کے کارندے لفظ وفا کو دودھ کی چار پلاتے ہیں +

خود خدا کا بیان ہے کہ وفا میرا اصلی ارمان ہے۔ جس کی خاطر بنا یہ سارا جہان ہے۔ جو بے وفائی کرتا ہے۔ مشرک کہلاتا ہے۔ اور بارگاہ الٰہی سے بڑی سزا پاتا ہے۔ حکومت بھی بے وفاؤں کو پھانسی پر لٹکاتی ہے۔ سوسائٹی بھی ایسوں کو منہ نہیں لگاتی ہے۔ پھر میں کہ عبد و معبود کا ایک ثالث تماشائی ہوں کیونکر اس متعدی خواہش کا شریک بنوں۔

جو خطیب ہر متوالی آنکھ کا تارا ہو۔ وہ میرا کیونکر دل آرا ہو۔ میں تو خدا کی ہر دلعزیزی پر بھی بدگمان سا ہوتا جاتا ہوں جب وہ اپنے حقوق کی باز پرس کر سکتا ہے تو مجھ کو بھی اجازت ہونی چاہیئے کہ اپنے حقوق کا مطالبہ کروں۔ اور پوچھوں کہ تمہارے لیئے تو مجھ جیسے بے شمار ہیں۔ مگر تم تو میرے لیئے یکتا و فرد ہو۔ پھر کیا معنی کہ تم اپنی یکتائی و وحدت کے جلوے اوروں کو بھی دکھاتے ہو۔ یا تو میرے لیئے مخصوص ہو جاؤ۔ اور ایک صفت میرے واسطے ریزروڈ کر دو۔ یا مجھ سے تقاضا نہ کیا کرو کہ ہمارے سوا کسی اور پر نظر نہ ڈالنا۔

خیال تو بہت کچھ آتے ہیں مگر اس کا کیا علاج کہ دل خدا کے قبضہ میں ہے۔ جب ایک جہم تیار ہوتی ہے۔ دل اس کو پراگندہ کر دیتا ہے۔

یہ خطیب بھی کاغذی دل ہے۔ کس کو خبر ہے کہ خدا اس سے کیا کیا کام لے گا۔ اور کن کن کے مجوزہ نقشے برباد کرائے گا۔ تو لاؤ اپنے ارادے کو ابھی سے اس کے سامنے رکھ دوں۔ اور کہوں کہ اے کاغذ فام خطیب! جب تو بندوں کو ان کے مذہبی اخلاقی تمدنی۔ ان کہنی حقوق یاد دلاتا اور سکھاتا ہے۔ تو ذرا ان سے بھی کچھ کہیو۔ جن کا تو پیام رساں ہے کہ وہ بھی اپنے دست توانا کو حرکت میں لائیں۔ اور بندوں کو خطیب کی باتوں پر عمل کرنے کی توفیق دیں۔ اور قدرے حسن نظامی کو اسیری تخیلات سے آزادی بخشیں۔

جھینگر کا جنازہ

از خطیب، مئی ۱۹۱۵ء

میری سب کتابوں کو چاٹ گیا۔ بڑا موذی تھا۔ خدا نے پردہ ڈھک لیا۔ اُفوہ۔ جب اس کی لمبی لمبی دو مونچھوں کا خیال کرتا ہوں۔ جو وہ مجھ کو دکھا کر ہلایا کرتا تھا۔ تو آج اس کی لاش دیکھ کر بہت خوشی ہوتی ہے۔ بھلا دیکھو تو قیصر ولیم کی نقل اُتارتا تھا۔

اس جھینگر کی داستان ہرگز نہ کہتا اگر دل سے یہ عہد نہ کیا ہوتا۔ کہ دنیا میں جتنے حقیر و ذلیل مشہور ہیں۔ میں ان کو چار چاند لگا کر چمکاؤں گا۔

ایک دن اس مرحوم کو میں نے دیکھا کہ حضرت ابن عربی کی فتوحات مکیہ کے ایک جلد میں چھپا بیٹھا ہے۔ میں نے کہا۔ کیوں رے شریر! تو یہاں کیوں آیا؟ اُچھل کر بولا۔ ذرا اس کا مطالعہ کرتا تھا۔ سبحان اللہ۔ تم کیا خاک مطالعہ کرتے تھے۔ بھائی یہ تو ہم انسانوں کا حصّہ ہے۔ بولا واہ۔ قرآن نے گدھے کی مثال دی ہے۔ کہ لوگ کتابیں پڑھ لیتے

ہیں۔ مگر نہ اُن کو سمجھتے ہیں اور نہ اُن پر عمل کرتے ہیں۔ لہٰذا وہ بوجھ اُٹھانے والے گدھے ہیں۔ جن پر علم و فضل کی کتابوں کا بوجھ لدا ہوا ہے +

مگر میں نے اس مثال کی تقلید نہیں کی۔ خدا مثال دینی جانتا ہے تو بندہ بھی اُس کی دی ہوئی طاقت سے ایک نئی مثال پیدا کر سکتا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ انسان مثل ایک جھینگر کے ہے۔ جو کتابیں چاٹ لیتے ہیں۔ سمجھتے بوجھتے خاک نہیں + یہ جتنی یونیورسٹیاں ہیں سب میں یہی ہوتا ہے۔ ایک شخص بھی ایسا نہیں ملتا۔ جس نے علم کو علم سمجھ کر پڑھا ہو +

جھینگر کی یہ بات سُن کر مجھ کو غصہ آیا۔ اور میں نے زور سے کتاب پر ہاتھ مارا۔ جھینگر پُھدک کر دوسری کتاب پر جا بیٹھا۔ اور قہقہہ مار کر ہنسنے لگا۔ واہ خفا ہو گئے۔ بگڑ گئے۔ لاجواب ہو کر لوگ ایسا ہی کیا کرتے ہیں +

لیاقت تو یہ تھی۔ کچھ جواب دیتے۔ لگے ناراض ہونے اور دھتکارنے +

ہائے کل تو یہ تماشا دیکھا تھا۔ آج غسلخانہ میں وضو کرنے گیا تو دیکھا بچارے جھینگر کی لاش کالی چیونٹیوں کے ہاتھوں پر رکھی ہے۔ اور وہ اُس کو دیوار پر کھینچے لیئے چلی جاتی ہیں۔

جمعہ کا وقت قریب تھا۔ خطبہ کی اذان پکار رہی تھی۔ دل نے کہا جمعے تو ہزاروں آئیں گے۔ خدا سلامتی دے نماز پھر پڑھ لینا۔ اس جھینگر کے جنازے کو کندھا دینا ضروری ہے۔ یہ موقعے بار بار نہیں آتے +

بیچارہ غریب تھا۔ خلوت نشین تھا۔ خلقت میں حقیر و ذلیل تھا۔ مکروہ تھا۔ غلیظ سمجھا جاتا تھا۔ اسی کا ساتھ نہ دیا تو کیا امریکہ کے کروڑپتی راک فیلر کے شریک ماتم ہوں گے +

اگرچہ اس جھینگر نے ستایا تھا۔ جی دُکھایا تھا۔ لیکن حدیث میں آیا ہے کہ مرنے کے بعد لوگوں کا اچھے الفاظ میں ذکر کیا کرو۔ اس واسطے میں کہتا ہوں :۔

خدا بخشے بہت سی خوبیوں کا جانور تھا۔ ہمیشہ دُنیا کے جھگڑوں سے الگ کونے میں۔ کسی سوراخ میں۔ بوریہ کے نیچے۔ آبخورے کے اندر چھپا بیٹھا رہتا تھا +

نہ بچھو کا سا زہریلا ڈنک تھا۔ نہ سانپ کا سا ڈسنے والا پھن۔ نہ کوّے کی سی شریر چونچ تھی۔ نہ بلبل کی مانند پھول کی عشقبازی۔ شام کے وقت عبادت رب کے لیئے ایک مسلسل بین بجاتا تھا۔ اور کہتا تھا کہ یہ غافلوں کے لیے صور ہے۔ اور عاقلوں کے واسطے جلوۂ طور ہے +

ہائے آج غریب مر گیا۔ جی سے گزر گیا۔ اب کون جھینگر کہلائے گا۔ اب ایسا مونچھوں والا کہاں دیکھنے میں آئے گا۔ ولیم میدان جنگ میں ہے ورنہ اُسی کو دو گھڑی پاس بٹھا کر جی بہلاتے۔ کہ مُری مٹّی کی نشانی ایک یہی بیچارہ دُنیا میں باقی رہ گیا ہے +

ہاں تو "جھینگر کا جنازہ ہے بڑا دھوم سے نکلے" + چیونٹیاں تو اس کو اپنے پیٹ کی قبر میں دفن کر دیں گی۔ میرا خیال تھا کہ ان شکم پرستوں سے اس توکل شعار فاقہ مست کو بچاتا۔ "ویسٹ منسٹر ایبے" یا قادیان کے بہشتی مقبرے میں دفن کراتا۔ مگر جناب یہ کالی چیونٹیاں بھی افریقہ کے مردم خوار سیاہ وحشیوں سے کم نہیں۔ کالی جو چیز بھی ہو۔ ایک بلائے بے درمان ہے۔ اس سے چھٹکارا کہاں ہے +

خیر تو مرثیے کے دو لفظ کہہ کر مرحوم سے رخصت ہوں +

" جھینگر کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے " ۔ " قیصر کا پیارا ہے اسے توپ پہ کھینچو "

اے پروفیسر! اے فلاسفر!! اے متوکل درویش!!! اے نغمۂ ربانی گانے والے قوال۔ ہم تیرے غم میں نڈھال ہیں۔ اور توپ کی گاڑی پر تیری لاش اُٹھانے کا اور اپنے بازو پر کالا نشان باندھنے کا رزولیوشن پاس کرتے ہیں خیر اب تو تو تخم موری کی قبر میں دفن ہو جا۔ مگر ہم جھینگر دیشنو میں تجھے یاد رکھیں گے ۔

من کہ ایک دھوبی

کاغذی گھاٹ پر

از خطیب ۔ ۳۰ ؍ جون سنہ ۱۹۱۵ع !

جا ری جا۔ میں روٹی نہیں کھاتا۔ چاولوں کی پیچ اُدھر کنارے پر رکھ دے۔ اور ایک چلم بھر کر لا ۔
چھُوا چھو۔ چھُوا چھو۔ چھُوا چھو ۔

کیوں ری ننوا کی ماں۔ دریا کا پانی گدلا۔ صابن کم۔ میں کیونکر ان میلے کپڑوں کو صاف کروں۔
چھُوا چھو۔ چھُوا چھو۔ چھُوا چھو ۔

دیکھ درخت کا پتہ سوکھ کر گرا۔ ہوا اُڑا کر لے چلی۔ اب خبر نہیں یہ بچھڑا ہوا کب ملے گا۔

چھُوا چھو۔ چھُوا چھو۔ چھُوا چھو ۔

میرا بیل ہاتھیوں سے بڑا۔ گھوڑوں سے تیز۔ ریل سے زیادہ تابعدار۔ پھر تو کہتی ہے کہ امیر بڑے ہوتے ہیں ان میں بڑائی میرے دم سے ہے۔ میں اُجلے کپڑے نہ پہناؤں تو ان کی عزت دو کوڑی کی ہو جائے ۔
چھُوا چھو۔ چھُوا چھو۔ چھُوا چھو ۔

بھر لے حقہ مار لوں گھونٹ ۔ بیتا چھا گئی چاروں کھونٹ

سُنتی ہے اس کاغذی گھاٹ پر آئی ہے۔ چنزی۔ چولا۔ دُھلوانے لائی ہے تو میری بات مان۔ یہ چولا من کے صابن سے دُھلے گا۔ جس کو پریم کی بھٹی میں چڑھاؤں گا نیچے آگ جلاؤں گا۔ اور بھیریہ گاتا جاؤں گا۔

اُو ~~~~~~~~ ہو ~~~~~~~~ اُو

کیوں رے چولے کا ٹوں تیرا ہیل۔ پانی اُبلا جوش میں آیا۔ تو گھبرایا۔ میل کٹا۔ پاک ہوا۔ صاف ہوا۔ اب کیسی سی سی آہ ۔

اُو ~~~~~~~~ ہو ~~~~~~~~ اُو

چھُوا چھو۔ چھُوا چھو۔ چھُوا چھو ۔

یہ تن ۔ وہ من ۔ تو دھوبن ۔ میں دھوبی ۔ سب ہیں ساجن ۔ تو دھوبن میں دھوبی ۔

چُھوا چھو ۔ چُھوا چھو ۔ چُھوا چھو ۔

کہنے دے ہم نکمین ہیں ۔ ہم موٹے وہ مہین ہیں ۔ دیکھتی نہیں سارے باریک میرے ہاتھ میں ہیں اور میں اُن کو پتھر پر پٹخ رہا ہوں ؎

چُھوا چھو ۔ چُھوا چُھو ۔ چُھو اچھو ؎

یثرب نگر کے چودھری نے کہا ۔ جو سارے سنسار کے میلے تنوں کو دھونے آیا تھا ۔ اسلام غریبوں سے شروع ہوا ۔ اور پھر غریبوں میں آجائے گا ۔ تو بس ہم تم دونوں اپنے چودھری کے بیان پر مگن ہیں ۔ اسلام ہم ہیں ۔ ہم اسلام ہیں ۔ اور سب امیر پیسہ والے من دلوں کے کلام میں ؎

چُھوا چُھو ۔ چُھوا چُھو ۔ چُھو اچُھو ؎

(۲)

چھیو رام ۔ چھیو ۔ چھیو ؎

پکا پکو کر وہیں دھر دیا ۔ بیچاری وہیں دھر دیا ۔ تجھ سے اتنا کہا ۔ میں روٹی نہیں کھاتا ۔ اَنّ اور جَل دو بہن بھائی ہیں ۔ اَنّ نے بابا آدم کو جنّت سے نکالا ۔ جل نے پاؤں میں بیڑی ڈالی ۔ آدھی رات سے اس دریا میں کھڑا ہوں ۔ اور پانی کا قیدی ہوں ۔ جب جَل نے جلایا تو اُس کی بہن اَنّ سے کیا محبّت ہو ۔

چھیو رام ۔ چھیو ۔ چھیو ۔ چُھوا چھو ۔ چھیو ؎

ندی کنارے میں کھڑی اور پانی جھل مل ہوئے
میں میلی پیا اُجلے ری میرا کس بدھ ملنا ہوئے

چھیو ۔ رام ۔ چھیّا ۔ چھیّا ؎

کپڑے دھوئے ۔ ساری عمر دریا کے کنارے گذر گئی ۔ مگر اپنا آپا میلا کا میلا رہا ۔ صاف ستھرے اور اُجلے پیا کی نظروں میں میری کیا قدر ہوگی ۔ اور اس تک کیونکر پہونچنا نصیب ہوگا ؎

چھیو رام ۔ چھیو رام ۔ چُھوا چُھو ؎

اچھا ری ۔ ذرا ایک بات اور سنتی جا ۔ دیکھیو خدا آسمان کی کھڑکی میں جھانک کر مجھ سے کچھ کہتا ہے ۔ پورا تو سمجھ میں نہیں آیا سوائے اس کے کہ اُس نے کہا ۔

رام جھروکے بیٹھ کے سب کو مجرا لے
جیسی جا کی چاکری ویسا واکو دے

تو جب اُس کی دین چاکری پر ہے ۔ تو لا میں بھی اس دریا میں جہاز چلاؤں ۔ دھوبی کیوں کہلاؤں ۔ امیر البحر کیوں نہ بنوں ۔ اس سنسار میں

کرنی کی بھرنی

ہے ۔ جو کرتا ہے ۔ پاتا ہے ۔ میں نے ساری عمر کپڑے دھوئے ۔ پیسہ ٹکے پر نیّت رکھی ۔ اتنا ہی ملا ۔ خیال آگے بڑھاتا ۔ رام زیادہ بھیجو اتا ؎

چھیئو رام - چھیا رام - ہو او چھیئو

اری ننوا کی ماں - تو تو خفا ہو گئی - کہاں چلی - لا میں روٹی کھالوں - تو جا مت - تیرا یہ خیال ہو گا کہ میں تیرے خفا ہونے کی پروا نہیں کروں گا - اری مجھ کو تو اس کا بڑا دُکھ ہوتا ہے - اور دل میں بڑی جلن ہوتی ہے -

سائیں تیں مت جانیو توہے چھوڑت موہے چین
گیلے بن کی لاکڑی سُلگت ہون دن رین

چھی ہو - چھی ہو - چھپا - رامہ چھپیا +

اری کل رات کا خواب سُن - میں نے دیکھا - ایک سُندر عورت اپنے بالم کو مایوس پنے سے دیکھ رہی ہے - مگر مُنہ کچھ نہیں کہہ سکتی - اتنے میں اس کا پیتم پیارا کہیں چلا گیا - اور وہ ہاتھ ملنے لگی - کہ ہائے میں تو دو باتیں بھی نہ کرنے پائی تھی - کہ پیا بچھڑ گئے -

میں نے کہا تو کون ہے - اور یہ مرد کون تھا - عورت بولی میں روح یعنی آتما ہوں - اور یہ مرد پریم شکتی (مظہر عشق) ہے - یہ خواب دُنیا ہے - اور عالم اسباب ہے - اُس عورت کی بات تو میری سمجھ میں آئی نہیں - ہاں اتنا ضرور ہوا - کہ اُس نے جو دوہا پڑھا تھا - وہ یاد ہو گیا :-

سپنے میں مورے پی ملے کر نہ سکی کچھ بات
سوتی تھی - روتی اُٹھی - ملت رہی دو ہات

رامہ چھیئو - چھوا چھو - چھیئو +

ہاں ننوا کے باپو یہ تو بتا - تو میرا پیا - میں تیری پیاری - تو میرا دھوبی - میں تیری دھوبن - پھر یہ پپیہا پی کہاں - پی کہاں - کیوں پکارتا ہے - اس کو پی پی کہنے کا کیا حق ہے -

تو کپڑے دھو چکے تو کچہری جائیو - اور پیا پیاری کے نام کو انگریز بہادر اپنے نام لکھوا لائیو - اس کے بعد پپیہا پی کو پکارے گا - تو میں نالش کر دوں گی +

نہیں ننوا کی ماں - یہ تیری غلطی ہے - پی کا پکارنا - پیا کا پیارا بننا آسان نہیں ہے - دیکھ بھونرا کیسا کالا ہوتا ہے - مگر پی کی محبت میں اس کے مُنہ کی رنگت زرد ہوتی ہے - اری اس پریم کی بڑی کٹھن بٹیا ہے - پپیہا بھی جھوٹ موٹ پی کو پکارتا ہے - اور تو بھی خواہ مخواہ اس میں جھگڑا کرتی ہے - اری جن کے من میں پی بستا ہے اُن کے مُنہ زرد پڑ جاتے ہیں - جا من میں پیا بسے - وا مکھ پیرا ہوئے -

جا لیجاری - وہیں دھر یا - پکا پکھ کر وہیں دھریا +

ننوا کے باپو - یہ رات کو چکوا چکوی - آپس میں کیا باتیں کرتے تھے - میں نے تو اتنا سُنا کہ چکوا جمنا کے اس پار اپنی چکوی کو پکارتا تھا - اور چکوی اُس پار اپنے چکوے کو آواز دیتی تھی - جب ان کے پر تھے - تو یہ اُڑ کر پاس کیوں نہیں جاتے تھے +

دیوانی - اس پریم کی ہزاروں ریتیں ہیں - کہیں پروانہ چراغ پر آن کر جل جاتا ہے - کہیں بلبل پھول کو گلے لگاتا ہے - لوہے کو مقناطیس کی محبت دی گئی ہے - کہ دیکھتا ہے تو بے اختیار اُس کی طرف دوڑتا ہے

تنکا کہربا پر فریفتہ ہے۔ دیدار پاتا ہے تو لپک کر سینے سے چمٹ جاتا ہے۔ مگر چکوے چکوی کی محبت یہی ہے کہ وہ جدائی کی بہار دیکھیں۔ وہ آپس میں مل نہیں سکتے۔ ساری عمر ترستے رہتے ہیں۔ اسی واسطے تو کہا ہے کہ چکوا چکوی کو نہ ستانا۔ وہ تو خود محبت کے ستائے ہوئے۔ جدائی کے صدمے اُٹھائے ہوئے ہیں +

چھیئو رام۔ چھیئو۔ چھیئو +

نوا کے باپو! تو نے کل کہا تھا۔ یثرب نگر میں ہمارے چودھری سارے سنسار کے تنوں کو دھونے آئے تھے اس کا بھید مجھ کو بتا۔ کہ یہ کیا بات تھی۔

او ہو۔ تو تو بڑی مورکھ ہے۔ چل تجھے قوالی میں لے چلوں۔ وہاں یہ بھید سمجھ میں آجائیگا۔ قوال گا رہے تھے۔

میری میلی گدڑ یا دھو دے

دھوبی نے کہا یہ میلی گدڑی ساری دُنیا ہے۔ خود ہمارے وجود ہیں۔ اور ان گناہوں اور شک وشبہ کے دھبوں کو صاف کرنے کے لیئے خدا نے یثرب نگر میں جو عرب میں ہے۔ اور جس کو مدینہ بھی کہتے ہیں۔ ایک بڑے چودھری کو پیدا کیا۔ جس نے سارے جہان کے دھبے دور کر دیے۔ اور یہ سب میلی گدڑیاں دھو کر رکھ دیں۔ یہی تو وجہ ہے کہ میں بے چارہ غریب دھوبی کا غذی گھاٹ پر کپڑے دھونے آیا ہوں +

از خطیب ۷۔ اکتوبر ۱۵ء

جیب میں چاندی۔ بدن میں صحت۔ دل میں جذبات اور عقل میں عروج ہو۔ تو شملہ آؤ۔ انگریزی میں یہ سملہ ہے۔ ذرا کھینچکر پڑھو تو سیم لا ہے جس کے معنی طلب نقرہ میں محو ہیں +

میں آیا تو جیب خالی۔ بدن ناتوان۔ دل جذبات سے معرّا۔ عقل زوال پذیر۔ کوئی وجہ ایسی نہ تھی۔ جس کے سہارے اس اونچے پتھر خانہ میں آتا۔ مگر دیکھتا ہوں کہ آگیا۔ حجرۂ فتح محمد میں ٹھہر گیا۔

یہ وہ وقت ہے کہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے سب پیشوا سیاسی وعلمی اس کوہ نور پر جمع ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ یونیورسٹی لینے آیا ہوں۔ کوئی کہتا ہے کہ ریزولیوشن پیش کرنا اور جواب میں نغمۂ دلربا سُننا ہے۔ کسی کو مال روڈ پر گشت لگانا اور ہوٹل میں جانا آتا ہے۔ کوئی زندگی کی دریدگی میں ہوائے شملہ سے رفو کرنے آیا ہے +

چاند زوروں پر ہے۔ آدھے دن اِدھر آدھے اُدھر۔ تیرھویں چودھویں کا سماں ہے۔ رات کو آسمان مُنہ دھو کر بے پردہ نکل آتا ہے۔ چاند تاروں کی فوج کو قواعد کراتا ہے۔ غیر فوجی بندہ اپنے حجرے کے جھروکوں میں بیٹھا ان نورانی ہستیوں کی نیزہ بازی دیکھا کرتا ہے۔ سردی باہر نکلنے نہیں دیتی۔ آتشدان کی ملکہ چاند کی قدرتی رقیب ہے۔ اس کے پاس ہوتا ہوں تو چاند کے پہلو میں کیونکر جاؤں +

کل چاندنی لرز لرز کر پہاڑوں کی چوٹیوں پر چل رہی تھی۔ اور میں ٹہلتا تھا۔ جب وہ پھسل کر غاروں میں لُڑھک جاتی تھی

غار گود کھولے بنت القمر کی یاد میں بیتاب نظر آتے تھے۔ اور جب اس تابانی کو پاتے تھے تو اپنے اندر کی سب مخفی حالتوں کو نمایاں کر دیتے تھے ۔

کہتے ہیں یہ وہ پہاڑ ہے جو سیکڑوں کوس اسی طرح اونچا نیچا چلا گیا ہے۔ میں کہتا ہوں یہ وہ پہاڑ ہے جس کے ہاتھوں میں ساری ہندوستان کی دُنیاوی قسمتیں ہیں۔ اس پہاڑ کے سینے پر جو تار ہیں اُن کی بجلی تمام ہندوستان کی موت و حیات پر حکمرانی کرتی ہے۔ اس پہاڑ کی گود میں جو ریل چلتی ہے وہ لاکھوں میل لمبے ہند کی زندگانی کے لیے آبِ حیات لیجاتی ہے یا ہر ایک کو اُسکے نامۂ اعمال پہونچاتی ہے۔ ہونگے اس سلسلہ سے اور بھی اونچے پہاڑ ہونگے مگر نصیبے میں اس سے اونچا کون ہے۔ اقبال اس سے بڑھکر کس کا ہے۔ سب راجہ پرجا اس سنگ خانہ میں کھینچے چلے آتے ہیں ۔

میں پوچھوں۔ کیوں جناب آپ نعرہ لگاتے تھے۔ انا سیم لا۔ اور بیا بغیر سیم کے آپ کے پاس آ گیا تو یہ پہاڑ کیا جواب دے۔ ممکن ہے کہ تیوری چڑھائے اور میری عقلی پر قہقہہ لگائے۔ مگر میں اس کی کچھ پروا نہیں کرتا اور کہتا ہوں کہ بغیر سیم کے بھی سیم لا دیکھنے میں آ سکتا ہے اگر توکل خالق سم و سیم پر ہو۔

حضرتِ کُن

بعض لوگ خیال کرتے ہیں کہ حضرت کُن پیدا ہوتے ہی جلت فرما گئے۔ اور اب دنیا میں ان کا نام ہی نام باقی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ تمام موجودات کا وجود ان ہی جناب کے سہارے پایا جاتا ہے۔ یہ مر جاتے۔ جہاں سے گزر جاتے تو فَیَکُوْن کی صورت نظر نہ آتی۔

لوگوں کو ان کی موت کا شبہ اس وجہ سے ہوا ہے کہ جو کرشمہ انھوں نے اپنی پیدائش کے وقت دکھایا تھا وہ دُبارہ نہ دیکھا گیا۔ ان کی پیدائش سے پہلے نہ آسمان تھا نہ زمین۔ اور نہ یہ تمام غلطاں پیچاں چیزیں جو آسمان زمین پر چھائی ہوئی ہیں۔ اور یہ میاں آدم بھی جو آج حضرت کُن کی زندگی پر بحث کر رہے ہیں ظہورِ کُن سے اوّل غائب تھے۔ مختصر بات یہ ہے کہ ناپید اور عدم کا لفظ بھی گم تھا ۔

حضرت کُن کے میلاد شریف کی کیفیت یوں بیان کی جاتی ہے کہ جب خزانۂ مخفی میں خود نمائی و خود آرائی کا جذبہ اُٹھا اور اس جذبہ نے سکوت معدوم کے دریا میں ایک لہر اور جنبش پیدا کی۔ خواہش نمود کا بادل گرجا اور برسوں کی قید شدہ بجلی نے بادل سے باہر آ کر چمکنا چاہا تو سب سے پہلے حضرت کُن کو ولادت[1] کا شرف عطا کیا گیا۔ جب یہ حضرت آغوشِ دہن سے باہر تشریف لائے تو عجیب شان سے آئے ۔

ھو حق سناٹے میں زور سے تجلّی ہوئی اور سایہ نمودار ہوا۔ یہ سایہ تیزی سے گردش کرتا تھا۔ اور موجودہ عالم کی رنگا رنگ شکلیں اس میں یکے بعد دیگرے ظاہر ہوتی جاتی تھیں۔ یہاں تک کہ اس سایہ کی گردش آہستہ آہستہ تھمی اور وجود عالم جم کر قایم ہو گیا ۔

اس کے بعد نہ پھر کبھی ایسی تجلّی ہوئی۔ نہ کوئی اس قسم کا دوسرا عالم ظاہر ہوا۔ اس واسطے بعض آدمی کہتے ہیں کہ حضرت کُن چل بسے ورنہ کبھی تو کوئی اور جلوہ دکھاتے ۔

لیکن آدم زاد غلطی کرتے ہیں جو مولانا کُن کو مُردہ تصوّر کرتے ہیں۔ وہ زندہ ہیں اور ہر روز تجلّیاں نازل کرتے ہیں۔ یہ پُرانا کارخانہ شب و روز نئے رنگ بدلتا ہے۔ جناب کُن نہ ہوتے تو یہ نت نئی رنگینیاں کہاں سے آتیں۔ ہمارا تو اس پر ایمان ہے کہ حضرت کُن زندہ ہیں۔ زندہ رہیں گے اور مرنا اُن کے لیے محال ہے۔ کلام ہے تو اس میں ہے کہ آیا ان کی ولادت کی ضرورت بھی تھی یا نہیں اور جب وہ پیدا ہو ہی گئے تو اُن کا وجود کچھ کام بھی آیا یا یوں ہی افشائے راز کا دھبہ ثابت ہوا ۔

اس معاملہ میں دو خیال ہیں۔ حضرت کُن کے حامی جو آرایش عالم کی ظاہری بہار کے شیدا ہیں کہتے ہیں:۔...... کُن نے بڑا احسان کیا جو ہمکو

[1] یہاں وہ ولادت مُراد نہیں جو ماں باپ کے تعلق سے ہوتی ہے۔ اس قسم کی ولادت سے قرآن شریف کی سورۂ اخلاص میں انکار کیا گیا ہے۔ ہم اس مسئلہ کو سچا جانتے اور ڈر کے مارے ولادت کی تشریح کر دیتے ہیں ۱۲ حسن نظامی۔

راز کے بند صندوق سے باہر نکالا اور عجیب و غریب تماشے دکھائے۔ مگر گروہ مست قلندر جناب گن کا بہت شکوہ گزار ہے۔ وہ خیال کرتا ہے کہ نہ یہ حضرت تشریف لاتے نہ ہمارے سکون وحدت میں طوفان آتا۔ خشک و تر۔ خیر و شر۔ جان دار و بیجان۔ سینہ سے سینہ لگائے آرام سے سوتے تھے۔ اب پہاڑ جنگل بیابان میں اکیلے کھڑے ہیں۔ اور شہروں کی رونق و چہل پہل کو ترستے ہیں۔ شہر رات دن کے غل و شور سے اُکتا کر پہاڑ و ان صحراؤں کی تنہائی و خاموشی پر حسرت کے آنسو بہاتے ہیں۔ دریا شاکی ہیں کہ ہم بہتے بہتے تھک گئے۔ یہ کنارہ آرام سے بیٹھا ہے۔ یہ کیوں نہیں بہتا۔ کنارہ کہتا ہے میں خود اپنی اُفتادگی سے نالاں ہوں۔ نقل مکان کر نہیں سکتا ورنہ تمہاری طرح سیر کرتا پھرتا۔ سب سے زیادہ انسان اپنی تکلیفیں بیان کرتا ہے۔ بچپن اور جوانی۔ بیماری اور بڑھاپا۔ غریبی و امیری نیکی و بدی سب اس کی جان کے لیئے وبال بنے ہوئے ہیں۔ ہم بھی جہاں تک غور کرتے ہیں انسان کی شکایتیں واجبی معلوم ہوتی ہیں۔ پر جہاں اس کو کن کے سبب آزار وہ پراگندگی نصیب ہوئی ہے۔ طرح طرح کی خوشیاں بھی ملی ہیں جو درجوں اور حالتوں میں تقسیم ہو کر ایسی پُر لطف بن جاتی ہیں کہ عالم یکجائی میں ان کا حاصل ہونا کسی طرح ممکن نہ تھا۔

(از صوفی ستمبر سنہ ۱۹۰۹ء)

روئی

(از صوفی جنوری سنہ ۱۹۱۳ء)

سردی کا موسم درحقیقت روئی کا موسم ہے۔ جہاں یہ دن آئے چاروں طرف روئی کی گوری گوری اُجلی اُجلی صورت نظر آنے لگی انگریزوں اور اُن کی ریس کرنے والے ہندوستانیوں نے سے ہمیں بحث نہیں جو روئی کا استعمال فیشن اور شان کے خلاف سمجھتے ہیں۔ اور بھیڑ کی اُون پہننے کو اپنا فخر جانتے ہیں۔ روئی خدا کی دی ہوئی سخت زمین سے نکلا ہوا شگوفہ ہے اُون غریب بھیڑ کا اوڑھنا بچھونا جس کو ظلم و بے دردی سے زبردستی چھین لیا جاتا ہے اور اُس مال مغصوبہ کے کوٹ کمبل اور طرح طرح کے کپڑے بنا کر استعمال کیے جاتے ہیں اور اُس پر یہ ڈھٹائی کہ جو لوگ خدا کی دی ہوئی روئی کے کپڑے پہنیں اُن کو ذلیل وحشی۔ غیر مہذب۔ اولڈ فیشن کے خطاب سے یاد کیا جاتا ہے۔

روئی کے درخت کو دیکھنا! کھیت میں اپنے سینکڑوں ہم جنس پودوں کے پاس سر پر سفید عمامہ باندھے خدا کی یاد میں جھوم رہا ہے۔ تم نے دیکھا ہوگا کہ جس قدر پھول اور پھل پیدا ہوتے ہیں اُن سب میں نمی اور تری پائی جاتی ہے۔ مگر روئی اپنے درخت کا ایک ایسا پھل پھول ہے جو تر شاخ میں خشک وجود کے ساتھ نظر آتا ہے۔ یعنی روئی کے درخت کی جڑ۔ ٹہنیاں۔ پتے یہاں تک وہ شگوفہ جس کے وسط میں روئی ہوتی ہے سب میں تری اور گیلا پن موجود ہوتا ہے مگر روئی بالکل سوکھی اور نمی سے پاک ہوتی ہے۔ یہ شہادت ہے خداوند تعالیٰ کے اُس ارشاد کی کہ وہ مُردے سے زندہ اور زندہ سے مُردہ۔ آگ سے پانی اور پانی سے آگ پیدا اور نمودار کرتا ہے۔ روئی کی جڑ پانی میں۔ ٹہنیاں۔ پتے پانی آلود۔ مگر پھل شعلۂ جوّالہ۔ باہمہ و بے ہمہ سب میں موجود۔ اور سب سے الگ۔ ٹھنڈک میں پیدا ہوا۔ مزاج گرم پایا۔

اب ذرا اس پر غور کرنا کہ روئی کے پھول کے اندر جو مسلمانوں کے عمامے کی شکل کا ہے۔ یہ کالی کالی سخت سخت کیا چیز ہے اس کا نام "بنولہ" ہے جس طرح انسان اشرف المخلوقات کے باطن میں حجابات کثیف پیدا ہو جاتے ہیں جو ریاضات و صحبت شیخ و اعمال حسنہ سے صاف ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح روئی کی باطنی کثافتیں گردش آسِ مشین کے اندر پوری مشقت کے بعد

صاف کی جاتی ہیں۔ جب بنولے چونکہ ایک سخت و کرخت وجود رکھتے ہیں۔ روئی کے نازک اور گلفام بدن سے دور ہو جاتے ہیں تو روئی کو ایک اور امتحان گاہ میں جانا پڑتا ہے اور وہ دُھنیے کی تانت ہے جو بچاری روئی کے تن زار کا ایک ایک رُواں کھول بکھیر کر رکھ دیتی ہے۔ اور رونگ رونگ کا میل کوڑا کرکٹ صاف کرکے پھر سب اجزا کو ایک جگہ کرکے روئی گا گا لا بنا دیتی ہے *

ایک گالے کو لو۔ اور اُس کو تولو۔ جتنا وزن اُس کا ہو اُسی انداز سے وہ روئی لو جس کے بنولے اور کوڑا کرکٹ صاف نہیں ہوا تو تم کو زمین آسمان کا فرق نظر آئے گا۔ صاف روئی نرم ہوگی۔ گرم ہوگی۔ اور جسامت میں کئی حصے بڑی نظر آئے گی۔ اور غیر صاف شدہ روئی اس کے بالکل برعکس۔ اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ انسان بھی جب صفائی باطن کے بعد درجہ تکمیل کو پہنچتا ہے تو اُس کی ذات و صفات میں بھی چار چاند لگ جاتے ہیں *

مغرب کے دُھنیے

روئی دُھنکنے کا ذکر آیا۔ آدمی اور روئی کے درجہ پر بحث ہوئی تو لامحالہ اس پر بھی گفتگو ہونی چاہیئے کہ اُترن پوش مغرب ہماری روئی کا کس قدر محتاج ہے۔ مغرب میں ہزاروں کارخانے ہماری روئی کے بل پر چل رہے ہیں۔ سوتی کپڑے کی مانگ نہ ہو تو روئی کے گالوں کی طرح گوروں کے گلے نہ پھولیں۔ اور پچک کر رہ جائیں۔ مگر یہ اہل سیاست اصحاب کے سوچنے کی باتیں ہیں۔ فقیر تو اس امر کی شکایت کر سکتا ہے کہ مغرب کے دُھنیے مشرق کی پرانی روئی کو دُھنکنے کے لئے تو اس قدر بے چین ہیں کہ کالے کوسوں روئی دُھنکنے کے سامان کندھے پر اُٹھائے لئے چلے آتے ہیں۔ کوئی اُن سے پوچھے کہ اپنے گھر کے لحاف۔ توشک کی بھی خبر لی۔ پرانی روئی کے دُھنکنے کی دُھن میں ایسے سرشار ہوئے کہ اپنے گھر کی روئی بیحیائی شراب خواری۔ خود غرضی۔ بے رحمی کے بنولوں سے اٹی پڑی ہے۔ اور اُس کی طرف کوئی توجہ نہیں کرتا..........

او آدمی! اپنے وجود کی روئی کے چار بنولے جن کا تعلق اربعہ عناصر سے ہے۔ نکال ڈال۔ اور الٰہی تانت بجا کہ تمام جسم صدائے وحدت کی تُن تُن سے گونج اُٹھے۔ اور رُوح کی ملکہ تیرے پاکیزہ جسم کے نرم و گرم لحاف میں خوشنودگی و پسندیدگی سے رہنا قبول فرمائے *

مستانہ بیمار کا جواب

از طبیب یکم جنوری ۱۹۱۴ء

انگریزی میز والے اخبار جی! مجھ سے کیا مانگتا ہے؟ میں کیا کروں۔ کیا دوں؟ طبیب اخبار بنتا ہے۔ بننے دو۔ دُنیا میں ہر چیز بننے سنورنے کو آئی ہے۔ خود خدا کے جی میں یہی سمائی ہے۔ ہر ہستی نمود داری کی طلبگار ہے۔ بندہ خود اس مرض کا گرفتار

ہے۔ مگر اب تو مدّت ہو گئی۔ زخموں نے بہنا چھوڑ دیا۔ میں نے لکھنے پڑھنے اور اخباری آہ و زاری کرنے سے ہاتھ اُٹھا لیا
تم جانتے ہو۔ پہچانتے ہو۔ پھر کیا مانگتے ہو۔؟

دلّی دور تھی۔ آج کل میں اُس سے دور ہوں۔ سُنتا ہوں کہ وہ میری طرف چلتی ہے اور کہتی ہے "دیوانہ ہنوز بیگانہ"
جو پانی کا سمندر دامن پکڑنے کو دوڑتا ہے۔ کہتا ہے۔ میری نبض دیکھو۔ طبیب کہتے ہیں! نبض کی تیزی اور حرکت بخار کی
نشانی ہے۔ کہیں مجھ کو بخار تو نہیں؟ میں اس سے بھی نہیں بولتا۔ دل کو بھی جواب نہیں دیتا۔ جو اپنی حرکت بے اختیاری کی
سبب تپ لازمی کی فکر میں مبتلا ہے۔ پلکوں کی جانب بھی مخاطب نہیں ہوتا۔ جو سکنڈ سکنڈ میں ٹھوکریں کھاتی اور چشم بیمار
پر گری پڑتی ہیں۔ لفظوں کی دُنیا میں سُنا جاتا ہے۔ علم دو ہیں۔ بدنی اور دینی۔ میں نے ابھی علم کے لفظ تک کو نہیں پہچانا
بدن و دین کا کوچہ بعد میں آئے گا +

دل گوشت کا ٹکڑا ہے۔ خون کا انجن گھر ہے۔ یا تخت ربّ العالمین ہے۔ یا مستانہ دیوانہ کا جھلجانا ہے۔ مجھے کچھ خبر نہیں
دماغ کہاں ہے۔ کیوں ہے۔ اس میں آنکھیں کدھر ہیں۔ کان کس رُخ ہیں۔ ناک کس جانب ہے۔ زبان کون سے پہلو میں
ہے۔ مجھے معلوم نہیں +

معدہ و جگر میں کیا تعلق ہے۔ گردہ کی کس کس سے دُشمنی ہے۔ خانۂ شکم میں کن رقابتوں کا بازار گرم ہے۔ ان کو سمجھنے کا
وقت نہیں نکال سکتا۔

کیفیات و محسوسات اندرونی و بیرونی اور ملکۂ جسم یا رانی بی طبیعت لاامکانی سے بھی میری شناسائی نہیں۔ سُنتا ہوں
وہ میری عاشق زار ہیں۔ رات دن میری ہی خبر گیری و خاطر داری میں گھُلی جاتی ہیں۔ مگر ان دنوں مجھے ان کی طرف بھی
آنکھ اُٹھانے کی فرصت نہیں +

دلّی کی گورنمنٹ ملیریا کے مچھر پکڑتی ہے۔ اور اخباروں کے جراثیم چھوڑتی جاتی ہے۔ اخبار روزانہ ہو تو یومیہ نوبت کا
بخار ہے۔ ہفتہ وار ہو تو آٹھ روزہ۔ ہفتہ میں تین بار ہو تو تجیہ۔ اور دو بار ہو تو چوتھیہ۔

طبیب کے ایڈیٹر صاحب کو خدا تندرستی دے۔ مجھ غریب الوطن کی نبض پر ہاتھ ڈالتے ہیں۔ دردمند عشق فارسی
جانتا ہوتا تو کہہ دیتا "خیز اے نادان طبیب" مگر یہاں تو اپنے عشق کا درد ہے جس کو دارو ئے دیدار بھی نصیب نہیں
بہت سے شربت دیدار پیئے۔ لال بھی۔ کالے بھی۔ مگر درد قابو میں نہ آیا +

کل رات حکیم سُقراط زہر کا پیالہ لے کر میرے پلنگ تک آئے۔ میں سیچے بچھے ہوئے مصلے کو دیکھ رہا تھا کہ اب کوئی دم میں
مجھ کو اس پر جانا اور خدا کے سامنے سر جُھکانا ہو گا۔ بوڑھے حکیم نے ادب سے گھٹنے ٹیکائے اور کہا اس کو پی لو بیقراری
جاتی رہے گی۔ میں نے کہا ثبوت دو کہ تم کو جام زہر آلود نے تسلّی دیدی۔ شام کو وکٹوریہ گارڈن میں۔ ایک اسیر
قفس طوطے نے بیان کیا تھا کہ قرار جنگل کی آزادی میں بھی نہ تھا۔ اور اس پنجرۂ آہنی میں بھی نہیں ہے۔ پھر اگر میں زہر کا
پیالہ پی لوں مسلمان مولویوں کے فتوے موت الحرام اور انگریزوں کے قانون خودکشی کا سزاوار بنوں۔ تو کون کہہ سکتا
ہے کہ مرض اضطراب دور ہو جائے گا۔

حکیم سقراط کے برابر ایک اور پیر مرد نمودار ہوئے۔ بولے میں سعدی ہوں۔ میں نے کہا جناب شیخ صاحب مجھ کو
حیران نہ کیجیے اور اس حکیم کو لیکر جائیے۔ آپ نے دُنیا کو خوب دیکھ بھال کر سمجھا اور میں بغیر دیکھے سمجھ گیا +

سعدی نے بغل سے ایک کتاب نکالی اور کہا اس کشفیہ میں نسخہ دیکھو۔ دم گھٹنے لگا۔ زبان بولی۔ کتابوں میں کیا رکھا ہے۔ ہربرٹ سپنسر نے آواز دی۔ آفریں۔ خوب جواب ہے۔ گردن موڑ کر حکیم ہربرٹ کو للکارنا پڑا۔ جاؤ گورے آدمیوں کو آفرین و تحسین دو مجھے درکار نہیں۔ بمبئی کے بازاروں میں ہزاروں بیمار نظر سے گزرتے ہیں ٹرام گاڑیاں دوڑتی ہیں اور ہر بیمار کو اُس کی شفاخانہ میں لے جاتی ہیں۔ میرے پاس پچکائے شہرۂ آفاق خود آئے ہیں فیس و نذرانہ سے انکار کرتے ہیں۔ اور غریب سمجھ کر مفت علاج کرنا چاہتے ہیں۔ اخبار طبیب ان کے نام بھی جاری کر دینا۔ ان کو نسخے خوب یاد ہیں۔ یہ سب کاغذی حکیم تھے۔ آسمانی حکیم تھے۔ روحانی حکیم تھے۔ طوفانی حکیم تھے۔

میں بیمار نہیں ہوں۔ حواس باختہ نہیں ہوں۔ عشقیہ مالیخولیا کے آزار سے آزاد ہوں۔ مولانا روم کے گندم نواز عشق کے زیر بار ہونے سے انکاری ہوں۔ یہ تمہارا طبیب مجھ سے کہا چاہتا ہے۔ اس سے کہو خلقت عشق سے تباہ ہو اور بڑے بڑے بزرگ خضر کی صورت اس آگ کو بھڑکاتے ہیں۔ ابھی اس خط کے لکھتے وقت شیکسپیئر نے قلم پکڑ لیا۔ کہتا تھا خدا اور محبت کا بھید کوئی نہیں جانتا۔ میں نے ایک کہنی مار کر دھکا دیدیا۔ سٹیج پر رقص کرنے والا۔ مجلس میں ناچنے والے کو سبق دینے آیا ہے۔ ارے میں خدا کو بھی جانتا ہوں اور عشق کو بھی پہچانتا ہوں۔ یہ دونوں اس ساری کائنات کے جسم و روح ہیں۔ جسم کے عوارض اور روح کے آلام جن اخلاط سے پیدا ہوتے ہیں وہ بغیر سمجھے مجھ کو معلوم ہیں۔ طبیب بیچارے کیا جانیں۔ بلغم و سودا کے صحرا میں سرگرداں رہتے ہیں۔ صفراوی تحقیقات کی محنت میں زرد ہو گئے ہیں۔ خلقت سے کہتے ہیں۔ ہم کو حکیم صاحب کہو۔ ان کا کہنا جھوٹ نہیں اور سچ بھی نہیں +

نادان خلقت کی حکمت جانتے ہیں اس لیئے سچے ہیں۔ دانا مخلوقات کی حکمت سے عاجز ہیں۔ لہذا دروغ گو ہیں۔ نیم حکیم خطرۂ جان ہو۔ مگر خطرۂ جسم نہیں ہوتا۔ جان اور چیز ہے۔ حکیم طبیب کو اس سے کیا سروکار۔ جان کا راز جانان کو معلوم ہے یا جاناں پرستوں کو۔ وہاں اگر کوئی خام کار گھس جاتا ہے تو کان پکڑ کر نکال دیا جاتا ہے۔ پروانہ کا سوز کبھی کم نہیں دیا جاتا +

تم سمجھے۔ جناب حکمت مآب ایڈیٹر صاحب مستانہ بیمار کے جواب کو۔ ڈرتا ہوں کہ تم لیاقت طبی جتانے کھڑے ہو جاؤ۔ اور کہو۔ حسن نظامی کے دماغ میں خلل آ گیا ہے۔ تربوز کا چھلکا اُڑھانے کی ضرورت ہے۔ تربوز کا چھلکا اُڑھاتے ہو تو وہ سُرخ سُرخ گودا بھی دو۔ جو رُخ شعلہ صفت کا ہمشکل ہے۔ زخمی جگر کی صورت رکھتا ہے +

طب اچھا فن ہے۔ عرفان جسم کا مرشد ہے۔ جسم کی شناخت ہو جائے۔ تو جان تک رسائی دشوار نہیں۔ جان کیا چیز ہے؟ روح کس کو کہتے ہیں؟ جو طبیب اس کی دانش کا دم مارے وہ بے دم ہے یا بیدم ہونے والا ہے۔

نئی روشنی کے طبیب جن کو ڈاکٹر کہتے ہیں تمام کائنات و موجودات عالم کو خشک ہوں یا تر حیوان ہوں یا بشر پہاڑ ہوں یا شجر سلسلۂ جاناں میں منسلک مانتے ہیں۔ ہند و فلاسفر پہلے ہی کہتے تھے مگر ان سرکشوں نے نہ مانا۔ اب آنکھیں کھلیں تو پہچانا کہ حیّ و قیّوم کی حیات ذرہ ذرہ میں نمایاں ہے۔ موت بھی زندگی رکھتی ہے۔ طاعون اور ہیضہ جیسی بلا کو امراض کے بھی جان ہے۔ نازک نازک کیڑوں میں اس کی پہچان ہے۔ اب چند روز میں کہیں گے خدا کو بھی خوردبین سے دیکھ لیا۔ مگر وہ چھوٹا سا کیڑا نہیں ہے نہ بڑا سا پہاڑ ہے۔ وہ نہ خردبین سے نظر آئے نہ دوربین میں سمائے۔ اس لیئے میں پہلے سے کہے دیتا ہوں کہ ایجاد خوردبین و دوربین سے پہلے میں نے اُس کو دریافت کر لیا ہے۔ یہ ایجاد و اختراع میرے تمام

پیٹینٹ ہونی چاہیئے۔ مگر اخبار والوں کا قلم دریا کا پانی۔ معترض کی زبان کون روکے۔ کہا جائیگا۔ تم سے پہلے بے شمار انسانوں نے اس کو جانا اور پہچانا۔ رجسٹری تمہارے نام نہیں ہوسکتی +

ہاں اُنھوں نے جانا پہچانا۔ مگر نئی روشنی کے آلات سے نہیں۔ سب پُرانی لکیر کے فقیر رہے۔ مجھ کو جو عینک میسر آئی ہو وہ پہلے نہ بنی تھی۔ نہ آیندہ اُس جیسی بننی ممکن ہے +

میری مانو تو کہوں۔ کامل طبیب کاغذ کے حرفوں اور مریض و امراض کے تجربوں سے نہیں پہچانا جاتا۔ یہ سب ابن آدم کے کسبی وظنی جوہر ہیں۔ کمال صفت عینی ہے۔ جو کبھی اثر بے توقع اور کبھی ضرر بے یقین بنکر مودار ہوتا ہے۔ خدا جب چاہتا ہے کسی طبیب کو یہ نعمت دیدیتا ہے کہ خلاف اُمید تاثیریں اُس کے ہاتھ سے ظاہر ہوتی ہیں۔ مایوس اور لاعلاج مریض ادنیٰ کوشش میں بستر مرگ سے زندہ ہو کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔

ایک دن میں نے عزرائیل سے پوچھا۔ تم بھی زندگی کے ہاتھ سے کبھی آزردہ ہوئے ہو؟ بولے رات دن میں کئی بار یہ زحمت پیش آتی ہے۔ ایک طرف مجھ کو حکم ہوتا ہے۔ فلاں مریض کی جان نکال لو۔ دوسری طرف طبیب کامل کے ہاتھ میں اثر دیا جاتا ہے کہ مرنے نہ دو۔ اور دیکھتا ہوں۔ کہ خاکی انسان جیت جاتا ہے اور مجھ کو اپنی جبلت ہلاکت کی شکست سے سخت اذیت ہوتی ہے +

میں نے کہا۔ تم سمجھے بھی۔ خدا یہ دورخی پالیسی کیوں چلتا ہے۔ جواب دیا اس کا علم مجھ کو نہیں۔ میں بولا سُنو! زندگی کشمکش کامیابی و ناکامی کا نام ہے۔ تم ہمیشہ کامیاب رہو تو زندگی کے انقلابات کا لطف جاتا رہے۔ یہ بات سُنکر عزرائیل نے حسرت سے مجھ کو دیکھا۔ اور میں نے جلدی سے اس کو قلمبند کرلیا +

تنکے کا سلوک

(از نظام المشائخ ۱۹۱۵ء)

شیراز کے فلسفی صوفی نے کہا۔ درخت کے ہر پتے پر کردگار نرنکار کی معرفت کے دفتر منقوش ہیں یہ سُنکر جنگل کے نیم کی ایک ٹہنی کو میں نے جُھکایا اور اُس کے پتوں سے پوچھا۔ خدا کی پہچان کا رجسٹر کس ورق میں ہے۔ شاخ جھومکر بولی۔ تم تو ہم کو جُھکاتے ہو خود جُھکو تب وہ مخفی نوشتے نظر آئیں گے۔

سُنا آپ نے۔ میں اور ناہنجار اشجار کے آگے سر کو خم کروں۔ اغیار کے سامنے اس سر کو جُھکنے کی عادت نہیں +

میرے سکوت اور پس وپیش نے نیم کی ٹہنی کو موقع دیا کہ اُس نے جھنجھلا کر اپنا ہاتھ مجھ سے چُھڑا لیا۔ اور دوسری شاخوں نے متحرک ہو کر اپنی گرفتار بہن کو اپنے اندر مِلا لیا +

قدم بڑھایا۔ چلوں اور کسی دوسرے عارف سے اس نکتے کو حل کروں۔ پاؤں کے نیچے دبے ہوئے گیاہ سبز کے تنکے نے آواز دی۔ میں بتاؤں۔ سُنو تو میں سُناؤں۔ میں جُھکا۔ اور اس مہین آواز کو سمجھنے کے لئے گردن خم کی +

نیم کی ٹہنیوں نے جھکتے دیکھکر نعرۂ شادمانی بلند کیا۔ اور کہا۔ وہ جُھکا جس کو انکار تھا۔ گھاس کے تنکوں نے ملکر جواب دیا۔ دیوانیو! یہ آدمی

اُس جنس کی جانب جھکا ہے جس سے بنا ہے۔ اس کو ایک دن اسی خاک میں آنا ہے۔ اور ہمارے ہی مٹیا محل میں تن گنوانا ہے۔ تم ہنسی ٹھٹھا اُڑاؤ میاں اشرف المخلوق ہے +

اب میں نے کہا پیارے تنکے۔ مجھ کو سلوک کا راستہ بتا۔ اور خدا تک پہونچا۔ تنکا بولا لکھنؤ جا۔ کاغذ بننے کی مشین دیکھ۔ وہاں میرے اور تیرے دونوں کے سلوک کی منزلیں طے ہو جائیں گی کہ

کرنا اور سمجھنا دیکھئے اور کہنے سے اچھا ہے

دیکھا لکھنؤ کی پیپر مل کو۔ غریب گھانس کے گٹھے بندھے رکھے ہیں۔ پھٹے پرانے گودڑ کے جھکڑے ڈھیر کے ڈھیر کھڑے ہیں۔ انجن سرگرم رفتار ہے۔ پہیے گردش میں مصروف ہیں۔ بھاپ بیقراریاں دکھا رہی ہے۔ کالا دھواں اونچے مینار سے اوپر کی طرف اُڑا چلا جاتا ہے +

تنکے کے سلوک کی پہلی منزل۔ پہلا مقام۔ پہلا لطیفہ۔ صفائی ہے۔ مشین اور حجاب غبار کی لڑائی ہے۔ لوہے کے پنجے تنکوں کو لکڑی کے تختے پر سمیٹتے ہوئے اوپر کھینچ رہے ہیں اور غریب گھانس عالم بے کسی میں کھنچی چلی جاتی ہے +

اس منزل کے امتحان سے پہلے تنکے کو دیکھا تو سراپا گرد تھا مگر امتحان میں جا کر دیکھا تو صاف شفاف پایا۔ خاک کا ایک ذرّہ بھی اس کے تن نازک پر موجود نہ تھا +

میں نے کہا۔ لو اب تو بتاؤ۔ سینہ کدورت سے صاف ہوا۔ تنکا بولا۔ واہ ابھی ایک ہی مقام طے ہوا ہے۔ تزکیۂ ظاہر کے بعد تزکیۂ باطن اور قلب ماہیت درکار ہے۔ دیکھتے دیکھتے ایک کھولتے ہوئے گرم حوض میں تنکے ڈال دیے گئے۔ اور آسمان سے گر کر زمین پر پہنچے۔ مجھے اُن کا گرنا اور گلنا ناگوار ہوا۔ جس طرح کہ میں ایک طالب خدا کو عروج دُنیا سے گرتا دیکھ کر ٹھنڈا سانس بھرا کرتا ہوں مگر تنکا ذرا نہ گھبرایا +

پھر دیکھا تو کرخت تنکوں میں ایک گداخت تھی۔ اُبلے ہوئے۔ گلے ہوئے پڑے تھے۔ اب تیسرا دور شروع ہوا۔ مشین نے اُن کو پیسنا اور دلنا شروع کیا اور آن کی آن میں بھُرتہ بنا دیا۔ اللہ تیری شان۔ وہ تنکے کی چھبیلی آن۔ اور یہ بربادی و مسماری کے سامان +

چوتھے مقام پر مرشد تیزاب نے ہاتھ پکڑا جسم افسردہ کو سینے سے لگایا۔ کثیف رنگ کٹ گیا سفید بنا کا رنگ چڑھا۔ باطن ہر چیز کا سفید ہے سیاہی عارضی اور حجاب ناپید ہے۔

مقام پنجم میں یہ سفید بھرتہ اشک محبت سے پانی پانی ہوا اور آہن کے رخسار شفاف پہ پھیل گیا۔

چھٹے مقام میں حرارت عشق نے اس پانی کو جمایا۔ ساتویں میں کاغذ بنایا اور سکھایا۔ اب ساتوں منزلیں طے کر کے تنکے نے زبان کھولی گھانس سے کاغذ بنا۔ اور وید۔ قرآن۔ توریت۔ انجیل۔ زبور۔ پران کے حرفوں کو لیکر نوشتۂ معرفت دکھانے لگا۔ اس وقت کچھ کچھ میری سمجھ میں بھی آنے لگا +

کیوں میاں تنکے! خود مٹے۔ جب عرفان حق کو سمجھانے اور دکھانے کے قابل ہوئے۔ ہمارا کیا بگڑا۔ کباب کو سوخت ہوئی۔ لذت ہم نے اُٹھائی +

تنکے نے کہا۔ تم اپنی قلب ماہیت کر لیتے تو اُسی دن میرے اندر کے اسرار پڑھ لیتے۔ مگر تم خود دار اور آرام طلب رہے۔ اس لیے میں نے یہ بار سر پر اُٹھایا۔ اور خودی کا مٹانا تم کو سکھایا۔ ظاہر میں یہ مٹنا ہے۔ لیکن حقیقت میں زندگی کی یہی بہار ہے۔ جنگل میں بکری کھا لیتی۔ گائے بھینس چر لیتی۔ گھسیارہ گھوڑے کو کھلا دیتا تو یہ سربلندی کہاں میسر آتی۔ کہ میں اُستاد اور تم شاگرد ہو۔ میں

عارف اور تم جاہل ہو +

تنکے کی گفتگو ختم نہ ہوئی تھی کہ پُرانے گُدڑوں میں سے ایک پھٹی ہوئی بوسیدہ گُدڑی نے پکارا۔ درد آشنا بنانے کو آواز دی میں ناک پر رومال رکھ کر اس غلیظ ڈھیر کو دیکھنے لگا۔ گدڑی نے کہا۔ میں ناک ہی سے بات کرنی چاہتی ہوں۔ اور تم نے اُسی کو ڈھک لیا +

صاحب میں ایک ناک والی حسینہ کا لباس ہوں۔ گو آج انقلاب دہر کے ہاتھوں اُداس ہوں +

پوچھا۔ کیوں۔ تم پر کیا بیتی۔ اس کوڑے میں آنے کی کیا اُفتاد پڑی۔ گدڑی بولی میرے جسم میں چار رنگ کے کپڑے ہیں۔ جن کو ایک بھکاری فقیر نے جوڑا تھا۔ ایک دُلاری طوائف کا پارچۂ پشواز ہے۔ دوسرا مولانا نجم الحق کی عبا کا حصہ ہے۔ تیسرا پنڈت ہرنام داس کی پوتھی کا جزدان ہے۔ چوتھا مسٹر ڈگلس کی قمیص کا ٹکڑا ہے +

یہ چاروں اپنے اپنے وقت میں ذی رُتبہ تھے۔ دُلاری طوائف کی پشواز عیش پرستوں کو عزیز تھی۔ مولانا نجم الحق کا چوغہ خدا پرستوں کی آنکھ کا تارا تھا۔ پنڈت ہرنام داس کی پوتھی کا جزدان تمام پنڈتوں کا دین و ایمان تھا۔ مسٹر ڈگلس کی قمیص سینۂ حکمرانی کی ہم جلیس تھی +

مگر اُفتادِ ایام نے ان چاروں کو اپنے مالکوں کی نظر سے اُتارا۔ کوڑی پر پُرزوں ڈلوایا۔ پھر بھکاری کے ہاتھوں میں پہونچایا اُس نے سب کو جوڑ کر ایک گُدڑی بنائی اور لباسِ غربت کی عزت دلوائی۔ اب بیچارہ فقیر بھی خدا کے ہاں گیا۔ بارہ برس کے بعد دن پھرے ہیں۔ یہاں آئی ہوں۔ سلوک کے مقامات طے کر کے میں بھی کاغذ بنوں گی۔ اور انسان کو بتاؤں گی کہ تیری مصیبت قلب ماہیت سے دور ہو سکتی ہے +

یہ باتیں سُن کر میں نے نظام المشائخ کے اڈیٹر کو دیکھا جو خریدکا غذ کی دُھن میں تھے۔ چاندی دیکھ گُدڑیاں اور گھاس کے تنکے لینے لینے جا رہے تھے۔ اس کاغذ پر وہ عقلمندی کی باتیں چھاپیں گے۔ اور خلقت ان حروف کو دیکھکر اڈیٹر صاحب کی فضیلت پر واہ واہ کرے گی۔ مگر کون جانے گا کہ اگر نظام المشائخ کے سفید اوراق پر تحریر نہ ہوتی۔ سادے صفحے شایع کر دیے جاتے تو وہ اس باتونی عبارت سیاہ سے زیادہ بلیغ ہوتے۔ بشرطیکہ کسی کو تنکے اور گُدڑ کے سلوک سے آگاہی بھی ہوتی +

دریائی سُرنگ

از خطیب ۱۴ مارچ ۱۹۱۵ء

لڑائی کی خبروں میں بحری سُرنگوں کا ذکر آیا کرتا ہے۔ یہ مخفی ہتھیار جہازوں کی نقل و حرکت کے لیئے بہت خطرناک ہیں۔ کیونکہ جہاز ان سے ٹکرا کر ڈوب جاتے ہیں +

مگر اردو زبان میں اس کا تلفظ بحری سُرنگ ایک اعتبار سے درست تلفظ نہیں ہے۔ اس لیئے کہ سُرنگ اُس مخفی راستہ کو کہتے ہیں جو ایک قلعہ سے دوسرے قلعے یا ایک مکان سے دوسرے مکان تک کسی جنگی یا پوشیدہ ضرورت کے لیئے تیار کیا جائے یہ راستہ زمین کے اندر ہوتا ہے +

اس کی زبان تالو سے نہ لگتی تھی۔ وہ چیختی تھی اور بلبلاتی تھی ✦

جوگی کے خیال میں پھر رخنہ پڑا۔ اس نے ایک اور جست کی۔ اور چڑیا کو بھی ڈنڈے سے مار ڈالا ✦ عاشق و معشوق کی لاشیں اُٹھا کر جھونپڑی کے باہر پھینکدیں۔ اور ایک لمبا سانس لیکر جس سے تضیع اوقات کا صدمہ ظاہر ہو رہا تھا۔ پھر مراقبہ میں بیٹھ گیا ✦

باہر چڑے چڑیا کے جنازے رکھے تھے۔ اندر جوگی اطمینان سے گردن جھکائے بیٹھا تھا۔ کہ نورِ حق ہاتھ میں شعلہ کی تلوار لیئے نمودار ہوا۔ جوگی اس کو دیکھکر سجدہ میں گر پڑا اور اس کی روح اپنے مرکز پر قربان ہونے کو خول میں پھڑپھڑانے لگی۔ مگر نورِ حق نے جوگی کے خول پر شعلہ کا ایک ہاتھ مارا۔ اور کہا میری چڑیوں کا خون کیوں کیا۔ جو فطرت کا سبق سُنانے تجھ تک آئی تھیں۔ ان میں زندگی تھی۔ وہ نسل بڑھانے کے دو پتلے تھے۔ تیرے ترک وجود سے ان کا رتبہ بڑا تھا ✦

جوگی کے خول نے عاجزی سے معافی مانگی۔ مگر اندر کی روح نے اپنے باپ نورِ حق کو ترشی سے جواب دیا۔ اور کہا۔ مجھ کو یہاں قید کر کے آپ آزاد رہنا چاہتا ہے۔ تو بھی تو اس قفس کا مزا چکھ۔ دُنیا میں تھوڑے پنجرے ہیں جن کے اندر کی ارواح تیری فطرت کا حکم مانتی ہیں۔ ایک میں اگر تعمیل نہ کروں تو کیا نقصان ہوگا ✦

نورِ حق نے یہ سُنکر اندر کا سانس لیا اور جوگی کی روح ایک سناٹے کے ساتھ ہاتھ پھیلائے کھنچکر اُڑی۔ اور نورِ حق میں سما گئی ✦

جوگی کا خول پڑا رہ گیا اور چڑیوں کے خول سے زیادہ اس نے اس جنگل کو بدبو دار کیا ✦

جب میرا خول یہ تمثیلی کہانی کہہ چکا۔ تو میں نے کہا۔ کہہ چکا یا کچھ باقی ہے۔ گھبرا مت۔ میں تجھ کو سڑنے سے بچاؤں گا۔ اور اس جنگل کو تیری بدبو سے آلودہ نہ ہونے دونگا۔ اس وقت وہ خول بولا۔ اب میں ہوشیاری کی ایک کہانی کہنی چاہتا ہوں اس کو سُن لے پھر جو تیرا جی چاہے کر۔

میں نے پھول کی پنکھڑیوں کو اپنے اوپر لپیٹ کر آنکھیں خول کی طرف پھیریں۔ اور اس سے کہا۔ پہلے یہ تو بتا کہ اس دُنیا نے تیری کیا قدر کی۔ جو تو دُنیا میں رہنے پر اتنا اصرار کرتا ہے۔ اور اس کی امیدوں کی اسیری پر فدا ہوا جاتا ہے۔ ناحق مثالیں دیکر مجھ کو گرفتار کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ میں جب تک تجھ میں تھا۔ ایک اچھا لکھنے والا۔ اور اُردو زبان میں ایک نئی روش ایجاد کرنے والا سمجھا جاتا تھا۔ جو قلم سے ظاہر ہوتی تھی۔ یا کبھی کوئی سامنے آ کر اس کو ادا کرتا تھا۔ تو جانتا ہے کہ اس وقت مجھ پر کیا حالت گزرتی تھی۔ میں الفاظ پرست خولوں کی یہ تعریف سُنکر بگڑتا تھا کہ یہ ایسے اندھے کیوں ہیں، جو میری اُس شان کو بیان نہیں کرتے جس پر مجھ کو نورِ حق نے اقتدار دیا ہے۔ نورِ حق سے میں جو کہتا ہوں وہ سُن لیتا ہے اور اُسکو پورا کر دیتا ہے۔ میں نے جس کی سفارش کی۔ نورِ حق نے کبھی اُس کو نہ ٹالا۔ یہی نہیں۔ نورِ حق نے اپنے طلسمی زنگار رنگ جلووں کو میرے پاس تنہا چھوڑ دیا۔ اور میں نے اُن میں خوابگاہ بنالی۔

اے خول آدمیوں کے جیلخانہ میں جی نہ لگا۔ یہ آدمی رشک کرنے لگتے ہیں۔ جب کسی کے پاس کچھ دیکھتے ہیں اور اگر انسان کو اپنے خول سے محبت ہو تو دوسروں کا رشک و حسد اس کو تکلیف دیتا ہے۔ کیا تو نے پایا کہ دُنیا میں کتنے تیرے حاسد ہیں اور اُن کی مکّارانہ کینہ وری سے تجھ کو کیسے کیسے صدمے اُٹھانے پڑے۔ اگر تو اپنی خواہشاتِ خاکی کو فراموش کر دے اور میرے مراقبہ و توجہ کے آگے سر جھکا دے تو تیری یہ ساری تکلیفیں دور ہو جائیں گی اور تو دُنیا کے سب خولوں کا

سرتاج بن جائے گا۔ مگر تجھ میں سرتاج بننے کی خوشی نہ ہوگی۔ کیونکہ سرتاجی تو کہو سکھ کے جذبات کی ثنائیت کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ جب یہ جذبات بھی نہ ہوں گے تو تجھ کو اس کی خوشی نہیں ہو سکتی۔ البتہ تجھ کو نورِ حق سے وہ انعام ملیں گے جن کے سامنے دنیا کی سب خوشیاں ہیچ اور بے نتیجہ ہیں۔

میرے خول نے یہ سن کر کہا۔ اچھا تو میری کہانی سن۔ اس کے بعد فیصلہ ہوگا۔

جڑی بوٹی کا شہید

چادرِ گل کے مزمل سن۔ کھڑا ہو۔ قدرت کی حقیر اولاد۔ جو ایک دن میں۔ پیدا ہوتی۔ بڑھتی۔ پھولتی پھلتی۔ اور مرجھا کر فنا ہو جاتی ہے جس کا نام گھاس ہے۔ بناس پتی ہے۔ جنگل کی جڑی بوٹی ہے۔ اور جو تیری گلکار مسہریوں کے میں کوسوں خاک سے سر نکالے چپ چاپ کھڑی ہے۔ بڑی قاتل ہے۔ سفاک ہے۔ بڑی دولت والی ہے۔ امیری کی کنجی ہے۔ بڑی طبیب ہے۔ امراض کی موت ہے۔ بڑی زندگی ہے۔ حیات کی روحِ رواں ہے۔

ایک پہاڑ کے نیچے میدانی زمین میں ایک راجہ رہتا تھا۔ جس کا ایک ہی بیٹا تھا۔ اس کا نام "اندرجوت" تھا۔ اسکی عمر سولہ برس کی تھی کہ باپ مر گیا۔ اور گدی اس کے ہاتھ آئی۔ اندرجوت کی رانی کنولا چودہ برس کی اور اندرجوت سے صورت شکل میں ذرا گھٹیا تھی۔ اندرجوت اپنے زمانہ کا کنہیا تھا۔ اس کے حسن کی دھاک دور دور تھی اس کو اپنی خوبصورتی پر گھمنڈ بھی تھا۔ سب سے بڑی سندرتا (خوبصورتی) اس کی آنکھوں میں تھی۔ اندرجوت ان کو دیکھ نہ سکتا تھا۔ مگر جس کو دیکھتا تھا۔ جس چیز پر نظر ڈالتا تھا۔ اس میں اپنی آنکھوں کی طاقت کو مشاہدہ کرتا تھا۔ کیونکہ آدمی ہو یا جانور۔ پتھر ہو یا درخت۔ اس کی آنکھوں کے پرتو سے شرما جاتے تھے۔ یا اندرجوت کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سامنے والی چیز اسکی آنکھوں کے رعبِ حسن سے جھک گئی ہے اور بے قابو ہے۔

کنولا اپنے پتی (شوہر) سے بہت کم تھی۔ مگر اس کے دل میں بھی خدا نے ایسی کشش دی تھی کہ اندرجوت اس کا دالہ و شیدا تھا۔

ایک دن کا ذکر ہے کہ اندرجوت کنولا کو لیکر دیبی کے درشن کو گیا۔ جو پہاڑ کے دامن میں براجمان تھی۔ راستہ میں اس کو ایک پودا جنگلی جھاڑی پر نظر آیا۔ جس کے سرمئی پیارے رنگ کے سامنے اس کی بدصورت پودی بہت بری معلوم ہوتی تھی۔ اندرجوت نے کنولا سے کہا کہ یہ پودا اس بدشکل جوڑے سے کیونکر خوش رہ سکتا ہوگا۔ کنولا بولی۔ جس طرح تم میرے ساتھ۔ یہ سنکر اندرجوت ایک خیال میں پڑ گیا۔ اور اس کو اپنے حسن کے غرور نے تھوڑی دیر بیچ و تاب میں رکھا۔

اندرجوت دیبی کے درشن کرکے واپس آ رہا تھا کہ ایک مور دکھائی دیا۔ جو اپنے بےمثال حسن کا لباس پہنے اپنی کالی کلوٹی بے قرینہ مورنی کو اپنا ناچ دکھا رہا تھا۔ اندرجوت کو پھر پودے کا خیال آیا۔ اور اس نے کنولا سے کہا۔ یہ بڑا بے وقوف ہے۔ ایسی بدشکل بیوی پر عاشق ہوا ہے۔ پودا اور مور اور شاید میں تینوں عقل سے دور ہیں۔ میں تجھ سے چار مہینے بات نہ کرونگا۔ جب تک اس کا بھید مجھ کو معلوم نہ ہو جائے۔

کنولا بڑی عقلمند لڑکی تھی۔ اس نے اندرجوت کے اس بچپن سے برا نہ مانا۔ اور کہا کچھ ہرج نہیں۔ تم اسکو سوچو تحقیق کرو

اپنا ماتم

(از خطیب ۱۴ ؍ اکتوبر ۱۹۱۵ء)

ازل کی صبح کو ابد نے رحلت کی۔ رُلیت نے آنکھ نہ کھولی تھی کہ مرگ زندہ ہوگئی۔ افسوس میں مرگیا۔ زندگی کے دریا میں ڈوبنے سے یہ واقعہ پیش آیا۔ موت کے ذرّے آبِ حیات میں حُسنِ صورت لے کر آئے۔ اور میری روح قبض کرنے لگے۔ میں ان کے فانی ہونے کا خیال کرکے کُڑھتا تھا۔ انھوں نے خود مجھے فنا کردیا۔

اب سمجھا کہ میری پیدائش کا مدعا عشق کی اسیری تھی۔ عشق نامدار ہے۔ اپنے طلبگاروں کو گمنام کرتا ہے۔ اس واسطے میرے ماتم کا کہیں چرچا نہیں۔ اور میں خود اپنا ماتم کرتا ہوں۔

میں جاتا ہوں اور حسینِ مجاز کی شہرتوں کو ورثہ میں چھوڑتا ہوں تاکہ کائنات میں حشر تک قیامت برپا ہوتی رہے۔ اس عشق کی آگ نے میری آنکھوں کی گنگا جمنا خشک کردی۔ میں دم توڑتا ہوں تو گنگا جمنا کی وادیاں اپنی ہستی کے بچاؤ میں اُلجھ جاتی ہیں۔ مجھ پر آنسو بہانے کی ان کو فرصت کہاں۔ میری موت نے ان سب صحراؤں اور لق و دق بیابانوں اور کوہستانوں کو سُنسان کردیا۔ جن کی آبادی میرے دم سے تھی۔ وہ بے دم۔ بیہوش اور بے سُدھ ہوگئے ورنہ ضرور میرے غم میں گریبان چاک کرتے۔ ہمالہ جس کو میرے عروجِ حیات نے آسمان تک پہونچایا تھا اور اپنی چوٹی کی سفیدی میں آلام کی سیاہی کو چھپایا تھا۔ میرے سرنگوں ہوتے ہی اپنے وجود کی فکر میں پڑ گیا۔ برف گھبراکر پگھلنے لگی۔ بلندیاں تیوراکر گرنے لگیں۔ پس میرا رنج وہ بھی بھول گیا۔

تو آؤ عبدالرحمان۔ اپنا ماتم میں خود کروں۔ کہ میں کیوں مرا۔ اور کیوں دُنیا کے قبرستان میں آیا۔ کاش میں ذات وحدت کی گود میں ہمیشہ زندہ رہتا۔ اور کثرت کے مرض سے میرا سامنا نہ ہوتا۔ اب ہوگیا تو صبر میرا ماتم ہے ٭

روح کا خول

(از اسوۂ حسنہ نومبر ۱۹۱۵ء)

تربوز کا چھلکا سبز۔ گودا سُرخ مزہ جو اس کی روح ہے میٹھا۔ مگر مٹھاس کی شکل دیکھی نہیں چکھنے سے جانی۔

آم کا چھلکا سبز۔ رس زرد۔ مزا شیریں۔ وہی اس کی جان ہے جس پر آدمیوں کی جان قربان ہے۔

جانتے سب جان اور روح کو ہیں۔ مگر ہاتھ میں فقط اس کا خول آتا ہے۔ کمہاری ایک چھوٹا سا پردار کیڑا ہے۔ بھڑ سے ذرا دُبلا پتلا۔ گھروں میں گیلی مٹی سے اپنا گھونسلا بناتا ہے اور اسمیں جھینگر مار کر اُس کی لاش چھپا دیتا ہے۔ اور دروازہ میں خود بیٹھکر روح کے خول کو توجہ دیتا ہے۔ چند روز میں اس کی مراقبہ کی طاقت جھینگر کو زندہ کردیتی ہے۔ اور

صحبت ہم نشیں کا اثر بے رونق جھینگر کو خوبصورت کمہاری کی شکل بنا دیتا ہے۔ اور جھینگر کمہاری بنکر اُڑ جاتا ہے
توجہ اور مراقبے کی یہ برکت دیکھکر اور جسم کی ماہیت میں یہ انقلاب مشاہدہ کرکے میں نے ایک دن جو ستمبر ۱۵ء کا
آخری حصہ تھا شملہ کے پہاڑ پر اپنے خول کا مراقبہ شروع کیا۔ اور اپنی لاش پر نظریں جمائیں۔
کمہاری نے جس دن جھینگر کا شکار کیا۔ اور اس کے ڈنک مارے تو اس کی تڑپ اور پھڑک سے ایک لالہ صاحب کا جی بہت
دکھا تھا۔ اور انھوں نے کمہاری کو ستھیاری جانور کا خطاب دیا تھا۔ اور میں نے بھی جو اس وقت تک خواجہ حسن نظامی
تھا مظلوم جھینگر کو بچانے کی بہت کوشش کی تھی ٭
یہ واقعہ آج پیش آیا۔ میرے خول کو میرے مرنے کا بڑا صدمہ ہوا۔ اور اس کے صدمے سے میں نے بھی ہمدردی ظاہر کی
مگر جو نعمت مجھ کو اس فرقت و زحمت میں نظر آئی تھی اس سے اوسان درست تھے۔ اور اطمینان سامنے تھا۔ اس لیئے
میں نے اپنے خول سے رسما غم خواری کا اظہار کیا۔ اور اس کی وہ کہانی سُن لی جو اس نے دم توڑتے وقت جی بہلانے کو مجھ سے
کہی :-

نشہ کی کہانی

پہلے میرے خول نے ایک ایسی کہانی کہی جس کو میں سکرات کے نشہ کی نشانی سمجھا۔ اور میں پہاڑ کے ایک پیاری پھول
کی پنکھڑی پر لیٹ گیا۔ اور اس کی بہکی بہکی باتوں کو متانت اور مسکراہٹ سے سُننے لگا۔
خول نے کہا۔ بُرا ہو اس عبادت کا جس نے چڑیا کی جان لی۔ خواجہ پیارے آج سے دس ہزار برس پہلے اس پہاڑ
پر ایک جھونپڑی تھی جس میں ایک عبادت گزار جوگی رہتا تھا۔ ایک دن اُس نے اپنے خیال کو خالق کے خیال سے لگایا
اور چاہا کہ اُس کا نور دیکھے کہ ایک چڑیا۔ چڑچڑاتی پروں کو پھیلاتی۔ پھدکتی۔ چیں چیں کرتی اس کی جھونپڑی میں آگئی۔
چڑا اُس کے ساتھ تھا۔ اُس نے اپنی لیڈی سے محبت کی گفتگو شروع کی۔ اور کہا پیاری دانہ چُگ چکیں۔ آؤ۔ اس فقیر
کی تونبی پر چلکر بیٹھیں۔ جس میں یہ پانی پیتا ہے۔ اور باتیں کریں۔ چڑیا اُچھلی۔ اور مستانہ ادا سے دو تین جھونٹے ہوا میں
کھائے اور تونبی پر جا بیٹھی۔
چڑے نے کہا۔ یہ آدمی کیا چاہتا ہے۔ چڑیا بولی۔ اپنے خول کی خواہشوں سے درگزر اور نورِ حق تک رسائی۔ چڑا اچھلا کر
بولا۔ دیوانہ ہے۔ خول ملا ہے تو اس کی خواہشوں کو بھی پورا کرنا پڑے گا۔ نورِ حق خواہشوں سے جُدا تھوڑی ہے۔
جوگی کو سوائے چیں چیں کے غل کے اور کچھ سُنائی نہ دیا۔ اور اس نے اپنا ڈنڈا اُٹھا کر ان دونوں پر کھینچ مارا جو
چڑے کے سر میں لگا اور وہ بیچارہ تڑپ کر زمین پر گر پڑا۔ اور مر گیا۔ چڑیا یہ دیکھکر پھُر سے اُڑ گئی اور باہر درخت کی
ٹہنی پر جا بیٹھی۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ وہ گھبرا کر ادھر اُدھر دیکھتی تھی۔ اور اپنے خول کے بچ جانے پر شکر کرتی
تھی۔ مگر تھوڑی سی دیر کے بعد اس کے دل کو شوہر کی محبّت نے بیقرار کیا۔ وہ الفت کے غم میں اندھی ہوگئی۔ اسکی روح
اپنے خول میں سر پٹکنے اور پھڑ پھڑانے لگی۔ جس کے صدمہ سے اس کا خول بھی حرکت میں آگیا۔ اور روح کے اندھے اشارہ
سے مجبور ہو کر چڑیا پھر جھونپڑی میں چلی گئی۔ وہاں اس کے غریب چاہنے والے چڑے کی لاش خاک پر پڑی تھی اور فقیر
اپنے خول کو توجہ دے رہا تھا۔ چڑیا نے آہ و نالے شروع کیئے۔ کبھی وہ تونبی پر آتی۔ کبھی جھونپڑی کے بانس پر جاتی

میں بجتا تھا۔ اور اقرار کرتا ہوں کہ کثرت کی ہر شان میں سراپا وحدت تھا۔ یعنی اس کا ہر جزو اپنے دوسرے اجزا کا ہم شکل تھا۔ میں نے اس تحفہ کے چٹکیاں لیں۔ اور وہ بے چین ہو کر زمین پر لوٹ گیا۔ لہذا یہ چند جملے بطور رسید الفت کے لکھدیئے تاکہ ماسوائے فراموشی ہو +

دوسرا مانسہ پٹیالہ کو جہاں برنالہ بھی ہے۔ اور سکھوں آریوں کے مقدمے بھی ہوا کرتے ہیں۔ اور جہان سنور یعنی بلی نام کا ایک ملک یا جزیرہ نما ہے۔ جس میں خان سراج اور دین بھی رہتے ہیں۔

ان سب حواشی کے متن میں مانسہ نامی دیار ہے۔ اس میں میرا ایک مفتوں یار ہے۔ اس کے تحفے کی رسید کا اسوقت بارہ ست سری کال کہکر میں اس رسید کو شروع کرتا ہوں۔ اور واہ گروجی کا خالصہ اور سری واہ گروجی کی فتح کہکر ختم + تحفہ کی پشت پر ایک مُہر ہے۔ اس میں رومی بہادر کاغذی تحریر کو پامال کر رہے ہیں۔ اس لیئے مجھے ڈر ہے کہ میرا سردار بہادر اس رسید کو پامال نہ کر دے۔

تحفے کے ہونٹھ سُنہری ہیں۔ ان کو دیکھ کر میرا مٹی کا ہاتھ۔ اور مٹی کی آنکھ شرماتی ہے۔ میں مٹی کا پُتلا۔ مٹی کے برتن میں پانی پیوں۔ مٹی کے ظرف میں کھانا کھاؤں اور تحفے طلائی پاؤں تو کیونکر نہ شرماؤں۔

دیوانے۔ دیوان سنگھ۔ کاغذی کھیل میں باطنی تفریح کو تلاش کر۔ زندگی کی یہ تماش ہوگی تو پوری رسید تماش ہوگی۔ دیدم۔ شنیدم۔ نوشتم۔ تو ببیں۔ بشنو۔ وخاموش شو۔ کہ سکوت ذریعۂ نجات ہے۔ دن عید۔ اور رات شب برات ہر لہروں میں منازل سلوک کی کشید ہو۔ اس واسطے پُر معنی یہ تحفہ کی رسید ہے۔

شملہ کی دیبی ماتا

(از خطیب ۱۴ر اکتوبر ۱۹۱۵ء)

اس رات کی تاریکی میں سب سوتے ہیں۔ میں پہاڑوں کو کیا کہوں۔ وہ بھی بے خبر پڑے سُن سناتے ہیں۔ جن کی آنکھ کُھلی ہے۔ ان کو بُت خانوں کی دُھن لگی ہے۔ ایک شراب کے گلاس کے آگے سر جُھکاتا ہے۔ دوسرا اپنے ہمشکل انسان پر مٹا جاتا ہے۔ کہیں مُردوں کی بندگی میں کمر بندھی ہے۔ درگاہ کی قبروں پر ٹکٹکی لگی ہے۔ یا پیر یا پیر کی صدائیں ہیں کہیں حور و غلمان کا خیال ہے۔ انہی کی تمنّا میں سجدہ بے نماز ہے۔ کوئی پُل صراط کے غم میں گرا جاتا ہے۔ دوزخ کی آگ کا خوف اپنے سامنے اپنی پوجا کراتا ہے۔ بیمار کو دیکھو نیند نہیں آتی۔ کروٹیں بدلتا ہے اور حکیم کے نسخے کو یا معبود کہہ کر سینہ سے لگاتا ہے۔ یہ دوسرا بھی بیدار ہے۔ کل کچہری کا مقدمہ سر پہ سوار ہے۔ توکّل کا دامن ہاتھ میں ہے۔ یا پلیڈر۔ یا بیرسٹر کی خیالی تسبیح پڑھ رہا ہے۔ اُف وہ یہ سب اناڑی کتنی بھول میں ہیں۔ آگے بڑھوں یا ٹھہر جاؤں۔ نہیں ذرا اور آگے دیکھوں۔ شاید کوئی حق پرست نظر آجائے۔ جس کی صحبت میں یہ کالی رات کٹ جائے +

یہ جنگی سپہ سالار ہیں۔ فوجوں کو لڑاتے ہیں۔ ملک جیتنے گھر سے نکلے ہیں۔ کیسے ہوشیار و خود دار ہیں ان کے دل میں کس کی یاد ہے۔ یہ کس کی عبادت کرتے ہیں۔ گولہ کی۔ توپ و بندوق کی۔ خندق و مورچہ کی رسد کے انبار خانوں کی۔ زہریلی گیس۔ اور ہوائی جہازوں کی۔ یہاں بھی اپنا نہ ملا۔ شملہ کی کونسلوں میں آؤ ریزولیوشن کی دنیا کو دیکھو۔ بڑے بڑے آنریبل اپنی قوت استدلال اور ملکۂ تقریر پر گھمنڈ کر رہے ہیں۔ ہر ایک اپنی خودی کا پرستار ہے۔ یہاں ٹھہرنا بیکار ہے ٭

اے دنیا! تیرے اندر اتنے بت خانے ہیں اور سب جاگنے والے۔ انہی بتوں کو پوجتے ہیں تو مجھ کو بھی اجازت دے کہ اپنے تجربے کے سامنے اس اونچی چوٹی کے پہاڑ پر دیبی ماتا کے مندر پر جاؤں اور اس ایل کی لاڈلی کے آگے سر جھکاؤں ٭

ماتا۔ ماتا۔ سوتی ہے۔ اٹھ اور بتا کہ مجھ کو کیونکر پوجوں۔ ایلو دیبی ماتا۔ آنکھوں میں آنسو بھرے اپنے پجاری پیا کو روتی ہوئی مجھ تک آئی۔ ماتا۔ میں تجھ پر قربان۔ تو کیوں تکلیف کرتی ہے۔ ماتا نے کہا۔

مورکھ نادان۔ قبر کا بت۔ پڑی کا بت۔ تحریر کا بت۔ تقریر کا بت۔ حکومت کا بت۔ زندہ بت۔ مردہ بت۔ ہفتا بت۔ روتا بت۔ میں بت۔ تو بت۔ سب ترک کرنے اور چھوڑنے کی چیزیں ہیں۔ ان بادلوں کو دیکھ [illegible] کی توحید میں سرشار اٹھے چلے آتے ہیں۔ جنت و دوزخ۔ خوشی و غم۔ رندی و تقدس کے جھگڑے [illegible] ڈال۔ رام نام جپ۔ خدا نام کی سمرن پھیر۔ صفاتی جھگڑوں کو لات مار۔ ذات میں رم۔ ذات میں سما جا ٭

[illegible] کو دیکھ۔ مجھ کو دھیان میں لا۔ میرا باپ۔ میرا سرچشمہ وہ ذات احدیت ہے۔ میں اسی نور کی شعاع ہوں جس کی جوت اس اندھیرے کے ذرہ ذرہ میں سمائی ہے۔ یہ دیوانے آدمی میری مورتی کو پوجتے ہیں اور میرے ایل کو مجھ سے ناراض کرتے ہیں ٭

تو بھی اپنے مداحوں کا بت ہے۔ ڈر کہ تیرا داتا تجھ سے روٹھ جائے گا۔ جب کوئی تیرے آگے سر جھکائیگا کہہ دے کہ بھروسہ اور ٹھکانا اس پر رکھو جس کے ہم سب جلوے ہیں۔ برساتی کیڑوں کی طرح جان نہ گنواؤ۔ جو چراغ کی لو کو نور کا دروازہ سمجھ کر اندر داخل ہونے آتا ہے اور اپنی بھول میں جلا کا جلا رہ جاتا ہے ٭

ارے بادل کے غبار۔ ارے اشک یا طوفانی۔ لا اپنے دل کا پانی۔ جو مدینہ کے چشمۂ حیات سے لایا ہے۔ اور دھو ہمارے دل۔ تاکہ دیکھیں توحید کا اصلی روپ۔ اور پائیں بیقراریوں میں قرار۔ ماتا چلی گئی۔ ایک نشتر لگا کر غائب ہو گئی۔ میں اس بیابان پہاڑ میں کس کو لاؤں جو اس تازہ زخم پر عملی عقل کا پھاہا رکھے۔

کمبل اوڑھ لوں۔ گرم آتشدان کے پاس جاؤں۔ پان چباؤں۔ اندھیرے غار میں گر پڑوں۔ یا اس زخم کو نوچ ڈالوں۔ یہ جس کیوں آئی۔ یہ ادراک کدھر سے آیا۔ اس کا نام عرفان سہی۔ مگر بہت ستانے والا۔ اور رلانے والا ہے ٭

بت خانوں کی بندشوں میں اسیر ہوں۔ اور کان یہ سناتے ہیں کہ آزادی کی توحید پر نثار ہو۔ رنگو نی پر ہو۔ تو آ تجھ کو یہ آفت سونپ دوں اور میں آنکھ بند کر کے سو جاؤں ٭

اور بحری سُرنگ ایک قسم کا آلہ ہے جس میں مشتعل ہونے والے مسالے بھرے ہوئے ہوتے ہیں ان آلوں یا پیپوں کو سمندر میں ڈال دیا جاتا ہے اور یہ تیرتے رہتے ہیں جب ان سے جہاز ٹکراتا ہے تو یہ پھٹ جاتے ہیں اور جہاز کو تباہ کر دیتے ہیں۔

اُن کی کئی قسمیں ہیں۔ ایک تو یہ جو بیان ہوئی۔ دوسری قسم پابند سُرنگوں کی ہے۔ جو تاروں سے بندھی ہوئی سمندر کی تہہ میں رکھی رہتی ہیں۔ اور جس وقت ان پر جہاز آتا ہے تو ٹکرا کر تباہ ہو جاتا ہے۔

تیسری قسم یہ ہے کہ ان پابند سُرنگوں کے تار محفوظ مقامات سے ملے ہوئے ہوتے ہیں جس وقت دشمن کا جہاز ان کے اوپر آتا ہے آدمی ان تاروں میں بجلی کی رو چھوڑ دیتے ہیں جس سے یہ سُرنگ پھٹ جاتی ہے اور جہاز کے پرخچے اُڑ جاتے ہیں پس معلوم ہوا کہ یہ

دریائی شہابے

بحری سُرنگ خواہ مخواہ سُرنگ مشہور ہو گئے ہیں۔ میں نے ان کو بحری شہابے اس واسطے کہا ہے کہ مسلمانوں کے ہاں عقیدہ ہے کہ جب شیاطین آسمان پر جانا چاہتے ہیں تو خدا کی جانب سے اُن پر آتشی شہابوں کی مار پڑتی ہے۔ چنانچہ رات کے وقت ہم دیکھا کرتے ہیں کہ آسمان پر ایک تارہ ٹوٹا اور دوڑتا ہوا ایک سمت چلا گیا۔ یہ تارہ نہیں ہوتا بلکہ وہی قدرتی شہابا

آگ کا کوڑا

ہوتا ہے جو شیطانوں کے مارا جاتا ہے۔ چونکہ آج کل زمین کے بعض آدمی اس عقیدہ کی ہنسی اُڑاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ شہابہ کوئی چیز نہیں۔ یہ روشنی جو نظر آیا کرتی ہے۔ زمین کی گیس ہے۔ جو اوپر فضا میں جا کر بعض اوقات روشن ہو جاتی ہے لہذا ان منکروں کو سمجھانے کے لیئے اللہ میاں نے خود انہی کے ہاتھ سے شہابے بنوائے اور پھر انہی کو شیطان بنا کر یہ شہابے اُن پر مارے ٭

حضرتِ خضر عالمِ خیال میں

آجکل یورپ کی عالمگیر جنگ درپیش ہے۔ دریائی شہابوں کا تذکرہ روزانہ اخباروں میں چھپتا ہے اس واسطے ایک دن عالمِ خیال میں حضرت خضر علیہ السلام کا تصوّر بندھا کہ اُنھوں نے ایک کشتی میں سوراخ کر دیا تھا اور جب حضرت موسیٰ نے اس فعلِ عجیب پر اعتراض کیا تو اُنھوں نے اس کی وجہ یہ بیان کی تھی کہ مشیّت الٰہی کے ماتحت میں نے ایسا کیا کیونکہ اُس کا فرمان تھا کہ آگے جا کر ایک ایسا بندرگاہ آئے گا جہاں ظالم بادشاہ کی حکومت ہے اور وہ نئی کشتیوں کو غصب کر لیتا ہے اس واسطے میں نے اس کشتی کو عیب دار بنا دیا۔

اس روایت سے نتیجہ یہ نکلا کہ مرضی خداوند دنیا کے کام اسباب ظاہری سے انجام دیتی ہے ورنہ وہ چاہتی تو کشتی کو ظالم کے پنجہ سے اور طرح بھی بچا لیتی۔ مثلاً یہ کہ غاصب اندھے ہو جاتے۔ اس کشتی کو نہ دیکھ سکتے۔ یا اُن پر کوئی اور بلا آ جاتی جس کے سبب وہ ظلم نہ کر سکتے۔ لیکن پروردگار نے اسکا انتظام بھی ظاہری حیلے اور سبب سے کیا ٭

پس یہ خونریزی اور تباہی بھی جو آج کل درپیش ہے کسی سبب اور باعث سے ہو۔ مگر اس کا راز کون بتائے۔ حضرت خضر نے حضرت موسیٰؑ کو بھی بہت مشکل سے یہ بھید بتایا تھا۔

خود سُرنگ بولی

مُجھ کو مستغرقِ بحرِ تخیل دیکھ کر تاروں سے بندھی ہوئی سُرنگ بولی۔ مُجھ سے سُن۔ مُجھ کو دیکھ۔ مُجھ تک آ جن کو نقشوں اور جغرافیوں کی شناخت نہ تھی وہ بھی آج کل ان لکیروں تک جاتے ہیں اور اُن سے آنکھیں لڑاتے ہیں۔ جو لڑائی کے نام سے کانپتے تھے اُن کو بھی ہوائی جہازوں میں سوار ہونے کی پھُریریاں آتی ہیں۔ اُمنگیں پیدا ہوتی ہیں۔ میں نے کہا۔ دیکھو تمہارے پاس ہوں۔ مجھے بتاؤ کہ تم کیا ہو۔ تم کیوں ہو *

پابند سُرنگ نے جواب دیا کہ آدمی! جو تو ہے۔ وہ میں ہوں۔ جو میں ہوں۔ وہ تو ہے۔ تو بھی فطرت الٰہی کے تاروں سے جکڑا ہوا ہے۔ میں بھی اُن ہی کی اسیر ہوں۔ تو بھی ایک اشارۂ ھُوْ سے پاش پاش ہو جاتا ہے۔ میں بھی ایک گردش انگشت سے نابود ہو جاتی ہوں۔

میری دوسری بہن کو دیکھ۔ جو آزاد ہے۔ تیرتی پھرتی ہے۔ مگر وہ بھی کشتیِ مرگ میں سوار ہے۔ کوئی جہاز اوپر آ جائے تو اُس کے وجود کا بھی بیڑا پار ہے *

تیری بہن کے تاروں کو بجلی نہیں ملی۔ مگر اندر کی آگ کیا کم ہے۔ ٹکر کی دیر ہے۔ ایسی بھڑکیگی کہ وہ اور جہاز دونوں گُم ہو جائیں گے۔ اب جرمنی و یورپ کی بحث فضول ہے۔ ہر ہستی موجود۔ مثل تارپیڈو۔ بحری سُرنگ ہے۔ اگر انسان اپنے وجود کی اندرونی طاقتوں کو دیکھے اور اُن سے کام لے تو باہر کی ان تمام اشیاء کو نظرِ حقارت سے دیکھنے لگے۔ کیونکہ جو شان ابنِ آدم کی ہے وہ اور کسی کی نہیں *

دو تحفوں کی رسید

(از خطیب ۳۰ جون ۱۹۱۵ء)

ایک رنگون کو جو برھما کا گاؤں ہے۔ جہاں سمندری تالاب پر تجارت کی بکریاں چرنے جاتی ہیں۔ اور جس میں آج کل سرکاری سنسر (محتسب) محبت کے خطوط کو بھی دل میں ہاتھ ڈال کر ٹٹول لیتے ہیں *

اس میں رسید ہے ایک تحفہ کی۔ محمود۔ یوسف۔ بھائی۔ میاں چار پتی کے پھول کی خدمت میں۔ رسید پر ٹکٹ ایک آنہ والا نہیں ہے۔ اور اس کا مجھے ڈر نہیں ہے۔ کیونکہ یہ تحفہ جان کا ہے۔ مال کا نہیں جس پر اسٹامپ کی ضرورت ہو۔ اقرار کرتا ہوں کہ تحفہ اس حالت میں کہ وہ بالکل کورا اور کوارا تھا مجھ کو ملا۔ اور اقرار کرتا ہوں کہ وہ اپنی ذات وصفات

اور چار مہینے مجھ سے الگ رہ سکتے ہو تو رہو۔ میں تم کو اجازت دیتی ہوں +

اندرجوت یہ سنکر بگڑا۔ اور کہا۔ تم کو اجازت دینے نہ دینے کا کچھ اختیار نہیں۔ میں نے اپنی خودمختاری سے یہ ارادہ کیا ہے۔ اور اپنے ہی اختیار سے اس پر عمل کروں گا۔ تم میری تابعدار لونڈی ہو۔ مگر بہت بدصورت ہو۔ تم میرا جوڑا نہیں ہوسکتیں۔ تم میری آنکھوں کی جوت کو نہیں سہار سکتیں اور میرے نگاہ بھر کر دیکھتے ہی نظریں جھکا لیتی ہو +

کنولا بولی جو کچھ تم نے کہا سچ ہے۔ میں تکرار نہیں کرتی۔ تم چار دن سے زیادہ اپنے ارادہ کی خودمختاری پر قایم رہ جاؤ تو غنیمت ہے مجھ کو خدا نے حسن نہیں دیا تو دوسری نعمت دی ہے جو تم کو میسر نہیں۔

اندرجوت :- وہ کیا نعمت ہے ؟

کنولا :- تمہیں سوال کرنے کا کچھ اختیار نہیں۔

اندرجوت :- میں پوچھتا بھی نہیں +

اتنے میں گھر آگیا اور یہ دونوں علٰحدہ علٰحدہ حویلیوں میں اُتر کر چلے گئے +

کنولا نے حویلی میں جاتے ہی ماما کو اپنے گُرو کے پاس بھیجا۔ جس نے سارا قصّہ اُن سے کہا۔ گُرو صاحب بڑے عالم اور دُنیا کے حال سے خبردار تھے۔ انھوں نے ماما کو دھکا کر نکال دیا۔ اور کہا۔ میں کیا کروں۔ میاں بیوی کے قصّہ میں دخل دینے کا مجھے کچھ حق نہیں ہے۔ جا کنولا سے کہہ دیجیو کہ آیندہ مجھ سے اپنے گھر کے جھگڑے بیان نہ کرنا +

ماما سہمی ہوئی کنولا کے پاس آئی۔ اور گُروجی جنگل گئے۔ اور وہاں اُنھوں نے سات کنکروں پر کچھ دم کیا اور نالے میں ڈال دیے اُدھر کنولا کو گُروجی کے برتاؤ سے اتنا رنج ہوا کہ اُس نے ہیرے کی کنی کھانے کو منگائی۔ مگر فوراً اس کے دل نے کہا کہ جو تعلیم گُروجی نے مجھ کو دی ہے اُس میں صبر کا بڑا درجہ ہے۔ "سنتوش پرم لابھ" (صبر میں بڑا نفع ہے) رام چندر جی کا قول ہے۔ پس مجھ کو بھی اپنے کلیجہ پر پتھر رکھنا چاہیے۔ دیکھیے غیب سے کیا ظاہر ہوتا ہے +

کنولا اسی خیال میں تھی کہ اندرجوت آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے اُس کے پاس آیا اور اس کے پیروں میں گر پڑا۔ کنولا نے کہا خیر ہے تم میرے پتی اور مالک ہو۔ اور میں تمہاری ادنٰے لونڈی۔ یہ کیا کرتے ہو ؟۔

اندرجوت بولا۔ میں نے غلطی کی۔ جو تم سے ایسی سخت باتیں کیں۔ خدا نے میرے دل کو روشنی دی۔ اور میں نے تمہاری شان پہچان لی۔ اب میں کبھی اُس کی قدرت میں دخل نہ دوں گا +

کنولا حیران تھی کہ یہ کیا انقلاب ہوا۔ اتنے میں دیکھا کہ گُروجی ہاتھ میں ایک بوٹی لیے چلے آتے ہیں۔ اُنھوں نے وہ بوٹی اندرجوت کو دی۔ اور کہا لے اس کو اپنی آنکھ پر رکھ۔ اندرجوت نے اس پتّہ کو اپنی آنکھ سے لگایا۔ تو کیا دیکھتا ہے کہ کنولا نور کا ایک پُتلا ہے۔ اور اس قدر حسین ہے کہ اندرجوت نے اس سے پہلے کبھی ایسی خوبصورت عورت نہ دیکھی تھی۔ اس کے بعد گُروجی نے کہا نادان نظر کے دھوکے میں نہ پڑ۔ اس دُنیا میں جو بدصورت ہیں اُن کو قدرت کی آنکھ سے دیکھے گا تو اچھی شکل میں پائے گا۔ مور تی اور پودنی خاکی آنکھوں میں بدنما ہیں۔ مگر مور اور پودنے کی حقیقت شناس نگاہوں میں بے حد خوشنما +

اندرجوت کو حیرت تھی کہ گُروجی کو ہمارے مخفی قصّہ کی کیونکر خبر ہوگئی۔ اور ان کی کرامت کا قایل ہوگیا +

اب اندرجوت گُروجی کے پاس روزانہ جانے لگا۔ اس کو جڑی بوٹی کے علم کا عشق ہو گیا تھا۔ گُروجی نے بھی اس کے شوق کے موافق بوٹیوں کے صدہا خواص سکھائے +

کایا پلٹ بوٹی

ایک دن گروجی نے اندرجوت کو کایا پلٹ بوٹی بتائی۔ اور کہا اس کو اگر ناف پر باندھ لیا جائے تو انسان اپنی روح کو جسم سے نکال کر آزاد کر سکتا ہے۔ اور روح کو جہاں چاہے سیر کرنے کو بھیج سکتا ہے اور پھر جب جی چاہے واپس بُلا سکتا ہے۔

اندرجوت نے کہا۔ پھر دوبارہ اپنے جسم میں بھی ڈالنا ممکن ہے یا نہیں۔ گروجی بولے کیوں نہیں۔ یہ نہ ہو تو کمال ہی کیا ہوا۔ مگر شرط یہ ہے کہ روح کو کسی ایسی جگہ نہ بھیجے جہاں سے وہ اُلٹی نہ آ سکے۔

اندرجوت:۔ وہ کونسا مقام ہے جہاں سے روح واپس نہیں آتی؟

گروجی:۔ خدا کی جھولی۔ جس میں ارواح رہتی ہیں۔ روح کا پسندیدہ مقام ہے۔

اندرجوت:۔ وہاں مجھے بھیجنے کی کیا ضرورت ہوگی۔ میں کبھی وہاں نہ بھیجوں گا۔

گروجی:۔ نہیں۔ یہ بات تمہارے اختیار میں نہیں ہے۔ دیکھو جو لوگ کسی نیک کام کی حمایت میں مارے جاتے ہیں اُن کی روحیں خدا کی ذات کے قریب ایک نورانی قندیل میں چلی جاتی ہیں۔ اور وہاں ان کو ایسا مزا ملتا ہے جو دُنیا کے کسی سرور کے مشابہ نہیں ہے جس کو تم سمجھ سکو۔ بس یہ خیال کرو کہ وہ بہت ہی بڑا لطف ہے۔ جو خدا کی ذات میں فنا ہونے سے پہلے اس مادی دُنیا میں ارواح کو میسّر آتا ہے۔

اگر تم نے کایا پلٹ بوٹی سے اپنی روح کو اپنے خول سے الگ کر لیا اور کہیں سیر کرنے کو بھیجا تو وہ ضرور آزادی کی ہوا سے سرشار ہو کر اپنی شہید روحوں کی قندیل میں جائے گی۔ اور وہاں گئی تو پھر کبھی نہ آئے گی۔

اندرجوت:۔ جب اس قندیل میں آپ کے فرمانے کے بموجب بہت بڑا سرور حاصل ہوتا ہے تو میں اپنی روح کو واپس کیوں بلاؤنگا اچھا ہے کہ وہ ہمیشہ وہاں رہے جہاں اس کو راحت اور چین ملتا ہو۔ اس دُنیا کی تکلیف اور بے مزہ زندگی سے تو وہ لاکھ درجے بہتر ہے۔

گروجی:۔ یہ سچ ہے۔ مگر قندیل مبارک میں غیر شہید روح کو رہنے کا حکم نہیں ہے۔ جو روح جسم کی شہادت کے بغیر محض سیر کیلئے وہاں چلی جاتی ہے تو چند روز کے مزے کے بعد ایک دُکھ لگ جاتا ہے اور وہ پھر دُنیا کے کسی ناپاک جسم میں ڈال دی جاتی ہے۔ اور قید کی تکلیف اُٹھاتی ہے۔

اندرجوت:۔ تو پھر میں کسی نیک کام میں شہید ہو کر اپنی روح کو قندیل مبارک میں کیوں نہ بھیجوں۔

گروجی:۔ ہاں۔ ایسا کرو گے تو ہمیشہ وہاں رہو گے۔

اندرجوت:۔ بتائیے کہ وہ شہادت کون سی ہے؟

گروجی:۔ خدا اور اُس کے علم کی تلاش میں اگر آدمی مر جائے تو اُس کی روح قندیل مبارک میں چلی جاتی ہے۔ کسی مظلوم کی حمایت میں مارا جائے تو اُس کو یہ درجہ ملتا ہے۔

لیکن اے اندرجوت اگر تو جسم کی قید میں رہ کر اپنی خواہشوں پر قابو رکھے اور خدا کی دی ہوئی طاقتوں کو نیک کام میں صرف کرے اور نفس کی دشمنی پر فتح پائے۔ تو کسی موت مرے قندیل مبارک میں ضرور تیری روح کو جگہ دی جائیگی اور تیرا نام شہیدوں میں لکھا جائے گا۔ دیکھ جس زمانہ میں اچھی باتوں کی بے قدری ہو جائے۔ اور خلقت نیکیوں کو عقل اور آرام کے

خلاف سمجھنے لگے۔ اس وقت میں اگر کوئی شخص ایک نیکی کو بھی زندہ کرے گا تو اس کی روح کو مرنے کے بعد قندیلِ نور میں اونچی جگہ دی جائے گی ✦

اندرجوت نے گروجی سے یہ سنکر اپنے وقت کے دو حصے کیے۔ ایک میں وہ اپنی حکومت کے کام کرتا تھا۔ اور مظلوموں کی فریاد سنتا تھا اور دوسرے میں جڑی بوٹیوں کی تحقیقات کرتا تھا۔ اور کنولا بھی اس کے شریک حال رہتی تھی۔ ایک روز وہ کنولا سمیت ایک بوٹی کی تلاش میں پھر رہا تھا کہ اس کے پاؤں میں ایک سانپ نے کاٹا۔ کنولا سانپ کو پاؤں سے چھڑانے لگی۔ کیونکہ وہ انگوٹھے کو چمٹ گیا تھا۔ تو سانپ نے کنولا کے ہاتھ میں بھی کاٹ کھایا۔ سانپ ایسا زہریلا تھا کہ دونوں وہیں پانی ہو کر بہہ گئے مگر ان کی ارواح فوراً قندیلِ مبارک میں اڑ کر چلی گئیں۔ جہاں ان کا ارواح نے بڑی دھوم دھام سے استقبال کیا۔ اور یہ دونوں ابدی اور کامل عیش سے وہاں رہنے لگے ✦

لہذا تو بھی اے میری روح ایسا ہی کر۔ اور مجھ خول میں مقید رہکر نیک کاموں میں مصروف ہو تاکہ شہیدوں کی قندیلِ حق تک رسائی پائے۔ یوں خواہ مخواہ مجھ کو ترک کرنے اور غیر فطری آزادی سے تجھ کو کچھ حاصل نہ ہوگا ✦

میں نے اپنے خول کی کہانی سنکر قہقہہ لگایا۔ اور کہا دیوانے تجھ کو اپنے خاکی جذبات کی مطابق قندیلِ حق کو بھی عیش خانہ سمجھا۔ کوئی اور مثال دی ہوتی۔ مگر دیتا کیونکر۔ تیری عقل کا عروج تو خواہشات و لذاتِ نفس تک ہے ✦

خول:۔ نہیں۔ میں نے کہا ہے کہ قندیلِ مبارک میں جو سرور ارواح کو ہوتا ہے اُس کی مشابہت ہماری دُنیا کی کسی چیز سے نہیں ہے۔ صرف سمجھنے کو کسی دُنیاوی لطف سے نسبت دے سکتے ہیں ✦

میں:۔ خیر اگر تو نے یہ کہا بھی تب بھی میں خیال کرتا ہوں۔ کہ تیری پرواز فانی لذتوں سے آگے نہیں ہے۔ میں قندیلِ حق میں شہید ہو کر جانا پسند کرتا ہوں۔ مگر اس لیے نہیں کہ وہاں مجھ کو دوسری ارواح کے ساتھ عیش و راحت نصیب ہو۔ وہاں میرا کام یہ ہوگا کہ سب ارواح کو قندیل کی قید کا دکھ بتاؤں۔ اور اُن سے کہوں کہ تم سب جد وجہد کرو اور اس محدود حیات سے نکلکر ذاتِ الٰہی کی نامحدود ہستی میں فنا ہونے کی کوشش کرو۔ کیونکہ قید تعین میں خواہ ہم کو کیسا ہی لطف ہو پر وہ بات حاصل نہیں ہو سکتی جو محویت و فنائیت ذات میں ہو سکتی ہے ✦

اگر میں قندیلِ حق کے بعد بہشت میں گیا تو وہاں بھی جب مجھ سے یہ سوال کیا گیا کہ کس قسم کا عیش چاہتا ہے تو آزادیٔ بیانِ حق کی طلب کروں گا۔ اور جنت والوں کو بہکاؤں گا کہ وہ بہشت کے جیل خانہ سے نکلیں اور موجِ الوہیت کی غمر قابی خدا سے مانگیں ✦

اے خول! میں تجھ سے نفرت نہیں رکھتا۔ میں تجھ سے جدا نہیں ہوتا۔ میں کوئی کام ایسا نہیں کرتا جو قانونِ اسلام اور قانونِ دُنیا کے برخلاف ہو۔ میں تجھ کو کسی قسم کی مادی اذیت نہیں دینا چاہتا۔ مجھ کو یہ بھی منظور نہیں کہ فطرت کے مقررہ وقت سے پہلے تجھ سے الگ ہو جاؤں۔ یا کسی اور کو ایسا کرنے کی نصیحت کروں۔ میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ تجھ سے جدا ہو کر ذرا اپنے اور تیرے حالات کا مطالعہ کیا کروں۔ جب تک تجھ سے جُدا نہ ہوں گا۔ سمجھ نہیں سکتا کہ تو کیا ہے اور میں کیا ہوں۔ تو کس حال میں ہے اور میں کس حال میں ہوں۔ تجھے کیا کرنا چاہیئے۔ اور مجھپر کیا کیا فرائض ہیں ✦

میرے مٹی کے پُتلے! تیری دید کا مجھے حکم دیا گیا ہے۔ تیرے اندر بند رہ کر تو میں تیا کہ تجھ کو کیا دیکھ سکتا ہوں۔ مانتا ہوں کہ دیکھنے کے ہزاروں طریقے ہیں مگر جو دید منزل تک پہونچاتی ہے وہ تیرے بندھن سے باہر آئے بغیر ہاتھ نہیں آسکتی ✦

یہ خیال نہ کر کہ میں ہمیشہ اس پھول کی ہستی پر بستر جمائے رہوں گا۔ میں کہہ چکا ہوں کہ محدود رہنا مجھ کو بالکل ناپسند ہے۔ میں ہمیشہ ترقی کرنے اور آگے بڑھنے میں مصروف رہتا ہوں۔ اور اس میں کہیں نہ رکوں گا تاوقتیکہ خدا کو نہ پالوں۔ اور خدا کے پانے پر بھی چپکا نہ رہوں گا یہاں تک کہ اُس کی ذات میں سما کر نابود کے اسم سے آزادی حاصل نہ کر لوں +

خول:۔ یہ حکم کہاں ہے کہ تو مجھ سے جُدا ہو کر مجھ کو پڑھے علم اندر رہ کر اچھا ہوتا ہے نہ کہ باہر نکلکر۔؟

بیج:۔ خدا نے اپنے عربی کلام میں کہا ہے۔ وَفِيٓ اَنْفُسِكُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ جس کی تعمیل جسم کی قید میں محال ہے + اے غافل میں تجھ سے جُدا کب ہوں۔ تو مجھ میں ہے تو میں تجھ میں ہوں۔ اور تیرے ہی اندر رہ کر علم حاصل کر رہا ہوں۔ مگر یہ وہ اندرون نہیں جس کو تو چاہتا ہے۔ کہ خواہشوں میں اسیر ہو کر علم حاصل کروں۔ بلکہ یہ وہ اندرون ہے جو مجھ روح کی اصطلاح میں اندرون ہے اور جس سے حکم خدا کی تعمیل اور دُنیا میں آنے کا منشار پورا ہوتا ہے +

دامِ مگس

(صوفی۔ جنوری سنہ ۱۹۱۶ء)

بلبل کو اسیر کر کے شاعروں کی یورش مول لے لی۔ جن کو سخن قلم کی تلوار کھینچے آنکھیں بند کیئے عالمِ خود فراموشی میں بلبل کے صیاد پر پلا پڑتا ہے۔ گویا غریب صیاد کو کچّا چبا جائے گا۔ کوئی پوچھے کہ شاعروں کو بلبل سے کیا ہمدردی ہے عقلمند جانتے ہیں کہ چمن کے موسمِ گُل میں بلبل اور انسان کی محفلِ عیش میں شاعر دونوں کانٹے ہیں۔ بلبل چمن میں آتا ہے تو پھولوں کی مستیاں اور خوش ادائیاں نالہ و فریاد کر کر کے خاک میں ملا دیتا ہے۔ پھول عالمِ سکوت میں اپنی نشیلی آنکھ کھولتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اُنکا چاہنے والا بھی ایسا ہی مخمور و خاموش ہو۔ سنجیدگی و متانت سے بہار کا حُسن لوٹے۔ نہ کہ بلبل کی طرح چیخے چلّائے۔ ہائے گُل۔ ہائے گُل کے نعرے لگائے۔ وصل نصیب ہو تو چونچ کی بیتاب بوسہ بازی سے برگِ گُل کو پاش پاش کر دے +

شاعر محفل میں جاتا ہے تو کبھی تو اپنی افسردہ دلی سے ساری انجمن کو افسردہ کر دیتا ہے۔ کبھی اپنی زندہ مزاجی سے داب مجلس میں برہمی ڈالتا ہے۔ کبھی ہنستا ہے۔ کبھی روتا ہے۔ غرض یہ بھی بلبل کی طرح آزار دہندہ ہے۔ خود تکلیف میں رہتا ہے دوسروں کو تکلیف میں ڈالتا ہے +

شکاری نے دام بچھایا اور شورش کنندہ بلبل کو اسیر کیا تو جناب شاعر کا کیا نقصان ہوا جو وہ شکاری کو کوستے ہیں اور اُس کی ہجو میں دفتر کے دفتر کالے کیئے ڈالتے ہیں۔ خیر آج میں نے ایک ایسی چیز کے لیئے دام بچھایا ہے جو شاعر صاحب کے کوچۂ عشق سے محروم ہے بلکہ بعض اوقات ان کی فکرِ شعر میں ہارج ہوتی ہے۔ دیکھوں اس مکّھی کی اسیری کی نسبت بھی حضرت کے قلم میں کچھ حرارت آتی ہے یا نہیں +

یہ دام مگس کے لیئے ہے۔ دام بھی بے نقط اور مگس بھی۔ شاعر صاحب کی بے نقط گالیوں کا اب کچھ اندیشہ نہیں۔ جو خود بے نقط ہو گا وہ دوسرے کی بے نقط صلواتوں سے کیا ڈرے گا +

کاغذی جال

میں نے دیکھا کہ اس زمانہ میں اخباروں رسالوں کے کاغذی جال چاروں طرف پھیلے ہوئے ہیں۔ اور حرص و ہوس کی اسیر ارواح اپنے اجسام کو ان میں پھنسا رہی ہیں اس واسطے میں نے بھی دو آنے کا مکھی مار کاغذ بازار سے خریدا۔ اور اپنے رین بسیرے کی آزاد مکھیوں کے سامنے یہ کاغذی جال لگایا ۔

اس وقت میرے دل میں مکھیوں سے کسی انتقام کی خواہش نہ تھی۔ نہ میں نے ڈاکٹر صاحب کے اس عقیدہ کو تسلیم کیا تھا کہ مکھی ہر بیماری کی جڑ ہے۔ میرے دماغ میں جرمنی قیصر کی خونخواری کا بھی کچھ دخل نہ تھا۔ نہ مجھ پر موجودہ جنگ کا ارتقائی اثر پڑا تھا۔ جو میں غریب مکھیوں کے قتل عام پر آمادہ ہوتا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے۔ مکھیوں نے مجھے بہت کم ستایا ہے۔ مچھروں کی جتنی شکایت کروں تھوڑی سی ہے۔ انھوں نے ہمیشہ میرے جسم کے خون کو شیر مادر سمجھا۔ بچاری مکھیاں میرے دسترخوان کی شریک ہوجو لیاں ہیں۔ میں ان سے اس قدر محبت رکھتا ہوں کہ جب کبھی انھوں نے میرے سالن میں ہاتھ ڈالا تو میں نے ہاتھ کھینچ لیا اور سارا دسترخوان ان کے آگے رکھ دیا۔ خود نہ کھایا سب کچھ ان کو سونپ دیا ۔

پھر جو میں نے ان کی گرفتاری و قتل کاری پر کمر باندھی اس کا سبب سوائے اس کے کچھ نہیں کہ میں فقرہ مگس بچیا کا امتحان کرنا چاہتا تھا۔ مجھے یہ خواہش تھی کہ میں اس جانور کی اسیری کا تماشا دیکھوں جس کو سرمد نے سوزِ عشق سے محروم گردانا ہے۔ اور کہا ہے کہ :-

سرمد غمِ عشق بوالہوس را ندہند
سوزِ دلِ پروانہ مگس را ندہند

جب مکھی بوالہوس ہے تو دیکھوں اسیرانِ ہوس کیونکر حرص و ہوس کا شکار ہوتے ہیں اور ان پر کیا کیا بپتائیں پڑتی ہیں ۔

سب سے زیادہ مجھ کو اس ننھے سے پرندے کی ایک اور آزمائش منظور تھی کہ وہ اپنی جان بچانے میں کہاں تک ہمت دکھاتا ہے اور جب اسپر آفت آجاتی ہے تو کس کس طرح حفاظت زندگی میں کوشش کرتا ہے۔ خاصکر یہ کہ مکھی پر سکرات موت کی کیسی کیفیت ہوتی ہے اور اس کے بے حقیقت اور ناتوان جسم سے جان کتنی دیر میں نکلتی ہے !

یہ بہت وحشیانہ تجربہ تھا۔ یہ بہت بے دردانہ تحقیقات تھی۔ اس میں دردمندی اور ترس شعاری کا ذرا دخل نہ تھا۔ مگر جذبۂ بشری نے مجھ کو سنگدل بنا دیا۔ رحم میرے خانۂ دل میں منہ چھپا کر جا بیٹھا۔ اور میں نے اپنے بستر کے آس پاس بسنے والی مکھیوں کو جال میں پھانسنے پر کمر باندھ لی۔

یہ کاغذی جال گورے ملکوں سے آیا ہے۔ اس میں انگریزی حروف ہیں۔ اور بھورے رنگ کی ایک چیپ دار چیز ہے جب میں نے اس کاغذ کو زمین پر رکھا ایک بھولی بھالی نشۂ شباب کی متوالی مکھی جست کر کے اس پر آئی اور جھپٹ مار کر ہوس کے پردوں سے نیچے اتری۔ قدم رکھنا تھا کہ دام میں الجھ گئی۔ یہ حالت دیکھکر اس نے چاہا کہ الٹے پاؤں بھاگے۔ اسواسطے وہ پھر

بالائی حیات کے لئے اُبھری۔ ہلکی۔ مگر پاؤں جال میں پھنس چکے تھے۔ اُس نے ساڑھے چار سکنڈ توقف کیا اور دم لیکر لگاتار اکیس سکنڈ اپنے پروں کو پھڑپھڑایا۔ اس وقت اس کے پاؤں قید تھے لیکن جسم پروں کی طاقت پرواز سے بار بار جنبش کرتا تھا۔ پر ایسی تیزی سے ہوا میں لہریں لیتے تھے کہ اُن کی شکل نظر نہ آتی تھی۔ آخر اکیس سکنڈ کے بعد قوت پرواز نے جواب دیدیا۔ پر شل ہو گئے۔ اور مکھی اپنے بائیں رُخ جھکی۔ جھکنا تھا کہ بایاں پر بھی جال میں پھنس گیا۔ اور مکھی آڑی ہو کر بے دم ہو گئی۔ ۳ سکنڈ وہ چُپ چاپ پڑی رہی۔ اور اس کے بعد پھر زندگی کی تمنا نے اُس کو آمادہ کیا کہ ایک بار اور جان بچانے کی کوشش کرے۔ اب کے اس نے مایوسانہ عالم میں اپنے بدن کو حرکت دی۔ اور ایک دلخراش چیخ بھی ماری جو مسلسل گیارہ سکنڈ ہوا میں گونجتی رہی۔ مگر ہائے اس میں بھی اس کو کامیابی نہ ہوئی۔ اور فرشتۂ موت اس کے سامنے آ گیا۔ اور مکھی نے دُنیا سے گزرنے کا تہیہ کر لیا۔ وہ نہ چاہتی تھی کہ اتنے جلد ہی اسکو موت سے سابقہ پڑے۔ وہ اپنی عمر کو بہت دراز تصوّر کرتی تھی۔ اس کو خیال تھا کہ یہ دُنیا ہمیشہ رہے گی اور میں اس میں آخر تک بھنبھناتی پھروں گی۔ آج اس نے موت کا پیام سُنا جس نے اس کے ارمانوں میں ہلچل ڈال دی۔ وہ چُپ ہو گئی۔ اور موت کے فرشتے کو حیرت دیاس سے دیکھنے لگی +

جب میں نے معلوم کیا کہ مکھی سکرات میں ہے تو گھڑی کو جلدی سے ہاتھ میں لے لیا۔ اور پھر سکنڈ شمار کرنے لگا۔ مگر یہ میری بڑی بھول تھی۔ اس وقت مجھ کو اپنی سکرات کی مشکلات کا خیال کرنا تھا جو ایک دن مجھ کو پیش آئے گی +

مکھی پر سکرات کا عالم ایک منٹ طاری رہا۔ اس کے بعد اُس نے داعی اجل کو اپنی روح دے دی۔ اور میرے منہ سے بے اختیار نکلا اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ ہم سب خدا کے ہیں اور آخر خدا ہی کے پاس جانا ہے +

جتنی دیر میں اس نوجوان مکھی کے انجام کار کی دید میں مصروف رہا۔ اتنے عرصہ میں مجھے خبر بھی نہ ہوئی کہ دس بیس اور نئے وجود اسیر بلا ہو چکے تھے۔ اور تڑپ رہے تھے۔ غور کیا تو قریباً ہر مکھی اکیس سکنڈ تک کوشش پرواز اور سعی رہائی میں مصروف رہکر آخر بائیں جانب جھک جاتی تھی۔ اور اس کا بایاں پر مسالہ میں آلودہ ہو کر اس کو جان سے کھو دیتا تھا +

اس کے بعد اور بھی تماشے دیکھے۔ بعض مکھیاں سرنگوں رہ گئیں۔ بعض ایسی آئیں کہ پاؤں رکھتے ہی خاموش ہو گئیں ذرا جنبش نہ کی۔ اور مری کی مری رہ گئیں۔ یہ شاید مسالہ کے زہر کا اثر ہو گا +

نابینا حرص

میں نے دیکھا کہ سینکڑوں لاشیں مکھیوں کی پڑی ہیں۔ آزاد مکھیاں ان کو دیکھنے اور سمجھنے کے باوجود اس جال میں آتی ہیں اور جان بوجھ کر اسیر پنجۂ اجل ہو جاتی ہیں۔

دل نے کہا ان میں اتنی عقل نہیں ہے جو اس قتل خانہ کی حقیقت کو سمجھیں۔ غیب کی صدا بولی نہیں۔ قدرت نے ہر جاندار کو موت وحیات کے خطرات کی تمیز و عقل دی ہے۔ مکھی اس سے محروم نہیں ہے۔ لیکن چونکہ حرص و ہوس کے آنکھ نہیں ہوتی اس واسطے یہ بچاری بھی اس کے ہاتھوں اندھی ہو کر موت کے مُنہ میں جا پڑتی ہے +

انسان سے زیادہ کس کو عقل ملی ہے۔ کیا اس کے اندھے پن کو نہیں دیکھا کہ وہ جان بوجھکر ہی ہمیشہ موت و ہلاکت کے مُنہ میں جاتا ہے۔ سب کو معلوم ہے کہ شراب سے لاکھوں آدمی تباہ ہو گئے۔ سب کی آنکھوں کے سامنے اس کی مثالیں پیش آتی ہیں مگر پھر بھی خلقت شراب خواری سے باز نہیں آتی۔ ہر ایک کو معلوم ہو گیا ہے کہ کوکین کھانے سے

آدمی چند روز میں گھل گھل کر مرجاتا ہے۔ اُس کا مال تباہ ہوجاتا ہے۔ اس کی آبرو خراب ہوتی ہے۔ حکومت جیلخانے بھجواتی ہے۔ مگر ہوس کی نابینائی اس کو کوکین سے باز نہیں رہنے دیتی۔ اور وہ دیدہ و دانستہ موت و بربادی کے مُنہ میں چلا جاتا ہے +

یہی حال قمار بازی کا ہے۔ عیاشی کا ہے۔ اور ہراُس چیز کا ہے جس میں جسمانی و روحانی خطرے ہیں۔ جب عقلمند آدمی نہیں بچتا اور نہیں دیکھتا تو مکھی بیچاری کس گنتی میں ہے +

دام مگس مکھی کی لاشوں سے کالا ہو گیا۔ میرا دل اس قتل عام کی سفاکی سے ہانپنے لگا۔ تو میں نے اپنی گردن کوپورے چار گھنٹے کے بعد اوپر سے ہٹائی اور مکھیوں کی ارواح سے گفتگو کی ٹھیرائی +

رُوحِ مگس نمبر ایک

جس وقت اجل کا ہاتھ ایک مکھی کی روح کو مُٹھی میں لیکر چلا تو میں نے دامن کو پکڑ لیا اور پوچھا۔ کیا مجھ کو اجازت ہے کہ چند باتیں آپ کے قیدی سے دریافت کروں؟ دست اجل نے ذرا تامل کے بعد جواب دیا۔ قدرت نے مجھ کو اس کا اختیار نہیں دیا ہے۔ لیکن اے آدمی تیری انسانی عظمت کے سامنے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ تو روح مگس سے مجھ کو روک کر سوال کرنے کا حق رکھتا ہے۔ پوچھ جو تیرا جی چاہے +

تب میں نے مکھی کی آزاد روح سے سوال کیا۔

تم قید جسم کے بعد اس حالت اور اُس حالت میں کیا فرق دیکھتی ہو؟

روح مگس:۔ وہ کیفیت مجھ کو محسوس ہوتی ہے جس کا سمجھانا محال ہے۔ پہلے میں تعلقات جسم کے پردوں میں ایسی بند تھی کہ باہر آنے کو میرا جی نہ چاہتا تھا۔ اور جانکنی کے وقت مجھ پر حسرتوں اور بیقراریاں برسا رکھی تھیں مگر اب مجھ کو نظر آتا ہے کہ میں اپنے وقت کی ملکہ ہوں۔ دست اجل کی مُٹھی میں بند ہوں لیکن تمام کائنات میری آنکھوں کے سامنے متحرک نظر آتی ہے۔ میری آنکھوں سے عالم کی کوئی شئے پوشیدہ نہیں۔ میرا جی چاہتا ہے کہ موت پر میں ہزاروں بار صدقے قربان ہوں جس کی بدولت میں نے منزل راحت پائی۔

میں:۔ کیا عالم علوی کو بھی مشاہدہ کرتی ہو؟

روح مگس:۔ نہیں ابھی مجھ کو وہ بہت دور کچھ مٹا مٹا اور دُھندلا دُھندلا سا دکھائی دیتا ہے۔ میں اُس کے وجود کو پاتی ہوں۔ مگر بیان کرنے اور تمیز کرنے کے قابل نہیں۔ صرف اتنا کہ اُس کے موجود ہونے پر یقین کرسکوں +

میں نے یہ سُنکر دست اجل سے کہا کہ اچھا اس کو لے جاؤ۔ باقی سوال دوسری ارواح سے کیئے جائیں گے۔ جب یہ روح غائب ہو گئی تو میں نے دوسری مکھی کی روح کو روکا +

رُوحِ مگس نمبر ۲ دو

تم بتاؤ کہ اس وقت بے خود ہو یا خودی میں ہو۔؟

روح مگس :- قید سے آزاد ہوئی۔ اب بے خودی کیسی۔ خودی میں ہوں۔ خودداری کا لطف اس وقت آیا ہے۔ حالت جسم میں وہ دیکھنے کو با خود۔ آزاد۔ خود مختار تھی۔ مگر درحقیقت عالم سفلی میں اپنی حرص و ہوس کی غلام اور بے خود تھی۔ اور عالم علوی میں قانون قدرت کے زبردست دباؤ نے مجھ کو معطل کر رکھا تھا۔ نہ اپنے اختیار سے اُڑتی نہ اپنی طاقت سے نقل و حرکت کرتی۔ نہ اپنے بل پر زندگی بسر کر سکتی۔ ہر چیز میں نیچر و فطرت کی مخفی سلطنت مجھ پر حکمران تھی تم جان سکتے ہو کہ محکومیت میں خودی کہاں رہ سکتی ہے۔ اس میں تو ہر ہستی بے خود رہنے پر مجبور رہتی ہے۔

تم انسانوں کے حالات پر غور کرنے اور اُن میں دخل دینے کی صلاحیت رکھتی ہو؟

روح مگس :- ہاں اس وقت تو میرا ادراک ارواح انسانی کے بہت قریب ہو گیا ہے میں بہت کچھ سمجھ سکتی ہوں اور دیکھتی ہوں کہ مجھ میں سمجھانے کی بھی صلاحیت موجود ہے۔

اچھا تم کو معلوم ہے کہ ڈاکٹر شیخ محمد اقبال نامی ایک مشہور شاعر نے آجکل ایک کتاب لکھی ہے اور اُس میں جسمانی و نفسانی خودی کو قائم کرنے اور دُنیا کے تعلقات سے محبت بڑھانے کی تاکید کی ہے اور کہا ہے کہ جو لوگ خودی کو مٹانا اور تعلقات دُنیا سے بے رغبتی سکھاتے ہیں وہ بڑے ہی احمق اور بے وقوف ہیں۔

روح مگس :- ہاں ہاں۔ میری بصیرت اس مثنوی کو صاف دیکھ رہی ہے جس کا نام اسرار خودی رکھا گیا ہے۔ اور جس میں حکیم افلاطون اور لسان الغیب حضرت حافظ شیرازی کو نہایت سخت حقارت سے یاد کیا گیا ہے اور ان کی پیروی کو خطرناک بتا کے آدمیوں کو اس سے روکا ہے۔

اچھا جب تم اس مثنوی کو دیکھ رہی ہو اور اُس پر اتنی حاوی ہو گئی ہو کہ تم نے اُس کے مضامین بھی بتا دیے تو بتاؤ حضرت حافظ شیرازی کی روح اس توہین کی نسبت کیا خیال کرتی ہے؟

روح مگس :- یہ سوال میری حالت سے بہت اونچا ہے۔ اب مجھ کو جانے دو کہ آزادی کے بعد عجیب قسم کی تمنائیں مجھ میں پیدا ہوئی ہیں اور اُن کا تقاضا ہے کہ میں اس عالم سفلی کے ہر تعلق سے جلدی کنارہ کش ہو کر اُن آرزوؤں کی جانب متوجہ ہوں۔

یہ سُنکر میں نے دوسری مکھی کی روح کو بھی رخصت کیا اور تیسری روح کو روک کر گفتگو شروع کی۔

رُوح مگس نمبر تین ۳

ارے بی ذرا ٹھیرو۔ ایسی بھی کیا گھبراہٹ ہے۔ یا تو یہ حالت تھی کہ موت کی صورت دیکھتے ہی دردناک آہیں کھینچتی تھیں۔ اور مرنے کے نام سے ہراساں ہوئی جاتی تھیں۔ یا یہ کیفیت ہے کہ ہوا کے گھوڑے پر سوار اُڑی چلی جاتی ہو۔

رُوح مگس :- کہو کہو۔ جلدی کہو۔ وقت خراب نہ کرو۔ یہ کہکر روح مگس نے ایک ایسی پیارے انداز سے انگڑائی لی اور خمار آلود آنکھوں کو آسمان کی طرف اُٹھا کر دیکھا کہ میں سینہ تھام کر رہ گیا۔ میں نے کہا۔ ہر بالی۔ راج دُلاری۔ بتو۔ یہ تم کس کو دیکھتی ہو۔ یہ تمہاری انکھڑیوں میں لال لال ڈورے کیوں پڑے جاتے ہیں۔ یہ تم پرستی کس بات کی چھا رہی ہے؟

روحِ مگس:۔ مسکرا کر اور اپنے وجود برقی کو کئی بل دیکر بولی۔ ارے آدمی کچھ پوچھتا ہے یا خواہ مخواہ مغز زنی کرتا ہے۔ کیا بتائیں کیا ارمان ہیں۔ کیا کہیں کس کے گلے لگنے کی تمنا ہے۔ تو اپنی سوکھی فلسفیانہ باتوں کو جانے دے اور میرا راستہ کھوٹا نہ کر۔
یہ کہکر مکھی کی روح نے پھر ایک جمائی کے ساتھ انگڑائی لی۔ اور آنکھوں کو مَل کر بولی۔ بعد مدت کے غریبوں کا نصیبہ جاگا۔ یہ کہا اور پھر آسمان کو للچائی اور شوق بھری نگاہوں سے دیکھا۔ اب کے ان نظروں میں اس قدر مستی تھی کہ مجھ کو اپنی قیدِ عنصری سے نفرت ہونے لگی اور میں نے چاہا کہ جسم سے آزاد ہو کر اس بہار تک پہونچوں۔
اس روح کو جب میں نے بہت بے قرار دیکھا تو کہا عشقِ دُنیا اچھا ہے یا عشقِ آخرت۔
دُنیا کیسی۔ آخرت کیسی۔ عشقِ آزادی۔ عشقِ حیاتِ ابدی کہو۔ یعنی یہ زندگی جو اِس وقت مجھ کو حاصل ہے اور جو دوامی ہے اگر اسی کا نام تمہارے ہاں آخرت ہے تو کہوں گی کہ عشقِ آخرت کی آرزو کرو۔ اُس دُنیا کو لات مارو۔ یہ کہا اور یکایک غائب ہو گئی۔

روحِ مگس نمبر ۴

مجھ کو اس گفت و شنید میں ایسا مزا آیا کہ میں نے ہر مکھی کی روح سے بات چیت کا تہیہ کر لیا اور چوتھی مکھی کی روح سے مخاطب ہُوا۔
یہ بہت اُداس اور غمگین تھی۔ اور دستِ اجل کے آغوش میں چُپ چاپ گردن جُھکائے بیٹھی تھی۔ میں نے کہا کیوں تم افسردہ کیوں ہو۔ بولی اس لیے کہ قیدِ جسم کی تکان نے شل کر دیا۔
آزادی نصیب ہوئی مگر سارا وجود حرص و ہوس کی سابقہ زیادتیوں سے کچلا ہُوا ہے۔ راحت ملی۔ مگر دیر میں۔ توانائی جلدی کہاں سے آئے۔ رفتہ رفتہ زخموں کا اندمال ہو گا۔
میں نے کہا۔ کیا مرنے کے بعد بھی تعلّقاتِ جسم کا خمیازہ روح پر باقی رہتا ہے۔
روحِ مگس جزا و سزا اسی کا نام ہے۔ جو دُنیا کے تعلّقات سے جی نہیں لگاتا۔ اس میں ایک مسافر کی طرح رہتا ہے۔ کھاتا پیتا ہے۔ کماتا ہے۔ شادی بیاہ کرتا ہے۔ عزّت آبرو کے درجوں تک پہونچتا ہے۔ مگر دل کو ان باتوں کا اسیر نہیں کرتا اور اس کو ہر وقت خدا سے لگائے رکھتا ہے تو مرنے کے بعد اُس کی روح کو کچھ تکان نہیں ہوتی۔ ورنہ میری طرح کہ دُنیا میں بہت زیادہ زندہ رہی اور حرص و ہوس کی غلامی کو مآلِ زندگی سمجھا۔ کھانے اور میٹھاس کی تلاش و طلب کو مقصدِ حیات سمجھتی رہی اور آج جسم سے نکلکر بے انتہا کوفت اور پشیمانی اپنے اوپر پاتی ہوں اس کا بھی یہی انجام ہوتا ہے۔ میں نے کہا تم نے سُنا ہے کہ ڈاکٹر اقبال اپنی مثنوی اسرارِ خودی میں دُنیا کو دین پر مقدّم بتاتے ہیں۔ اور عیشِ دُنیا کی طلب کو لازمی قرار دیتے ہیں؟
روحِ مگس آہ۔ یہ اُن کی بھول ہے۔ اہلِ یورپ کی خوش حالی اور فروغِ دُنیا وی نے اُن کو دھوکا دیا ہے۔ وہ چار دن کی چاندنی کو نورِ ابد تصوّر کرنے لگے۔ اُنھوں نے سائنس کی ترقی مشاہدات اور مادّہ کی اوپری اُفتاد پر قیاس کر لیا کہ بس یہی چیزیں قابلِ تقلید ہیں۔ حالانکہ ان ترقیوں کی اور ان کے عیش و آرام کی بہت تھوڑی عمر ہے۔ وہ ہوسِ نفس کے بادلوں کی ایک بجلی ہے جو صرف ایک محدود موسم میں چمک کر رہ جاتی ہے۔ وہ خواہشاتِ سفلی کی برسات کے نالے ہیں

جو چند ساعت چڑھاؤ دکھا کر اُتر جاتے ہیں +

بقا اس کائنات میں کسی شکل کو نہیں ہے۔ ہر نیک و بد اسیرِ انقلاب ہوتا ہے۔ مگر جس ہستی کی بنیاد امید آخرت اور توکل خدا پر ہو اُس کو یہ دُنیا جلد ہی فنا ہونے سے بچاتی ہے۔ اور جو خود اس دُنیا کے اسباب پر اپنی عمارت کی نیو رکھتا ہے اُسکی چند روزہ ٹیپ ٹاپ تو بہت پُر بہار ہوتی ہے۔ مگر قایم نہیں رہ سکتی۔ ایک جنبشی فطرت میں برباد ہو کر گر پڑتی ہے۔

ڈاکٹر اقبال کی نیت بُری نہیں ہے۔ انھوں نے اپنے اُستادوں کی تعلیم اور اس تعلیم کے وطن کی بود و باش سے یہ خیالات اخذ کیے ہیں۔ ان کے دل میں اپنی قوم کا درد ہے۔ اور وہ چاہتے ہیں کہ ان کے بھائی بھی کامرانی اور عیش جاودانی حاصل کریں لیکن شیطان نے جب کسی ذی عقل کو دھوکا دیا ہے تو اس طرح زینت دیکر اور اسکی نیک نیتی میں شریک ہو کر دیا ہے +

میں نے اس افسردہ مکھی کے اتنے لمبے چوڑے لکچر کو سُنکر بہت تعجب کیا کہ جو مکھیاں مرنے کے بعد خوش تھیں اُنھوں نے بات کرنے سے گریز کیا۔ اور یہ غمگین مکھی ایسی طول کلامی کرتی ہے +

اس پر میں نے اُس سے اِس کا سبب پوچھا۔ مکھی بولی :-

جس طرح دُنیا میں راحت و آرام انسان کو دوسروں سے بے پروا اور بے خبر بنا دیتا ہے۔ اسی طرح مکھیوں کی ارواح اپنے سرور باطنی کی مصروفیت میں مجھ سے ہمکلام ہونا نہ چاہتی تھیں۔ اور آگے بڑھنے کو جہاں ان کا مطلوب تھا گھبراتی تھیں۔ مگر میں کہ اب تک اسیر رنج و محن ہوں۔ دوسروں کی تکلیف کا حس رکھتی ہوں۔ اور چاہتی ہوں کہ اور ارواح میری طرح مبتلائے عذاب نہ ہوں۔ اسی واسطے میں نے ڈاکٹر اقبال کی مثنوی کی بنسبت زیادہ گفتگو کی۔ کیونکہ مجھ کو نظر آتا ہے کہ جو اسکی پیروی کریگا وہ اپنی آخرت کے عیش کو تباہ کر لے گا۔ اور جو اس سے بچیگا وہ دائمی حیات کے سرور کا حق دار ہوگا +

مکھی کی روح اتنا کہنے پائی تھی کہ ہوا کا ایک جھونکا آیا۔ اور مکھی مار کاغذ کو جس پر صدہا لاشیں مکھیوں کی پڑی تھیں اُڑا کر لے گیا۔ اس حادثہ کو دیکھکر مجبوراً عالم خیال سے اُلٹا پھرنا پڑا۔ اور ارواح کی بات چیت اُدھوری رہ گئی +

میں اُٹھا اور قتیلان تجربہ کو اُٹھا کر لایا۔ سامنے رکھا۔ اور کہا۔ اے بے حیا مگس کے بے جان جسموں تم اس جال میں کیسے سُن سان پڑے ہو۔ کچھ اپنی ارواح کا بھی حال معلوم ہے۔ اگر تم سُن سکتے ہو تو سُنو کہ اُن میں سے نیک اعمال بے فنا عیش میں مصروف ہیں۔ اور دُنیا کی طلبگار اعراف میں پھڑ پھڑا رہی ہیں۔ میں تم کو اپنے گھر کے اندر یہ آواز اس لیے دیتا ہوں کہ یہ صدا غیب کی طاقتوں سے اُڑ کر ہندوستان بھر میں گونج جائے۔ اور ہند کے ہر باشندے کو اُس کا آخری وقت یاد دلائے اور خدا کرے کہ یہ آواز پہاڑوں اور دریاؤں اور سمندروں تک سے عبور کر کے اثر کرے + آمین +

از وکیل مورخہ ۱۷ر جولائی سنہ ۱۹۰۲ء
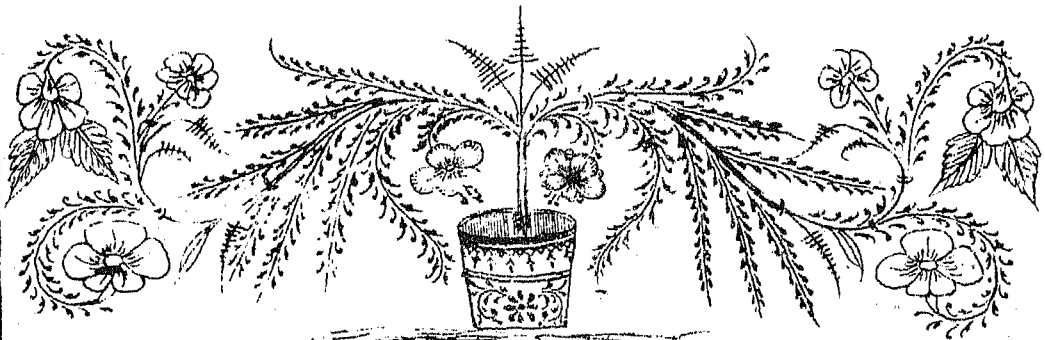
اس ضرورت کا احساس عام طور پر ہو گیا ہے کہ مسلمان اپنی پچھلی حالت پر نہیں پہونچ سکتے۔ جب تک کہ اُن کی عورتوں کو تعلیمیافتہ نہ بنایا جاوے۔ اسی لیئے نئی روشنی کے جوان ہمہ تن کوشش میں ہیں کہ ہماری عورتیں بھی یورپ کی طرح خوب جی لگا کر لکھنا پڑھنا سیکھیں۔ اور عیسائی لیڈیوں کی طرح کھُلّم کھُلّا بازاروں میں گشت لگائیں۔ لیکن ہمارے نوجوان یورپ کی ترقی دیکھکر ان کی تقلید کرنا چاہتے ہیں، اگر اُن کو اپنی قدیمی ترقی کے اسباب معلوم ہو جاتے تو وہ ہرگز اس بیہودہ خیال پر توجہ نہ کرتے۔

لازم ہے کہ وہ اپنے اُن بزرگوں کے حالات دیکھیں جن کے طفیل آج ہندوستان میں ہماری صورتیں نظر آتی ہیں ❊

حضرت خواجہ معین الدین حسن اجمیری چشتی رحمۃ اللہ علیہ کے اسم گرامی سے ایسا کون سا ہندوستانی ہے جو نا واقف ہو آپ کے والد سید غیاث الدین حسن سنجری نے رحلت فرمائی ہے۔ تو آپ کا سن شریف پندرہ برس کا تھا اور یہ وہ عمر ہوتی ہے کہ اس میں آج کل کے صاحب پدر لڑکے بھی آوارہ ہو جاتے ہیں۔ مگر آپ کی والدہ حضرت بی بی "خاصۃ الملکہ" نے آپ کی اس قابلیت سے تعلیم و تربیت فرمائی کہ آپ کا نام غلغلہ مچ گیا۔ ہندوستان جیسے اجنبی ملک میں مُسلمانوں کا جھنڈا اسی دُرِّ یتیم کے صدقے سے نظر آتا ہے۔ خیال کیا جائے۔ اگر حضرت خواجہ کی والدہ تعلیمیافتہ نہ ہوتیں، تو کیا اس نونہال کی یہ مشہور سرسبزی ممکن تھی۔؟ آپ ہی کے خلیفہ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی دہلوی ماں کی گود میں تھے کوئی ڈیڑھ برس کی عمر تھی، کہ آپ کے پدر بزرگوار خواجہ کمال الدین حسن کا وصال ہو گیا۔ آپ کی والدہ حضرت بی بی صالحہ نے پرورش کی۔ اور جب سن شریف چار سال چار ماہ چار یوم کا ہوا تو مکتب میں تحصیل علم کے لیئے بٹھا دیا۔ آپ نے قرآن

شریف کے پندرہ پارے اس سہولیت سے پڑھ لیئے کہ اُستاد حیران رہ گئے۔ دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ یہ اپنی والدہ سے جو حافظ قرآن تھیں اکثر یہ پارے پڑھتے سُنا کرتے تھے۔ چونکہ ذہن بہت اچھا تھا۔ ان الفاظ نے پہلے ہی جگہ پکڑ لی تھی۔ اب تعلیم کے وقت کچھ دشواری نہ ہوئی +

بی بی صالحہ نے اس قطب زمانہ کو جس علم سے تربیت کی تھی۔ اب وہی ہماری عورتوں کو بھی سکھایا جاوے۔ تاکہ اُن کے بچے بھی اسی طرح لایق و فائق بنیں +

حضرت محبوب الٰہی خواجہ نظام الدین اولیاؒ بھی اپنے والد ماجد حضرت مولانا سید احمد صاحب کی وفات کے وقت پانچ برس کے تھے۔ آپ کی مادر محترمہ حضرت بی بی زلیخا نے تعلیم کے فرض کو اس خوبصورتی سے ادا کیا کہ آج اُن کا قرۃ العین خدا کے محبوب کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ سولہ برس کے سن تک محبوب الٰہیؒ تمام علوم سے فارغ ہو گئے۔ یہ بی بی صاحبہ کی تعلیم کا اثر تھا۔ کہ آپ کو بچپن میں صبر و قناعت سے محبت ہو گئی تھی۔ چنانچہ خود فرماتے ہیں کہ جس دن ہمارے گھر میں فاقہ ہوتا والدہ صاحبہ فرماتیں "بابا نظام آج ہم خدا کے مہمان ہیں" یعنی آج گھر میں کھانے کو نہیں ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ مجھ کو والدہ صاحبہ کا یہ فقرہ بہت ہی مزہ دیتا تھا۔ اور جب کبھی ایسا ہوتا کہ متواتر کئی روز تک کھانے کو ملے جاتا تو میں دل ہی دل میں کہتا کہ "الٰہی وہ دن کب آئے گا کہ والدہ یہ فرمائیں کہ" بابا نظام آج ہم خدا کے مہمان ہیں"

بھلا یوروپ میں کسی غریب اور مفلس بچہ کی ایک بھی ایسی ماں ہے کہ جس کا بچہ ناداری سے مکدر نہ ہوتا ہو + بلکہ اُلٹا خوش اور مگن رہتا ہو۔ نہیں۔ بلکہ وہاں تو طمع و حرص و اسراف کا سب سے پہلا سبق دیا جاتا ہے۔ تو کیا انہی عادات کے اختیار کرنے کے لیئے مسلمان اُن کی عورتوں کی تقلید کرنی چاہتے ہیں۔

مسلمانوں کو ان مذکورہ خواتین کی حالت پر غور کرنا چاہیئے۔ کہ اُنھوں نے کس علم کی بدولت اس قسم کی قابلیت اور شائستگی حاصل کی؟ نہ پردہ دری سے۔ نہ کسی غیر زبان کے یاد کرنے سے۔ نہ کسی ترقی یافتہ قوم کی طرز معاشرت سیکھنے سے۔ بلکہ محض اپنے کامل مکمل دین کے تعلیم کی بدولت۔ جس کو وہ پوری حد تک حاصل کرتی تھیں۔

اب بھی اگر مسلمان لڑکیوں کو زمانہ کی حالت کا لحاظ رکھکر تعلیم مذہبی دی جاوے تو وہ اور اُن کی آئندہ نسلیں پہلی سی ترقی حاصل کر سکتی ہیں۔ کیونکہ اسلام سب کے نزدیک ظاہر و باطن کے دُرست کرنے کے لیئے ایک مکمل مذہب ہے۔

ایک ہی اور کچھ نہیں

(از خاتون جولائی ۱۹۰۷ء)

اچھی اّبا۔ یہ سختی کے دن کب جائیں گے۔ بے فکری کی نیند بھی کبھی میسر آئے گی۔ یا یوں ہی ڈر اور خوف سے راتیں آنکھوں میں کٹینگی چچا عالمگیر ہم کو کیوں ستاتے ہیں۔ خدا بھی ہماری مدد نہیں کرتا۔ اُس نے بھی حق کا ساتھ چھوڑ دیا۔ دُنیا گواہی دیتی ہے کہ تخت دارا کا تاج دارا کا اور دین کے قاعدے کے موافق بھی آپ ہی تاج و تخت کے اصلی وارث ہیں۔ مگر میں دیکھتی ہوں کہ کامیابی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ زمین و آسمان دشمن ہیں۔ گھر سے بے گھر، جنگلوں میں بسیرا لیتے پھرتے ہیں۔ جب بھی لوگوں کو چین نہیں اور ہم کو

جڑ بنیاد سے فنا کرنے کی ترکیبیں سوچی جا رہی ہیں ۔ جواب دیا گیا :-

دارا کی جان دل آرا ! جو باتیں کل شام کو ہم نے بیان کی تھیں شاید تم نے اُن کو ذہن سے اُتار دیا۔ بیٹی اسی زیردستی اور زبردستی کا نام دُنیا ہے ۔ یہی ناکامی اور کامیابی ہے جس کے چکّر میں تمام عالم گرفتار ہے۔ یہ نہ ہو تو ساری دُنیا بے مزہ ہو جائے ۔ اسی اُلٹ پھیر سے یہ کارخانہ چل رہا ہے ۔ بھائی اورنگ زیب کا کوئی قصور نہیں ۔ نہ خدا اور زمانے کی کوئی شکایت ۔ قدرت کا دستور ہے کہ ایک بادشاہی کا تاج پہنتا ہے ۔ دوسرا سولی دیا جاتا ہے ۔ ایک پاؤں پھیلا کر بے فکری سے سوتا ہے ۔ دوسرا پلک جھپکنے کو ترستا رہ جاتا ہے ۔ لیکن پیاری اس کی خوشی اور اُس کا غم دونوں فانی ہیں ۔ قرار ایک کو نہیں ۔ بلکہ ذرا اور غور کرو تو معلوم ہوگا کہ خوشی و رنج فقط وہم و خیال ہے ۔ خیال قابو میں ہو تو کیسی ہی سخت مصیبت پیش آئے انسان اُس کو ہیچ سمجھتا ہے اور اُس کو کسی قسم کی تکلیف نہیں ہوتی ۔ جو باتیں آج کل ہم کو پیش آ رہی ہیں ۔ وہ بھی ایک طرح کی خدمت ہے ۔ جو خدا تعالیٰ کی طرف سے انسان کو دیجاتی ہے ۔ جس طرح ایک آدمی بادشاہ بنایا جاتا ہے اور اُس کے ذمّے حکومت کے فرائض لگائے جاتے ہیں ۔ اسی طرح ایک غریب کو بھی غربت کی خدمت سپرد کی جاتی ہے ۔ بادشاہ کو دولت کی شان سے اپنے کام عمدگی سے پورے کرنے چاہئیں اور غریب کو غریبی کی حیثیت سے اس خدائی نوکری کو بجا لانا چاہیئے ۔

بھائی اورنگ زیب سے میں اتنا بھی مقابلہ نہ کرتا جتنا کیا ۔ دیکھنا صرف یہ تھا کہ آیا واقعی قدرت نے اُس کی بادشاہت قبول کر لی ہے یا نہیں ۔ اب معلوم ہوتا ہے کہ بے شک خدا تعالیٰ اُس کی حکومت اور میری غربت چاہتا ہے ۔ یہ ہے تو میں ہر طرح راضی ہوں اور نگ زیب جس طرح چاہے ستائے ۔ ہماری سرکوبی اور بیخکنی کی جیسی چاہے تدبیریں کرے ۔ اُس کے لیئے یہی شایاں ہے ۔ کیونکہ اُس کو شاہی طرز کی نوکری پوری کرنی ہے ۔ ہم کو سب سختیاں برداشت کرنی چاہئیں ۔ کیونکہ ہمارے ذمہ غربت بے کسی لاچاری اور ہر طرح کی مصیبت لگائی گئی ہے ۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم سہیں ۔

داراشکوہ کی یہ تقریر سُنکر اُس کی بیٹی دل آرا بولی :-

یا اللہ ۔ دل میں اور خلجان پیدا ہوا ۔ آپ روز سمجھاتے ہیں ۔ مگر مجھ بے وقوف کی عقل میں نہیں آتا ۔ پرسوں آپ نے فرمایا تھا کہ ایک ہے اور کچھ نہیں ۔ یعنی جو چیز آنکھوں کو نظر آتی ہے ۔ اور جن چیزوں کی صورت خیال کرنے سے ذہن میں جمتی ہے ۔ سب کی حقیقت ایک ہے ۔ شکلیں الگ الگ ہیں ۔ جیسے مٹّی کے برتن ۔ ایک مٹکا ہے ۔ تو ایک آبخورہ ۔ ایک کونڈا ہے اور ایک چینی ۔ نام الگ الگ کام الگ الگ ۔ شکل و صورت الگ الگ مگر مٹّی سب کی ایک ۔ یا مثلاً ایک ڈورا ہے ۔ جس میں کئی گرہیں لگی ہوئی ہیں ۔ غور کرو تو معلوم ہوگا کہ گرہ ایک اُبھری ہوئی صورت کا نام ہے ۔ مگر اصل اس کا ڈورا ہے ۔ جو لپٹ کر گرہ بن گیا ہے ۔ پہلی چیز جو مسلمان بچّہ کو سکھائی جاتی ہے وہ کلمہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللہِ ہے ۔ جس کے معنی عام طور پر یہ تبلائے جاتے ہیں کہ ایک خدا کے سوا دوسرا نہیں ۔ اور محمدؐ اُس کے رسول ہیں ۔ مگر حقیقت میں یہ کلمہ ہی تمام دین و دُنیا کی بُنیاد بتا دیتا ہے ۔ اگر اس کے معنی یوں سمجھائے جائیں کہ ایک خدا کے سوا کچھ نہیں ۔ یا لفظی معنی کہ نہیں ہے کچھ مگر خدا ۔ اور محمدؐ اُس کے رسول ہیں ۔ ابّا جان یہ تعلیم میں نے اپنے اُستاد مولوی صاحب سے بیان کی تھی ۔ وہ یہ سُنکر بہت ناراض ہوئے اور فرمایا کہ یہ شرک کی باتیں ہیں ۔ ان میں پڑ کر آدمی کافر ہو جاتا ہے ۔ داراشکوہ نے ہندوؤں کی صحبت اور اُن کی کتابوں کے پڑھنے سے یہ باتیں سیکھی ہیں ۔ دینِ اسلام کو ان سے کوئی تعلق نہیں ۔ اسلام تو یہ سکھاتا ہے کہ خدا ایک ہے ۔ اور سب مخلوقات اُس نے بنائی ہے ۔ مگر ان باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ سب کچھ خدا ہے ۔ درخت بھی خدا ۔ اور جانور و آسمان و زمین بھی خدا ۔ توبہ توبہ بالکل کفر کے کلمے ہیں ۔ سو حضرت اوّل تو میں پرسوں

کی باتوں میں اُلجھی ہوئی تھی۔ آج آپ نے یہ اور نئی باتیں سُنائیں کہ مصیبت بھی ایک نوکری ہی جس کو خوشی خوشی بجالانا چاہیئے۔ پرسوں کی باتوں کی نسبت مولوی صاحب کہتے ہیں کہ قرآن شریف میں اس کا کہیں ذکر نہیں۔ یہ ہندوؤں کی ویدانت کا مسئلہ ہی جس کو مسلمانوں میں صوفیوں کا گروہ بھی ان کا دیکھی دیکھی ماننے لگا۔ اور آج کی تقریر سُنکر تو میں پیشگی حکم لگاتی ہوں۔ کہ مولوی صاحب اس کو بالکل مسلمانی کے خلاف بیان کریں گے۔ اور سچی بات یہ ہی کہ میرے جی کو بھی مولوی صاحب کی باتیں لگتی معلوم ہوتی ہیں۔ بھلا جس کا ذکر قرآن شریف میں نہ ہو وہ ہم کس طرح مان لیں۔ اور بات بھی ایسی کہ سب چیز خدا ہے +

الٰہی تیری پناہ! دل آرا کی شگفتہ باتیں سُن کر دارا شکوہ کو جوش آگیا۔ مگر وہ جوش خفگی و ناراضگی کا نہ تھا۔ بلکہ جس طرح کوئی آدمی جانی پہچانی چیز کا انکار کسی نادان کی زبانی سُن کر افسوس کے جوش میں آجاتا ہی۔ ایسے ہی دارا کے چہرے پر جوش کے آثار نمایاں ہوگئے۔ اور نہایت بے پروائی سے بولا۔ دیوانی۔ اس چیز کے وجود پر شبہ کرتی ہی جو سورج کی طرح ظاہر ہے۔ مولوی صاحب کی ناسمجھی ہے جو قرآن شریف کو اس تعلیم سے خالی بتاتے ہیں۔ اری نادان قرآن کے دل میں اُنہیں باتوں کا خزانہ ہی۔ ظاہری الفاظ پر عمل کرنا بیکار ہے۔ اصلی معانی پر غور کرنا چاہیئے۔ قرآن شریف میں جگہ جگہ پایا جاتا ہے۔ وہ سب پر محیط ہے۔ وہ اوّل ہے۔ آخر ہے۔ ظاہر ہے۔ باطن ہے۔ نیچے ہے اوپر ہے۔ اس کے بہت سے نام ہیں۔ مگر جس طرح قرآن شریف میں ارشاد ہی کہ ہدایت اُنھیں کو ہی جو غور کرتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ لوگ غور نہیں کرتے۔ بیشک ویدانت کے بھی یہی اُصول ہیں۔ لیکن اسلام کی تعلیم اگر اُس کے موافق ہے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ میں نے کب کہا تھا کہ ہر چیز کو خدا کہنا چاہیئے۔ وہ تو میری مثال سے خیال میں آسکتا ہے۔ کہ جب تک آبخورہ اپنی صورت پر اور مٹکا اپنی شکل پر قایم ہے اُس کو مٹی نہیں کہہ سکتے۔ یا جب تک ڈورے میں گرہ ہے گرہ نام رہیگا ڈورا نہیں کہا جائے گا۔ لیکن سمجھنا یونہی چاہیئے کہ حقیقت سب کی ایک ہے +

رہی دوسری بات کہ رنج و راحت آدمی کے فرائض ہیں۔ یہ بھی تعجب کی بات نہیں ہی۔ جب ہم نے یہ مان لیا کہ ایک ہی اور کچھ نہیں یعنی جو کچھ ہے سب خدا کا ظہورا ہے۔ تو کہیں اُس کی شانِ کرم ظاہر ہے۔ اور کہیں شانِ غضب۔ ایک کانٹے دار درخت جسمیں پھول پھل نہیں آتے۔ شکایت کرے کہ دوسرے درخت میں پھول بھی خوبصورت ہیں اور پھل بھی مزے دار ہیں مجھے اس سے کیوں محروم کیا گیا تو ہم یہی جواب دیں گے کہ تجھ کو وہ میسّر ہے جو پھولدار بیلدار درخت کو نصیب نہیں۔ جو شان تجھ میں ہی وہ اُس میں نہیں۔ جو اُس میں ہے وہ تجھ میں نہیں۔ پھر شکوہ کرنا لاحاصل ہے۔ دل آرا! یہ ایسی اچھی تعلیم ہی کہ اگر انسان اس کو خوب سمجھکر ذہن نشین کرلے تو دُنیا کے عیش و راحت اور رنج و غم کے جھگڑوں سے آزاد ہو جاتا ہے۔ دُنیا کا ترک اسی کا نام ہے کہ اُس کے اُتار چڑھاؤ کی تکلیف جاتی رہے۔ یہ نہیں کہ انسان مال و دولت۔ جورو بچے چھوڑ بیٹھے۔ سو پیاری جب میں اپنے بھائی کے برتاؤ کا شاکی نہیں تو تُو کیوں شکایت کرتی ہے۔ بس ہر وقت اس خیال میں غرق رہ کہ "ایک ہے اور کچھ نہیں"

(از نظام المشائخ جولائی ۱۹۰۹ء)

دعا مذہبی زندگی کی جان ہے اہلِ مذہب کے نزدیک مذہب کی عملی صورت کا ظہور بہت کچھ دعا پر منحصر ہے۔ دعا سے مطلوب کا حاصل ہونا اور پیغمبرانِ الٰہی کا خاص خاص مطالب کے لیئے دعا مانگنا اور اُس کا قبول ہونا آسمانی کتابوں سے ثابت ہے +

اسلام میں دعا کا مرتبہ ضروری اور اہم عقائد میں شمار کیا جاتا ہے۔ مسئلۂ ذات و صفات اور فطرۃ اور قوانین فطرۃ کی طرح یہ مسئلہ بھی نہایت دقیق ہے۔ اور اس کی نسبت صدہا مختلف رائیں اور جداگانہ اقوال بزرگان اسلام کی کتابوں میں پائے جاتے ہیں۔ قرآن شریف میں ارشاد ہے وَ اِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ اُجِیْبُ دَعْوَۃَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ۔ یعنی "اور جب تم سے میرا بندہ مجھ کو طلب کرے (تو کہدو) کہ میں اُس کے قریب ہوں۔ قبول کرتا ہوں دعا کرنے والے کا سوال جبکہ وہ مجھ سے مانگے"۔ دوسری جگہ فرمایا اُدْعُوْا رَبَّکُمْ تَضَرُّعًا وَّ خُفْیَۃً۔ دعا کرو اپنے پروردگار سے پوشیدگی اور عاجزی کے ساتھ" اور فرمایا۔ اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ۔ مجھ سے مانگو میں قبول کروں گا +

دعا چونکہ تمام رسولوں کا ورثہ ہے۔ جو اُمتِ مرحومہ کو عطا ہوا اور جس میں خدا تعالیٰ نے اعجازِ رسالت کی شان باقی رکھی ہے۔ اس لیئے بعض لوگوں کو دعا کے معاملہ میں بڑا اختلاف ہے۔ ایک فرقہ دعا کی تاثیر کا بالکل منکر ہے۔ دوسرا اس کے اثر کو خیالی بیان کرتا ہے اور کہتا ہے کہ قرآن شریف کی اس آیت ادعونی استجب لکم کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تم جو کچھ دعا میں مانگو قبول کیا جائے گا۔ کیونکہ اس میں دو دشواریاں پیش آتی ہیں۔ اوّل یہ کہ ہزاروں دعائیں نہایت عاجزی اور خلوص سے کی جاتی ہیں۔ مگر سوال پورا نہیں ہوتا جس کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ دعا قبول نہ ہوئی۔ حالانکہ خدا نے استجابت کا وعدہ فرمایا ہے۔ دوسری یہ کہ جو اُمور ہونے والے ہیں وہ مقدر ہیں اور جو نہیں ہونے والے وہ بھی مقدر ہیں۔ ان مقدرات کے برخلاف ہرگز نہیں ہو سکتا۔ پس استجابت دعا کے معنی سوال کا پورا کرنا قرار دیئے جائیں تو خدا کا یہ دعوہ کہ ادعونی استجب لکم ان سوالوں پر جن کا ہونا مقدر نہیں ہے صادق نہیں آسکتا یعنی ان معنوں کی رو سے یہ عام وعدہ استجابت دعا کا باطل ٹھیریگا۔ کیونکہ سوالوں کا وہی حصہ پورا کیا جاتا ہے۔ جس کا پورا کرنا مقدر ہے لیکن استجابت دعا کا وعدہ عام ہے۔ جس میں کوئی بھی استثنا نہیں۔ پھر جس حالت میں بعض آیتیں ظاہر کر رہی ہیں کہ جن چیزوں کا دیا جانا مقدر نہیں وہ ہرگز نہیں دی جاتیں۔ لہذا استجابت دعا کے یہ معنی لینے چاہئیں کہ دعا ایک عبادت ہے اور جب وہ قلبی خشوع و خضوع سے کی جائے تو اُس کے قبول کرنے کا خدائے تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے۔ گویا دعا عبادت متصور ہو کر عطائے ثواب کا مستحق بناتی ہے۔ اور کسی خاص مسئول عنہ کے حصول سے اُسے اسی حد تک تعلق ہے کہ مسئول داعی کی نصیب میں مقدر بھی ہو۔ اس قاعدہ سے دعا کا اثر بے کار ہو جاتا ہے۔ کیونکہ جو چیز دعا میں مانگی گئی تھی وہ مل تو گئی مگر اُس کو تاثیر دعا سے کچھ لگاؤ نہیں۔ تقدیر کی خوبی سے یہ نتیجہ ظاہر ہوا۔ دعا کا صرف یہ فائدہ ہے کہ دعا کرنے کے وقت خدا کی عظمت اور بے انتہا قدرت کا خیال دل میں جم جاتا ہے تو خیالات کی لہریں بھی جمع ہو کر ایک مرکز پر ٹھیر جاتی ہیں۔ اور انسان کی پریشانی و گھبراہٹ جو کسی خاص فکر سے پیدا ہوئی ہو مغلوب ہو کر صبر و استقلال سے بدل جاتی ہے۔ اور استقلال کی کیفیت کا دل میں ہونا عبادت کے لیئے لازمی امر ہے پس یہی دعا کا مستجاب ہونا ہے +

دوسرا فریق دعا کی قبولیت پر پورا ایمان رکھتا ہے۔ اُس کے نزدیک دعا کا نتیجہ ضرور حاصل ہوتا ہے۔ اور وہ مذکورۂ اعتراض کے جواب میں کہتا ہے کہ دُنیا میں کوئی خیر و شر مقدر سے خالی نہیں۔ تاہم قدرت نے اس کے حصول کے لیئے لیسے اسباب مقرر کر رکھے ہیں جن کے صحیح اور مؤثر ہونے میں کسی عقلمند کو کلام نہیں۔ پہلے فرقہ نے دعا اور ترک دعا میں جس تقدیر کا ذکر کیا وہ تقدیر دوا میں بھی تو موجود ہے۔ مگر سب دیکھتے ہیں کہ دوا کے اثر کو ایسا یقینی مانا جاتا ہے کہ تقدیر کا خیال بھی نہیں آتا۔ اور دوا سے دوری مرض کا نتیجہ یقین ہوتا ہے۔ جسمانی معاملات میں تو تقدیر کا لحاظ نہ کیا جائے اور روحانی مسئلہ میں تقدیر کو شامل کر کے تاثیر دعا کا انکار کر دیا جائے۔ یہ کسی طرح قرینِ انصاف نہیں ہو سکتا +

ادعونی استجب لکم میں بیشک دعا سے عبادت مراد ہے۔ چنانچہ نعمان بن بشیر سے روایت ہے کہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ان الدعاء ھو العبادۃ ثم قراء ادعونی استجب لکم۔ یعنی فرمایا۔ دعا عبادت ہے۔ اس کے بعد آیت ادعونی استجب لکم تلاوت فرمائی۔ جس سے معلوم ہوا کہ اس آیت میں دعا سے مراد عبادت ہے۔ اس کے علاوہ یہاں دعا کی تعلیم امر کی صیغہ سے کی گئی ہے گویا دعا کو فرض کر دیا گیا ہے حالانکہ دعا انسان پر فرض نہیں ہے پس معلوم یہ ہوا کہ اس آیت میں دعا سے عبادت ہی مقصود ہے لہٰذا جو فریق استجابت دعا کے یقینی ہونے کو اس آیت سے نکالکر مسئلۂ تقدیر کے ذریعہ سے اشکال پیدا کرتا ہے اُس کو معلوم ہونا چاہیئے کہ یہ آیت عبادت کے متعلق ہے۔

ہاں اس کے علاوہ اور کئی آیتیں ہیں جن سے قبولیت دعا ثابت ہوتی ہے۔ بلکہ ایک آیت میں تو گویا صاف صاف انہیں شکوک کا جواب دیا گیا ہے۔ جو سورۂ انعام میں ہے۔ بَلْ اِیَّاہُ تَدْعُوْنَ فَیَکْشِفُ مَا تَدْعُوْنَ اِلَیْہِ اِنْ شَاءَ تم خاص اُسی سے دعا مانگتے ہو تو وہ دیدیتا ہے۔ تمہارے مطلوب کو اگر چاہے۔ یہاں تقدیر کا صاف طور سے ذکر کر دیا گیا ہے۔ مگر دنیا میں کوئی چیز تقدیر سے خالی نہیں۔ آگ جلا دیتی ہے۔ پانی ڈبو دیتا ہے۔ ان تاثیرات سے کسی کو انکار نہیں۔ مگر اثر تقدیر کے وقت ظاہر ہوتا ہے۔ ایسے ہی دعا بھی آگ کی طرح یقینی اثر دار چیز ہے۔ دواؤں کی مثل خدا نے اس میں تاثیر پیدا کی ہے مگر جس طرح تقدیری گردش کے سبب باوجود دوا استعمال کرنے کے مریض کو فائدہ نہیں ہوتا۔ دعا کا نتیجہ بھی ظاہر نہیں ہوتا۔

آج کل نئی روشنی کے مسلمانوں میں یورپ کی تقلید کے سبب دعا سے بے توجہی ہوتی جاتی ہے۔ اور وہ اس کو ایک فعل عبث خیال کرنے لگے ہیں۔ اور یہی سبب ہے کہ ان کے دل کو مصیبت کے وقت تسلی و تسکین کسی صورت سے میسّر نہیں آتی۔ کیونکہ دعا کا مانگنا صرف اس یقین پر مبنی ہے کہ خدا تعالیٰ قادر مطلق اور فاعل مختار ہے۔ بیقرار دل کی نکلی ہوئی دعا کا سُننے والا اور اس کی حاجت پوری کرنے والا ہے اگر ایک لحظہ کے لیئے اس یقین میں تذبذب ہو تو کون سا دل ہو گا جو بیقراری کی حالت میں اس کی طرف رجوع کرے اور وہ کون سا خیال ہو گا جو اس کے اضطرار کی آگ کو ٹھنڈا کرے۔ اس لیئے کہ صرف یہ خیال کہ دعائیں سُننے اور حاجت پوری کرنے کی قدرت رکھتا ہے اضطرار کی حالت میں بندہ کا خیال خدا کی طرف رجوع کراتا ہے۔ اور محض اس اعتقاد سے کہ باوجود قدرت کے خدا کا دعا قبول نہ کرنا کسی مصلحت پر مبنی ہو گا اور وہ مسئول عنہ سے بہتر کوئی چیز دے گا۔ دعا کرنے والے کے دل کو تسلی ہوتی ہے۔ اگر دعا کا عمل موقوف ہو گیا اور خدا سے دعاؤں کے سُننے اور حاجتوں کے پورا کرنے کا خدائی حق لے لیا گیا تو مذہبی زندگی بھی ختم ہو گئی۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ دعا ذریعہ حصولِ مقصد نہیں ہے اور یہ بھی سمجھ لیا جائے کہ وہ اپنے بندوں کی مصیبتوں کے دور کرنے کی قدرت نہیں رکھتا اور نہ کسی کی گریہ وزاری اور اضطرار و بے قراری کا اثر ہوتا ہے تو دعا بیکار اور توکّل فضول ہے۔ پھر یقین اور اعتقاد کو بھی اپنے قدم جمانے کے لیئے کوئی جگہ نہیں رہتی۔ اور بندہ کو بجز اس کے کہ وہ غیر تغیّر پذیر قوانین فطرت کو اپنا خدا مانے دوسرا کوئی چارہ نہیں رہتا۔ ایسی حالت میں انسان کو بے جان قانون سے واسطہ رہتا ہے اور ایک زندہ خدا سے۔ اور یہ خیال اُس محبّت کے رشتے کو جو خدا اور اُس کے بندوں کے بیچ میں ہے توڑ دیتا ہے۔ اگر اُس میں مدد کرنے کی طاقت نہیں ہے تو ہم کس لیے اُس پر بھروسہ کریں۔ اور اگر وہ ہماری دعائیں نہیں سُنتا تو ہم کیونکر اُسے رحیم مانیں۔ اور اگر اُس میں رحم نہیں تو ہم کیوں اُس سے محبّت کریں۔ پس اس عقیدہ سے ہمارا یقین جاتا رہتا ہے۔ ہم کو خدا سے محبت باقی نہیں رہتی اور ہم ایسے مذہب کے ماننے والے رہ جاتے ہیں جس میں نہ یقین ہے نہ محبت۔ لہٰذا اگر دعا کی اجابت ناممکن ہے۔ تو مذہب بھی ناممکن ہے۔

صوفیۂ کرام کے تمام سلسلے اجابت دعا کے قائل ہیں اور صرف قائل ہی نہیں ہیں بلکہ ان کو خدا کی طرف سے تاثیرات دعا کا وہ مرتبہ عطا ہوا ہے جو بنی اسرائیل کے پیغمبروں کو حاصل تھا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے کہ نبوت کے آثار میں اس اُمت کو مقبول دعا دی گئی ہے یعنی جس طرح اگلے زمانہ کے پیغمبر دعا کے ذریعہ سے اپنے اعجاز دکھاتے تھے۔ ہمارے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اُمت کے اولیا اسی دعا سے کرامتیں دکھانے پر قادر بنائے گئے ہیں۔ آیندہ پرچہ میں خدا نے چاہا تو ہم ثابت کریں گے کہ صوفیوں کے مختلف خاندانوں کے مشایخ کی دعا کی کیا کیا تاثیریں ظاہر ہوئی ہیں چشتیوں۔ قادریوں۔ نقشبندیوں۔ سہروردیوں وغیرہ کل سلسلوں کے بزرگوں نے اپنی ذات اور قوم کے لئے دعائیں کی ہیں اور اگر ہر دعا کے الفاظ علیحدہ علیحدہ نظر تعمق سے دیکھے جائیں تو صاحب دعا بزرگ کی باطنی کیفیت اندرونی احساس اور جذبہ کا حال معلوم ہو جاتا ہے یہاں اُن کی تفصیل کی گنجایش نہیں ہے۔ پھر کبھی اس کو وضاحت سے لکھا جائے گا +

اب یہ بات ثابت کرنے کے بعد کہ دعا میں تاثیر ہے اور دعا ہمارے صوفیۂ کرام کے کُل فرقوں کی مسلّمہ چیز ہے اس رسالہ کا شروع (جو صوفیوں کی دینی و دُنیاوی اغراض کی خدمت گزاری کے لیئے جاری کیا جاتا ہے) اور جس کا یہ آج پہلا پارہ نمودار ہوتا ہے) دعا کرتے ہیں یقین ہے کہ جس طرح خدائے تعالےٰ نے صوفیائے کرام کی دعاؤں میں تاثیر عطا فرماکے اُن کو ہمیشہ مقبول فرمایا اسی طرح اُن کا یہ ہمارا رسالہ بھی اپنی دعا کے ذریعہ سے بارگاہِ الٰہی میں قبول ہوگا اور اپنے ابنائے جنس کو فائدہ پہونچائے گا +

"گلیم دُرویشی کی تنگی"

اور

ایک المناک فسانہ

از نظام المشایخ ۱۹۰۹ء

اگلے وقتوں میں کہا کرتے تھے کہ دو بادشاہ ایک اقلیم میں نہیں رہ سکتے۔ مگر دس درویش ایک کمبل میں بسر کر سکتے ہیں آجکل اسکے خلاف پایا جاتا ہے۔ بادشاہت کا تو یہ عالم ہوگیا کہ ہر فرد واحد اپنے تئیں ملک کا حاکم سمجھتا ہے۔ جس سے ایک اقلیم میں کروڑوں بادشاہ نظر آتے ہیں۔ اور درویشوں کی یہ کیفیت ہوگئی کہ ایک گلیم میں دس تو کجا دو درویش بھی نہیں سما سکتے۔ قادری ہوں یا نقشبندی۔ چشتی ہوں یا سہروردی سب ایک تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ اُصول کے لحاظ سے ان میں کوئی بیّن فرق یا تفاوت نہیں ہے۔ فروعات ہر مشرب کی علیحدہ ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ فروعات کے جھگڑوں سے ان سلسلوں میں ایسی اجنبیت اور غیریت قایم ہوگئی ہے کہ باہم ایک دوسرے سے جُدا نظر آتا ہے سب سے پہلے تفریق حد سے زیادہ محبّت کرنے سے پیدا ہوئی یعنی اپنے سلسلہ کے مشایخ سے جب مُریدین کو تعلق بڑھا۔ تو اُنھوں نے اُس کو اتنا بڑھایا کہ اور تمام مشایخ کو پست کر دیا۔ یہ کیفیت دیکھکر دیگر مشایخ کے متوسّلین نے بھی اپنے بزرگوں کو ناجائز طور سے دوسروں پر ترجیح اور فوقیت دینی شروع کی۔ اور اس طرح درویشی خاندانوں میں نفسانی کشمکش شروع ہوگئی سب سے پہلے قادری سلسلہ سے لوگوں کو شکایت پیدا ہوئی کہ یہ لوگ حضرت غوث الاعظم محبوب سبحانی رضہ کو تمام مشایخ عالم پر ترجیح دیتے ہیں اور حضرت

غوث الثقلین رح کا یہ قول کہ قدمی ھذہ علیٰ رقبۃ کلّ ولیّ اللّٰہ (یعنی یہ میرا قدم سب ولیوں کی گردن پر ہے) اس شدّ ومدّ سے بیان کرتے ہیں جس سے دوسرے خاندان والے بتقاضائے بشریت مشتعل ہوں۔ اس کے بعد چشتیہ طریق کی آزادی اور نقشبندیہ طریق کی محدود خیالی کی نسبت لوگوں کو شکایت پیدا ہوئی۔ خود چشتیہ خاندان میں کئی شاخیں ہوگئیں۔ نظامی۔ صابری۔ جمالی۔ اور ان شاخوں میں بھی وہی فضیلت کے جھگڑے برپا ہوگئے۔ نظامی کہتے ہیں کہ حضرت بابا گنج شکر رح کے اصلی جانشین اور خلیفۂ اعظم حضرت خواجہ نظام الدین اولیا محبوب الٰہی رح ہوئے۔ صابری کہتے ہیں کہ تمام باطنی اُمور کا حصّہ حضرت مخدوم صابر رح کو ملا۔ جمالی کہتے ہیں کہ جو نظر خاص حضرت بابا صاحب کی حضرت قطب جمال الدین ہانسوی رح پر تھی وہ کسی اور کو میسّر نہ ہوئی۔ نقشبندیوں میں بھی مجدّدیہ شاخ کے دعوے تمام خاندان سے نرالے ہوگئے۔ حضرت شیخ احمد مجدد سرہندی رح کے ایسے عجیب غریب عوے اور اُن کے ایسے فضائل بیان کیے جاتے ہیں جو تمام متقدمین مشائخ نقشبندیہ سے مجدد صاحب کو بڑھا دیتے ہیں۔

الغرض نہایت سخت کشمکش ہیں سلسلوں میں معمولی باتوں کے سبب پڑی ہوئی ہے جس قدر ذکر کیا گیا یہ سب محبت یا علم سے متعلق ہے۔ ہر شخص اپنے بزرگ اور اپنے شیخ کو سب سے بڑھکر سمجھتا ہے **یہ کوئی شکایت کی بات نہیں ہے**۔ افسوس صرف اس بات کا ہے کہ اس ولولے میں دوسرے بزرگوں کی تحقیر اور تنقیص کی جاتی ہے۔ ہم نے بارہا دیکھا ہے کہ جہاں دو شخص جمع ہوتے ہیں اور ان میں ایک چشتی ہوتا ہے اور ایک قادری۔ تو وہ بجائے اس کے کہ کسی مسئلۂ تصوف پر بات چیت کریں فضیلت حضرت غوث الاعظم رح اور حضرت خواجۂ خواجگان اجمیری رح پر گفتگو کرتے ہیں۔ ایک کہتا ہے کہ حضرت غوث الاعظم رح سے حضرت خواجۂ بزرگ رح نے فیض پایا۔ دوسرا کہتا ہے نہیں بلکہ حضرت غوث الاعظم رح حضرت خواجۂ بزرگ سے فیضیاب ہوئے۔ ان فضول باتوں کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ وہ دونوں بزرگوں کی شان میں بےادبی اور گستاخی کرنے لگتے ہیں اور اُس نعمت سے محروم ہوجاتے ہیں جو ادب اور تعظیم سے حاصل ہوا کرتی ہے۔

ہم کو بڑا افسوس ہوتا ہے جب ہم سماع کی محفلوں میں حضرت صابر صاحب کا نام قوّال کی زبان سے سُنکر نظامی درویشوں کو یہ نام لینے سے منع کرتے ہوئے پاتے ہیں۔ ایسے ہی صابری محفل میں حضرت محبوب الٰہی رح کا نام لینے سے قوّال کو روکا جاتا ہے تو بیحد قلق ہوتا ہے کیونکہ یہ لوگ اپنی دانست میں حضرت محبوب الٰہی رح اور حضرت مخدوم صابر رح کی محبّت اس میں سمجھتے ہیں کہ دوسرے بزرگ کا نام نہ لیا جائے۔ حالانکہ یہ اُن کی کور باطنی اور جہالت ہے۔ یہ سب بزرگ ایک شان رکھتے ہیں۔ ان میں تفریق کرنا ملّتِ عشق میں کفر کی برابر ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں فرماتا ہے لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ (یعنی ہم کسی رسول کے (مرتبہ) میں فرق نہیں کرتے) اولیا ءاللہ مثیلِ انبیاء ہوتے ہیں۔ پھر بھلا ان میں تفریق کیونکر ہوسکتی ہے۔

الغرض گلیم درویشی کی وسعت کو تنگ خیال لوگوں نے اس قدر چھوٹا کردیا ہے کہ اس میں ایک درویش بھی نہیں سما سکتا۔ اوپر جتنی باتیں لکھی گئی ہیں یہ سب تو ایک حد تک محبّت یا علمی روایتوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ افسوس آج کل کے زمانہ پر ہے کہ محض دُنیاوی اور نفسانی کدورتوں سے مشائخ میں تفریق اور جُدائی پھیلتی جاتی ہے۔ نقشبندی۔ قادری۔ سہروردی چشتی تو خیر الگ الگ خاندان ہیں غضب تو یہ ہے کہ ایک ہی خاندان کی مختلف شاخوں میں اس قدر عناد پایا جاتا ہے کہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ ان کا آپس میں کوئی تعلق بھی ہے۔

مثلاً نقشبندیہ طریق میں مجدّدی حضرات غیر مجدّدی لوگوں سے بالکل ناآشنا اور بےغرض ہیں۔ اور اُن کو سوائے مجدد صاحب کے اپنے سلسلہ میں اور کسی سے محبّت نہیں ہوتی۔ امیر حبیب اللہ خاں والی کابل جب ہندوستان میں آئے تو تمام مشہور مزارات پر حاضری

دی۔ مگر حضرت خواجہ باقی باللہ رح کے مزار کی زیارت کو نہ گئے۔ کیا یہ تعجب خیز امر نہیں ہے کہ مجدد صاحبؒ کے پیر و مرشد کے مزار کی زیارت بیکار سمجھی گئی۔ مگر اس میں شاہِ کابل کا کوئی قصور نہیں ہے اگر ان کو بتایا جاتا کہ مجدد صاحبؒ کے شیخ کا مزار دہلی میں ہے۔ تو وہ ضرور حاضر ہوتے۔ مگر جو حضرات اُن کے گرد و پیش تھے وہ سب مجدد صاحبؒ کے مقابلہ میں حضرت خواجہ باقی باللہ رح کی کوئی حقیقت نہیں سمجھتے۔ یا سمجھتے ہیں تو بہت معمولی۔ ورنہ وہ ضرور شاہ کو وہاں کی حاضری کے لیئے آمادہ کرتے۔

اسی طرح چشتیوں کا عالم ہے۔ اُن کی ایک مشہور شاخ نظامیہ پر غور کیجیئے تو زمین و آسمان کا فرق نظر آتا ہے۔ حضرت مولانا فخرالدینؒ سے پنجاب اور پورب میں کئی مسندیں نظامیوں کی قایم ہوئیں۔ بریلی میں نیازیہ۔ تونسہ شریف میں سلیمانیہ۔ فخریہ خاندان کی مشہور شاخیں ہیں۔ مگر ہمنے کبھی نہیں سُنا کہ سلیمانیہ اور نیازیہ مشایخ میں کبھی اس قسم کا ارتباط پیدا ہوا ہو جو طریقہ اور ہم سلسلہ مشایخ میں ہوا کرتا ہے اور ہونا چاہیئے۔ پنجاب میں فخریہ سلسلہ سے جس طرح تونسہ شریف میں سلیمانیہ مسند قایم ہوئی اسی طرح چاچڑاں شریف میں حضرت قاضی محمد عاقل صاحب کی خانقاہ بڑی مشہور اور با اثر مانی جاتی ہے۔ اس خانقاہ کے مشہور سجادہ نشین حضرت خواجہ غلام فرید صاحب تھے جن کا ابھی حال میں وصال ہوا ہے۔ اور تونسوی خانقاہ میں خواجہ غلام فرید صاحب کے ہمعصر حضرت خواجہ الٰہ بخش صاحبؒ تھے جن کی رحلت کا زمانہ بھی خواجہ غلام فرید صاحب کے قریب واقع ہوا۔ ان دونوں حضرات کی نسبت مشہور تھا کہ تعلقات کشیدہ رکھتے ہیں۔ مگر مہار شریف کے عُرس میں ایک دفعہ یہ دونوں بزرگ جمع ہوگئے۔ اور باہمی ملاقاتیں ہوئیں جس خلوص اور تپاک سے ان بزرگوں نے باہم ملاقات کی ہے وہ اس بات کا نمونہ تھا کہ مشایخ اپنے عمدہ اخلاق رکھتے ہیں۔ عوام کی سب غلط فہمیاں دور ہوگئیں۔ اور جس قدر فرضی روایتیں کشیدگی اور رنجش کی مشہور تھیں مجمع کی ایک ہی ملاقات میں صاف ہوگئیں۔ مگر افسوس ان بزرگوں کے بعد ان کے جانشینوں نے رسم مودت و اتحاد کو تازہ نہ کیا۔ ہر ایک اپنے مشاغل میں مصروف ہے۔ اور اس عظیم الشان ضرورت کی طرف توجہ نہیں کرتا۔

جس قدر بڑے بڑے عرس نظامیہ خانقاہوں میں ہوتے ہیں وہاں سوائے ان ہی مشایخ کے جن کو صاحب عرس سے کچھ تعلق ہے اور کوئی اس عرس میں نہیں آتا۔ اور آتے ہیں تو اس طرح کہ ایک دوسرے کی حالت سے بے خبر رہتے ہیں۔ ہم نے دیکھا ہے کہ اجمیر شریف میں چشتیوں کے تمام مشائخ خواہ وہ کسی شاخ کے ہوں جمع ہوتے ہیں اور محفل سماع میں بازو سے بازو ملا کر کھڑے ہوتے ہیں لیکن ان سے پوچھا جائے کہ چھ دن کی محفلوں میں تم نے کتنے مشایخ سے واقفیت حاصل کی۔ تو وہ جواب دیتے ہیں کہ ہم واقفیت حاصل کرنے نہیں جاتے۔ ہمارا مقصد سماع کی شرکت ہوتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں محفل سماع کے آداب کے خلاف ہے کہ وہاں بات چیت اور کلمہ کلام ہو۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ ان مشایخ کے باہمی میل جول کا اور ایک جگہ جمع ہونے کا اس سے بہتر اور کوئی موقع میسر نہیں آسکتا۔ اگر سماع سے پہلے یا بعد کوئی وقت ایسا مقرر کیا جائے جس میں مشایخ آپس میں میل جول اور تبادلۂ خیالات کریں تو کوئی حرج نہیں۔ یہ بات جب ہی ہو سکتی ہے کہ مشایخ اس کی ضرورت اور اہمیت اور مفاد کو سمجھتے بھی ہوں۔ وہاں تو یہ عالم ہے کہ ہر بزرگ دوسرے بزرگ سے مصافحہ کرنا یا آنکھ ملانا اپنی شان اور وقار کے خلاف سمجھتا ہے۔ پھر کیونکر یہ رسم جاری ہو سکتی ہے کہ "ملاقاتی محفل" قایم ہو۔

قصہ مختصر اس تنگ خیالی اور نقصان رساں کشیدگی اور علیحدگی کو سالہا سال مشاہدہ کرنے کے بعد ہم چاہتے ہیں کہ اس کے دور کرنے کا خیال مشایخ میں پیدا کر دیں۔ اور یہ خیال جب ہی پیدا ہو سکتا ہے کہ اُن کے سامنے بزرگوں کی مثالیں پیش کیجائیں اور دکھایا جائے کہ مشایخ قدیم کا باہمی برتاؤ کیسا تھا اور تم آج کل کیا برتاؤ کر رہے ہو۔ اُن کا طرز عمل دین و ملت کے لیئے مفید تھا یا تمہارا۔ خدا کو منظور ہے تو ان اوراق میں ہم کل سلسلوں کے مشایخ متقدمین کا وہ تذکرہ شایع کرتے رہیں گے جس سے ہمارا

مذکورہ مقصد ہویدا ہو سکے۔ سر دست چشتیوں اور سہروردیوں کے پرانے تعلقات لکھے جاتے ہیں۔ کیونکہ ہندوستان میں ان ہی سلسلوں کا قدم پہلے آیا تھا۔ گو آج کل سہروردی طریقہ کی اشاعت عام نہیں ہے۔ مگر جس زمانہ کا ذکر ہم کرنا چاہتے ہیں وہ سہروردیوں کے عروج و کمال کا زمانہ تھا۔ اُمید ہے کہ تمام مشائخ عظام ان واقعات کو غور و خوض اور تعمق سے ملاحظہ فرمائیں گے ✤

التمش کی خرقہ پوشی

قبل اس کے چشتیوں اور سہروردیوں کے تعلقات کا ذکر شروع کیا جائے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ شاہان ہند کے مذہبی خیالات کا تھوڑا سا تذکرہ کر دیا جائے ✤

جب شہاب الدین محمد غوری نے ہندوستان فتح کر لیا تو اُس کے نائب اور غلام قطب الدین ایبکؒ نے پایۂ تخت کی بنیاد دہلی میں قائم کی اور فتح کی یادگار میں مسجد قوۃ الاسلام اور قطب مینار بنانا شروع کیا۔ یہ بادشاہ درویشوں کی طرف خاص میلان رکھتا تھا۔ مگر اس کی زندگی نے بہت کم وفا کی۔ اس کے بعد جس قدر بادشاہ تخت نشین ہوئے وہ عموماً سب چشتیہ طریق کے تھے۔ کیونکہ دہلی میں چشتیوں کے بہت بڑے پیشوا حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ اجمیری خواجہؒ کے دربار کی جانب سے تشریف رکھتے تھے۔

ان غلام بادشاہوں میں سلطان شمس الدین التمش سب سے بڑھ گیا۔ اور اس نے حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ سے اس قدر عقیدت پیدا کی کہ حضرت کے ممتاز مریدوں میں شمار ہونے لگا۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت نے اس کو خرقۂ خلافت بھی عطا فرمایا تھا۔ اور حضرت کے وصال کے بعد اسی بادشاہ نے اپنے ہاتھ سے آپ کا غسل میت کیا۔ مشائخ میں خیال کیا جاتا ہے کہ التمشؒ کو مرتبۂ قطبیت بھی حاصل ہوا تھا۔ بہر حال التمش کی خرقہ پوشی اور چشتیہ خاندان سے گرویدہ ہونے کے سبب مُلک میں چشتیوں کی طرف عام میلان پیدا ہو گیا تھا۔ اور لوگ جوق جوق اس طریقے کے مُرید ہو رہے تھے ✤

اس زمانہ میں ملتان اور دیپالپور وغیرہ سرحدی مقامات میں سہروردی سلسلہ نے قدم بڑھانے شروع کیے تھے۔ چونکہ ملتان بیرونی دشمنوں کے حملے کی پہلی ٹکر پر واقع تھا اسواسطے شاہان دہلی اس کے استحکام کیلئے چیدہ افسر مقرر کرتے تھے۔ اور مُلک کی زبردست فوجیں وہاں رہتی تھیں۔ اس ظاہری انتظام کے ساتھ باطنی انتظام بھی تھا۔ مُلک کے نامور علما و مشائخ خلقت کی روحانی تربیت کے لیے ملتان میں رہتے تھے۔ چنانچہ سہروردیہ طریق کے نامور پیشوا حضرت بہاء الدین زکریا رحمۃ اللہ علیہ یہیں تشریف رکھتے تھے لوگوں کو اُن سے بڑا اعتقاد تھا اور سہروردی سلسلہ نہایت سُرعت سے پھیل رہا تھا۔ اسی اثناء میں دہلی سے حضرت خواجہ قطب صاحب کے خلیفۂ اعظم حضرت بابا فرید گنج شکر بھی ملتان کے قریب قصبۂ اجودہن میں تشریف لے گئے اور وہیں قیام اختیار کیا۔ حضرت بابا صاحب کے تشریف لیجانے سے سہروردیہ سلسلہ کی ترقی میں پہلی سی تیزی نہ رہی۔ مگر اسکا نہ حضرت شیخ الشیوخ شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کو افسوس تھا اور نہ حضرت بابا صاحب کو خوشی تھی۔ کیونکہ یہ دونوں بزرگ دینی خدمت کر رہے تھے اُن کو اس سے کچھ سروکار نہ تھا کہ کون خاندان زیادہ پھیل رہا ہے ✤

التمش کے بعد سب غلام بادشاہ چشتیوں کے حلقہ بگوش رہے۔ غیاث الدین بلبن حضرت بابا صاحب کی زیارت کیلئے خود اجودھن (پاکپٹن) حاضر ہوا۔ اور ایک روایت کے بموجب اپنی لڑکی بھی آپ کے نذر کی۔ بلبن کے آخری زمانہ میں حضرت خواجہ نظام الدین اولیا محبوب الٰہی حضرت بابا صاحب کی اجازت سے دہلی کے نائب مقرر ہو کر تشریف لائے اور آپ کا غلغلہ اُس کی موت سے پہلے اچھی طرح

تمام ملک میں پھیل گیا۔ بلبن اور اُس کا بیٹا محمد خاں شہید جو ملتان کا صوبہ دار تھا حضرت محبوب الٰہیؒ سے دلی عقیدت رکھتے تھے۔ بلکہ محمد خاں تو آپ کے دو مقبول مریدوں حضرت امیر حسن علاء سنجریؒ اور حضرت امیر خسروؒ کو اپنے ہمراہ ملتان لے گیا اور مرتے دم تک پاس رکھا۔ بلبن کے بعد اُس کا پوتا کیقباد بھی حضرت محبوب الٰہی رح کا خاص عقیدت شعار رہا۔ اور اس طرح چشتیوں کی دھاک تمام ملک کے دل پر بیٹھ گئی *

کیقباد کے بعد جلال الدین خلجی اور علاء الدین خلجی بھی چشتیوں کے حلقہ بگوش رہے۔ مگر علاء الدین کا جانشین قطب الدین خلجی چشتیوں سے منحرف ہوگیا اور اپنی نادانی و ناتجربہ کاری کے سبب اس کے درپے ہوا کہ پولیٹکل چال سے

چشتیوں کا زور

توڑ دے۔ چنانچہ اُس کے مشیروں نے اُس کو صلاح دی کہ جب تک حضرت محبوب الٰہیؒ کے مقابلہ میں کوئی دوسرا بزرگ دہلی میں نہ آئے گا ان کا زور قایم رہے گا۔ شاہی اختیارات سے ایسے ہر دلعزیز لوگوں کا زیر کرنا آسان کام نہیں۔ ملتان سے سہروردیہ خاندان کے سب سے بڑے پیشوا حضرت مولانا رکن الدین ابوالفتح کو دہلی بلوائیے۔ اوّل تو یقیناً اُن کے آپس میں زور آزمائی ہوگی حضرت محبوب الٰہی کبھی گوارا نہ کریں گے کہ اُن کی اقلیم میں غیر خاندان کا آدمی سکہ چلائے۔ مولانا رکن الدین چونکہ سلطان کی شہ سے آئیں گے اس واسطے وہ بھی مضبوطی سے چشتیوں کا مقابلہ کریں گے اور دہلی سے اُن کا اثر زائل کرنے کی کوشش کرینگے اس کشمکش میں سلطان کا مطلب حاصل ہو جائے گا۔ سلطان نے اس مشورہ کو پسند کیا۔ اور ملتان سے حضرت مولانا رکن الدین ابوالفتح کو بلوایا۔ چنانچہ حضرت مولانا ملتان سے روانہ ہو کر دہلی تشریف لے آئے۔ اور وہ وقت قریب آگیا کہ

تلوار اور تسبیح کا مقابلہ

شروع ہو۔ کیونکہ سلطان تلوار کے زور سے حضرت محبوب الٰہیؒ کی تسبیح کو زک دینی چاہتا تھا آج کل کا زمانہ ہوتا تو خبر نہیں کیا حالت ہوتی۔ خود مختار۔ جابر۔ ظالم سلطان کا زمانہ اور ایسی خطرناک چال کہ بھائی کو بھائی سے جنگ کا اندیشہ۔ مگر حضرت محبوب الٰہی رح نے اپنی خداداد حقانیت اور حسنِ نیّت سے سلطان کے تمام منصوبے خاک میں ملا دیئے۔ جوں ہی حضرت مولانا رکن الدین ابوالفتح شہر میں داخل ہوئے سلطان نے بڑی دھوم دھام سے استقبال کیا۔ اور پوچھا کہ دہلی میں سب سے پہلے کون ملا؟ آپ نے ارشاد کیا جو سب سے اچھے ہیں۔ سلطان نے گھبرا کر دریافت کیا۔ وہ کون ہیں؟ فرمایا مولانا نظام الدین محبوب الٰہی! یہ سُنکر سلطان کا چہرہ فق ہوگیا۔ اور اُس نے غیظ و پشیمانی میں اپنا مُنہ حضرت کی طرف سے پھیر لیا۔ وہ اپنے ہونٹھ چباتا تھا اور حضرت محبوب الٰہی کی ایسی صاف کامیابی سے مبہوت تھا۔ اُسے کیا خبر تھی کہ یہ لوگ دُنیا کے آدمیوں کی طرح چالبازیاں نہیں کیا کرتے وہ نہیں جانتا تھا کہ جو چراغ خدا نے روشن کیا تھا وہ ان فریب کاریوں کی پھونکوں سے بجھنا دشوار ہے۔ اس کے مشیروں نے چشتیوں اور سہروردیوں کو جُداگانہ مذہب تصوّر کرکے یہ چال چلی تھی مگر اب اُنہیں معلوم ہوا کہ یہ سب تو ایک ہی گھر کے رہنے والے ہیں اور ان میں کچھ بھی اختلاف نہیں۔ ان کو ذہن میں یہ بات وہم و گمان کی طرح بھی نہ آئی تھی کہ حضرت محبوب الٰہی باوجود اسقدر عظمت و شان کے کہ تمام ہندستان

ان کے قدموں کے آگے سر جھکاتا ہے۔ مولانا رکن الدین ابوالفتح کے استقبال کو شہر سے باہر تشریف لے جائیں گے اور اس طرح بادشاہ کی کی کرائی محنت کو خاک میں ملا دیں گے۔

مولانا رکن الدین بشر تھے۔ امکان میں تھا کہ وہ دہلی میں بادشاہ کے پاس ٹھہر کر اغوا میں آجاتے۔ اور حضرت محبوب الٰہیؒ سے مخاصمت شروع کر دیتے۔ مگر حضرت محبوب الٰہیؒ نے کمال دوراندیشی۔ کمال اخلاص شعاری۔ کمال مہمان نوازی اور کمال فروتنی کو کام میں لا کر خود تکلیف اُٹھائی۔ شہر سے باہر استقبال کو تشریف لے گئے۔ اور بادشاہ سے پہلے حضرت سے ملاقات کر لی جس کا اثر یہ ہوا کہ مولانا نے بادشاہ سے کہا کہ حضرت محبوب الٰہی ہی تمام دہلی میں سب سے اچھے ہیں۔ جو بادشاہ کے دل پر تیر کی طرح زخم انداز ہوا۔

ہند کے تاجدار کو دوسری زک

قطب الدین خلجی اس واقعہ کے بعد فکر میں رہا کہ مولانا رکن الدین کو حضرت محبوب الٰہی سے برہم کرانے کی کوئی اور صورت پیدا ہو۔ مگر مرتے دم تک اُس کو کامیابی نصیب نہ ہوئی۔ اِدھر تو وہ اس خیال میں تھا۔ اُدھر حضرت مولانا رکن الدین خود کیلوکھری کی جامع مسجد میں نماز کو تشریف لے گئے۔ جہاں حضرت محبوب الٰہیؒ نماز پڑھا کرتے تھے۔ اس مسجد کا صحن بہت وسیع تھا۔ نماز کے بعد حضرت محبوب الٰہیؒ کو خبر دی گئی کہ مولانا رکن الدین اس مسجد میں تشریف لائے ہیں۔ حضرت یہ سُنکر مولانا سے ملنے تشریف لے چلے۔ اور تمام وسیع صحن پیادہ طے کر کے مسجد کے دوسرے حصے میں پہنچے۔ اُس وقت مولانا صاحب نماز میں مصروف تھے۔ حضرت محبوب الٰہیؒ مولانا کی پس پُشت بیٹھ گئے۔ خلقت کا یہ عالم تھا کہ ٹوٹی پڑتی تھی۔ عوام کو نہایت تعجب تھا کہ حضرت محبوب الٰہیؒ جیسے شاندار بزرگ نے مولانا کے پس پُشت بیٹھنا کیونکر گوارا کر لیا۔ حالانکہ یہ کوئی عجیب بات نہ تھی عارفین ان ظاہری تکلفات کو ہیچ سمجھتے ہیں۔ مگر آج کل کے زمانہ میں تو کبھی درویش اس بات کو قبول نہ کرے گا کہ دوسرے درویش کے پیچھے بیٹھ جائے۔ اور ہزاروں مُرید یہ تماشا دیکھ رہے ہوں۔ کیونکہ اُس کے دل میں ضرور اندیشہ ہوگا کہ اس سے میرے مریدوں کے عقیدے میں کمزوری واقع ہوگی۔ اور میری وقعت کے مقابلہ میں اس شخص کی وقعت بڑھ جائے گی۔ جس کی تعظیم کر رہا ہوں۔ لیکن حضرت محبوب الٰہیؒ نے چھ سو برس پہلے اس وہم کو جھوٹا ثابت کر کے دکھا دیا کہ ایک غیر سلسلہ کے فقیر کی ایسی غیر معمولی تعظیم اپنے مُریدوں کے سامنے کی۔ مگر حضرت کی وقعت کو بال بھر صدمہ نہ پہونچا بلکہ اور زیادہ بڑھ گئی۔

جب حضرت مولانا نماز سے فارغ ہوئے تو حضرت محبوب الٰہیؒ کے ساتھ کمال تپاک سے مصافحہ و معانقہ کیا اور دونوں بزرگ ہاتھ پکڑ کے باتیں کرتے ہوئے دروازے پر تشریف لائے اور پالکیوں میں سوار ہو کر اپنے مقامات پر تشریف لے گئے۔

اس ملاقات کی خبر سلطان کو ہوئی تو اُس نے بہت پیچ و تاب کھایا۔ مگر کیا کر سکتا تھا۔ خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ آخر اس آتشِ حسد میں جلتا ہوا ایک دن اپنے مرغوب غلام خسرو خان کے ہاتھ سے محل ہزار ستون کی چھت پر قتل کیا گیا۔

ایک اور پُراسرار مُباحثہ

حضرت مولانا رکن الدین رح جس کام کے لیئے بلائے گئے تھے وہ تو قطب الدین کے ساتھ قبر میں گیا۔ اب ان دونوں بزرگوں کی ایک اور ملاقات کا ذکر لکھا جاتا ہے۔ جو موجودہ مشایخ کی سبق آموزی کے لیئے ازبس مُوثّر ہے اور اتحاد کا جذبہ ہر قالب میں پیدا کرتا ہے +

ایک دن حضرت محبوب الٰہیؒ اس مقام پر تشریف رکھتے تھے جہاں آپ کا مزار ہے کہ ایک شخص خبر لائے کہ حضرت مولانا رکن الدینؒ ملاقات کو تشریف لاتے ہیں۔ حضرت نے خواجہ اقبال کو حکم دیا کہ کھانا تیار کرو۔ اسی اثنا میں خبر آئی۔ تشریف لے آئے حضرتؒ بالاخانے سے نیچے تشریف لائے اور حضرت مولانا کا استقبال فرمایا۔ مولانا پالکی میں سوار تھے اور پاؤں میں کچھ تکلیف تھی لیکن اسی حالت میں پالکی سے نیچے اُترنے کی کوشش فرمانے لگے۔ حضرت محبوب الٰہیؒ نے اصرار کیا۔ اور نیچے نہ اُترنے دیا پالکی زمین پر رکھدی گئی۔ اور حضرت محبوب الٰہی رح بھی وہیں رونق افروز ہوگئے۔ اقبال نے دستر خوان چُنا۔ کھانے لگائے گئے۔ انگوری سرکہ دور رکھا تھا۔ مولانا نے فرمایا۔ سرکہ قریب لاؤ۔ پیالی قریب سرکا دی گئی حضرت محبوب الٰہی نے فرمایا۔ اسی شہر کا ہے۔ مولانا نے جواب دیا۔ اسی لیئے تیز ہے۔ حضرت نے فرمایا۔ ہاں اور اسی واسطے عزیز ہے۔ اس پُر لطف بات چیت کے بعد کھانا بڑھایا گیا۔ خواجہ اقبال نے ایک باریک کپڑے میں سَو اشرفیاں باندھکر اور چند تھان نہایت نفیس کپڑوں کے ان کے ہمراہ مولانا کے سامنے رکھے۔ اشرفیوں کی زردی کپڑے سے جھلک رہی تھی۔ مولانا نے فرمایا استر ذھبکَ (اپنے سونے کو چھپاؤ) اپنے جانے کو چھپاؤ۔ اپنے مذہب کو چھپاؤ۔ استرذھبکَ و ذھابکَ و مذھبکَ (اپنے سونے کو چھپاؤ۔ اپنے جانے کو چھپاؤ۔ اپنے مذہب کو چھپاؤ۔) اس جواب سے مولانا بہت محظوظ ہوئے۔ کیونکہ یہ تمام باتیں سلوک کے مقاموں کی تھیں۔ جن کو حضرت محبوب الٰہی رح نے اس برجستگی اور فصاحت سے ادا کردیا۔ کہ مزاح کا مزاح اور بیان کا بیان۔ کوئی شخص اس اختصار اور موزونیت سے درویشی کی باتیں ادا نہیں کرسکتا +

اس پُراسرار و لطیف گفتگو کے درمیان میں مولانا رکن الدین کے بھائی مولانا عماد الدین اسمٰعیل نے عرض کیا کہ اسوقت ہندوستان کے دو نامور بزرگ ایک جگہ جمع ہیں۔ اس سے بہتر اور کوئی موقع میسّر نہیں آسکتا۔ میں یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ ہجرت کا کیا سبب تھا۔ یعنی حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلّم نے مکّہ سے مدینہٗ منورہ کو کیوں ہجرت فرمائی۔ اگرچہ ظاہری طور پر تو ہر شخص جانتا ہے کہ کفّار قریش کی یورش و آزار دہی کے سبب سے ہجرت ہوئی۔ مگر

ہر ظاہر کا ایک باطن ہے

اس ظاہری وجہ کا باطن بھی ضرور ہوگا۔ اس کی تشریح و توضیح کا طلبگار ہوں۔ حضرت مولانا نے فرمایا کہ حضرت سلطان المشایخ جواب ارشاد کریں گے۔ اور حضرت محبوب الٰہی سلطان المشایخ نے فرمایا۔ نہیں آپ ہی فرمائیں آخر اس کسرِ نفسی کے تبادلہ کے بعد حضرت محبوب الٰہیؒ نے اوّل ارشاد کیا کہ فقیر کے خیال میں مدینہ کے ناقصوں کی تکمیل اس بات پر منحصر تھی کہ حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم گھر بار چھوڑیں۔ سفر کی تکلیف برداشت کریں۔ عزیز و اقارب سے جُدا ہوں اور مدینہ میں ہجرت کرکے تشریف لے آئیں +

مولانا رکن الدینؒ نے یہ جواب سُنکر فرمایا۔ میرے نزدیک خود حضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے کمالات کی تکمیل ہجرت پر منحصر تھی۔ جب آپ نے کامل طور سے تمام تعلّقات خانہ کو ترک کرکے بے وطنی اختیار کی۔ اُس وقت دین مکمّل ہوا۔ ان دونوں جوابوں میں ہر بزرگ نے نہایت مزہ دار اشارے کیے ہیں۔ جن کی تشریح ضروری معلوم ہوتی ہے۔ مولانا عماد الدین کا سوال تو محض ہجرت کے متعلق تھا مگر ان حضرات نے جواب ایسے پیرایہ سے دیا کہ اپنی ذات کے متعلق بھی اشارے کنائے ہو گئے۔ مثلاً حضرت محبوب الٰہی کا یہ فرمانا کہ ہجرت مدینہ کے ناقصوں کی تکمیل کے لیئے ہوئی۔ بظاہر نہایت سادہ و مؤدّب جواب ہے مگر حقیقت میں حضرت نے خود اپنی ذات کی نسبت اشارہ کیا ہے کہ مولانا رکن الدّین کا ملتان سے ہجرت کرکے دہلی آنا میرے نقص کی تکمیل کے لیئے ہے۔ اس کے جواب میں مولانا رکن الدین نے فرمایا کہ نہیں بلکہ خود میری تکمیل دہلی آنے اور آپ سے فیضیاب ہونے پر منحصر تھی۔ بہرحال یہ وہ برتاوے ہیں جن سے اعلیٰ درجہ کی یگانگت و اخلاصمندی مترشح ہوتی ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ یہ دونوں بزرگ علیحدہ علیحدہ سلسلہ کے تھے۔ گو اس میں سے ایک چشتیہ گھرانے کا آفتاب اور دوسرا سہروردیہ طریق کا ماہتاب تھا۔ لیکن طرزِ عمل سے وہ دونوں ایک جان دو قالب تھے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ آج کل کے مشائخ نے گلیم درویشی کو اس قدر تنگ کر دیا ہے اور میل جول و رسم اتحاد کو چھوڑ بیٹھے ہیں۔ حلقۂ نظام المشائخ نے اس بات کا بیڑا اُٹھایا ہے کہ مشائخ میں پھر وہی اگلا سا اتحاد پیدا ہو۔ قادری چشتی۔ نقشبندی۔ سہروردی۔ نظامی صابری۔ مجددی وغیرہ سب شیر و شکر ہوکر رہیں اور اپنی اُن اغراض کی جو سب طریقوں میں شامل ہیں اغیار کے مقابلہ میں حفاظت کریں۔ اس اتحاد کا یہ مطلب نہیں ہے کہ سب سلسلے خلط ملط ہوکر ایک معجون مرکب بن جائیں بلکہ منشا یہ ہے کہ فروعات کے ناجائز اختلافات مٹا دیے جائیں۔ ہر شخص دوسرے سلسلہ کے بزرگ کا ادب اسی طرح ملحوظ رکھے جس طرح کہ وہ اپنے سالارِ سلسلہ کا ادب کرتا ہے۔ اگر ایسا ہونے لگا اور ہمیں تسلّی دی گئی ہے کہ ایسا ہی ہوگا تو گلیم درویشی کی وسعت پھر اپنی اصلی شان پر آجائے گی +

خوش خلقی

(از صوفی - نومبر سنہ ۱۹۰۹ء)

خُوش خُلقی کی فضیلت :- جس طرح ہمارے رسول صلعم کو تمام رسولوں پر فوقیت اور فضیلت ہے۔ اسی طرح اُن کے اوصاف و خصائل سب پیغمبروں سے اعلیٰ ہیں۔ اللہ تعالےٰ نے خود اپنے کلام قرآن شریف میں اس کا ذکر فرمایا ہے۔ مگر وصف بھی وہ بیان کیا گیا جو تمام اوصاف کی جان ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوا اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْم تمہاری (پیدایش اے محمدؐ) بہت بڑے خُلق پر ہوئی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ حُسنِ خلق ایسی شاندار چیز ہے کہ حضور رسولِ مقبول کے اعلیٰ اوصاف میں اس کا شمار ہوا۔ خود حضور رسول مقبول صلعم نے حُسنِ خلق کی فضیلت میں جو کچھ ارشاد فرمایا ہے اُس کو ذیل میں قلمبند کرکے بدخلقی کی بُرائی کو لکھا جائے گا۔ اور اس کے بعد بتایا جائیگا کہ حُسنِ اخلاق کیا چیز ہے +

احمد حاکم اور بیہقی نے حضرت ابی ہریرہؓ سے روایت کی ہے کہ حضرت رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ میں اس واسطے بھیجا گیا ہوں کہ عمدہ اخلاق کو پورا کروں۔ ابو داؤد اور ترمذی نے ابو الدرداؓ سے روایت کی ہے کہ حضرت صلعم نے فرمایا سب سے بھاری چیز جو میزان اعمال میں رکھی جائے گی وہ خدا سے ڈرنا اور خوش خلقی ہوگی۔ ایک دفعہ کسی نے آپ سے دریافت کیا دین کیا چیز ہے؟ آپ نے فرمایا خوش خلقی۔ اُس شخص نے آپ کے داہنی طرف آکر یہی سوال کیا۔ اور یہی جواب پایا۔ یہاں تک کہ چاروں رُخ سے پوچھا اور ایک ہی جواب پایا۔ ایک اور آدمی نے دریافت کیا۔ اعمال میں افضل کیا چیز ہے فرمایا حُسنِ خُلق۔ کسی نے دریافت کیا۔ باعتبار ایمان کون افضل ہے؟ ارشاد ہوا۔ جو خُلق میں سب سے اچھا ہے طبرانی نے مکارم الاخلاق میں بروایت حضرت ابی ہریرہؓ بیان کیا ہے کہ حضرت صلعم نے فرمایا۔ اگر تم لوگوں سے دولت میں نہیں بڑھ سکتے تو خندہ پیشانی اور خلق حسن میں بڑھ جاؤ۔ حضرت جریر بن عبد اللہ کو ایک دفعہ ارشاد ہوا۔ تجھ کو اللہ نے خوبصورت بنایا ہے۔ اپنے خُلق کو بھی خوبصورت بنا۔ حضرت ابن مسعود سے روایت ہے کہ آنحضرت صلعم اکثر یوں دعا فرماتے تھے اَللّٰھُمَّ احسنت خلقی فحسن خلقی "الٰہی تو نے میری اچھی صورت بنائی ہے تو میرا خلق بھی اچھا بنا" دریافت کیا گیا۔ بندہ کو سب سے اچھی چیز کیا دی گئی ہے؟ فرمایا۔ خُلقِ حسن! دوسری جگہ فرمایا قیامت کے دن زیادہ محبوب اور میرے قریب بیٹھنے والے وہ لوگ ہونگے جن کے اخلاق اچھے ہوں گے۔ فرمایا خوش خلقی گُناہ کو اس طرح گھلا دیتی ہے جس طرح دھوپ برف کو۔ فرمایا کوئی تدبیر عقل کی موافق نہیں ہوتی مگر خوش خلقی ✤

بدخلقی کی بُرائی

حضرت صلعم سے کسی نے دریافت کیا نحوست کیا چیز ہے؟ فرمایا۔ بدخُلقی۔ فرمایا بدخلقی اعمال نیک کو اس طرح خراب کر دیتی ہے۔ جس طرح سرکہ شہد کو بدمزہ کر دیتا ہے۔ دوسری جگہ ارشاد ہے بدخلقی ایسا گُناہ ہے۔ جو کبھی بخشا نہیں جائے گا۔ نیز آپ نے فرمایا۔ بدخلق آدمی دوزخ کی تہہ میں ڈالا جائے گا۔ حضرت خواجہ حسن بصریؒ نے فرمایا بدخلق انسان اپنی جان کو آفت میں خود پھنساتا ہے۔ وہب بن منبہ فرماتے ہیں۔ بدخلق ٹوٹا ہوا برتن ہے۔ نہ جُڑ سکتا ہے نہ مٹی بن سکتا ہے۔ حضرت فضیل نے فرمایا بدکار خوش خلق کو بدخلق عابد پر ترجیح ہے ✤

خوش خلقی کیا چیز ہے؟

حضرت خواجہ حسن بصریؓ فرماتے ہیں کہ خوش خلقی یہ ہے کہ کشادہ پیشانی رہے اور دولت کو خرچ کرے۔ اور کسی کو ایذا نہ دے۔ واسطی فرماتے ہیں کہ خوش خلقی کی یہ علامت ہے کہ نہ آدمی خود کسی سے دشمنی کرے۔ نہ کوئی اس سے خصومت رکھے۔ اور مفلسی و تونگری میں خلقت اس سے راضی رہے۔ شاہ کرمانی کے خیال میں ایذا سے باز رہنا اور مشقتوں کا سہنا خوش خلقی ہے۔ ایک اور بزرگ فرماتے ہیں غربت کی شان سے لوگوں کے قریب رہنا خوش خلقی ہے۔ حضرت مولا علیؑ فرماتے ہیں۔ خوش خلقی تین چیزوں میں ہے۔ محرمات سے بچنا۔ حلال روزی کا تلاش کرنا۔ اور عیال پر زیادہ خرچ کرنا۔ امام غزالیؒ کی رائے میں خلق کی

تعریف یہ ہے کہ انسان سے افعال بآسانی بلا فکر و تامل صادر ہوں۔ اگر وہ افعال عقلاً و شرعاً عمدہ ہیں تو خوش خلقی ہے ورنہ بدخلقی
نیز فرمایا خلق فعل کا نام نہیں ہے۔ کیونکہ بہت سے آدمی طبیعت کے اعتبار سے سخی ہوتے ہیں۔ مگر مفلسی کے سبب سخاوت نہیں کرسکتے
یا بعض آدمیوں کی طبیعت بخیل ہوتی ہے لیکن ریاکاری سے خرچ کرتے ہیں۔ اور فرمایا جس طرح ظاہری جسم کا حسن محض آنکھوں
یا صرف رخساروں کی موزونیت سے مکمل نہیں کہلاتا جب تک کہ کل جسم کے اعضاء موزوں نہ ہوں اسی طرح خوش خلقی جو انسان کا باطنی حسن
ہے چار چیزوں سے مکمل ہوتی ہے۔

ایک قوت علم۔ دوسرے قوت غضب۔ تیسرے قوت خواہش۔ چوتھے قوت عدل۔ یعنی ان چاروں طاقتوں کو درجۂ اعتدال پر رکھنا۔
علمی طاقت کی ضرورت اس لیے ہے کہ آدمی اس کے سبب اپنے اعمال اور عقائد میں راست رو رہ جاتا ہے۔ اسی طرح سو غضبی اور شہوانی
طاقت پر قایم ہونا محاسن اخلاق کے لیئے لازمی ہے اور یہ قابو قوت عدل کے بغیر نہیں ہوسکتا *

خوش خلقی کیونکر پیدا ہوتی ہے؟

بعض لوگ کہتے ہیں کہ جس طرح انسان سے ظاہری جسم کی اصلاح ناممکن ہے۔ اسی طرح باطنی درستی بھی دشوار ہے۔ بونا آدمی کوشش
سے دراز قد نہیں بن سکتا۔ کالا رنگ گورا نہیں ہوسکتا۔ بدصورتی خوب صورتی سے نہیں بدل سکتی۔ ایسے ہی جس کی سرشت میں کج اخلاقی
ہے وہ تدبیر سے خوش اخلاق نہیں بن سکتا۔ مگر یہ خیال بالکل غلط ہے۔ اول تو یہ بعض جسمانی مثالیں اس مسئلہ پر کماحقہ ثابت نہیں
آتیں۔ دوسرے یورپ کے محققین نے اس کلیہ کو بھی غلط ثابت کر دیا ہے اور جسم کے وہ عارضے جن کی صحت ناممکن مانی گئی تھی
ان کی تدبیروں سے گم ہوتے جاتے ہیں۔

بدخلقی کا بدل جانا تو فطرت سے ثابت ہے۔ درندے جانور انسان کی تربیت سے اپنی خونخوار خصلت کو بھول جاتے ہیں
تو خود انسان دوسرے انسانوں کی تربیت سے اصلاح پذیر کیوں نہ ہوسکے گا۔ بعض آدمی تو پیدائشی نیک اور خوش
خلق ہوتے ہیں لیکن جن کی عادت ابتدا سے بدخوئی اور تنگ مزاجی کی ہوتی ہے۔ وہ بھی خوش خلق بن سکتے ہیں جن
کی سب سے آسان ترکیب خوش اخلاق لوگوں کی صحبت ہے۔ صحبت زمانۂ قدیم سے لیکر اس نئے زمانہ تک (جو پرانے
عہد کی باتوں پر خندہ زنی کرتا ہے) امر مسلّم ہے کہ صحبت کا اثر تمام تعلیمات سے بڑھکر ہے۔ ملنے جلنے کی تاثیر سے آدمی
میں انسانیت پیدا ہوتی ہے اسی واسطے مشائخ عظام نے حسن صحبت کو تصوف کی درسگاہ مانا ہے *

جس کو خوش اخلاقی سیکھنی ہو یا کسی دوسرے کو خوش خلق بنانا ہو تو چاہیئے کہ ایک ایسے شخص کی صحبت اختیار کرے جو خوش اخلاقی کا
مکمل نمونہ ہو *

انسان کامل کے اخلاق

خوش خلقی کی ذہن نشین تعلیم ایک انسان کامل کی اخلاقی مثالوں کے بغیر دشوار ہے۔ اس واسطے حضرت رسالت پناہ صلعم کے اخلاق
کی چند مثالیں معتبر و مستند کتب سے اخذ کر کے لکھی جاتی ہیں۔ مشائخ صوفیہ ان مثالوں کو توجہ اور غور سے ملاحظہ فرمائیں۔ اور اپنے متکبرانہ
اخلاق کی تبدیلی میں متوجہ ہوں۔

حضرت رسول مقبول صلعم کا قاعدہ تھا کہ بیمار کی عیادت کو خود تشریف لیجاتے۔ غلام کی دعوت منظور کر لیتے۔ پاپوش مبارک کی خود مرمت کر لیتے۔ کپڑوں میں پیوند لگا لیتے۔ اپنے گھر والوں کے کام میں شریک ہو کر خود کام کرنے لگتے۔ اپنا کام اپنے ہاتھ سے کرتے۔ صحابہؓ کو تکلیف نہ دیتے۔ بلکہ جو کام خود نہ کر سکتے تھے اُس کو دوسرے سے کرانا بُرا تصوّر فرماتے تھے۔ جب آپ کا گزر لڑکوں پر ہوتا اُن کو سلام کرتے۔ ایک شخص آپ کے پاس آیا۔ وہ آپ کی ہیبت سے کانپنے لگا۔ آپ نے فرمایا کیوں ڈرتا ہے میں بادشاہ نہیں ہوں۔ میں تو قریش کی ایک عورت کا لڑکا ہوں۔ جو خشک گوشت کھایا کرتی تھی۔ آپ کا دستور تھا کہ آپ اپنے اصحاب میں اس طرح سے رل مل کر بیٹھتے کہ اجنبی آدمی آپ کو پہچان نہ سکتا تھا۔ آخر صحابہؓ نے بار بار عرض کر کے مٹی کا ایک چبوترہ بنا دیا جس پر آپ تشریف رکھنے لگے اور لوگوں کو اس امتیاز کے سبب شناخت کی دقّت جاتی رہی۔

ایک دفعہ حضرت عائشہؓ نے آپ سے عرض کیا کہ میں آپ پر قربان جاؤں تکیہ لگا کر کھانا نوش فرمایا کیجیئے۔ تاکہ تکلیف نہ ہو آپ نے ارشاد کیا میں اسی طرح کھاؤں گا جس طرح بندہ کھاتا ہے اور ویسا ہی بیٹھوں گا جیسا کہ بندہ بیٹھتا ہے۔ آپ کے اصحاب میں سے یا اور کوئی آدمی آپ کو پکارتا تو آپ جواب میں لبّیک فرماتے۔ جس قسم کی بات کا آپ کے اصحاب میں پہلے سے ذکر ہوتا تو آپ بھی اُسی کے متعلق باتیں کرتے۔ اگر وہ اشعار خوانی کرتے ہوئے ہوتے تو آپ بھی شعر پڑھتے۔ اگر اصحاب ہنستے تو آپ بھی تبسّم فرماتے اور سوائے حرام اور ناجائز اُمور کے اور کسی بات میں اصحاب کو زجر و توبیخ نہ فرماتے تھے۔ فقیروں میں بیٹھتے۔ مساکین کو اپنے ساتھ کھانا کھلاتے۔ جو لوگ اخلاق میں افضل ہوتے اُن کا احترام فرماتے تھے جو آپ کے سامنے عذر کرتا اُس عذر کو قبول کر لیتے۔ خوش طبعی فرماتے مگر جھوٹ کو نہ آنے دیتے تھے۔ مباح کھیل کو دیکھتے اور منع نہ فرماتے۔ آپ بچوں کے ساتھ دوڑتے کہ دیکھیں کون آگے نکلے۔ لوگ آپ کے سامنے بلند آواز سے بولتے تھے جس سے آپ کو اذیت ہوتی تھی مگر آپ صبر فرماتے۔ کسی کو مفلسی و بیماری کے سبب حقیر نہ جانتے تھے۔ کسی بادشاہ سے اُس کی دُنیاوی شوکت کے سبب خوف نہ کرتے تھے۔

آپ نے کبھی کسی عورت یا نوکر کو لعنت نہیں کیا۔ اگر آپ سے کہا جاتا کہ کسی کے لیئے بد دعا کیجیئے تو آپ اُسکو دعا دیتے سوائے جہاد کے آپ نے کسی پر وار نہیں کیا۔ اگر آپ کے واسطے بچھونا بچھا دیا جاتا تو آپ اُس پر لیٹ رہتے اور اگر بچھونا نہ بچھایا جاتا تو آپ زمین پر لیٹ جاتے۔ جب کوئی آپ سے ملتا۔ سلام میں سبقت فرماتے اور جب تک وہ چلا نہ جاتا آپ کھڑے رہتے۔ اگر کوئی آپ کا ہاتھ پکڑ لیتا تو آپ چھڑانے کی کوشش نہ کرتے۔ یہاں تک کہ وہ خود ہی چھوڑ دیتا۔ آپ کے پاس کوئی آتا اور آپ نماز میں مصروف ہوتے تو نماز کو مختصر کر دیتے اور پوچھتے کہ تم کو مجھ سے کچھ کام ہو تو کہو۔

کبھی مجمع میں تشریف لیجاتے تو جہاں جگہ ملتی وہیں بیٹھ جاتے۔ کسی کو اُٹھانے کی تکلیف نہ دیتے۔ مجمع میں اس طرح پھیل کر نہ بیٹھتے۔ ہاں گھر میں کبھی کبھی پیر پھیلا کر بیٹھتے تھے۔ جو لوگ آپ کے پاس آتے تھے اُن کی خاطر اور تعظیم فرماتے قرابت داروں کے لیئے اپنی چادر بچھا دیتے تھے۔ جس تکیہ کے سہارے آپ تشریف رکھتے تھے آنے والے کو وہ تکیہ عنایت فرماتے کہ اس کے سہارے بیٹھو۔ اگر وہ عذر کرتا تو قسم دیکر تکیے کے سہارے آرام سے بٹھاتے۔ ہر شخص سے ایسا برتاؤ کرتے کہ وہ یہ سمجھتا کہ مجھ سے زیادہ اور کسی پر مہربانی نہیں ہے۔

قصّہ مختصر یہ آپ کے حسنِ اخلاق کا مجمل سا بیان ہے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ مسلمان خاصکر صوفیائے کرام جو حضور کی پیروی و تقلید کو مقصود حقیقی تصوّر کرتے ہیں۔ آیا واقعی اس قسم کے اخلاق رکھتے ہیں۔ یا کچھ فرق و تفاوت ہے۔ اب تو

مشائخ کی صحبتیں متکبر امرار کے درباروں سے بڑھکر پائی جاتی ہیں۔ جہاں غربا اور کم حیثیت لوگوں کو کوئی نہیں پوچھتا۔ اور جو معمولی بات چیت ایسی درشتی سے کرتے ہیں کہ سُننے والا خواہ مخواہ مکدر ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ اب فقرا میں اگلے وقت کے بزرگوں کی سی تاثیریں نہیں پائی جاتیں۔ نہ پہلا سا قال ہے نہ حال۔ ہر چیز میں آسمان زمین کا فرق پڑ گیا ہے اللہ تعالیٰ ہم سب کو توفیق عنایت فرمائے کہ آقائے نامدار مرشد حقیقی حضرت رسول العرب والعجم صلعم کے اخلاق سے سبق حاصل کریں۔ اور یورپ کی خودغرضانہ زندگی میں اسلامی صداقت کے اخلاق کا زندہ نمونہ بنکر نمودار ہوں تاکہ روحانیت کی پیاسی دُنیا اسلامی چشمۂ حیات سے سیراب ہونے کو آگے بڑھے۔ آمین۔

خُونی درویش

ازنظام المشائخ جنوری ۱۹۱۰ء

درویشی اور خونخواری یہ دونوں لفظ آپس میں کیسے اجنبی اور ناآشنا معلوم ہوتے ہیں جو وجود خاک نشینی کے سبب میدان ہستی میں موجود نظر آتا ہو۔ اُس کو خدنگ اندازی سے کیا سروکار۔ مگر زمانہ نے اور اُس کی غلط گو زبانوں نے ابھی تھوڑا عرصہ ہوا سوڈانی ملا صاحب کے ہمراہیوں کا نام درویش مقرر کر دیا تھا۔

سوڈان مصری حکومت کے جوار میں ایک علاقہ ہے جہاں کوئی مُلّا صاحب مہدی کے لقب سے نمودار ہوئے تھے۔ اور چند جنگجو اعراب کو ساتھ لیکر سوڈان فتح کر لیا تھا۔ انگریزوں نے جو مصری حکومت کے محافظ ہیں۔ مصری فوج کے ساتھ ہو کر مُلّا مہدی صاحب اور اُن کے رفقا سے جنگ بازی کی۔ اور آخر شکست و فتح کی متعدد گردشوں کے بعد سوڈان فتح کر لیا۔ جو اب تک قبضے میں ہے۔ مجھ کو اس سے بحث نہیں کہ مُلّا حق پر تھے یا ناحق پر۔ انگریزوں نے اُن سے جنگ بازی انصاف سے کی یا ناانصافی سے۔ کیونکہ غیر مُلک اور غیر حکومت کے معاملات سے ہمیں کیا واسطہ۔ گفتگو اس معاملہ میں ہے کہ مُلّا مہدی کے سپاہیوں کو لفظ درویش سے یاد کیا جاتا تھا۔ اور تمام عربی۔ اُردو۔ انگریزی اخبارات مہدی کی فوج کو درویش کے نام سے موسوم کرتے تھے۔ آیا یہ لفظ موزوں تھا یا ناموزوں۔ غلط تھا یا صحیح۔ جائز تھا یا ناجائز۔

میں کہتا ہوں کہ مُلّائی لشکر کو درویش کا نام دینے والا یا تو کوئی بڑا ہی نادان اور درویشی طریق سے بے خبر تھا اور یا اُس کو فقرا سے کچھ عداوت تھی اور دانستہ اُس نے اُن کے غیر متحرک اور ساکت گروہ کو بدنام و مشتبہ کرنے کے لیئے یہ لفظ استعمال کیا تھا۔

درویشوں کی پُرامن معاشرت پر اس سے بڑھکر کوئی حملہ نہیں ہو سکتا کہ اُن کو شریر۔ فسادی طبقے میں شمار کرانے کے واسطے ایسے ناجائز وسائل اختیار کیئے جائیں۔

مُلّا مہدی کی فوج میں سوائے اس کے کہ وہ بدویانہ زندگی کے مسلمان تھے کوئی بات درویشی کی نہ تھی۔ خود مُلّا مہدی صاحب عالمانہ حیثیت کے ایک بزرگ تھے۔ جنھوں نے ظاہری اتقا کے سبب عوام پر ایک اثر حاصل کر لیا تھا۔ اور یہ اثر اُن کی

دانشمندی سے حصول مملکت میں اُن کے لیئے مفید ہوگیا تھا۔ نہ اُن کا باضابطہ کوئی سلسلہ تھا اور نہ وہ درویشی طریقہ پر سلسلہ چلانا پسند کرتے تھے۔ بلکہ وہ ایک مُلکی اور جنگی بیعت لیتے تھے جس کو فقیری بیعت سے کچھ علاقہ نہیں +

ایسی صاف صورتوں میں کوئی منصف مزاج مُلا صاحب کی فوج کو درویش نہیں کہہ سکتا۔ لہٰذا ان خونی درویشوں کو اصلی اور حقیقی درویشوں سے جدا کیا جاتا ہے +

اب مسلمانوں میں کوئی خونی درویش باقی نہیں رہتا جس کی ہستی پر غور کرسکیں۔ اور نظر ہند۔ وؤں کے ایک فرقہ پر جاتی ہے جو باعتبار لباس درویش معلوم ہوتا ہے۔ مگر کام درویشی کے نہیں کرتا۔ فقیری لباس کی آڑ میں پوشیدہ ہو کر حصول مملکت کے منصوبے پورے کرتا۔ بم اندازی اور پستول بازی کے کرشمے دکھاتا ہے +

یہاں بھی ہم کو اس سے کچھ بحث نہیں ہے کہ ان کی یہ کوشش جائز ہے یا ناجائز۔ بلکہ کلام اس روش اور طرز میں ہے کہ اس سیاسی جماعت کو طرز درویشی استعمال کرنا زیبا ہے یا نہیں +

کلکتہ میں میں نے ان مصلحتی درویشوں کے سرگروہ بابو آربند و گھوش سے محض اسی مسئلہ کے متعلق باتیں کرنے کے لیئے ملاقات کی۔ آربند و گھوش بنگال کے نامور فضلا میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کی انگریزی قابلیت کا بڑے سے بڑے انگریزی دانوں کو اعتراف ہے۔ اگر نوکری کرنی چاہیں تو نہایت معزز عہدہ انگریزی گورنمنٹ ان کو عطا کرے۔ مگر انھوں نے اپنی دانست میں زندگی ملک پر قربان کر دی ہے۔ اس لیئے بہت سادہ طریق سے بسر اوقات کرتے ہیں۔ اور نوکری نہیں کرنا چاہتے۔ ابھی تھوڑا عرصہ ہوا جب بنگالی بم اندازی اور بم سازی کے جرائم میں پکڑے گئے تھے۔ جن کی مدت تک اخباروں میں شہرت رہی تھی۔ بابو آربند و گھوش بھی اس جماعت کے ساتھ ماخوذ تھے لیکن تحقیقات سے ان کی شرکت کا کوئی قانونی ثبوت نہ پہونچ سکا اس لیئے بری کر دیئے گئے۔ جیل خانے سے واپس آکر انھوں نے کلکتے میں ایک ہفتہ وار انگریزی زبان کا اخبار جاری کیا۔ جس کا نام "کرمہ یوگن" ہے۔ کہتے ہیں اس اخبار کا لہجہ انقلاب انگیز ہے مگر ایسے عاقلانہ پیرائے سے مرتب کیا جاتا ہے کہ قانونی مواخذہ کی حد دور رہ جاتی ہے +

القصہ جب میں نے معلوم کیا کہ بابو آربند و خود بھی سنیاسی ہو گئے ہیں اور سنیاسی لباس میں پولٹیکل مشن چلا رہے ہیں۔ اور تمام پولٹیکل سنیاسیوں کی افسری بھی ان ہی کو حاصل ہے تو ملنا ضروری سمجھکر ایک دن ملاقات کی۔ آربند و اُردو بہت کم جانتے ہیں اس لیئے ترجمان کے ذریعہ سے انگریزی میں باتیں ہوئیں +

اوّل تو میں نے یہ دیکھا کہ آربند و کا لباس درویشی نہیں ہے اور نہ اُن کے گرد و پیش کوئی اس لباس کا نظر آیا اس لیئے جو خبر مجھ کو دی گئی تھی اُس میں شبہ پیدا ہوا۔ پہلا سوال میں نے آربند و سے یہی کیا۔ کہ کیا تم سنیاسی ہو گئے ہو؟ جس کا جواب انھوں نے متانت آمیز تبسم سے یہ دیا کہ میں باعتبار ظاہر سنیاسی نہیں ہوئی۔ مگر میرا دل سنیاس کو پسند کرتا ہے اور وہ سنیاسی ہو چکا ہے۔ میں نے دریافت کیا۔ تمہارے گرو کون ہیں؟ کہا سوامی ودیکا نندجی۔ اس کے بعد میں نے کرم یوگ کی حقیقت پر گفتگو شروع کی۔ اور پوچھا۔ اخبار کا نام کرم یوگن کیوں رکھا ہے؟ جس کا جواب معمولی طور پر یہ دیا گیا کہ اس اخبار کا مقصد لوگوں کو اُن کے فرائض سے آگاہ کرنا ہے۔ اور یہی معنی کرم یوگ کے ہیں۔ کہا گیا کہ کیا گیتا کے کرم یوگ سے اس کو کوئی تعلق نہیں ہے؟ جہاں سری کرشن جی نے ارجن کو انقلاب پیدا کرنے کا فلسفہ بتایا ہے۔ یہ سُنکر آربند و نے اپنے دور اندیش دماغ کو جنبش دی اور کہنیاں میز پر ٹیک کر مصنوعی مسکراہٹ ظاہر کر کے سر ہلایا۔ اور گیتا

کی پیروی کا اقرار کیا۔ لیکن اس اقرار کے بعد ان کا چہرہ فکرمند نظر آنے لگا جس کو وہ اپنی عقلمندی سے دور کرنے کی کوشش کر رہے تھے ٭

آخر سوالات کی نوبت اُس مقام پر آگئی جو ملاقات کا اصل مقصود تھا۔ کیونکہ اس بات کا یقین ہوگیا تھا کہ گو یہ خود درویشی لباس میں نہیں ہیں مگر پولیٹکل درویشوں کی مرشدی کا منصب انہیں کو حاصل ہے۔ یہ باتیں بہ طور سوال وجواب کے نہیں ہوئیں بلکہ مشورے کے طریق سے کہا گیا کہ جس طرح آپ کو ہندوستان اور اس کے علوم سے محبت ہے میں بھی بحیثیت ایک ہندوستانی کے ان علوم کا شیدا ہوں۔ ویدانت نے اپنی برتری وخوبی کا سکہ یوروپ وامریکہ میں بھی جیلانا شروع کر دیا ہے اور اس سے ہم کو اسی قدر خوشی ہے جتنی آپ کو ہوتی ہوگی۔ مگر جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ بعض پولیٹکل کام کرنے والے جن کو ویدانت سے کچھ تعلق نہیں ہوتا جو سنیاس یوگ کی ذمہ داریوں سے ناآشنا ہوتے ہیں محض ملکی مصلحت سے سنیاسیوں کا لباس پہنتے ہیں۔ اور اس لباس میں بم اندازی وپستول بازی کرتے ہیں تو افسوس ہوتا ہے۔ کیونکہ اس سے درویشی لباس سلطنت کی نگاہ میں مشتبہ ہوجاتا ہے۔ اور بیچارے غیر پولیٹکل درویش خواہ مخواہ پولیس کے شک کا شکار ہوتے ہیں۔ اگر حالات کی یہی صورت رہی تو ایک دن تمام ملک کے فقرا خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان اطمینان سے یادِ الٰہی نہ کر سکینگے۔ اور روحانیت کی تلقین کمزور ہوجائے گی۔ اور آپ سمجھ سکتے ہیں کہ روحانیت کو ضرر پہونچنا ملک کا کتنا بڑا نقصان ہے۔ جس دولت کے سبب ہندوستان اور ایشیا تمام یوروپ وامریکہ میں عزت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے وہ یہی روحانی جواہرات ہیں۔ آپ مادّی دولت وحکومت کی طلبگاری میں اس اصلی دولت کو برباد نہ کیجیے۔ اور اپنی جماعت کو فہمایش کیجیے کہ درویشی لباس ترک کر دے ٭

اس کا جواب بابو آربندو نے ایسا دیا کہ جس سے معلوم ہوتا تھا کہ باوجود اعلےٰ قابلیت کے اس اعتراض کا تسلی بخش جواب اُن کے پاس نہیں ہے۔ چنانچہ انھوں نے یہ عذر کرکے بات کو ٹالنا چاہا کہ سادھو اور درویش اپنی بد اعمالیوں کے سبب پہلے ہی مشتبہ و بدنام ہو رہے ہیں۔ اب مزید بدنامی کا انہیں اندیشہ نہ چاہیئے ٭

میں نے کہا اعمال کی بدنامی اصلاح حال سے درست ہوسکتی ہے لیکن اس ناجائز اور خوفناک شبہ کی بدنامی ہرگز دور نہیں ہوگی جب تک کہ یہ طریقہ ترک نہ کیا جائے۔ جو پولیٹکل درویشوں نے شروع کیا ہے۔ اس کا جواب کچھ نہ دیا گیا اور معلوم ہوا کہ بابو صاحب مکالمہ کی اہمیت کے سبب زیادہ توضیح وتشریح پسند نہیں کرتے۔ لہٰذا گفتگو کسی مفید نتیجہ پر پہونچنے سے پہلے ختم ہوگئی ٭

لیکن ہر محب وطن ہندوستانی کا فرض ہے کہ اس گفتگو کے مقصد کو ختم نہ سمجھے اور اس بات کی کوشش کرے کہ پولیٹکل مشنری درویشی ہیئت میں نہ رہیں۔ سوامی ودیکانند بابو آربندو گھوش کے گرو تھے۔ اور سوامی ودیکانند کے گرو سوامی رام کرشن پرم ہنس جی تھے۔ جو دورِ آخر میں بنگال کے نہایت خدارسیدہ اور عارف بزرگ مانے جاتے تھے۔ میں نے اُنکی زندگی کے حالات پڑھے ہیں۔ عجب پُراثر زندگی تھی۔ دہلی کے رسالہ تہذیب نے اردو زبان میں اُن کے سوانح شایع کیئے ہیں جو لالہ چند ولال صاحب چاول والے سے چھ آنے میں دستیاب ہوتے ہیں۔ پرم ہنس جی کے تارک دُنیا چیلے دو چار اب بھی کلکتے میں موجود ہیں۔ اور ایک متھ میں رہتے ہیں۔ سوامی سردھانند جی سے جو باغ بازار کلکتہ میں رہتے ہیں میں نے بھی ملاقات کی۔ بہت اچھے درویش ہیں۔ اور اپنے گرو کے فیضان کا موثر حصہ رکھتے ہیں۔ مگر ان درویشوں میں پولیٹکل چل چل کا کوئی لگاؤ میں نے محسوس نہ کیا۔

میری خواہش ہے کہ سوامی پرم ہنس کے تمام ممتاز چیلے بالاتفاق اس بات کی کوشش کریں کہ درویشی صورت میں پولٹیکل مشن بند ہوجائے اور میں یقین کرتا ہوں کہ اگر وہ چاہیں تو بہت آسانی سے ایسا کرسکتے ہیں +

بہرحال اس تمام سمع خراشی کا نتیجہ یہ ہے کہ درویشی لباس کی شان اور اصلی حیثیت کی حفاظت میں ہم سب خواہ ہندو ہوں یا مسلمان یکساں کوشش کریں۔ کیونکہ درویشی ہی ایک ایسا کوچہ ہے جس میں ہندو مسلمان کا امتیاز نظر نہیں آتا +

درویشی شہادت نامہ

از نظام المشائخ فروری ۱۹۱۰ء

شہادت کیا چیز ہے؟

اصطلاح میں شہادت ایک قسم کی قربانی کو کہتے ہیں جو مذہبی یا ملکی یا معاشرتی امور کی حمایت میں ظاہر ہو یعنی اگر کوئی شخص مذہب یا ملک یا رسم و رواج کی حفاظت میں جان دیدے تو اُس کو شہید کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ دیگر ممالک اور مذاہب میں بھی شہادت کے لفظ کا کوئی مفہوم باقاعدہ موجود ہو۔ مگر ہم کو جہاں تک اس مسئلہ میں گفتگو کرنی ہے اُسکا تعلق صرف اسلام سے ہے +

اسلام نے ظاہر ہو کر جو زبردست اور دلزلہ انگیز چیز پیدا کی وہ شہادت کا عقیدہ تھا۔ ہر شخص جسنے اپنے سر کو اسلام کے آگے جھکایا تھا اپنے وجود کو شہادت کی قربان گاہ میں فنا کر دینے کا متمنی اور طلبگار نظر آتا تھا۔ مسلمانوں کو یقین ہوگیا تھا کہ

ایک وجود کی فنا دوسرے وجود کی بقا

کے لیے لازمی ہے۔ جب تک ہم یہ اجسام اسلام پر نثار اور فدا نہ کریں گے۔ جسد اسلام مستحکم کائنات نہیں بن سکتا۔ لہٰذا اُن کے بچوں۔ بوڑھوں اور عورتوں تک میں شوق شہادت کا جذبہ موجیں مارا کرتا تھا۔ اور بارہا دیکھا گیا کہ ان جنگی میدانوں میں جہاں بڑے بڑے شیروں۔ جوانمردوں کا کلیجہ کانپ جاتا ہے وہاں مسلمانوں کی خانہ نشین نازک کلائیوں والی عورتیں دلیری و بیباکی سے تلوار چلاتی تھیں۔ انسانی خون کے رنگ کی مہندی لگاتی تھیں۔ خاک و خون سے لتھڑے ہوئے کپڑے ان کو اطلسی و حریری لباس کا لطف دیتے تھے۔ اور عرصۂ کارزار کی جگر خراش آہ و بکا اُن کے کانوں میں شیریں نغمے بن کر جاتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ تکبیروں کے نعرے مارتی ہوئی برچھیوں اور تلواروں کی نوکوں سے رزم گاہ کو درہم و برہم کر ڈالتی تھیں +

یہ ذوق شہادت جس گھرانے کا عطیہ تھا خدا تعالےٰ نے اُسی خاندان کو نمونہ بنا کر دکھایا۔ جس سے شہادت کی اصلی شان نظر آگئی۔ مگر ہم پہلے یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اس کائنات ہستی میں آکر اشیاء کا ظہور دوسری اشیاء کی شہادت یعنی فنا سے ہوتا ہے

جنس آدم سے قطع نظر کر کے عناصر اربعہ کے اجزاء کو علٰحدہ علٰحدہ دیکھیے کہ جب تک ایک وجود فنا نہیں ہوتا۔ دوسرا وجود موجود و ہستی پذیر نہیں ہوسکتا۔ آگ کی ہستی کو معدوم کرنا ہو تو پانی کا وجود قربان کیجیے۔ پانی کا نشان مٹانا ہو تو آگ کی زندگی خرچ کیجیے +

بھاپ جس کے بل پر نئی دُنیا کے کارخانے چل رہے ہیں۔ ریلیں دوڑتی پھرتی ہیں۔ جہاز سمندر میں لہراتے ہیں۔ یہ کیا ہے۔ اور کیونکر پیدا ہوتی ہے؟ سب جانتے ہیں کہ پانی کی شہادت و قربانی سے جو آگ کی تپش سے ہوتی ہے بھاپ کا طلسماتی جسم تیار ہوتا ہے۔ یعنی پانی آتشی حرارت کے خنجر سے ذبح ہو کر اپنا جسم چھوڑ دیتا ہے اور بھاپ کی شکل اختیار کر لیتا ہے +

دانہ خاک میں ملتا ہے۔ اپنا نام و نشان مٹاتا ہے تو شگوفہ اور درخت کا وجود ظاہر ہوتا ہے۔ دانہ شہید نہ ہو۔ اپنی ہستی قربان نہ کرے اور کہے میں کیوں پرائے واسطے اپنے تئیں خاک میں ملاؤں اور برباد کروں تو تمام دُنیا بھوکی مر جائے۔ کیونکہ دانہ ہی کی قربانی ہے جس کی بدولت چار دانے پیدا ہوتے ہیں اور انسان و حیوان اُن کو کھا کر اپنی زندگی قایم رکھتے ہیں +

روئی اپنے وجود کی قربانی کرتی ہے تو سوت تیار ہوتا ہے اور آدمی کی تن پوشی کے قابل بنتا ہے۔ ورنہ سب برہنہ مادر زاد پھرا کرتے۔ یا درخت کے پتوں سے ستر پوشی کرتے۔ مگر اس میں بھی یہ اندیشہ تھا کہ درخت پتوں کی قربانی سے انکار نہ کر دیں +

کھانے میں صرف دانے کی مثال پر موقوف نہیں ہے۔ دانہ کے بعد شہادت اور قربانی کا سلسلہ دور تک جاتا ہے دانوں کی شہادت سے آٹا ظاہر ہوتا ہے۔ آٹے کی شہادت سے روٹی نمودار ہوتی ہے۔ روٹی کی شہادت سے پرورش کا ظہور ہوتا ہے۔ الغرض اسی شہادت کی بنیاد پر سب کارخانہ قایم ہے +

تیل نہ جلے تو تاریکی کون دور کرے۔ روشنی کہاں سے پیدا ہو۔ بتی آتشی آرہ سر پر نہ چلوائے تو لوگ اندھیرے میں ٹکراتے پھریں۔ اور ہاں جن کے دم سے سب گھروں میں روشنی ہے اور جن کو حقارت سے تنکا سمجھا جاتا ہے وہ تو شہادت کی خاص شان رکھتے ہیں۔ اُن کی مقبول شہادت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا +

دیاسلائی کی شہادت

یہ ذرا تفصیل سے غور کیجیے۔ عجب دردناک قصہ ہے۔ جنگل میں ایک ہرا بھرا درخت لچکدار شاخوں اور نرم نرم پتوں سے چھایا ہوا کھڑا تھا۔ ایک صاحب گئے اور ایک نئے وجود کے لالچ میں درخت کو شہید کر ڈالا۔ اس کے بعد ایک گرم چشمے کے گھونٹ لیتے ہوئے پانی میں جوش دیکر کھال کھینچ لی۔ پھر مشین کے دوسرے خنجر سے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے تیسری مشین نے یہ صورت بھی مٹا دی اور چھیل کر پرت بنا دیے۔ چوتھی نے اُن پرتوں کو بھی کتر ڈالا۔ اور دیاسلائی کے ننھے ننھے تنکے بن گئے۔ ان تنکوں کو اوّل گندھک اور تیزاب کے پانی سے وضو کرایا گیا۔ اس کے بعد بکس کی مسجد میں بھیج دیا۔ اب میاں تنکے بکس کی سیاہ جانماز پر ایک ہی رگڑا دار سجدہ کرنے پائے تھے کہ غیبی خنجر آگ کی صورت میں نمودار ہوا

اور تنکے کو شہید کر دیا۔ تنکا تو آن کی آن میں جلکر نابود ہوگیا مگر اُس کی شہادت ایسی مقبول ہوئی کہ فوراً خانۂ تاریک روشنی میں آگیا۔ مسجد۔ گرجا۔ مندر۔ شراب خانہ۔ غرض ہر مقام نے تنکے کی شہادت سے فائدہ اُٹھایا۔

باغ میں تشریف لیجایئے۔ نہر کا پانی درختوں میں آکر جذب و فنا ہو رہا ہوگا۔ باغ کی شادابی اسی شہادت پر منحصر ہے پانی قربان نہ ہو تو درخت جل کر رہ جائیں۔

ذرا پھولوں کو بھی دیکھیے کیا بہار ہے۔ توڑ لیجیئے۔ یہ نازک ہستی بھی شہادت کا ارمان رکھتی ہے اور وہ یہی ہے کہ آپ ان کو توڑلیں۔ اور ٹہنیوں کے سایہ سے جدا کر کے اپنے ساتھ گھر لے جائیں۔ ہار بنا کر گلے میں ڈالیں۔ چادر بنا کر قبر پر چڑھائیں۔ سہرا گوندھ کر سر پر رکھیں۔ یا شکر ملا کر گلقند بنائیں۔ ہر حال میں خدمت کو حاضر ہیں۔ یہ قربانی سے انکار کرلتے تو تفریح کی کتنی کیفیتیں نابود رہتیں +

ہا۔ مگر آپ کس قدر نا انصاف ہیں۔ ان پھولوں کو شہید کر کے گھر لے چلے تو پتوں کا دونا بنالیا۔ تاکہ سورج کی تپش سے ان کا جسم کُملا نہ جائے۔ مگر کربلا میں اپنے رسولؐ کے نواسے کو شہید کر کے دُھوپ میں تپنے دیا۔ اور حرم رسولؐ کو جو گلاب کی پنکھڑیوں سے زیادہ نازک اور لطیف تھیں بے چادر کر کے پھرایا۔ یہ خیال نہ کیا کہ یہ بھی پھول میں مُرجھا جائیں گے +

القصہ نتیجہ ان سب مثالوں سے یہ نکلا کہ شہادت دوسرے کے فائدے کے واسطے اپنا وجود فنا کر دینے کا نام ہے اور یہ ایسی چیز ہے جس کی تمام موجودات میں ضرورت ہے۔ جو شخص اس ضرورت سے انکار کرے وہ گویا تمام بدیہات سے انکار کرتا ہے اور اُس کو بصارت و بصیرت سے محروم سمجھنا چاہیئے۔

شہادت خوشی کی چیز ہے یا غم کی؟

اب یہاں ایک نہایت باریک اور نازک سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب شہادت کارخانۂ عالم میں ایسی مفید اور ضروری شئے ہے تو اس کے سبب ماتم کیوں کیا جاتا ہے۔ غمگینی و افسوس کو اس سے کیا تعلق۔ آہ و بُکا کا اس سے کیا سروکار۔ مگر یہ کچھ ایسی پیچیدہ بات نہیں ہے جس کا جواب نہ ہو۔ جو چیز شہید ہو رہی ہے اُس کو تو اپنی موت کا کچھ افسوس اور غم نہیں ہوتا۔ اور نہایت بے پروائی اور اطمینان سے اپنی ہستی مٹانے کو آمادہ ہوتی ہے۔ مگر غیروں کے دل پر اس کی چوٹ کا لگنا فطرتی امر ہے۔ بشرطیکہ اُن دلوں میں آدمیت کا حس اور درد شناسی کا مادّہ بھی ہو۔ پروانہ اگر شمع کی شہادت دیکھ نہ سکے اور بے چین ہوکر در و دیوار سے سر ٹکرائے تو شمع لو نفس شہادت پر کوئی الزام قایم نہیں ہوسکتا۔ یہ تو بہت بڑی خود غرضی ہے کہ جس چیز نے ہمارے فائدہ کے لیئے اپنی جان دیدی اُس کا ہم رنج بھی نہ کریں +

جو بتّی پہلے جل چکی ہوتی ہے۔ اُس کا سرا آگ جلدی پکڑ لیتا ہے لیکن کوری اور نئی بتّی کو جسنے پہلے آگ کی شکل نہ دیکھی ہو۔ مشکل سے روشن کیا جاتا ہے۔ اسی طرح جن دلوں میں اللہ تعالیٰ نے محبت کی آگ کا نشان لگا دیا۔ وہ تو عالم کی تمام شہادتوں میں درد محسوس کرتے اور اثر پذیر ہوتے ہیں۔ لیکن جو ازل سے سنگین سرشت پیدا ہوئے ہیں۔ وہ اس بھید کو سمجھنا کجا سمجھنا چاہتے بھی نہیں +

شہادت حضرت امام علیہ السلام کے جس قدر واقعات شعرا نے لکھے ہیں اور اُن میں شہیدوں کی بے سر و سامانی اور مایوسی

کی تصویریں کھینچی ہیں یا اُن کے اہلبیت عہ کی بیقراری و نالہ وزاری کے نقشے دکھائے ہیں۔ یہ سب ہمارے غم کو اُستوار اور اثردار کرنے کے لیے ہے۔ ورنہ ان باتوں کی کچھ اصلیت نہیں۔ حضرت امامؑ اور اُن کے خاندان نے شمع سے بڑھکر سکوت و اطمینان ظاہر کیا۔ اور نہایت دلیری و ثابت قدمی سے ظہورِ حق کے لیے جانیں قربان کردیں۔

اسلام میں شہادت کی ابتدا

یہ معلوم کرنے کے بعد کہ شہادت کیا چیز ہے۔ اور دُنیا میں اسی کے بل پر صدہا کام چلتے ہیں اب یہ جاننا چاہیئے کہ اسلام میں شہادت کا دور کب شروع ہوا۔ اور کون کون بزرگ سب سے پہلے درجۂ شہادت کے وارث قرار پائے +

حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے پہلے معرکہ کی لڑائی بدر میں پیش آئی تھی۔ جہاں آپ کے مٹھی بھر صحابہ نے کفار قریش کے دَل بادل لشکر کو میسکر رکھ دیا۔ اس معرکہ میں جو مسلمان شہید ہوئے اُن کا مرتبہ بعد کی لڑائیوں کے شہدا سے زیادہ مانا جاتا ہے۔ بلکہ جو لوگ زندہ واپس آگئے وہ بھی شرکت بدر کا فخر شہدا کی طرح کرتے تھے۔ اور مسلمان ان کے فخر کو تسلیم کرکے ان کی عظمت و بزرگی کو دیگر مجاہدین پر فوق دیتے تھے۔ اسی طرح شہادت کا سلسلہ بدر سے اُحد وغیرہ میدانوں کے سبب جڑ پکڑتا گیا۔ یہاں تک کہ مسلمانوں میں آج تک دین کی حمایت و حفاظت میں جان دینا شہادت خیال کیا جاتا ہے +

مگر مشایخ صوفیہ نے جس شہادت کو سب سے برگزیدہ شہادت مانا ہے وہ فنائے نفس اور فنائے ماسوی اللہ ہے اس اعتبار سے دیکھا جائے تو اسلام میں سب سے پہلے بڑی عمر والوں میں حضرت ابوبکر صدیق رض تھے اور چھوٹی عمر میں حضرت مولیٰ علی ع تھے۔ اور عورتوں میں بی بی خدیجۃ الکبریٰ تھیں۔ جنھوں نے تمام قوم۔ تمام ملک بلکہ تمام دُنیا کو لات مارکے کلمۂ توحید کے آگے سر جُھکایا۔ اور تمام ملکی قومی۔ خاندانی تعلقات کو ترک کرکے خنجر سے ذبح کرڈالا

اس شہادت کے بعد دوسری شہادت کا رتبہ حضرت مولیٰ علی رض کو اور حاصل ہوا اور وہ ہجرت کا زمانہ تھا۔ جبکہ کفار نے حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے شہید کرنے کا پختہ ارادہ کرلیا تو آنحضرتؐ نے مدینہ شریف کو ہجرت کرنی چاہی مگر کفار نے گھیرا ڈال رکھا تھا جس سے بچکر نکلنا آسان نہ تھا۔ اس وقت ایک فدائی کی قربانی درکار تھی۔ جو آپ کے بستر پر لیٹ رہے اور آپ کے عوض اپنی جان دیدے۔ لڑکر مرجانا دوسری بات ہے۔ یوں موت کے منہ میں کوئی نہیں جاسکتا۔ مگر آنحضرتؐ کے قدیمی فدائی علیؑ نے جو ایک بار شہادت کا رتبہ حاصل کر بھی چکے تھے۔ اس امتحان جوکھوں کو قبول کیا اور بستر رسولؐ پر لیٹ گئے ان دو شہادتوں کے بعد آپ کو تیسری شہادت بھی خدا تعالیٰ نے عطا فرمائی یعنی ابن ملجم کے خنجر سے زخمی ہوکر شہید ہوئے +

لڑائیوں سے قطع نظر اسلام میں سب سے پہلے شہید عمر فاروق رض ہیں جو ایک پارسی غلام کے ہاتھ سے مسجد میں شہید ہوئے آپ کے بعد تیسرے خلیفہ حضرت عثمان غنی رض کو مسلمانوں کے ایک گروہ نے غلط فہمی سے شہید کردیا۔ اگرچہ آپ کی شہادت محض غلط فہمی کے سبب ہوئی۔ یعنی محمد بن ابی بکر وغیرہ کی جماعت کو آپ کی نسبت وہ شبہ ہوا جس کا آپ کو مطلق علم نہیں تھا اور جس میں آپ کی بے گناہی کا سب کو اقرار ہے۔ مگر آپ کی شہادت نے اس امر کا راستہ کھول دیا کہ خود مسلمان اپنے ہم مذہب لوگوں

کو شہید کرنے لگے۔ حالانکہ کفّار کے ہاتھوں شہادت کا جام حاصل ہوا کرتا تھا۔

حضرت مولیٰ علیؑ کی شہادت کے بعد اُن کے بڑے صاحبزادہ سیدنا حضرت امام حسنؑ کو مسلمانوں نے زہر دیکر شہید کر دیا۔ اور پھر آپ کے چھوٹے فرزند سیدنا حضرت امام حسینؑ کو کربلا میں لیجا کر مسلمانوں ہی نے بھوکا پیاسا ذبح کر ڈالا۔ اور یہی وہ شہادت ہے جو اسلام میں سب شہادتوں سے زیادہ مشہور۔ زیادہ پُر درد۔ زیادہ درجہ والی۔ زیادہ ہر دلعزیز اور نہایت مہتم بالشان چیز مانی جاتی ہے اسی شہادت کی یادگار میں ہمنے بھی اپنے رسالہ کا شہید نمبر نکالا ہے۔

سیدنا و مولانا حسینؑ کی شہادت کو اتنی اہمیت کیوں دی جاتی ہے۔ حالانکہ ان سے پہلے اور ان کے بعد سیکڑوں مسلمان نہایت بیکسی اور بے بسی کے عالم میں شہید کیئے گئے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جو حالات اور واقعات سیدنا و مولانا حسینؑ کو پیش آئے اُن کا سا نہ گزشتہ تاریخوں میں ذکر پایا جاتا ہے۔ نہ بعد کے تذکروں میں اس قسم اور اس طرز کا کوئی واقعہ موجود ہے +

سیدنا و مولانا حسینؑ کی شہادت میں حسب ذیل خصوصیات تھیں جو اور کہیں نہیں پائی جاتیں +

آپ اُس زمانہ میں تھے جب کہ اسلام کا نشو و نما تازہ تازہ ہوا تھا اور ہر فرد کے دل میں اپنے مذہب کی محبت ہر چیز سے زیادہ پیاری تھی خاصکر اپنے رسول کی الفت میں ہر مسلمان کا یہ عالم تھا کہ وہ دل و جان سے آنحضرتؐ پر نثار تھا اور آپ کے تعلق کی ادنیٰ سے ادنیٰ چیز مسلمانوں میں بہت بڑے ادب کی مستحق مانی جاتی تھی۔ ایسی حالت اور ایسے زمانہ میں خاص رسول کے نواسہ پر مسلمانوں کا یہ ظلم و ستم کرنا کسقدر عجیب تھا اور حضرت مولانا و سیدنا حسینؑ کے دل پر جو صدمہ اُن لوگوں کی بے وفائی و جفا شعاری کا گزرتا ہوگا وہ ہزار خنجر و سناں سے بڑھکر تھا کہ کل کے دن جو لوگ رسولؐ کے نواسہ کی حیثیت سے اپنی آنکھیں میرے قدموں میں بچھاتے تھے۔ آج وہ میرے سینہ پر پاؤں رکھکر گلا کاٹتے ہیں +

(۲) اہل و عیال کی معیت بھی ایک ایسی خصوصیت ہے۔ جس کی نظیر تاریخ میں کم ملے گی۔ ممکن ہے کہ کسی مقتول کے ساتھ اُس کے خاندان والے بھی ہوں مگر جو حالت سیدنا و مولانا حسینؑ کو بال بچوّں کے ہمراہ ہونے سے پیش آئی۔ وہ اور کسی کو ہرگز ہرگز پیش نہ آئی ہوگی۔ مختلف سن و سال کی عورتیں۔ ننھے ننھے بچّے۔ اور وہ بھی بیمار۔ جن کو ہر مذہب و قوم نے قابل رحم سمجھا ہے۔ تین روز بھوک پیاس سے تڑپے۔ مگر حضرت کو بے کسی کے سبب کچھ چارۂ کار نہ تھا +

ہمارے عقیدے میں اُس وقت خیمۂ امامؑ کی یہ تصویر تھی۔

ظہر کا وقت۔ صحرائے عرب کی تپش۔ خیمے کی قناتوں سے آگ کی لپٹیں آ رہی ہیں۔ پانی کو بند ہوئے دوسرا دن ہے۔ حضرت امام مستورات کے خیمے میں تشریف لے گئے۔ دیکھا۔ سب کے چہروں پر بھوک پیاس کی شدّت سے ہوائیاں اُڑ رہی ہیں۔ ہونٹ خشک ہیں اور آنے والے وقت کے کھٹکے سے سب پر یاس و ہراس کا عالم طاری ہے۔ آپ نے اپنی ہمشیرہ حضرت زینبؑ سے کہا۔ بہن! اگر تمہاری رائے ہو تو یزید کی بیعت قبول کر لوں۔ کیونکہ مجھ سے تمہاری تکلیف نہیں دیکھی جاتی۔ اور خبر نہیں میرے بعد تم پر اور کیا کیا ظلم و ستم ہو۔ بیعت کے اقرار سے یہ مصیبت جاتی رہیگی۔

اکیلے اور بے یار و مددگار بھائی کی زبان سے یہ کلمے سُنکر حضرت زینبؑ نے اپنی چادر کے آنچلوں کو اُلٹ دیا۔ اور بنی ہاشم کے تیوروں میں بیباک ہو کر بولیں۔ بھائی! تم میرا امتحان لیتے ہو۔ ہاشم کے گھر کی لڑکیاں کم ہمّت اور ڈرپوک نہیں ہوتیں۔ وہ اپنی آن اور حق کی حمایت میں جان دینی کچھ بات نہیں جانتیں۔ اے بھائی جاہلیت کے زمانہ میں عرب کی عورتیں بچّہ کی پیدائش کے وقت سب سے بڑی آرزو اُس بچّہ کی یہ کرتی تھیں۔ کہ میدانوں میں تلوار چلانے والا۔ خون میں نہلانے اور نہانے والا ہو۔

پھر اسلام نے اس جنگی خیال کو شہادت کے درجات بیان کرکے اور بھی مستحکم کر دیا۔ تو کیا ہم میں عرب نسل اور مسلمان ہونے کے باوجود حرارت نہیں ہے۔ یا حسین! میں علیؓ کی بیٹی ہوں۔ جو خون کے میدانوں میں بے پروائی سے گھوڑا دوڑاتا تھا۔ جو دشمن سے ڈرتا نہیں تھا۔ بلکہ شبیر کی طرح اپنے بچوں سے کھلاڑیاں کرتا تھا۔ وہ جو فقر و فاقہ میں بھوک پیاس کو شرافت کا جوہر سمجھتا تھا۔ میں اپنے باپ کی اصل نسل لڑکی ہوں۔ مجھ کو عیب نہ لگا۔ میں تیرے سر کو خاک و خون میں لتھڑا ہوا دیکھ کر فخر کروں گی کہ ہم وہ لوگ ہیں کہ حق کی پاسداری میں کٹ کر مرجاتے ہیں۔ اگر تو نے یزید کی بیعت قبول کرلی تو ہمارے خاندان کے لیئے اس سے بڑھ کر اور کوئی ننگ و عار نہ ہوگی کہ ایک فاسق فاجر کی بیعت زندگی کے لالچ سے منظور کرلی۔ میں جانتی ہوں کہ تو میری زندگی کا سہارا ہے۔ تیرے سوا میرا دنیا میں کوئی میرا نہیں۔ اور ایک فقط مجھ پر کیا منحصر ہے۔ رسولؐ کے خاندان میں ہر شخص تیرے وجود کو اپنا سہارا اور پناہ سمجھتا ہے۔ مگر غریب زینب کے لاچار بھائی۔ حق بات کی حمایت میں جان دیدے۔ ہمارا کچھ فکر نہ کر۔ ہم تکلیف و مصیبت کو آسانی سے برداشت کرنے والے لوگ ہیں ٭

حضرت زینبؓ کی تقریر ختم ہوچکی تو امام اپنی زوجہ حضرت شہربانو کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا:۔
تم کہو۔ تمہارا کیا خیال ہے؟۔ بانو نے شرم آلود ادب سے نظریں جھکا کر کہا۔ میں ہر حال میں تابع فرمان ہوں۔ جو میرے مالک کی مرضی ہو۔ اُس کی تعمیل کروں گی۔ اگرچہ میں حضرت زینبؓ کی طرح فخر تو نہیں کرسکتی۔ مگر اتنا ضرور عرض کروں گی کہ میری پیدایش ایران کے شہنشاہ کے گھر میں ہوئی تھی۔ اور اب بھی ایک شہنشاہ کے گھر میں ہوں۔ پس ایک حرارت والا اور ہمت والا دل میرے سینہ میں بھی حرکت زن ہے۔ نازک وقت میں میری بے صبری کا اندیشہ میری توہین و حقارت ہے۔ اے امام! ان سب بچوں کو جو میری گود کی زینت ہیں بلکہ برسوں کی محنت سے پالا ہے۔ جن کے دیکھنے سے میری زندگی قایم ہے۔ میدان میں لیجائیے۔ اور قربان کردیجیئے میں بھی قربان اور یہ بچے بھی۔ میں نہیں چاہتی کہ آپ حق کی پاسداری کے خیال کے خیال سے چھوڑ دیں۔ چلیئے۔ تاجدار ایران کی لڑکی اپنے شریف خون کا وصف دکھائے۔ میدان میں چلیئے۔ میں رکاب تھام کر چلوں گی۔ اور تیر و سنان کے میدان میں آپ کے قدموں پر جان دیدوں گی ٭

حضرت امام رضؓ عورتوں کی اس دلیری سے بہت خوش ہوئے اور فرمایا۔ شاباش۔ ایسا ہی خیال رکھنا ٭
ان باتوں کے باوجود حضرت امام بشر تھے۔ جوان جوان بچوں کا سامنے کٹ جانا۔ ننھے ننھے بچوں کا بھوک پیاس سے بلکنا اور اسپر یہ خیال کرنا کہ میرے بعد میرے ناموس کا کیا حال ہوگا۔ ایسا نہ ہو کہ بنی ہاشم اور رسولؐ کے گھر کی مستورات کے ساتھ دشمن ناروا بےعنوانی کریں۔
الغرض بال بچوں کی ہمراہی بھی ایک بڑا امتحان تھا۔ جس نے حضرت کی شہادت میں خاص خصوصیت پیدا کردی تھی ٭

(۳) بھوک پیاس میں بہت آدمی شہید ہوئے ہوں گے۔ مگر جو کیفیت حضرت امام اور آپ کے خاندان کی تھی وہ کبھی کو پیش نہیں آئی۔ پورے تین شب و روز کا بھوکا پیاسا رہنا۔ گرمی کا موسم۔ عرب کی گرمی۔ چاروں طرف سے تکلیف کے اسباب گھیرے ہوئے تھے۔ پھر اس پر طرہ یہ کہ بچوں کی زبانیں پیاس کے مارے نکلی پڑتی تھیں۔ اور حضرت امام آنکھوں سے یہ تماشا دیکھتے تھے ٭
امریکہ کے ایک تشریح داں ڈاکٹر نے لکھا ہے کہ جب انسان ۲۴ گھنٹے پیاسا رہتا ہے تو اُس کے ہر رونگٹے میں ایسی

تکلیف ہوتی ہے گویا ایک انچ زخم پڑ گیا ہے۔ پس حضرت امامؑ اور آپ کے فدائی ۲ - ۲ گھنٹے کال پیاسے رہکر جب برچھی و تلوار کے زخم کھاتے ہوں گے تو ظاہر ہے کہ کیسی تکلیف ہوتی ہوگی۔ ایسی دردناک تکالیف کو برداشت کرنا اور امر حق سے قدم نہ ہٹانا شہادت کی اعلیٰ خصوصیت ہے ؎

(۴) سارا کنبہ آنکھوں کے سامنے کٹ گیا۔ سوائے ایک طفل بیمار کے کوئی باقی نہ رہا جس سے بقائے نسل کی امید ہو۔ اس پر بھی قول کی حمایت کرنا اور مرنے کو تیار ہو جانا مخصوص شہادت کا ثبوت ہے ؎

(۵) آخر وقت تک اپنے اشغال و قواعد کو جاری رکھنا اور مصیبت سے حواس باختہ نہ ہونا بھی خصوصیات امام سے ہے۔ حد ہے کہ سر کٹتے کٹتے نماز پڑھی اور سجدہ ناغہ نہ کیا ؎

اس شہادت کے بعد

اکثر سادات و مشایخ اسی قصور پر شہید ہوئے جو حضرت امامؑ کے ذمہ لگایا گیا تھا۔ یعنی جس طرح یزید بن معاویہ کو اندیشہ ہو گیا تھا کہ حضرت امام حسینؑ کی زندگی میں اُس کی بادشاہت پختگی سے نہیں جم سکتی۔ اس لئے کسی بہانہ سے ان کا قصہ پاک کر دینا چاہیئے۔ ایسے ہی حضرت امامؑ کے بعد متعدد اماموں بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ سب ائمۂ اطہار کو ہوس پرست نام کے سلطان بادشاہوں نے شہید کیا۔ بعض سادات کو ایسی بے رحمی سے شہید کیا گیا کہ اگر ان کی تفصیل کی جائے تو کلیجہ کانپ اُٹھے۔ سیدوں کے نازک جسم جو ریشمین کیڑوں کی طرح نرم اور خوبصورت تھے اموی اور عباسی خلفاء نے زندہ دیواروں میں چنوا دیے اور اُن غریبوں نے پھڑک پھڑک کر جان دی ؎

حضرت امام حسینؑ اور اُن کی اولاد کے بعد پولیٹکل بدگمانی کی وبا ایسی پھیلی کہ جو شخص عبادت و یاد خدا کے سبب خلقت میں ذرا عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا اُس بیچارہ پر آفت آ جاتی۔ یا تو جلاوطن ہوتا۔ یا کسی شرعی بہانہ کی آڑ میں قتل کر دیا جاتا۔ اس کی صدہا مثالیں تاریخ کے صفحوں پر موجود ہیں۔ جس میں سے چند اس شہید نمبر میں لکھی گئی ہیں۔ باقی پھر کسی موقع پر بیان ہوں گی ؎

حضرت شہاب الدین مقتول کو محض اُن کے کمالات و تسخیر خلایق کے سبب بے دردی سے مار ڈالا گیا حضرت منصور کو خفیہ منصوبہ باز تصور کر کے دار پر کھینچ دیا۔ سرمد کو دارا کا درد مند یقین کر کے اور اس اندیشہ سے کہ کہیں سرمد لوگوں کو انتقام کے لیئے کھڑا نہ کر دے۔ بے سروپا الزام لگایا گیا اور بے گناہ قتل کیا گیا۔ سیدی مولہ کی ہر دلعزیزی بزرگی و سخاوت جلال الدین خلجی جیسے نیک سلطان کو بھی کھٹکی۔ اور بیچارے درویش کو ہاتھی کے پاؤں سے کچلوا دیا ؎

اب آخر زمانہ میں ترکی سلطان کے پیر و مرشد سید ابوالہدیٰ رفاعی کو نوجوان ترکوں نے تاریک کوٹھری میں بند کر کے محض اس جھوٹے شبہ میں مار ڈالا کہ سید صاحب ان کے پولٹیکل منصوبوں میں حارج تھے ؎

یہ خیال نہ کرنا چاہیئے کہ میں مسلمان بادشاہوں پر ظلم و سفاکی کا بیجا الزام لگاتا ہوں۔ یا میرے دل میں اسلامی حکومت کی کوئی

عظمت نہیں ہے۔ بلکہ مقصود بزرگان دین کی شہادت کا احوال لکھنا ہے۔ اس کے ضمن میں لازمی طور پر قاتل و مقتول کے حق و باطل پر نظر جاتی ہے۔ اور ائمۂ اطہار و مشایخ کبار بے گناہ و مظلوم معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن یہ سب قصور شخصی و خود مختارانہ حکومتوں کا تھا۔ جو قاعدۂ اسلام کے برخلاف تھیں۔ اس لئے ہر مسلمان خود ایسی حکومت ہی کو سر سے ظلم و سفاکی کا مظہر خیال کرتا ہے۔ اسلام نے جمہوریت و مساوات کی حکومت قایم کر کے کامل حریت انسانوں کو عطا فرمائی تھی۔ مگر لوگوں نے اپنے ذاتی فوائد کی خاطر اُصول اسلامی کو کچل ڈالا۔ اور شخصی بادشاہت قایم کر دی ✤

شخصی حکومتوں میں ہمیشہ خود غرض لوگ بادشاہ کے گرد جمع رہتے ہیں۔ اور بادشاہ اُن کے ہاتھ میں کٹ پتلی ہوتا ہے اور کٹ پُتلی نہ بنے تو کیا کرے۔ اکیلا بشر تمام ملک کی خبر گیری و حفاظت میں مجبور محض ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خود مختار بادشاہ حاشیہ نشین لوگوں کے بہکانے سے خونریزیاں اور بے انصافیاں کیا کرتے ہیں۔ ہم کو تسلیم کرنا پڑیگا کہ ان خود مختار بادشاہوں میں بعض ایسے دل و دماغ کے تھے کہ ہزاروں آدمیوں کی متفقہ رائے ان کی رائے کے سامنے نکمّی اور کمزور ثابت ہوتی تھی۔ لیکن ایک آدمی پھر ایک ہی ہے ہمیشہ اسکی رائے پر بھروسہ نہیں ہو سکتا۔

جو بزرگان دین خود مختار بادشاہوں کی غلطیوں سے شہید ہوئے وہ سب بے گناہ و مظلوم تھے۔ اس کی نسبت ہم کچھ فیصلہ نہیں کر سکتے۔ مگر جن شہدا کا اس شہید نمبر میں ذکر ہے وہ تو یقیناً ناکردہ گناہ شہید کیے گئے ✤

غالباً یہ معلوم کرنا دلچسپی کا موجب ہوگا کہ بعض مشایخ کبار نے جب خود مختار بادشاہوں کی دست درازیاں دیکھیں اور اُن کو اپنی جان کا اندیشہ ہوا تو اُنھوں نے بارگاہ الٰہی میں بد دعا کی جس سے وہ بادشاہ ہلاک و تباہ ہو گئے۔ مثلاً ہمارے سرتاج سلطان المشایخ خواجۂ نظام الدین اولیاء محبوب الٰہی رح کی نسبت جب نا تجربہ کار سلطان قطب الدین خلجی کو مشورہ دیا گیا کہ حضرت سلطان المشایخ کا وجود پولیٹکل حیثیت سے تیری تاجداری کو نقصان پہونچائے گا تو اُس نے آپ کو آزار پہونچانا چاہا۔ اور قریب تھا کہ ایک جاہل بد ذات کو حضرت کا آفتاب حیات ابر شمشیر سے پوشیدہ کر دیا جائے تو دفعۃً آپ نے اپنی شان قہاری کو ظاہر فرمایا اور آپ نے گرگر یہ شعر پڑھنا شروع کیا ؎

اے روبہک چرا ننشستی بجائے خویش ۔۔۔ باشیر پنجہ کردی و دیدی سزائے خویش

یعنی او لومڑی اپنی جگہ کیوں نہ بیٹھی رہی۔ شیر سے پنجہ کیا۔ اپنی سزا دیکھی۔ آپ کا یہ شعر پڑھنا تھا کہ بادشاہ کے ایک منظور نظر غلام نے بادشاہ کا سر کاٹ ڈالا۔ اور اس طرح وہ آہنی پنجہ جو حضرت سلطان المشایخ محبوب الٰہی رح کی اذیت کے لیئے بڑھایا گیا تھا غیب کے فولادی پنجے سے آن کی آن میں شکست کھا گیا ✤

اب نئے زمانہ کے مورخ اس واقعہ پر طرح طرح کے حاشیے چڑھاتے ہیں مگر ہمارا تو ایمان یہ ہے کہ خود مختار سلطان کو اور تمام دُنیا کو یہ دکھانے کے واسطے کہ کوئی دوسری با اختیار طاقت بھی موجود ہے جو سب طاقتوں و حکومتوں کی نگراں ہے اور زبردست کو زیردست کر دینا اُس کو کچھ مشکل نہیں۔ یہ واقعہ ظاہر ہوا۔ اور حضرت محبوب الٰہی کو ظالم کے شر سے بچایا گیا ✤

ناظرین! خود مختار بادشاہوں کی حرکات پر اگر انصاف کی نظر ڈالیں گے تو اُن کو لامحالہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس وقت انسان انسان نہ تھا بلکہ گھاس پھوس کی طرح بالکل زندگی بسر کرتا تھا جس کو ہر وقت جان و آبرو کا خوف دامنگیر تھا۔ آزادی جو ہر آدمی کی فطرت میں رکھی گئی ہے ہمیشہ دل کے قید خانہ میں بند رہتی تھی۔

زبان اور قلم پر مُہر لگی ہوئی تھی کہ آزادی نکل نہ آئے۔ اس میں مذہب کو کچھ دخل نہ دینا چاہیئے۔ کیونکہ خودمختاری ہر ملک۔ ہر مذہب۔ ہر قوم میں یکساں ضرر پہونچاتی تھی۔ اس لیئے میرا روئے سخن مسلمان بادشاہوں سے نہیں ہے۔

اُس زمانہ میں زیادہ دولتمند ہونا۔ زیادہ بارسوخ ہونا۔ زیادہ خداپرست ہونا قابلِ دار جرم تھا۔ کیونکہ اسی قسم کے آدمی بغاوت کا جھنڈا بلند کیا کرتے تھے۔ مگر آج خدا کے فضل سے جمہوریت و مساوات کا دَور ہے آزادی خوش و خرم ہر گھر میں چلتی پھرتی نظر آتی ہے۔ زیادہ دولتمندی زیادہ عزت کی علامت ہے۔ زیادہ رسوخ ہونا بادشاہ کی نظر میں ممتاز بناتا ہے۔ عبادت و خداپرستی کی روک ٹوک نہیں۔ بلکہ آزادی اتنی بڑھی ہے کہ شیطان پرستی سے بھی کوئی نہیں روکتا ۔

جس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ خدا آسمان سے مینہ برساتا ہے تاکہ زمین میں سبزی و غلّہ پیدا ہو۔ ہوا چلاتا ہے۔ تاکہ ہم اُس کے سہارے زندہ رہیں۔ یا اُس نے چاند۔ سورج۔ پانی۔ بجلی۔ وغیرہ چیزیں انسان کے عام فائدہ کے لیئے پیدا کی ہیں اور اُن کو دیکھکر ہم اپنے محسن اور رحیم خدا کا شکر و حمد بجا لاتے ہیں۔ اسی طرح ہم کو اُس کا شکر بھی ادا کرنا چاہیئے کہ اُس نے آزادی کی حکومت عطا فرمائی۔ جس کے سایہ میں ہم نہایت بےفکری اور امن سے زندگی بسر کرتے ہیں اور جس طرح چاہیں اور جس قدر چاہیں خدا کی عبادت کر سکتے ہیں۔ کوئی مخل اور حارج نہیں۔ اب ہماری مذہبی برتری یا لقدس کی عالمگیری سے کسی کو بدگمانی نہیں ہوتی۔

اس لیئے

اے حجروں اور گوشوں میں رہنے والے بزرگو! باہر نکلو اور آزادی سے حق کے نعرے لگاؤ۔ اب منصور و سرمد کی طرح تم کو کوئی آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھے گا۔ یہ توپ خانے۔ یہ فوجیں۔ یہ رسالے۔ یہ سنگینیں۔ یہ چھاؤنیاں سب تمہاری ہیں۔ اور تمہارے ہی امن و سکون کی خاطر پرے جمائے کھڑی ہیں۔ شکر کرو۔ کس کا؟ آدمی کا نہیں۔ خدا کا۔ جس نے اپنی رحمت سے یہ آزاد حکومت عطا فرمائی۔

انگریز و ترک۔ افغان و ایران۔ ہند و جاپان۔ سب الفاظ ہیں۔ جن کو دیکھنا تمہاری شان سے بعید ہے۔ تم تو حقیقت و معانی کو دیکھنے والے ہو۔ یہ اشکال و صُوَر تو تمہارے عقیدے میں نابود و بےحقیقت ہیں۔

ہاں یہ مت سمجھو کہ حکومت عیسائیوں کی ہے یا موسائیوں کی۔ انگریزوں کی ہے یا افغانیوں کی ہے۔ کالوں کی ہے یا گوروں کی۔ بلکہ طریق حکومت کو دیکھو۔ اس کے اثر و کیفیت کو مشاہدہ کرو۔ کہ اس میں کس قدر راحت۔ آسائش۔ سکون و خاموشی ہے۔ خدا تعالیٰ اس آزادی کو برقرار رکھے۔ اور ہم کو دوسرا درویشی شہادت نامہ لکھنے کے وقت موجودہ وقت میں کوئی ظاہری واقعہ نہ ملے۔ اور مجبور ہوکر باطنی شہادت کی طرف رجوع کریں جو شہادت اکبر ہے اور جس کا حاصل کرنا ہر صوفی کا مقصود حقیقی ہے ۔

مستانہ بزمِ مولود

نئے الفاظ میں پُرانی مطالب

دن آگئے کہ ہم فراق کی راتوں سے رخصت ہوں۔ ربیع الاوّل کا چاند عرب کے اُفق سے بلند ہونے کو ہے۔ آؤ سب ملکر اُس کو دیکھیں اور چشم منتظر کو ٹھنڈا کریں۔

سارا جہان اس ماہ مبارک میں اُس پاکیزہ وجود کے میلاد کا ذکر کرے گا جو تمام موجودات کے وجود کا سبب ہے۔ ہم بھی جہان میں ہیں۔ کیوں نہ ایک بزم میلاد منعقد کریں۔

نظام المشائخ کے اوراق کا فرش بچھا دو۔ حروف کے نقش و نگار سے محفل کو آراستہ کردو۔ اور صدائے مستانہ سُنو۔

ہم اپنی محفل میں اغیار کو نہیں بُلائیں گے۔ نہ کوئی اس قابل ہے کہ اس شاندار بزم میں مدعو ہو سکے۔ رقعہ خدا کو گیا تھا اور اُس سے درخواست کی گئی تھی کہ ہماری مجلس کی صدارت کو قبول فرمائے۔ اور اپنی مرضی سے جس کو چاہے شرکت جلسہ کی دعوت دے۔ سو اُس نے لوح محفوظ کے چکنے کاغذ پر مطبع وحی میں حسب ذیل اعلان چھپوا کر اخبار القرآن میں شایع کردیا۔

إِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا

"خدا اور اُس کے فرشتے نبی پر درود پڑھتے ہیں۔ تم بھی اے ایمان والوں اُسپر درود و سلام بھیجو۔"

چونکہ القرآن کثیر الاشاعت اخبار ہے۔ بیشمار اہل ایمان اس بزم درود و سلام و ذکر خیر الانام کی شرکت کے لیئے جمع ہوگئے اس وقت صدر انجمن صاحب جل جلالہ وعم نوالہ کرسی لامکان پر جلوہ افروز ہوئے اور اپنی افتتاحی تقریر آواز ہُو میں شروع کی جو یہ تھی:-

فرشتوں! اور جنٹلمین (ایماندار آدمیوں)!!- میں خوش ہوں کہ تم سے آج کے دن شان تعین میں خطاب کرنا چاہتا ہوں۔ اگرچہ تمہاری کوئی بزم ایسی نہیں ہے جو میرے دائرۂ وجود سے باہر ہو۔ گر یہ محفل ایک خاص محفل ہے جس میں علانیہ میری تجلی تم سے ہمکلام ہوتی ہے۔ آج کے جلسہ کی غرض یہ ہے کہ ہم سب اسم کثرت کی شان میں اس

نور کا ذکر کریں جو ہماری ذات وحدت مآب کا ذکر بشکل حمد و ثنا میں تھا۔ جس کو ہم نے احمد بھی کہا اور محمد بھی +
میں تم کو بتانا چاہتا ہوں کہ کس کا ذکر کیونکر کیا جائے گا۔ سُنو سُنو۔ ہر وجود اپنی شکل و صورت کے اعتبار سے اس کا ذکر کرے۔ مگر ہم کبریائی کے مالک ہیں۔ سب کچھ ہمارا ہے۔ سب کچھ ہم میں ہے۔ سب کچھ ہم سے ہے۔ اور سب کچھ ہم ہیں۔ اس لیئے ہمارا ذکر صرف ان الفاظ میں ہوگا +

اے کملی اوڑھنے والے اُٹھ۔ رات کو ہماری یاد کر۔ لوگوں کو ہدایت کا رستہ بتا۔ ہماری شان سے اُن کو آگاہ کر۔ مانگ۔ تجھ کو دیا جائے گا۔ بول اس کو سُنا جائے گا۔ سفارش کر۔ قبولیت ہوگی۔ اے اندھیری رات کی مثل سیاہ گیسو والے۔ اے صبح کی روشنی کی مانند منور چہرے والے میں تجھ کو پسند کرتا ہوں۔ تو ازل سے ابد تک میرا ہے۔ تجھ پر میرا سلام +

فرشتوں! تمہارا ذکر یہ ہے کہ اس آدم زاد کو سجدہ کرو۔ مومنو! تم اس کے احکام کی اطاعت کرو یہی تمہارا ذکر ہے +

جب حضرت قدوس اپنا ایڈریس ختم کر چکے تو ایک گدڑی پوش مست کھڑا ہوا۔ اور اس طرح بولنے لگا +

جناب باری! و دیگر یاران خراباتی! میں دیوانہ ہوں اور عقل و خرد سے بیگانہ۔ اجازت دیجیئے کہ میں اپنے ممدوح کا ذکر اس قاعدہ اور ضابطہ سے نہ کروں جس کا مجمل خاکہ پریسیڈینٹ صاحب نے قایم کر کے دکھایا ہے بلکہ ذوق و شوق اور ولولے میں جو چاہوں کہہ جاؤں۔ چیرز (نعرۂ حق) اُمید ہے کہ آنریبل چیرزمین مجھ ذرّہ بمقدار کی گستاخی و بے ادبی سے ناراض ہو کر ظلوماً جھولا سے زیادہ کوئی اور دوسرا خطاب تجویز نہ فرمائیں گے۔ خندہ اور زور شور سے چیرز (نعرۂ حق)

میں حضرت سبحانی سے دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ قرآنی دعوت نامہ میں جس نبی پر درود و سلام بھیجنے کا ذکر ہے وہ کونسا نبی ہے۔ کیا وہ جس کا خاکی وجود سب سے پہلے بنا۔ اور جس کے متحرک ہونے کے واسطے خود ذات ربّانی نے اپنے دم کو بُلایا۔ اور آ۔ دم کے حکم کو سُنکر سب موجودات نے اس پیکر خاک کو آدم کا لقب دیا۔ یا وہ جسکو نوحؑ کہتے ہیں جس نے حضرت کی اشان تہر کو طوفان آب پر علانیہ جنبش کرتے دیکھا۔ یا نبی مراد آپ پر فطرتاً ایمان لانے والے ابراہیمؑ سے ہے۔ یا اُن سے جنھوں نے طور پر راز و نیاز کے کلام کے بعد ذرا بیباکانہ جرأت پردہ اُٹھانے کی کی تھی۔ یا نبی کا لفظ ابن مریم کی شان میں فرمایا گیا ہے۔ جو آپ کی حیران کرنے والی نشانیوں میں ایک نشانی تھی +

اگر یہ سب نہیں تو کیا وہ یتیم جو امن کی آغوش میں پلا۔ وہ جو چھوٹے سے قد پر لمبے لمبے بال بکھیرے لکڑی ہاتھ میں لیئے بکریاں چراتا تھا۔ وہ جو کمبل اوڑھ کر آیا۔ اور دوشالہ اُڑھا کر گیا۔ جسے جو کا آٹا کھایا اور گیہوں کا کھلایا۔؟

پروردگار! ہمیں بتا۔ کیا وہی جو امن میں شیر کی طرح شیریں اور صاف۔ اور جنگ میں شیر کی مانند دلیر و صف شکن تھا۔ کیا وہی جو نیزہ و شمشیر کا مالک اور میدان کارزار کی رونق تھا۔ جس کی پشت دشمن نے کبھی نہیں دیکھی۔ جس کا قدم ہمیشہ آگے بڑھتا رہا۔ وہ جس کو آپ کی گورنمنٹ نے خلق عظیم کی ڈگری عطا فرمائی۔ وہ جو غریبوں۔ بیکسوں۔ لاوارثوں کا ولی و سرپرست تھا۔ وہ جو مدینہ کی گلیوں میں معمولی آدمیوں کی طرح چلتا پھرتا تھا۔ آہ۔ آہ۔ آہ۔ وہ تو نہیں جس کی آنکھوں کی یاد نے ہم کو آنسوؤں کے دریا میں ڈبو رکھا ہے؟

اگر وہ ہے تو ہم کو اجازت دی جائے کہ اُس کی محبّت کا جام سر جلسہ نوش کریں۔ (چیرز) اور اس دربار میں جتنے مجھ جیسے

مستانے ہیں اُن کو رخصت ملے تاکہ ؎

خراباتیاں مے پرستی کنند
محمدؐ بگویند و مستی کنند

رند خراباتی اس قدر گفتگو کرنے پایا تھا کہ محفل میں گردش پیدا ہوئی اور عاشقان سوختہ تڑپنے لگے تجلّی کی بجلیاں چمکنے اور کڑکنے لگیں۔ اور ہوا جو ہوا۔ بیچارہ حسن کی مجال نہیں کہ اس سے زیادہ اس محفل کی نسبت زبان کھولے۔

صاحب بزم میلاد کی اخلاق

اس مستانہ و بے باکانہ بیان کے بعد بزم میلاد کے سالکانہ طریق کو ادا کیا جاتا ہے۔ جس میں میرے عقیدے میں سب سے زیادہ مفید اور ضروری صاحب میلاد کی اخلاقی خوبیوں کا تذکرہ ہے۔ جن کو احادیث کی معتبر روایتوں سے اخذ کر کے لکھا جاتا ہے۔

جس طرح ہمارے رسول صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کو تمام رسولوں پر فوقیت اور فضیلت ہے۔ اسی طرح اُن کے اوصاف و خصائل سب پیغمبروں سے اعلےٰ ہیں۔ اللہ تعالےٰ نے خود اپنے کلام قرآن شریف میں اس کا ذکر فرمایا ہے۔ مگر وصف بھی وہ بیان کیا گیا جو تمام اوصاف کی جان ہے۔ چنانچہ یہ ارشاد ہوا۔ اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ۔ تمہاری پیدائش (اے محمدؐ) بہت بڑے خلق پر ہوئی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ حُسنِ خلق محمدی شاندار چیز ہے۔ کہ حضور رسول مقبولؐ کے اعلےٰ اوصاف میں اس کا شمار ہوا خود حضور رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے حُسنِ خلق کی فضیلت میں جو کچھ ارشاد فرمایا ہے اُس کو ذیل میں قلمبند کیا جاتا ہے۔

احمد۔ حاکم اور بیہقی نے حضرت ابی ہریرہ رضؓ سے روایت کی ہے کہ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ میں اس واسطے بھیجا گیا ہوں کہ عمدہ اخلاق کو پورا کر دوں۔ ابوداؤد اور ترمذی نے ابوالدردا سے روایت کی ہے کہ حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ سب سے بھاری چیز جو میزان اعمال میں رکھی جائے گی وہ خدا سے ڈرنا اور خوش خلقی ہوگی۔ ایک دفعہ کسی نے آپ سے دریافت کیا۔ دین کیا چیز ہے؟ آپ نے فرمایا۔ خوش خلقی۔ اُس شخص نے آپ کے داہنی طرف آ کر یہی سوال کیا اور یہی جواب پایا۔ یہاں تک کہ چاروں رُخ سے پوچھا اور ایک ہی جواب پایا۔

ایک اور آدمی نے دریافت کیا۔ اعمال میں افضل چیز کیا ہے؟۔ فرمایا۔ حُسنِ خلق۔ کسی نے عرض کیا۔ باعتبار ایمان افضل کون ہے فرمایا۔ جو خلق میں سب سے اچھا ہے۔ طبرانی نے مکارم الاخلاق میں بروایت حضرت ابی ہریرہ رضؓ کے بیان کیا ہے کہ حضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ۔ اگر تم لوگوں سے دولت میں نہیں بڑھ سکتے تو خندہ پیشانی اور خلقِ حسن میں بڑھ جاؤ۔

حضرت جریر بن عبداللہ کو ایک دفعہ ارشاد ہوا تجھ کو اللہ نے خوبصورت بنایا ہے۔ اپنے خلق کو بھی خوبصورت بنا۔ حضرت ابن مسعود سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اکثر یوں دعا فرماتے تھے۔ اَللّٰھُمَّ احسنت خلقی فحسن خلقی الٰہی تو نے میری صورت اچھی بنائی ہے تو میرا خلق بھی اچھا بنا۔

دریافت کیا گیا۔ بندہ کو سب سے اچھی چیز کیا دی گئی ہے؟۔ فرمایا۔ خلق حسن۔ دوسری جگہ فرمایا۔ قیامت کے دن زیادہ محبوب اور میرے قریب بیٹھنے والے وہ لوگ ہوں گے جن کے اخلاق اچھے ہیں۔ فرمایا خوش خلقی گناہ کو اس طرح گھلا دیتی ہے جس طرح

دھوپ برف کو۔ فرمایا۔ کوئی تدبیر عقل کے موافق نہیں ہوتی۔ مگر خوش خلقی +

بدخلقی کی بُرائی

حضرت صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم سے کسی نے دریافت کیا۔ نحوست کیا چیز ہے؟ فرمایا بدخلقی۔ فرمایا۔ بدخلقی نیک اعمال کو اس طرح خراب کر دیتی ہے۔ جس طرح سرکہ شہد کو بدمزہ کر دیتا ہے۔ دوسری جگہ ارشاد ہے۔ بدخلقی ایسا گناہ ہے جو کبھی بخشا نہیں جائے گا۔ نیز آپ نے فرمایا۔ بدخلق آدمی دوزخ کی تہہ میں ڈالا جائے گا +

حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کا قاعدہ تھا کہ بیمار کی عیادت کو خود تشریف لیجاتے۔ غلام کی دعوت منظور کر لیتے۔ پاپوش مبارک کی خود مرمت کر لیتے۔ کپڑوں میں پیوند لگا لیتے۔ اپنے گھر والوں کے کام میں شریک ہو کر خود کام کرنے لگتے۔ اپنا کام اپنے ہاتھ سے کرتے صحابہ کو تکلیف نہ دیتے۔ بلکہ جو کام خود کر سکتے تھے اُس کو دوسرے سے کرانا بُرا تصور کرتے تھے۔ جب آپ کا گزر لڑکوں پر ہوتا اُن کو سلام کرتے +

ایک شخص آپ کے پاس آیا۔ وہ آپ کی ہیبت سے کانپنے لگا۔ آپ نے فرمایا کیوں ڈرتا ہے۔ میں بادشاہ نہیں ہوں۔ میں تو قریش کی ایک عورت کا لڑکا ہوں جو خشک گوشت کھایا کرتی تھی۔ آپ کا دستور تھا کہ اپنے اصحاب میں اس طرح مل جلکر بیٹھتے کہ اجنبی آدمی آپ کو پہچان نہ سکتا تھا۔ آخر صحابہ نے بار بار عرض کرکے مٹی کا ایک چبوترہ بنا دیا۔ جس پر آپ تشریف رکھنے لگے۔ اور لوگوں کو اس امتیاز کے سبب شناخت کی دقت جاتی رہی +

ایک دفعہ حضرت عائشہ رضؓ نے آپ سے عرض کیا کہ میں آپ پر قربان جاؤں۔ تکیہ لگا کر کھانا نوش فرمایا کیجیے تاکہ تکلیف نہ ہو۔ آپ نے ارشاد کیا۔ میں اسی طرح کھاؤں گا۔ جس طرح بندہ کھاتا ہے اور ویسا ہی بیٹھوں گا۔ جیسا کہ بندہ بیٹھتا ہے۔ آپ کے اصحاب میں سے یا اور کوئی آدمی آپ کو پکارتا تو آپ جواب میں لبیک فرماتے۔ جس قسم کی بات کا آپ کے اصحاب میں پہلے سے ذکر ہوتا۔ آپ بھی اُس کے متعلق باتیں کرتے۔ اگر وہ اشعار خوانی کرتے ہوئے ہوتے تو آپ بھی شعر پڑھتے۔ اگر اصحاب ہنستے تو آپ بھی تبسم فرماتے۔ اور سوائے حرام اور ناجائز امور کے اور کسی بات میں صحابہ کو زجر و توبیخ نہ فرماتے تھے۔ فقیروں میں بیٹھتے۔ مساکین کو اپنے ساتھ کھانا کھلا لیتے۔ جو لوگ اخلاق میں افضل ہوتے اُن کا احترام فرماتے تھے۔ جو آپ کے سامنے عذر کرتا۔ اُس کا عذر قبول کر لیتے۔ خوش طبعی فرماتے مگر جھوٹ کو نہ آنے دیتے۔ مباح کھیل کو دیکھتے اور منع نہ فرماتے۔ اپنے اہل کے ساتھ دوڑتے کہ دیکھیں کون آگے نکلے۔ لوگ آپ کے سامنے بولتے تھے جس سے آپ کو اذیت ہوتی تھی۔ مگر آپ صبر فرماتے۔ کسی کو مفلسی و بیماری کے سبب حقیر نہ جانتے تھے۔ کسی بادشاہ سے اُس کی دنیاوی شوکت کے سبب خوف نہ کرتے تھے۔

آپ نے کبھی کسی عورت یا نوکر کو لعنت نہیں کیا۔ اگر آپ سے کہا جاتا کہ کسی کے لیے بد دعا کیجیے تو آپ اُس کو دعا دیتے۔ سوائے جہاد کے آپ نے کسی پر وار نہیں کیا۔ اگر آپ کے واسطے بچھونا بچھوا دیا جاتا تو آپ اُس پر لیٹ رہتے۔ اور اگر بچھونا نہ بچھایا جاتا تو زمین پر لیٹ جاتے۔ جب کوئی آپ سے ملتا۔ سلام میں سبقت فرماتے۔ اور جب تک وہ چلا نہ جاتا آپ کھڑے رہتے۔ اگر کوئی آپ کا ہاتھ پکڑ لیتا تو آپ چھڑانے کی کوشش نہ کرتے۔ یہاں تک کہ وہ خود ہی چھوڑ دیتا آپ کے پاس کوئی آتا اور آپ نماز میں مصروف ہوتے تو نماز کو مختصر کر دیتے اور پوچھتے کہ تم کو مجھ سے کچھ کام ہو

تو کہو +

کسی مجمع میں تشریف لیجاتے تو جہاں جگہ ملتی وہیں بیٹھ جاتے کسی کو اُٹھانے کی تکلیف نہ دیتے۔ مجمع میں اس طرح پھیل کر نہ بیٹھتے۔ ہاں گھر میں کبھی کبھی پیر پھیلا کر بیٹھتے تھے۔ جو لوگ آپ کے پاس آتے اُن کی خاطر اور تعظیم فرماتے۔ قرابتداروں کے لیئے اپنی چادر بچھا دیتے۔ جس تکیہ کے سہارے آپ تشریف رکھتے تھے آنے والے کو وہ تکیہ عنایت فرماتے کہ اس کے سہارے بیٹھو۔ اگر وہ عذر کرتا تو قسم دیکر تکیہ کے سہارے آرام سے بٹھاتے۔ ہر شخص سے ایسا برتاؤ کرتے کہ وہ یہ سمجھتا کہ مجھ سے زیادہ اور کسی پر مہربانی نہیں ہے +

قصہ مختصر یہ آپ کے حسن اخلاق کا مجمل سا بیان ہے اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ مسلمان خاصکر صوفیائے کرام جو حضورؐ کی پیروی و اتباع کو مقصود حقیقی تصور کرتے ہیں۔ آیا واقعی اس قسم کے اخلاق رکھتے ہیں۔ یا کچھ فرق و تفاوت ہے۔ اب تو مشائخ کی محفلیں متکبر امراء کے درباروں سے بڑھکر پائی جاتی ہیں۔ جہاں غرباء و کم حیثیت لوگوں کو کوئی نہیں پوچھتا۔ اور جو معمولی بات چیت ایسی درشتی سے کرتے ہیں کہ سُننے والا خواہ مخواہ مکدر ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ اب فقراء میں اگلے وقت کی بزرگوں کی سی تاثیریں نہیں پائی جاتیں۔ نہ پہلا سا قال ہے نہ حال۔ ہر چیز میں آسمان و زمین کا فرق پڑ گیا ہے۔

اللہ تعالےٰ ہم سب کو توفیق عنایت فرمائے کہ آقائے نامدار مرشد حقیقی حضرت رسول العرب والعجم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اخلاق سے سبق حاصل کریں اور یورپ کی خود غرضانہ زندگی میں اسلامی صداقت کے اخلاق کا نمونہ بنکر نمودار ہوں تاکہ روحانیت کی پیاسی دُنیا اسلامی چشمۂ حیات سے سیراب ہونے کو آگے بڑھے۔ آمین +

درویشی مرکز

از نظام المشائخ جون ۱۹۱۱ء

آج کل ہر قوم اپنے استحکام اور قرار وجود کے لیئے ایک مرکز قایم کر رہی ہے۔ مسلمانوں کا قومی و دینی مرکز تیرہ سو برس سے عرب میں موجود ہے۔ ہر فرقہ و ہر عقیدے کا مسلمان مکہ معظمہ و مدینہ منورہ کو اپنی ہستی کی قرارگاہ سمجھتا ہے۔ مگر ضرورت ہے کہ اس عام مرکز کے علاوہ اپنے مشرب اور طریقہ کے جداگانہ مرکز بھی ہوں جو مرکز اعلیٰ کی شاخیں تصور کی جائیں +

مثلاً علمی حیثیت سے مسلمانوں کا دینی مرکز ندوہ قرار پایا ہے۔ اور دُنیاوی علی گڈھ تو مناسب ہے کہ درویشی مرکز اجمیر شریف مقرر کیا جائے۔ ہندوستان میں چشتیہ سلسلہ سب سلسلوں سے فروغ رکھتا ہے۔ اور قادریہ و سہروردیہ خاندان بھی بوجہ قربت خاص کے اس ملک میں چشتیوں کے دست و بازو ہیں۔ ان دونوں سلسلوں کو اجمیر شریف کے مرکز بنانے میں ہرگز تامل نہ ہوگا +

رہ گیا نقشبندیہ طریقہ۔ اس کے متعلق عوام میں مشہور ہے کہ اس خاندان کے مشائخ سرہند کے مقابلہ میں اجمیر شریف کو ترجیح نہ دینگے۔ مگر میں خیال کرتا ہوں کہ حضرات نقشبندیہ ایسے ناسمجھ نہیں ہیں کہ خواہ مخواہ تین سلسلوں سے الگ ہو کر اپنا مرکز جداگانہ بنائیں گے۔ کیونکہ ان میں خدا کے فضل سے بڑے بڑے فاضل اور روشن خیال بزرگ موجود ہیں۔ جو مرکز کی اہمیت اور

اجماع کی خوبی کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ پس کوئی وجہ نہیں ہے کہ وہ اپنے ہم مشرب بھائیوں کا اس معاملہ میں ساتھ
اجمیر شریف کو مرکز بنانے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہاں کے سجادہ نشین کو سب مشائخ ہند کا پیشوا تسلیم کر لیا جائے
مقصد صرف یہ ہے کہ چونکہ اجمیر شریف میں سب سلسلوں کے مشائخ جمع ہوتے رہتے ہیں۔ لہذا جو بات تمام طبقۂ صوفیہ
مفاد کی پیش آئے وہ اجمیر شریف کے مقام پر مشائخ کے مشورہ میں لائی جائے اور اس اجماع سے جو فیصلہ ہو وہ سارے
ملک میں عملدرآمد کے قابل تسلیم کیا جائے۔

مرکز کی ضرورت پر وضاحت سے لکھنا بجائے خود ایک طویل گفتگو کا محتاج ہے۔ جس کا یہ وقت اور موقع نہیں ہے
مشائخ نے خواہش کی تو آئندہ اس کی تشریح کر دی جائے گی۔

میرا تخیل عرصۂ دراز سے درویشوں کی مرکزی ضرورت پر گردش کھا رہا ہے اور اس کے متعلق میرے دل میں
طوفانی ولولے ہیں۔ میرے لیئے وہ دن سب سے بڑا اور مبارک ہوگا جب کہ میں اپنے مرکزی تخیل کا مجسمہ سرزمین ہند
پر دیکھوں گا۔ یا میری روح اپنے مقام پر اس کو محسوس کرے گی۔

میں جانتا ہوں کہ مشائخ میں ابھی یہ احساس بہت کم پیدا ہوا ہے کہ وہ اپنی ہستی کا خرقہ صحرائے زمانہ کے خاروں
سے محفوظ کرنے پر مائل ہوں۔ تاہم مایوس نہ ہونا چاہیئے۔ آگاہ کرنے سے آگاہی ہوتی ہے۔ فریاد کرنے سے داد ملتی ہے
یہ ہماری پراگندگی کا باعث ہے کہ دوسرے فرقے ہم کو ٹھکراتے ہیں اور زیروزبر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جس دن
ہم ایک مرکز پر جمع ہوکر اپنے وجود کو مستحکم کرکے دکھائیں گے۔ پھر کس کی مجال ہے جو ہم کو آنکھ اٹھا کر بھی دیکھ سکے۔

از نظام المشائخ اگست ۱۹۱۰ء

ہندوؤں کے مشہور و معروف مذہبی پیشوا سری رام چندر جی کے عارفانہ کلمات یوگ بسشٹ سے مخص ناظرین
نظام المشائخ کے ملاحظہ کے لیئے ترجمہ کرتا ہوں۔ تاکہ ہمارے مشائخ و فقراء کو ہندوؤں کے مقتداؤں کی روش اور
اُن کی روش سے آگاہی ہو۔ حسن نظامی۔

ایک جلسے میں جہاں راجہ دسرتھ رام چندر جی کے باپ اور باشسٹ جی اُن کے گرو و اُستاد اور بسوامتر جی
اس زمانہ کے نامور عارف بزرگ موجود تھے اور رام چندر جی کی عمر صرف ۱۶ برس کی تھی اُنھوں نے یہ تقریر کی:۔

دُنیا کی بُرائی

دُنیا ناپائدار ہے۔ جو پیدا ہوتا ہے۔ مرتا ہے۔ مال اسباب جو دُنیا میں ہیں بلا اور محنت کے سبب ہیں۔ اس کی
زندگانی کچھ خوشی اور آرام کی چیز نہیں ہے۔ تعجب ہے کہ دُنیا دار اسے آرام کا گھر سمجھتے ہیں۔ دیکھو۔ عورت۔ مال متاع اور

سب دُنیا کی موجودات ایک دوسرے سے میل نہیں رکھتے۔ جس طرح لوہے کی سیخیں اکٹھی باندھی جائیں تو چسپاں نہیں ہوتیں۔ پس دُنیادار کیونکر یہ کہکر اسباب دُنیا سے اصلی جوڑ ملا سکتا ہے کہ فلاں چیز میری اور اُمکا ڈھمکا میرا ہے +
میں نہیں جانتا کہ کون ہوں۔ اور یہ تمام عالم جو دیکھنے میں آتا ہے کس چیز سے ظہور میں آیا۔ میں دیکھتا ہوں کہ وُہ بے حقیقت ہے۔ مگر موجود نظر آتا ہے۔ اس سے نہ کسی کو نفع ہے نہ نقصان۔ وہ چمکتی ریت کی طرح ہے جو پیاسے کو دھوکا دے۔ مگر نہ پیاس کو بجھاسکے اور نہ اُس میں ڈوب سکے۔ وہ گھر جو مال اسباب سے بھرا ہوا ہے مگر حقیقت و معرفت کی مایہ سے خالی ہے۔ آرام کی جگہ نہیں ہے۔ جیسے وہ غریب آدمی خوش نہیں رہ سکتا جس کے اولاد بہت ہو حالانکہ اولاد انسان کے دل کو خوش کرتی ہے +

دولت سب کو پھسلاتی ہے مگر کہیں ٹھہرتی نہیں۔ اور کسی کو حقیقتاً خوش حال نہیں کرتی عیب و ہنر کے بغیر دیکھے جہاں جی چاہا مقام کر دیتی ہے۔ تو اس سے اخلاص پیدا کر کے سانپ کو دودھ پلاتا ہے۔ ایک دن یہ سانپ تیرے دودھ سے پلے ہوئے زہر کو تیرے ہی مار ڈالنے میں خرچ کرے گا +

آدمی جب تک مفلس ہے۔ سب سے ملکر اور جھک کر چلتا ہے۔ مگر دولت ملتے ہی اپنے بیگانے سب سے بگڑتا ہے اور پتھر کا دل بنا لیتا ہے۔ جیسے ہوا نرم برف کو پتھر بنا دیتی ہے۔ دولت دل کی صفائی اور روشنی کو گدلا کر دیتی ہے جیسے یاقوت مٹی میں رکھنے سے بے آب ہو جاتا ہے۔

زندگی

زندگی کا کچھ بھروسا نہیں۔ پتے کی نوک پر رُکا ہوا پانی کا قطرہ مضبوط ٹھکانہ میں نہیں ہے۔ پس تو بھی اپنی زندگی کو پائدار مت سمجھ +

جس طرح ہوا کو پکڑ نہیں سکتے۔ جواہرات کی چمکدار کرنوں کو ایک لڑی میں پرو نہیں سکتے۔ اسی طرح ابدی زندگانی کسی کے اختیار میں نہیں +

زندگی معرفت الٰہی کی پناہ میں محفوظ رہ سکتی ہے۔ ظاہری زندگی جانور اور گھانس پھوس بھی رکھتے ہیں مگر حقیقی زندگی اُسی کو ملتی ہے جو حقیقت کی معرفت حاصل کرتا ہے +

بڑھاپے سے ایک قدم چلنا دوبھر ہے۔ مگر تو زندگانی کی ترقی ہی چاہے جاتا ہے۔ کیا تو نہیں دیکھتا کہ بوڑھا گدھا جب بوجھ اُٹھانے کے قابل نہ رہے تو جنگل میں اکیلا نکال دیا جاتا ہے +

دل

دُنیا کے دھندوں کے سبب دل بزرگوں کے طریق پر نہیں ٹھہرتا۔ جس طرح پرندکے پر ہوا کے جھونکوں سے منتشر ہو جاتے ہیں۔ دل گنبد کی طرح ہر آواز پر لپکنا چاہتا ہے اور اچھائی بُرائی میں تمیز نہیں کرتا +

وہم بھرا دل آگ سے زیادہ پُرسوز ہے کہ اُس کو پکڑ نہیں سکتے۔ پہاڑ سے زیادہ بلند ہے جس پر کوئی چڑھ نہیں سکتا۔ ہیرے سے زیادہ سخت ہے جس کا توڑنا مشکل ہے۔ سمندر کی سطح اب پر چل سکتے ہیں۔ پہاڑ کھود کر اُس کی تہہ کا پانی نکال سکتے ہیں لیکن

دل کو مغلوب نہیں کر سکتے۔

پریشان کرنے والے خطرے اور واہی تباہی خواہشیں سب دل کی بیماری کے سبب ہیں۔ اس بیماری کا علاج گرو کی صحبت میں ہے اُس کو حاصل کر +

حرص

ترشنا یعنی حرص اندھیری رات کے منحوس اُلوؤں کی طرح دل میں ارمانوں کو جمع کرتی ہے۔ اور اس طرح آخر کار اُس کو ویران کر دیتی ہے +

دل کے پاک اور سُریلے جذبات کو حرص اس طرح برباد کر دیتی ہے جیسے چوہا رباب کے تار کتر کر اُس کو بیکار کر دیتا ہے +

جو حرص کی آگ میں جل کر مرا ہے اُس کو آبِ حیات میں ہزار بار بھی غسل دیں تو وہ زندہ نہیں ہو سکتا۔

جو شخص اپنی دانست میں دُنیا کے تمام کاروبار سے آزاد ہو کر بیٹھا ہو۔ حرص پہلے اُسی کو شکار کرنا چاہتی ہے۔ حرص آدمی کے لیے اندھیری رات ہے جس میں ہزاروں خطرے بھرے ہوئے ہیں۔ اور انسان کے دل میں اس کے سبب ہر وقت فکر و اندیشہ رہتا ہے +

حرص کھلی آنکھ کو بند کر دیتی ہے۔ حرص گھر گھر کی ٹھوکریں کھلواتی ہے۔ حریص آدمی سے کوئی خوش نہیں ہوتا۔ جیسے بوڑھی عورت کو دیکھنے سے کوئی آنکھ خوش نہیں ہو سکتی +

حریص آدمی اُس ناچنے والی کے مثل ہے جو اپنے ناچ کے سب بھاؤ اور کمالات ایک ہی وقت میں ادا کرنے چاہے۔ اور ایک بھی پورے طور پر ادا نہ کر سکے +

حرص جسم کے ظاہری اعضا سے بھی کام لیتی ہے۔ اور باطنی اعضا سے بھی۔ اور اس کی حکمرانی میں تھوڑے ہی دن بعد یہ سب اعضا بیکار و معطل ہو جاتے ہیں۔

حرص شریف آدمیوں کو اس طرح اپنی طرف مائل کرتی ہے جیسے حسین عورت متقی و پاکباز مرد کو۔ اور سورج کی گرم شعاع نیلوفر کے نرم و نازک پھول کو +

آدمی کیسا ہی عقیل اور پہاڑ کی طرح بھاری بھرکم ہو حرص کے سامنے سوکھی گھاس کا تنکا بن جاتا ہے +

استقبالِ رسولؐ

از نظام المشائخ ماہ مارچ ۱۹۱۱ء

السلام علیک یا رسول اللہ۔ السلام علیک یا حبیب اللہ۔ السلام علیک یا شفیع المذنبین
السلام علیک یا رحمۃً للعالمین

غریبوں کا سلام لیجیے۔ گنہگاروں کا مجرا قبول فرمائیے۔ بے کس و لاچار اُمت کے خیر مقدم پر نظرِ توجہ ڈالیے +

آج اوراق نظام المشائخ کے پلیٹ فارم پر ہم سب آپ کا استقبال اور خیر مقدم کرنے حاضر ہوئے ہیں۔ یہ ایک طرف

آپ کی غریب اُمت کھڑی ہے۔ دوسری جانب عیسائی۔ ہندو۔ آریہ ہیں جو تہنیت کے گلدستے پیش کرنے چاہتے ہیں۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ لوگ اپنے حاکم کے سامنے استقبال کے وقت اپنی ضروریات ظاہر کیا کرتے ہیں۔ گزشتہ کارناموں کو سُناتے ہیں۔ موجودہ حالت کا نقشہ پیش کرتے ہیں اور پھر اظہار رائے کے طلبگار ہوتے ہیں۔ دادرسی و مراعات و انعامات کا یہی موقع سمجھا جاتا ہے۔ لہذا ہم بھی ہندوستان کے پردیس میں اپنے دین و دنیا کے بادشاہ کا استقبال کرتے وقت رسم زمانہ کے موافق عرض حال کرنا ضروری سمجھتے ہیں +

سرکار والاتبار! جو زمین اس وقت ہم سب کے زیر قدم ہے۔ چھ سو برس تک ہمارے زیرنگین رہ چکی ہے۔ یہاں ہمارا تاج تھا۔ یہاں ہمارا تخت تھا۔ سکّہ بھی ہمارا تھا۔ شان و عزّت بھی ہماری تھی۔ تلوار کے بل پر آئے تھے۔ تلوار کے بل پر رہے تھے۔

ہم نے اس ملک میں خدا کے بندوں پر محبت و انصاف سے حکومت کی۔ حضور کے ارشاد کے موافق رعایا کی خبر گیری و حفاظت میں کوئی دقیقہ باقی نہ چھوڑا۔ آج تک ہمارا عہد خوشی۔ راحت اور فارغ البالی کا عہد سمجھا جاتا ہے +

جہاں پناہ یہ سُنکر کمال درجہ مسرور ہوں گے کہ یہ ملک علوم الٰہیہ کے قبول کرنے اور ان میں جی لگا کر مصروف ہونے میں خاص صلاحیت رکھتا ہے۔ یہاں بھی اگلے زمانہ میں توحید کا چرچا رہ چکا ہے۔ اس خطّہ میں بھی خدا تعالےٰ نے اپنے مقبول بندوں سری رامچندر جی دسری کرشن جی و مہاتما بدھ کے ذریعہ کلام حق بھیجا تھا۔ جو تمادی ایّام کے سبب اور نفس و شیطان کی شرارتوں کے باعث خلط ملط ہو گیا +

ظلّ سبحانی کے سمع اقدس میں یہ واقعہ پیش ہونا ضروری ہے کہ اس ملک کی آسمانی کتاب وید میں وحدت الٰہی کا یہ کلمہ ارشاد ہوا ہے "ایکو برہم دو ہیو ناستی" جس کا عربی مفہوم لا الٰہ الّا اللہ ہے۔ اسی وید کے ایک حصّہ اتھرون وید میں حضور عالی کی نسبت اُسی طرح کی پیشین گوئیاں ہیں جیسی زبور۔ توراۃ۔ اور انجیل میں پائی جاتی ہیں +

جب ہم غلامان رسالت اس دیار میں وارد ہوئے اور حضور عالی کا پیام یہاں کے باشندوں کو سُنایا تو وہ جوق جوق آئے اور آپ کے حکم کے سامنے سر جھکا دیا۔ چنانچہ اس وقت کروڑوں آدمی ایمان لانے والوں میں موجود ہیں +

اب ہم موجودہ دور کا فسانہ عرض کرنا چاہتے ہیں۔ نہایت شرم کے ساتھ۔ نہایت ندامت و پشیمانی کے ساتھ یہ الفاظ ہمارے مُنہ سے نکلتے ہیں کہ ہمارا چھ صدی کا تاج لُٹ گیا۔ تخت اُلٹ گیا۔ ہمارے محل اور قلعے غیروں کے پاس چلے گئے۔ اب ہم رات کی روٹی کو محتاج ہیں۔ ہماری رعیت ہم پر ہنستی ہے۔ ٹھوکریں مارتی ہے۔ ریشمین قباؤں کے بدلے ہم کو میلے کچیلے پھٹے پُرانے کپڑے بھی میسّر نہیں آتے +

ہماری حرارت برباد ہو گئی۔ ہماری غیرت تباہ ہو گئی۔ اب رسوائی و ذلّت کی کوئی حد باقی نہیں رہی +

آج جہاں پناہ کے حضور میں ایک شکستہ حال اُمت کھڑی ہے۔ جو کل تاجدار تھی۔ باوقار تھی۔ آج وہ لوگ آپ کے سامنے پیش ہو رہے ہیں جو کشمکش کے میدان میں بے یار و مددگار ہیں۔ جن کا خدا کی ذات کے سوا کوئی سہارا نہیں +

قدرت نے انگریزی قوم کو ہمارا لنگراں بنایا ہے جو چاہتی ہے کہ ہم زبونی و خرابی کے غار سے ہمّت کر کے باہر نکلیں۔ مگر زخموں کی تکلیف اور فاقوں کی ناتوانی کے سبب ہم ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھا سکتے۔ لیکن ہم کو یقین ہے کہ اب گردش کے دن ختم ہونے والے ہیں۔ اب ہم پھر اقبال و دولت کے سایہ میں پہونچنے والے ہیں۔ کیونکہ آپ کا دیدار۔ آپ کے اوصاف و اطوار کا دیدار۔ ہم سب کی ظاہری و باطنی مصیبتوں کو دور کرنے والا ہوگا + آمین +

دربارِ رسولؐ

ازنظام المشائخ مارچ ۱۹۱۱ء

(گستاخ نامہ یعنی سائنس ڈاکو کا خط دربار رسالت میں)

از کیمپ یورپ - بارگاہ شاہ ہفت اقلیم حضور سائنس بہادر - بخدمت جناب معلّی القاب

محمدؐ بن عبد اللہ بانی مذہب اسلام

جناب من! مجھ کو پیشگاہ سرکار دولتمدار حضور بادشاہ ہفت اقلیم سائنس زمانہ گیر دام اقبالہ کی جانب سے ہدایت ہوئی ہے کہ آپ کو اُن کے دوستانہ خیالات سے آگاہ کروں۔ چونکہ ہمارے بادشاہ جم جاہ آپ کے خیالات میں بہت کچھ صلاحیت اور اپنے خیالات سے نزدیکی ملاحظہ فرماتے ہیں۔ اس لیئے اُن کی خواہش ہے کہ دوستانہ طریق سے چند اُمور آپ کے گوش گزار کریں۔

یہ اطلاع غالباً آپ کو مل گئی ہوگی کہ یورپ میں عیسائی مذہب کے مسمار کرنے اور اُس کو اپنا محکوم بنانے میں ہماری شاہ کو بہت بڑی کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ آپ یہ سُن کر بہت خوش ہوں گے کہ اس زمانہ میں عیسائی مذہب کا جو کچھ غل مچ رہا ہے وہ محض لفافہ ہی لفافہ ہے۔ اندر کچھ بھی نہیں۔ شاہ سائنس نے تمام عیسائی قوموں کے دلوں پر تسلّط پالیا ہے۔ اور اب یوروپ میں ایسا کوئی سرکش باقی نہیں ہے جو عیسوی مذہب کو بچانے یا اُس کا اثر برقرار رکھنے کی شاہ سائنس کے مقابلے میں طاقت رکھتا ہو۔ بدھ مذہب کا جاپان میں خاتمہ کر دیا گیا۔ چین میں کچھ لوگ ہیں اُن پر مہم بھیجی گئی ہے یقین ہے وہ بھی عنقریب مفتوح ہو جائیں گے۔ ہندوستان میں پچاس برس سے معرکہ کارزار گرم ہے اور شاہ سائنس کو اکثر مقامات پر کامیابی حاصل ہو چکی ہے۔ شاہ سائنس کی خوش اقبالی سے ہندو مذہب کا ایک بڑا گروہ دیانند راجہ کی سرکردگی میں ہندو مذہب پر چھاپے مار رہا ہے اور ہمارے بادشاہ کو اس کی پر زور اور پُر اثر یورش سے امید ہے کہ ہندو مذہب پر بہت جلد ان کا قبضہ ہو جائے گا۔ زرتشتی دین کی نسبت تو آپ کو طرح واقفیت ہوگی کہ وہ ہمارے شاہ کے قدموں میں آن گرا۔ اور اب اُس نے خانہ زاد خاص کا خطاب حاصل کیا ہے۔ مگر حضور ظل زمانی بہت افسوس کرتے ہیں کہ آپ کا مذہب اسلام جگہ جگہ ان کی فتوحات میں سد راہ ہوتا ہے اگرچہ حضور ظل زمانی آپ کے سپہ سالار جنرل اسلام کی قابلیتوں کے قایل اور بہت مداح ہیں لیکن وہ اسلام کی موجودہ روش کو پسند نہیں کرتے۔ اور چاہتے ہیں کہ آپ اپنے سپہ سالار کی حالت میں تبدیلی کا حکم دیں۔ شاہ سائنس کی حکمرانی نسل انسانی کے لیئے راحت و شادمانی کا لازوال خزانہ ہے۔ شاہ سائنس نے اپنی سلطنت کے ایسے طریقے مقرر فرمائے ہیں جن سے ہر مذاق اور ہر خیال کا انسان مساوی درجہ کیا خوشی اور آسایش حاصل کرتا ہے۔ اگر آپ ذرا غور فرمائیں گے تو معلوم ہو جائے گا کہ مذہب انسان کے لیئے اور اُس کی زندگی کیلیئے بڑی خوفناک اور ضرر رسان چیز ہے۔ مذہب کے باعث ہر ملک ہر قوم یہاں تک کہ ہر گھر میں فساد اور خونریزیاں برپا رہتی ہیں مذہب انسانی فطرت کے جذبات کو قدرتی طور پر اُبھرنے نہیں دیتا اور دبا کر برباد کر ڈالتا ہے۔ مذہب تہذیب داری اور شائستگی کا دشمن ہے مذہب بیدار مغزی اور معقولیت سے کوسوں دور ہے۔ مذہب نہیں چاہتا کہ انسان اپنے اختیارات اور اپنی طاقتیں کام میں لاتے۔ مذہب

آزادی و مساوات کا مخالف ہے۔ یہی وہ چیز ہے جس نے دنیا پر تکلیفات کا جال پھیلا رکھا ہے۔ آپ ملاحظہ فرمائیے کہ یورپ کی اس زمانہ میں جب کہ وہاں مذہب کا دور دورہ تھا اہل یورپ کیسی ذلیل اور کمینی زندگی بسر کرتے تھے۔ پیشوایانِ مذہب اُن کو ٹھکراتے تھے۔ آگ میں جلاتے تھے۔ اُن کی عورتوں کو اور عزت و ناموس کو خراب کرتے تھے اور بیچارے پیروانِ دین ہیچ اُف نہ کر سکتے تھے۔ مگر آج جبکہ شاہ سائنس کا دورِ حکومت ہے۔ ہر شخص آزاد۔ ہر شخص با اختیار۔ خوش و خرم اور عزت دار بنا ہوا ہے۔ کسی کی مجال نہیں کہ اپنے سوا دنی یا اعلیٰ کی آزادی و اختیارات میں دخل دے سکے۔ اہل یورپ ہمارے شاہ کی تاجداری پر دل سے فریفتہ ہیں اور چاہتے ہیں کہ سب دنیا والے سائنس تاج کے زیرِ سایہ آجائیں۔ ایسی حالت میں آپ خود انصاف فرما سکتے ہیں کہ ہمارے شاہ کا آلہ کٹھپتلا اور مذہبی حکومت کو تہ و تدبیر کرنا کس قدر ضروری اور کیسا اچھا کام ہے۔ لہٰذا آپ فوراً اپنے اصول جہانداری کو بدل ڈالیئے اور سائنس اور گورنمنٹ سائنس کے قوانین اپنے ہاں جاری کر دیجیئے۔ تاکہ ہماری گورنمنٹ کے سامنے سے دشواریاں اور مشکلات دور ہو جائیں۔ اور زمین پر امن و امان کا آفتاب چمکنے لگے۔ ورنہ اندیشہ ہے کہ شاہ زمانہ گیر اُن تدابیر کو عمل میں لائیں گے جن سے آپ کی گورنمنٹ کو سخت نقصان اُٹھانا اور بربادی کا سامنا کرنا پڑے گا ✤

میں بے باکانہ عرض کرنے پر مجبور ہوں کہ اگر اس آخری اطلاع پر جلدی توجہ نہ کی گئی تو افواجِ قاہرہ کو حرکت میں لایا جائے گا اور اسلامی قصر کی اینٹ سے اینٹ بجا دی جائے گی۔ ہماری گورنمنٹ کے اسلحۂ آتش فشاں اور فنونِ حرب کی ترقیوں سے غالباً آپ بے خبر نہ ہوں گے اور صلح کو جنگ سے غنیمت تصور فرمائیں گے ✤

راقم

میں ہوں آپ کا ادنیٰ خدمتگار

دہریہ۔ وزیر محکمۂ خارجہ گورنمنٹ۔ سائنس زمانہ گیر

مشورہ

سپہ سالارِ اسلام فرشِ خاک پر تلوار ٹیکے کھڑا تھا اور سامنے تمام عہدہ دارانِ فوج دست بستہ ایستادہ تھے ہوا تیز چل رہی تھی۔ اور سپہ سالار کی تقریر صاف سُنائی نہ دیتی تھی لیکن آخر میں سپہ سالار نے ایسے پُر جوش جملے کہے کہ سب نے اچھی طرح اُن کو سُنا ✤

یورپ کے مشہور قزاق سائنس کا ایک گستاخانہ مراسلہ دربارِ رسالت پناہی میں آیا ہے۔ جس میں اُس نے لڑائی کی دھمکی دیکر ہماری سلطنت کے قوانین بدلوانے کی خواہش ظاہر کی ہے۔ بولو۔ اب تم کیا ارادہ رکھتے ہو؟

جنرل شریعت دار:۔ پہلے یہ فرمائیے کہ دربارِ قدسی کی جانب سے اُس گستاخ کو کیا جواب دیا گیا؟

سپہ سالار:۔ وہ جواب تم عنقریب سُن لو گے۔ میں تمہارا منشاء معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ اگر حالات کی صورت دگرگون ہو تو تم کن طریقوں سے مدافعت کرو گے اور تمہارے پاس کیا کیا ذرائع مقابلے کے ہیں؟

جنرل شریعت دار:۔ جس قسم کی ضرورت ہو ہم ہر حیثیت سے تیار ہیں۔ اگر علمی مقابلہ ہو تو حدیث۔ تفسیر۔ فقہ۔ اصول فقہ۔ الغرض معقول، منقول جس قرینے کا معرکہ ہوگا ہم مقابلہ کریں گے۔ جنگ کی نوبت آئے تو اس میں بھی ہم کو سب سے آگے ہاتھ مارتے پائیں گا

جنرل طریقت دار :- جناب عالی تردد نہ فرمائیں۔ میری کمان میں وہ بہادر ہیں جن کے نعرۂ حق سے آسمان زمین لرزتے ہیں۔ سائنس کی کیا ہستی ہے جو ہمارے شہنشاہ کے قوانین کو ٹیڑھی نگاہ سے دیکھ سکے۔ یہ دیکھئے حضور کے روبرو چشتی۔ قادری۔ نقشبندی۔ سہروردی۔ رفاعی وغیرہ نامور افسر کھڑے ہیں۔ انھوں نے ہزاروں بار نفس امّارہ کے لشکروں کو زیر و زبر کیا ہے جن و ہوا کی کائنات ان کے نام سے تھراتی ہے خود بینی و ناحق شناسی کے سیکڑوں تاج و تخت ان کے نعرۂ ہو سے خاک میں مل گئے۔ سائنس اپنے تمام ابلیسی لشکروں کو لیکر آجائے اور دیکھے کہ شہسواران طریقت کس شان سے میدان کارزار میں نکلتے ہیں اور کیونکر اس کے دھوئیں اڑاتے ہیں ؛

جنرل طریقت دار کی تقریر سنکر سپہ سالار اسلام کا چہرہ بشاش ہو گیا۔ اور اس نے تبسم خیز انداز سے کہا۔ آفرین بہادرو! شاباش دلیرو!! تمہاری ہمت مردانہ سے مجھے یہی امید تھی۔ مگر جس دشمن کا مقابلہ درپیش ہے وہاں یہ ہتھیار کام نہیں دیں گے۔ اب نری جرأت سے کام نہیں چلتا۔ تم کو چاہیئے کہ اپنے حریف سائنس کے طریق حرب سیکھو۔ اور پھر مقابلے کے لیئے مورچہ باندھو۔ آؤ پہلے اس کی کوشش کریں کہ ہمارا لشکر سائنس کے قواعد سے خبردار ہو جائے۔ اس کے بعد دو ہاتھ کرنے کو آگے بڑھے ؛

تخت رسالت کا فرمان

تمام اُمت محمدی کے صوبہ داروں اور ادنیٰ و اعلیٰ افراد ملت کو معلوم ہو کہ با بدولت و اقبال تمدن جدید کی دنیا میں کلمۃ اللہ کی تبلیغ کرنی چاہتے ہیں۔ تم کو لازم ہے کہ دربار رسالت کے فرمان واجب الاذعان کی تعمیل کے لیئے دل و جان سے کمر بستہ ہو جاؤ ؛

وقت آگیا کہ یورپ و امریکہ چین و جاپان اور ان تمام ممالک میں جہاں سائنس اور علوم جدیدہ کی اشاعت ہو رہی ہے اسلامی صداقت کی روحانیت پھیلائی جائے۔ لہٰذا تم سب کیل کانٹے سے درست ہو جاؤ۔ پہلے اپنے حالات کی اصلاح کرو۔ اور اپنے وجود کو اسلامیت کا مجسم نمونہ بنالو۔ اور پھر نئے علوم سیکھنے شروع کرو تاکہ تخت کی منشاء کے موافق مذکورہ زمین پر امر حق رائج کر سکو ؛

مسلم یونیورسٹی کے نام سے جو تحریک ہندوستان میں اُٹھی ہے وہ تاج ملت کے ارادے کے موافق ہے۔ اسکو سرسبز بنانے میں اتفاق و یکجہتی سے کوشش کرو۔ یہ پہلا دروازہ ہے جو تمہارے لیئے قدرت خداوندی نے کھولا ہے۔ اس کے اندر بے دھڑک گھس جاؤ ؛

قرآن شریف میں سب سے پہلے الٓمٓ کا لفظ تم نے پڑھا ہو گا۔ اس میں اشارہ ہے کہ آل محمد اس کتاب (علم) کو جس میں کچھ شک نہیں عالمگیر کرنے کے لیئے کھڑی ہوگی۔ چنانچہ پہلے سید احمد خاں نے جو محمد ہی آل سے تھا یہ کام شروع کیا۔ اور اب آغا خان جو زمرہ آل رسالت سے ہے اس کی مدد کرنی چاہتا ہے۔ تم سب کو بلکہ اس کی اعانت کرنی چاہیئے۔ تاکہ ہدایت کا چشمہ ان قوموں کو سیراب کرے۔ جو روحانیت کی پیاسی ہیں اسی الٓمٓ کے ۷۱ سے میں اس نائب رسول مہدی کے ظہور کی خبر ہے۔ یعنی وہ ۱۳۷۱ھ میں ظاہر ہو گا۔ اور تمہارے منتشر اور پراگندہ کاموں کو سمیٹ کر یکجا کر دے گا۔ اور سارے جہان کو اسلام کی حقانی دائرہ میں لے آئیگا

با جناب رسالت مآب کے تخت کی جانب سے اس غلط فہمی کی اصلاح ضروری ہے جو یورپ کی قوموں میں پھیلی ہوئی ہے۔ وہ لوگ ہمارے نائب مہدی کے نام سے طرح طرح کے وہم کرتے ہیں۔ اُن کو اطمینان رکھنا چاہیئے ہمارا مہدی ان کی مملکت میں ہاتھ نہیں ڈالے گا۔ امن و امان کو برہم نہیں کرے گا۔ اُس کا کام صرف یہ ہو گا کہ باطنی اور روحانی تسکین کے ذرائع دُنیا میں شایع کرے۔ اور انسانوں کو ظاہری دولتمندی کے ساتھ باطنی تسلی کی دولت بھی بانٹے۔ اور لکھا جا چکا ہے کہ جس وقت وہ دُنیا میں آئے گا سب قومیں اُس کے طریق روحانیت کو قبول کر لیں گی۔ اور اُس کی ہدایت پر عمل شروع کر دیں گی۔ بس اسی کا نام مہدی کی حکومت ہے۔ کہ اسلامی روحانیت تمام جہان پر مسلط ہو جائے۔ یہ نہیں کہ لوگوں سے تاج و تخت چھینے۔ جس طرح جرمن و انگریز۔ روس و فرانس وغیرہ کی سلطنتیں اب قایم ہیں۔ مہدی کے وقت میں بھی برقرار رہیں گی۔ فرق صرف اتنا ہو گا کہ یہ سب اُن اُصول پر اپنی زندگی شروع کر دیں گی جو مہدی مقرر کرے۔ اس میں جھگڑا فساد اور خونریزی مطلق نہ ہو گی۔ لہٰذا سب لوگوں کو بے فکر رہنا چاہیئے۔ اور خوشی و خرمی سے ہمارے نائب کے خیر مقدم کے لیئے آگے بڑھنا چاہیئے ❖

دُنیا میں اس اعلان کی خبر نے جو سائنس کی جانب سے دربار رسالت میں پہونچا ہے ہلچل ڈال دی ہے۔ مگر تخت تم سب کو تسلی دیتا ہے کہ معاملات کی صورت ایسی پیچیدہ اور نازک نہیں ہے۔ سائنس کے اعلان کا جواب دیدیا گیا ہے۔ ہمارا سپہ سالار اسلام میان سے تلوار نکالے بغیر سب خرخشوں کو صاف کر دے گا۔ فکر کی کوئی بات نہیں۔ اگرچہ سائنس کے وزیر خارجہ دہریہ کا لب و لہجہ سخت تھا۔ مگر ہمارا جناب سختی کا جواب سختی سے نہیں دینا چاہتے ہماری سرکار کا ہمیشہ سے نرمی و ملائمت کا شیوہ رہا ہے۔ اور وہی اب بھی ملحوظ ہے۔

مرحمت نامہ

(یعنی سائنس کے گستاخنامہ کا جواب دربار رسالت سے)

(از مملکت حجاز۔ خیمۂ رسالت۔ بنام سائنس مدعی زمانہ گیری)

تمہارا خط جس میں تخت رسالت پناہی کو اسلام کی موجودہ روش تبدیل کرنے کی جانب توجہ دلائی گئی ہے پہنچا۔ بارگاہ قدوسی میں عرض کر دیا گیا ❖

حضور انور نے کمال الطاف و نوازش کے بشرہ سے اُس کو سماعت فرمایا۔ تمہارے وزیر نے جس طریقے سے اپنی کامیابیوں کا ذکر کیا ہے۔ وہ اگرچہ پسندیدہ نہیں ہے لیکن دارین پناہ بوجہ خلق عظیم کے اُس سے درگذر فرماتے ہیں اور ہدایت کرتے ہیں کہ غرور و تجبر ہر کامیابی کے لیئے سبب ناکامی ہے۔ اس سے احتیاط کرنی چاہیئے۔

ارشاد ہوا ہے کہ مذہب کی مضرتوں کو تم نے بالکل غلط سمجھا۔ یورپ کے مذہبی زمانہ میں جس قدر خرابیاں تھیں وہ مذہب کے غلط استعمال کے سبب تھیں۔ مذہب کا اس میں کچھ قصور نہیں۔ اور اب جن راحتوں کو پیش کیا جاتا ہے وہ بھی موہوم اور بے اصل ہیں۔ جن کو پائداری نصیب نہیں۔ ذرا لوگوں کے دل سے پوچھو کہ باوجود

اس آزادی و دولتمندی کے اُن کو اندرونی اطمینان اور قرار و سکون میسّر ہے یا نہیں - ہر شخص یہی کہے گا کہ نہیں پھر اس نمائشی راحت سے کیا فائدہ - راحت وہ ہے جس کی جڑ آدمی کے دل میں جاگزین ہو۔

نائبِ بارگاہِ ایزدی تم کو مطلع فرماتے ہیں کہ اُن کی اُمت عنقریب تمہاری اُن مشکلات کو رفع کر دے گی جو در حقیقت سچی مشکلیں ہیں - نہ وہ جن کو تم مشکلات تصور کر رہے ہو ✤

اس سے زیادہ وہ کچھ فرمانا نہیں چاہتے - گو اُن کو قلم کے جواب کے علاوہ تیغ و سناں کی جواب دہی کی بھی ہر طرح قدرت حاصل ہے ✤

اُمید ہے کہ تم ہماری رحیم و کریم سرکار کی مہربانی اور نوازش سے فائدہ اُٹھاؤ گے اور اچھا زمانہ حاصل کرنے کی کوشش کرو گے ✤

راقم
عبید - حلقہ بگوش تختِ رسالت
محکمۂ تحریرات - بقلم حسن نظامی

از نظام المشائخ ستمبر سنہ ۱۹۱۰ء

قوموں کی زندگی اور ترقی جن ذرائع سے معلوم ہوتی ہے اُن میں قومی تہواروں کی شان و شوکت کو بہت کچھ دخل ہے - اسلام نے ظاہر ہو کر عرب اور اکثر حصۂ عالم کی مراسمِ قبیح و نازیبا رواجوں کو زیر و زبر کر ڈالا - اور مٹا دیا مگر جو رسمیں بشریت کی فطرت میں داخل تھیں اُن کو باوجود اپنے بھاری بھرکم طرزِ عمل اور تقوے و متانت کے جاری رکھا - بلکہ اُن میں اور چار چاند لگائے ✤

چنانچہ وہ کھیل جو جنگجو قوموں میں بطور مشق جاری تھے - اسلام نے اُن کو منع نہیں کیا - خود بانیِ اسلام علیہ التحیۃ والسلام بارہا ایسے کھیلوں میں شریک ہوئے ہیں - حالانکہ کھیل تماشہ اور لغو مشغلوں سے آپ نے ہمیشہ نفرت کا اظہار کیا - اور لوگوں کو اس سے روکتے رہے -

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کھیل جن سے قوم میں کوئی کارآمد بات پیدا ہو اسلام نے بند نہیں کیے - اور اُن کو اپنی متانت و بُردباری کے خلاف نہیں سمجھا - مثلاً حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نیزہ بازی و تیر اندازی کے کھیلوں کا خود بھی تماشہ دیکھتے تھے اور اپنے عیال کو بھی دکھاتے تھے - معتبر روایتوں سے یہاں تک ثابت ہے کہ آپ اپنے گھر والوں کے ساتھ دوڑ کے کھیل میں شریک ہوتے - اور خود بنفسِ نفیس دوڑتے اور فرماتے

دیکھیں کون آگے نکلے ۔

بہادری اور مردانگی کے کھیلوں میں خود ذات رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا شریک ہونا دلیل ہے اس امر کی کہ ہر زمانہ میں جو کھیل دلیری و شجاعت کا جذبہ پیدا کرنے والے ہوں۔ ان میں ہر ثقہ اور متین مسلمان شامل ہو سکتا ہے۔ اور کوئی شخص اس پر اعتراض نہیں کر سکتا۔ کیونکہ جو ذات سب سے زیادہ متین اور سب سے زیادہ بردبار تھی وہ بھی ایک مفید حد تک ان کھیلوں کو جائز رکھتی تھی ۔

اسی پر ایام خوشی کو قیاس کرنا چاہیئے۔ کہ سال بھر میں ایک دن ایسا ہونا جس میں قوم کا ہر فرد اپنی حیثیت اور طبیعت کے موافق خوش ہو۔ ضروریات سے تھا۔ اس واسطے حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عید الفطر اور عید الضحیٰ دو دن مقرر فرمائے۔ یہ دونوں دن اسلام کے دو عظیم الشان فرائض کی تکمیل کی خوشی میں مقرر ہوئے۔ عید الفطر مہینے بھر کے روزے عطا کرنے کے بعد۔ اور عید الضحیٰ حج کعبہ کے بعد۔ اس طریقے سے مسلمانوں کی خوشی کو اپنے معبود کی عبادت کے ساتھ جیسی کچھ وابستگی ہو گئی ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ ہر شخص خود غور کر سکتا اور سمجھ سکتا ہے ۔

حضرت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کے جلیل القدر صحابہؓ دلی یکجہتی اور شادمانی سے ان تہواروں میں حصہ لیتے تھے۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ قومی تہوار ان کی شان کے موافق متانت اور بھاری بھرکم پن کے خلاف و منافی نہیں ہیں۔ درویش اور مشائخ بھی بشر ہیں اور انسانوں کے دل سینے میں رکھتے ہیں۔ اور حضرت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ان کی شان کچھ اعلیٰ و برگزیدہ نہیں ہے جو اپنے دینی و قومی تہوار کی خوشی کے اظہار میں شریک ہونا اپنے وقار اور منصب کے خلاف تصور کریں۔ خوشی اور رنج کا حس مٹ جانا دوسری چیز ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ انسان اپنے حواس آدمیت سے معطل ہو جائے۔ بلکہ وہ ایک مقام رضا و تسلیم ہے جس میں درویش رضائے الٰہی کی طلب میں ایسا بے خبر ہو جاتا ہے کہ وہ دنیا کی تکلیفات اور خوشیاں اس کی طلب میں مخل نہیں ہونے پاتیں۔ اور وہ ایک ہی دھن میں مستغرق رہتا ہے۔

پس عید جیسے قومی و دینی تہوار میں فقراء و مشائخ کا یا ان کے اخبار و رسالہ کا شریک ہونا اور اس کی خوشی میں اپنے دیگر ہم مذہب بھائیوں کی مثل برابر حصہ لینا نامناسب و ناروا نہیں ہے بلکہ لازمی اور ضروری ہے ۔

عید میلاد الرسول صلعم

از نظام المشائخ جنوری ۱۹۱۱ء

ایک سو ایک ضرب اِلّا اللہ کی سلامی دو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لاتے ہیں۔ آنکھیں مژگاں کی سناں اور ابرو کی تیغ سنبھالے۔ ادب سے پتلیاں جھکائے کھڑی رہیں۔ زبان درود کا بینڈ بجاتے

بدن کی سب رگوں کو حکم دو کہ صلواتی بینڈ میں یک جان ہو کر سُر ملائیں۔ یہاں تک کہ ہر بُن مو سے نغمہ صَلُّوا عَلَی مُحَمَّد نکلنے لگے۔ روزہ کی عید۔ حج کی عید۔ دونوں دست بستہ آئیں اور عید میلاد کا خیر مقدم کریں ✤

دودھ۔ سویّوں۔ اور قورمہ چپاتی کو اس عید سے کچھ سروکار نہیں۔ جَو کی روٹی کھاؤ۔ اور خوشی مناؤ ✤

آج عید ولادت ہے۔ آج وہ پیدا ہوئے جن پر کائنات کی پیدائش کا حصر ہے ✤

چاند کو رُخ انور سے شرمانے والے۔ ظلمت کو گیسوؤں میں اُلجھانے والے۔ شاہ گدا نواز۔ رسول العرب والعجم۔ جن کی ولادت سے تاریکی باطل ہو گئی۔ حق کی روشنی چاروں طرف پھیل گئی۔ خود سر بے سر ہوئے۔ بے تاج تاجور ہے۔ جنہوں نے ہونٹوں کو ہلا کر ساری زمین زلزلے میں ڈال دی۔ غریبوں، مظلوموں کے غمگسار۔ سرکشوں۔ ظالموں کے زیر کرنے والے۔ وہی جن کا نام لینے سے ہمارے خون میں حرارت اور دل میں جوش پیدا ہوتا ہے ✤

ایسے برگزیدہ و پاکیزہ وجود کے ظاہر ہونے کا وقت ہے۔ کہ آسمان۔ زمین۔ شجر۔ حجر۔ کیف میں ہیں پھر تم کیوں اے مسلمانوں یوم ولادت کو قومی تہوار نہیں بناتے ✤

یہ وہ خوشی ہے جس میں ہر فرقہ اور عقیدے کے مسلمان کو یکساں حصہ لینا چاہیئے۔ یہاں شیعہ سُنّی مقلد۔ غیر مقلد۔ صوفی۔ وہابی کی قید نہیں۔ سب یک دلی و اتفاق سے میلاد کا تہوار مقرر کریں۔ اور دُنیا کو دکھائیں کہ جس طرح رسول خدا کو اپنی اُمت سے محبت تھی۔ اسی طرح اُمت بھی اُن کے نام پر قربان ہے۔ اور اُن کی یادگار میں دل وجان سے حصہ لینا چاہتی ہے۔ دوسری قومیں فرضی اور خیالی تہوار مناتی ہیں تاکہ قوم میں زندگی کے جذبات پیدا ہوں۔ تمہارے سامنے ایک اصلی اور شاندار موقع موجود ہے اس سے کیوں نہیں فائدہ اُٹھاتے ✤

اسلامی ممالک میں جہاں ہمارے خوش قسمت بھائی تخت و تاج کے مالک ہیں میلاد شریف کے موقع پر بڑے جوش و خروش کا اظہار کیا جاتا ہے ✤

ہم بدنصیب سہی۔ بے تاج سہی۔ ہیں تو حلقہ بگوش رسول۔ پھر کیوں اپنے تاجدار بھائیوں سے حب رسولؐ میں پیچھے رہیں۔ یہ وقت اس بات کے دیکھنے کا نہیں ہے کہ از روئے فقہ میلاد جائز ہے یا نہیں۔ بلکہ یہ سوچنے کا وقت ہے کہ میلاد کے جلسوں کو کس طریقہ پر بارونق اور شاندار بنایا جائے ✤

یاد رکھو کہ ہم سب کی دینی و دنیاوی زندگی اپنے رسولؐ کی الفت و یاد میں مخفی ہے۔ اگر ہم دُنیا میں اپنی عزت محفوظ رکھنا چاہتے ہیں۔ اگر ہم کو آخرت میں سُرخرو جانا ہے تو آقائے نامدار محمد مصطفٰے صلے اللہ علیہ و آلہ وسلّم کے میلاد پاک کی عیدین سے زیادہ خوشی منایا کریں۔ بلکہ میلاد الرسول کی ایک علیحدہ عید مقرر کریں جس میں دھوم دھام سے میلے ہوں۔ جلسے ہوں اور ہر عقیدے کا مسلمان اپنے کلمہ کے شریک بھائیوں کے ساتھ عید الرسولؐ منائے۔ اور کہے۔ "آج اُس کے نام کی عید ہے جس نے دُنیا کے پردے کو شرک و کفر کے

غم والم سے پاک وصاف کر کے وحدت کے سرور سے آراستہ کر دیا" +

وصلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ اجمعین ہ

ایکو برہم دُوتیونا ستی

(از صوفی۔ جولائی ۱۹۱۱ء)

یہ فقرہ جس کے سلیس معنی وحدہ لاشریک یا لا الٰہ الا اللہ ہیں۔ ہندو مذہب کے اُصول میں داخل ہے۔ اور غور سے دیکھا جائے تو ہر مذہب کی بنا توحید پر ہے۔ مگر انسان اپنے خیالات کی سیر کر کے اس متفق علیہ اُصول کو خراب کر ڈالتا ہے اور وقتاً فوقتاً ضرورت لاحق ہوتی ہے کہ خدا تعالےٰ کسی انسان کو بشری خیالات کی اصلاح کے لیے مقرر فرمائے۔ چنانچہ ہر ملک اور ہر قوم میں ضرورت کے وقت مصلح ظاہر ہونے کا ثبوت تواریخ اور مذہبی کتب میں موجود ہے۔ قرآن شریف میں صاف طور پر ارشاد ہوا ہے کہ ہر ملک و ملت کے واسطے خدا ایک ہادی مقرر کرتا ہے۔ بعض رسولوں کے نام اور حالات کی تصریح فرما دی گئی ہے۔ بعض کی نسبت اشارے کنائے کر دیے ہیں اور پھر ایک کلیہ قاعدہ قایم کر کے حکم دیدیا گیا ہے کہ مسلمانوں کو خدا کے تمام رسولوں اور تمام کتابوں پر ایمان لانا ضروری اور لازم ہے مسلمان بھی زبان سے نہیں بلکہ دل سے یقین رکھتے ہیں کہ جن رسولوں کی اطلاع اُن کو پہونچی اور جن کی نہیں پہونچی وہ سب برحق ہیں +

اتنا معلوم کرنے کے بعد سوچنا چاہیئے کہ ملک ہندوستان جو دُنیا میں ایک بڑا ملک کہلاتا ہے اس بات کا مستحق ہے یا نہیں کہ یہاں بھی خدا نے اپنے دستور کے موافق پیغامبر بھیجے۔ اور اُن کو ہدایت کرنے کے واسطے کتابیں دیں۔ اگرچہ قرآن شریف میں اس ملک کے رسومات کی بابت کوئی تصریح نہیں پائی جاتی۔ مگر خدا کے اس کلیہ کے موافق کہ ہر قوم کے لیئے ایک ہادی ہے تسلیم کرنا پڑے گا کہ ہندوستان بھی اُن متبرک آدمیوں سے محروم نہیں ہے جن کو خدائی اصطلاح میں نبی و رسول کہتے ہیں۔

ہندوستان کے نامور بزرگوں سری رامچندر جی اور سری کرشن جی اور مہاتما بُدھ کے حالات پڑھیئے۔ اُن کی طرز زندگی پر غور کرنے اور اُن کی تعلیمات پر منصفانہ نظر ڈالنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کے وہی حالات تھے جو سیدنا حضرت ابراہیم وعیسیٰ وموسیٰ وغیرہ علیہم السّلام کے پائے جاتے ہیں۔ اور وہی تسلیم تھی جس کا ذکر بار بار قرآن شریف میں آیا ہے +

اسلامی عقائد میں یہ مسلّم امر ہے کہ انسان کے لیئے فطرتی مذہب ہمیشہ سے ایک ہے۔ جس قدر پیغمبر اور رسول بھیجے گئے وہ سب ایک ہی مذہب اور ایک ہی اُصول کی تعلیم کرتے تھے۔ نئے اُصول کی شریعت کسی پیغمبر نے قایم نہیں کی یہاں تک کہ سب سے آخر اور سب سے اچھے رسولؐ نے بھی جن کی پیروی کا فخر ہم کو حاصل ہے وہی بتایا جو آگے نبی بتاتے آئے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ تعلیم میں ہر ملک و قوم کی سمجھ اور طرز معاشرت کا لحاظ رکھا گیا ہے اور ویسے طریقہ

سے سمجھایا گیا ہے کہ ہر درجہ کی عقل میں آسکے آپ کو معلوم ہوگا کہ توراۃ وانجیل کا طریقۂ تعلیم تشبیہ اور استعارات پر مبنی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آخر زمانہ کے آدمی عقلی و ذہنی تغیر کے سبب اس کے فہم سے قاصر ہوگئے۔ اور طرح طرح کی غلطیوں اور توہمات میں مبتلا ہونے لگے۔ وید مقدس اور ہندوؤں کی تمام مذہبی کتابوں اور بزرگوں کے بیانات میں بھی اس قدر مشکل استعارات پائے جاتے ہیں۔ جن کا ٹھیک ٹھیک ذہن نشین کرنا دشوار ہے اگرچہ مثالیں ایسی دی ہیں کہ معمولی عقل والا بھی ذراسی دیر میں سمجھ جائے۔ مگر افسوس ہے کہ اس ملک کے بعض لوگوں نے اصلی بات معلوم کرنے میں توجہ نہیں کی اور ظاہری الفاظ پر عمل کرکے اپنے پاکیزہ اصول کو خراب کر دیا +

میں ایک مثال دنیا کی پیدائش کی نسبت پیش کرتا ہوں۔ قرآن شریف میں خدا فرماتا ہے کہ ہم نے حکم دیا کن فیکون ہندو مذہب میں اول برھما پیدا ہوا۔ اس نے تمام عالم کو ظاہر کیا۔ غور کیجیے کہ ان دونوں بیانات میں کیا فرق ہے۔ کچھ بھی نہیں۔ متحد البیان ہیں۔ قرآن میں خدا نے صفت خالقیت کو کُن کے لفظ سے تعبیر کیا ہے اور وید میں برھما کے لفظ سے۔ برھما صفت ایجاد کا نام ہے۔ جب تک یہ صفت ظاہر نہیں ہوئی دنیا ناپید تھی۔ جس طرح کُن کے ظہور کے بعد یکون کا ظہور ہوا۔ اسی طرح برھما کے ظہور کے بعد سب کچھ ظاہر ہوا۔ یہی کیفیت تمام اصول مذہب کی ہے +

عورتوں میں آپ نے دیکھا ہوگا کہ ایک جسم میں سینکڑوں ہاتھ اور متعدد سر ہیں۔ اور ہر ہاتھ میں مختلف چیزیں ہیں۔ کسی میں تلوار ہے۔ کسی میں پھول ہے۔ کسی میں اناج کا خوشہ ہے۔ اور ہندو ان مورتوں کے آگے سر جھکاتے ہیں + اسوقت آپکو نفرت آمیز ہنسی آئے گی کہ یہ کیسی مضحکہ انگیز صورت ہے اور یہ کیسے احمق ہیں کہ ان کے آگے سر جھکاتے ہیں مگر حضرات ہندوستانی رہبروں نے یہاں کے باشندوں کو سمجھانے کے لیے صفات الٰہی کی حقیقت صاف طور پر ذہن نشین کرنے کے واسطے یہ مورتیں بنائی تھیں۔ تاکہ کم سمجھ لوگ آسانی سے سمجھ جائیں کہ خدا میں قہر کی شان بھی ہے جس کا نمونہ تلوار ہے اور رحم بھی جس کا نشان پھول یا اس قسم کی کوئی اور چیز ہے۔ اسی کے ہاتھ میں رزق ہے۔ اسلیے اناج کا خوشہ دکھایا جاتا ہے۔ مگر ثابت یہ ہوا کہ انسان بہت ہی بے عقل ہے اور مثالوں کو ذریعہ کے بجائے نتیجہ سمجھ لیتا ہے۔ چنانچہ ان مثالی مورتوں کے سبب بت پرستی شروع ہوگئی۔ اور ہزاروں غلط فہمیاں واقع ہوگئیں یہ بات ہندوستان پر مخصوص نہیں ہے۔ دنیا میں اور بھی کئی ملک ایسے ہیں۔ جہاں صرف مثالی خرابی سے بت پرستی کا رواج ہوا۔ روم۔ یونان و مصر میں اس کی کافی شہادتیں موجود ہیں۔

جب تمام دنیا میں عالمگیر غلط فہمیاں واقع ہوگئیں تو خدا تعالیٰ نے ایک ایسا آسان صاف اور سیدھا طریقہ تعلیم سکھلا کر ہمارے حضرت صلعم کو بھیجا۔ جو تمام دنیا کی ہدایت کے لیے کافی ہو۔ اور تمام مذاہب عالم میں جس قدر خرابیاں بشری خیالات اور نفسانی جذبات کے سبب پڑ گئی تھیں وہ دور ہو جائیں۔ میں نہیں کہتا کہ میرا دعویٰ خواہ مخواہ تسلیم کر لیا جاوے بلکہ تجربہ اور تحقیق سے غور کرنا چاہیے کہ اسلام نے قدیمی اصول کو جس پیرایہ میں بیان کیا ہے وہ اس قابل ہے یا نہیں کہ تمام دنیا کے مذہبوں کی خرابیاں آسانی سے رفع کر دے۔ تجربہ مشاہدہ کرا دے گا کہ بے شک اسلام کا طریقہ تعلیم ایسا صاف سیدھا اور آسان ہے کہ قدیمی اصول مذہب عمدگی کے ساتھ ذہن نشین ہو سکتے ہیں +

اب میں مجمل طور پر ہندوستان کے دو نامور بزرگوں سری رام چندر جی اور سری کرشن جی کے حالات پیش کرتا ہوں تاکہ آپکو

معلوم ہو کہ ان لوگوں کی زندگی اور تعلیم ہمارے مسلمہ رسولوں کے کس قدر مشابہ تھی - میں رام کرشن جی کے بعض اقوال کو اپنے حضور صلعم کے ارشاد اور قرآن شریف کے بیان سے مطابق کرکے دکھانا چاہتا ہوں کہ یہ لوگ واقعی ہندوستان کے رسول تھے اور ہمارے رسول گو سب کے بعد بھیجے گئے مگر وہی بیان کیا جو پہلے بیان ہو چکا تھا۔ کوئی نیا دین لیکر نہیں آئے تھے لہذا تمام دنیا خاصکر ہندوستان کو لازم ہے کہ پرانی تعلیم کو نئے طریقے سے سیکھے جو سب سے زیادہ آسان اور صاف ہے اور جس میں اکثر وہی باتیں ہیں جو ہندوستانی رسول فرما گئے تھے +

رام جی اودھ کے راجہ دسرتھ کے بڑے صاحبزادے تھے۔ ہندوستان میں رام لیلا کا مشہور میلا انہیں کی یادگار میں منایا جاتا ہے۔ ابھی سولہ برس کی عمر بھی نہ ہوئی تھی کہ اپنے خاندانی پیشوا بشسٹ جی کے ہمراہ سیاحت کو نکلے اور تمام مشہور اور متبرک مقامات اور اہل اللہ بزرگوں کی زیارتیں کیں۔ قدرتی نظارے دیکھے۔ دنیا کے نشیب و فراز ملاحظہ کیے۔ جب واپس آئے تو عجب حال ہو گیا۔ ہر وقت سوچ اور فکر میں مستغرق رہتے نہ کھاتے نہ پیتے۔ اور دنیا کے تفریحی شغلوں سے نفرت ہو گئی۔ اکثر خاموش رہتے۔ اور بولتے تو فرماتے۔ یہ دنیا کیسی بری دنیا ہے۔ بالکل ہیچ و ناپائدار۔ اسی اثنا میں ایک ایسا موقع آیا کہ اُس زمانہ کے مشہور بزرگ بسوامترجی راجہ دسرتھ کے پاس آئے اور رام جی کو کسی سرکش و بدکار کی ہلاکت کے لیئے مانگا راجہ نے ان کی کمسنی اور ناتجربہ کاری کا عذر کیا۔ مگر بسوامترجی کے اصرار سے رام جی دربار میں بلائے گئے۔ اور ایک ایسی عالمانہ و عارفانہ تقریر کی کہ راجہ اور تمام درباری خاصکر بشسٹ اور بسوامتر جیسے عارف لوگ حیران رہ گئے کہ یہ کم سن بچہ کیسی باتیں کرتا ہے +

رام جی نے اپنی تقریر میں انسانی ہستی کے تمام مدارج اور دنیا کے تغیرات کی نسبت بشسٹ جی اور بسوامتر جی سے سوالات کیئے۔ مگر ایسے پیرایہ میں جیسے کوئی شخص تجاہل عارفانہ کرتا ہے۔ خود ہی ایک امر کی نسبت شک و شبہ بیان کرتے اور خود ہی ایک لطیف کنایہ سے اس کا جواب دیتے۔ بسوامتر اور بشسٹ نے رام جی کے سوالات کا جواب دیا۔ مگر انصاف سے دیکھا جائے تو

صاحب عرفان سائل کو سوالات

کی شان کے موافق ان لوگوں کے جواب نہ تھے۔ یہ رام جی کا شروع حال ہے۔ اس کے بعد اُنھوں نے ایک خاص امتحان کے موقع پر بیسیوں راجوں کے مقابلہ میں ایک مشہور کمان توڑ کر امتحان پاس کیا۔ اور راجہ کی بیٹی سیتا جی کو جیت کر بیوی بنالیا پھر چند سال تک اپنی سوتیلی ماں کے حسد کے سبب صحرا کی زندگی بسر کرتے رہے۔ یہاں اُن کے ہمراہ اُن کے بھائی لچھمن جی اور بیوی سیتا جی بھی تھیں۔ یہیں اُن کو ایک سرکش و بدکار راجہ نے جس کا نام راون تھا دھوکا دیا۔ اور اُن کی بیوی سیتا کو چرا کر لے گیا۔ اور رام جی کو اُس کے ملک لنکا پر حملہ کرنا پڑا۔ چنانچہ ہنومان نامی کوہستان کے راجہ کی مدد سے لنکا فتح کر کے راون کو مارا اور سیتا جی کو چھینا۔ اس کے بعد اپنے راج استھان یعنی دارالخلافہ اجدھیا پوری میں واپس آئے اور راج کرنے لگے۔ اسی راج کے زمانہ میں اُنھوں نے رسالت کے فرائض کو پورا کیا +

ایک عجیب بات ہے جس کی بابت حدیثوں میں بھی اشارہ ہے کہ ہر بڑے رسول کو ایک بڑے دشمن سے سابقہ پڑتا ہے اور وہ دشمن اُسی رسول کے ہاتھ سے ہلاک ہوتا ہے۔ حضرت ابراہیم کو نمرود اور حضرت موسیٰ کو فرعون اور ہمارے حضور صلعم کو ابوجہل

سے سابقہ پڑا تھا۔ اسی طرح رام جی کو راون اور کرشن جی کو کنس جیسے خونخوار دشمن دیے گئے تھے جو مذکورہ بالا دشمنوں کی طرح ذلت و خواری سے ہلاک ہوئے۔ مگر اس ظاہری خصوصیت کے ساتھ میرے خیال میں ایک اور خصوصیت بھی ہے جس کو حضرت مولانا محی الدین ابن عربی نے بھی لکھا ہے کہ فرعون اور نمرود صفت قہاری کے ظہور تھے۔ چونکہ خدا کو صفت رحیمی اور شان رحمت ظاہر کرنی مقصود تھی جو رسولوں کے ذریعے سے ظاہر کی اسواسطے شان جلالت و جبروت کو بھی ہر رسولؐ کے زمانہ میں ظاہر کیا۔ رام جی کے زمانہ میں راون بھی شان قہر کا مظہر تھا۔ چونکہ شان قہر کے ظہور کے لیئے مختلف صورتیں اور طریقے ہیں اس لیئے راون کے بہت سے ہاتھ اور سر بیان کیے جاتے ہیں +

اب رام جی کے چند اقوال جو اُن کی تعلیم کا نمونہ ہیں یوگ بسشٹ اور رامائن سے اخذ کر کے بیان کیے جاتے ہیں +

فرماتے ہیں کہ دُنیا کی مثال چمکدار ریت کی ہے جو پیاس نہیں بجھا سکتی مگر پیاسے کو دھوکے میں ڈالتی ہے۔ اسلام بھی دُنیا کو سراب کی مثال سے یاد کرتا ہے۔ فرمایا جن کے پاس کتابیں ہیں اور سمجھتے نہیں وہ بوجھ اُٹھانے والے مزدور ہیں۔ قرآن شریف میں اس کی مثال بوجھ اُٹھانے والے گدھے سے دی گئی ہے +

فرمایا۔ دل کُتا ہے۔ جہاں مُردار دیکھتا ہے کھانے کو دوڑتا ہے۔ ہمارے حضور نے فرمایا۔ الدّنیا جیفۃٌ وطالبھا کلاب۔ دنیا مردار ہے اور اس کے طالب کتّے +

فرمایا۔ جو کچھ دریافت کرنا ہے اپنے آپ سے دریافت کر۔ کہ سب کچھ تجھ میں ہے۔ قرآن شریف میں بھی ایسا ہی ارشاد ہے کہ وفی انفسکم افلا تبصرون۔ اپنے آپ کو کیوں نہیں دیکھتے۔ اور حدیث میں ہے من عرف نفسہ فقد عرف ربّہ۔

اور فرمایا۔ بارہا دیکھا گیا کہ ایک اکیلا مرد بڑے گروہ کو بھگا دیتا ہے۔ قرآن شریف میں آیا ہے۔ کم من فئۃ قلیلۃ غلبت فئۃ کثیرۃ (ترجمہ) بعض دفعہ چھوٹا گروہ بڑے پر غالب آجاتا ہے +

فرمایا۔ یہ عالم محسوس و ہیولیٰ ہے۔ مگر تعجب ہے کہ جو نہیں ہے وہ دکھائی دیتا ہے اور جو ہے وہ نظر نہیں آتا۔ فرمایا۔ عمر کی مثال بجلی کی ہے کہ ایک دم چمکی اور ندارد +

فرمایا۔ یہ کیسا بُرا گھر ہے جس کا دروازہ ہڈی کا اور دربان بندر یا ہے۔ بندریا زبان کو فرمایا اس لیئے کہ اس کو قرار نہیں رہتا۔ آہنکار یعنی ہماہمی آدمی کی دشمن ہے +

فرمایا۔ دُنیا میں رہنا اور اُس میں مبتلا نہ ہونا ایسا ہے جیسا دریا میں کوئی ہو اور تر نہ ہو + ؎

درمیان قعر دریا تختہ بندم کردۂ ‍ ‍ ‍ ‍ باز میگوئی کہ دامن ترمکن ہشیار باش

اور فرماتے ہیں (۱) سنتوش پرم لابہ (صبر میں سب سے بڑا فائدہ ہے۔) (۲) ست سنگ برہم دھنم (اچھی صحبت بڑی دولت ہے) (۳) بچار پرم گیانم (سوچنا بڑی عقلمندی ہے) ۴۔ سمم چہ پرم سکھم (سب کو ایک نگاہ دیکھنا بڑا سکھ ہے) +

کیا اچھی تعلیم ہے مگر افسوس زیادہ بیان کرنے کی گنجائش نہیں۔ رام جی کے بعد تھوڑا احال سری کرشن جی کا بھی معلوم کر لینا چاہیئے۔ کرشن جی کے ساتھ بعینہ وہ قصہ پیش آیا ہے جو حضرت موسیٰ کے ساتھ پیش آیا تھا۔ یعنی کرشن جی کے ماموں راجہ کنس کو جو متھرا پر حکومت کرتا تھا نجومیوں نے خبر دی تھی کہ تیری بہن دیوکی کا آٹھواں فرزند تیرا قاتل ہوگا۔ اس خبر

نے کنس کو ایسا حواس باختہ کیا کہ اُس نے اپنی بہن اور بہنوئی کو قید کر دیا اور جو بچہ اُن کے ہاں ہوتا اُسے مارڈالتا۔ جب آٹھویں کرشن جی پیدا ہوئے تو ماں باپ نے چپکے سے ایک گاؤں میں جس میں گائے چرانے والے رہتے تھے اس بچہ کو بھیجدیا۔ اور کنس سے بیٹی پیدا ہونے کا بہانہ کر دیا۔

کرشن جی نے گوکل میں جو گھوسیوں کا گاؤں تھا پرورش پائی۔ جب ہوشیار ہوئے تو اُن سے عجیب وغریب باتیں ظاہر ہونے لگیں اسکی راجہ کنس کو خبر پہونچی اور وہ سمجھ گیا کہ یہ میرا بھانجا ہے۔ ان دنوں کرشن جی رسولوں کی سنت خاصکر حضرت موسیٰ کی سنت کے موافق گائیں چرایا کرتے تھے۔ ماموں نے حیلے سے بُلایا اور قتل کرنا چاہا۔ مگر انھوں نے اُسی کو ہلاک کرڈالا۔ اور دنیا کو اس ظالم سے پاک کیا۔

ان ایام میں کرشن جی کا بانسلی بجانا اور گوپیوں سے اختلاط کرنا سب استعارے ہیں۔ جن سے دل کی پاکبازی پر حرف نہیں آسکتا۔ کنس کے مرنے کے بعد ان کی زندگی میں نئے آثار شروع ہوئے۔ اور حکومت ظاہری کے ساتھ ہی انھوں نے روحانی حکومت کے اصول بیان کرنے شروع کیے۔ چنانچہ جب ہندوستان کی مشہور لڑائی مہابھارت ہوئی ہے جسمیں کرشن جی نے اپنے چیلے ارجن کو اُپدیش دیے۔ انہی لکچروں کے مجموعہ کا نام گیتا ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان اپنے مغالطہ کی پیدا شدہ تکلیف سے نجات پاسکتا ہے اگر تین طریقے اختیار کرے۔

(۱) قدرت کاملہ اور قدرتی اشیاء کا عشق (۲) فرائض معلوم کرنیکے لیے تحصیل علم۔ (۳) فرائض کا ادا کرنا بلا خواہش نفسانی انہی تین اُصول پر بحث کی ہے۔ اور رادھیائے سنیاس یوگ میں فرماتے ہیں۔ ذی علم اور خلیق برہمن۔ گائے۔ ہاتھی کتے اور بدکار آدمی سب کو ایک نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اور فرمایا وہ یوگی سے بھی بڑھکر ہے جو بھلا چاہنے والوں دوستوں دشمنوں۔ قابل نفرت لوگوں۔ نیکوں اور بدوں سب کو یکساں سمجھتا ہے۔ گیتا ۱۳۔ ادھیائے۔

علالت کے سبب سے میں کرشن جی کے اقوال زیادہ تفصیل اور اسلامی مطابقت کے ساتھ جمع نہیں کرسکا۔ انشاءاللہ کسی دوسرے موقع پر پیش کیے جائیں گے۔ البتہ سامعین کی دلچسپی کے لیئے ایک وظیفہ بیان کیا جاتا ہے۔ جو کرشن جی کے پیرو کسی سختی کے وقت پڑھتے ہیں۔ وظیفہ یہ ہے:۔

"کرشنا کرشن پرمہ آتما پرینڈ سیکھے بھجنت سیم تو اننگ شرنم یام مے بھے بھیتا پر تھک دیپیے"

مگر افسوس ہے کہ کرشن جی کے اقوال کے لفظوں کو پوجا کر لی جاتی ہے۔ جس کا نام گیتا کا پاٹ ہے اور بہت کم لوگ اس کے عجیب فلسفہ کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

آخر میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستانی رسولوں کی پیشین گوئی لکھدی جائے جس سے ہماری حضور کی نسبت خبر دی گئی ہے۔ ہمارے سلسلۂ نظامیہ کے ایک بزرگ مولوی شاہ حکیم محمد حسن صاحب نظامی نے ایک ضخیم تفسیر لکھی ہے جسکا نام غایۃ البرہان ہے۔ اس تفسیر میں تمام دنیا کی مذہبی کتب سے حضرت صلعم کی خبریں لکھی گئی ہیں اور عجیب معلومات سے اُن کو ثابت کیا ہے۔ چنانچہ وید کی پوری عبارتیں مع تشریح درج ہیں جن کا نقل کرنا مشکل ہے۔ جس کو شوق ہو مولوی شاہ فضل احمد صاحب نظامی سے امروہہ ضلع مرادآباد کے پتے پر یہ مطبوعہ تفسیر منگا کر دیکھ لے۔ میں صرف ایک حصہ کا اقتباس کرتا ہوں۔ جہاں کلنکی پرانوں کے حوالہ سے مولانا نے حضرت کی خبر لکھی ہے۔ لکھتے ہیں۔

کلنکی اوتار کے باپ کا نام وشنو یش ہوگا۔ وشنو کے معنی اللہ اور یش کے معنی عبد۔ یعنی عبداللہ نام ہوگا۔ ماں کا نام سومتی

یعنی امانت دار ہوگا سو حضور کی والدہ کا نام آمنہ تھا۔ پہلے پہاڑ کے غار میں عبادت کریں گے ۔ سو حضرت نے غار حرا میں عبادت کی۔ پھر شمالی پہاڑوں میں ہجرت کریں گے ۔ سو ہجرت بھی ہوئی ۔ پہاڑ کی کھوہ میں پرشرام سے تعلیم پاویں گے ۔ پرش کہتے ہیں روح کو اور رام خدا کو یعنی روح خدا ۔ مراد جبرئیل فرشتے سے ہے ۔ سو حضرت جبرئیل سب سے پہلے وحی لے کر آئے ۔ سنبل نگری میں پیدا ہوں گے ۔ سنبل دیپ کی نسبت مولانا نے ایک درست بحث کر کے ثابت کیا ہے کہ سنبل ملک عرب کو کہتے ہیں کالکی اوتار کے چار بھائی ہوں گے ۔ جن کے ذریعہ وہ فتحیاب ہوں گے وغیرہ وغیرہ +

اس بیان سے میری غرض یہ ہے کہ جس طرح سب پیغمبر ہمارے حضور کی تصدیق کرتے آئے ہیں ۔ ہندوستانی رسولوں نے بھی تصدیق کی ہے ۔ پس ہندوستانی رسولوں کی اُمت کو بھی حضور کی تصدیق کرنی چاہیئے ۔ اور ہم کو بھی ہندوستان کے تمام رسولوں پر ایمان لانا چاہیئے ۔ اسی میں ہندوستان کی ظاہری و باطنی بہبودی ہے ۔ اور یہی ایک طریقہ ہے جس سے ہندو و مسلمانوں میں دلی اتحاد پیدا ہو سکتا ہے ۔ اگرچہ ہندوؤں کا مسلمان اور مسلمانوں کا ہندو ہونا مشکل ہے ۔ نہ اس بیان سے میری یہ غرض ہے ۔ میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ ان دونوں قوموں کی باہمی نفرت و اجنبیت دور ہو ۔ ہر ایک دوسرے کے پیشوا کی عزت کرے ۔ اور گلے ملنے کے لیئے پہلے مسلمانوں کا قدم آگے بڑھے + سلام علی المرسلین والحمد للہ رب العالمین +

(از اخبار توحید ۱۹۱۳ء سنہ ۶)

مسلمانوں کا ذریعہ خطاب ہے ۔ اس کے معنے ہیں کہ تم سلامت رہو +

ہندوستان میں اس کی جگہ ۔ آداب ۔ تسلیمات کا رواج ہو گیا تھا ۔ اور اب گڈ مارننگ ۔ گڈ نائٹ اور گڈ بائی کے چرچے ہیں +

یہ زمانہ کا اثر ہے ۔ مگر مسلمان وہ ہے جو اپنے دل کو آثار وقت سے محفوظ رکھے ۔ اور دینی اُمور کو اپنا شعار بنائے +

خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو خدا رسول کے مقرر کردہ سلام کی پیروی کرتے ہیں اور ایک دوسرے سے جب ملتے ہیں تو سلام علیکم ۔ وعلیکم السلام کہکر ہمکلام ہوتے ہیں +

ہمارے خیال میں جن لوگوں کو خط و کتابت زیادہ کرنی پڑتی ہے ۔ وہ بڑے خوش قسمت ہیں کہ ہر روز صبح اُٹھتے ہی سلامتی کی دعائیں ان کو ملتی ہیں +

ہم جس وقت توحید کے خطوط کھولتے ہیں تو سب سے پہلے جس چیز پر نگاہ پڑتی ہے وہ سلام علیکم ہے اور جب ہم دیکھتے ہیں کہ آج پچاس سلامتی نامے ہم کو ملے تو خدا کا شکرانہ بھیجتے ہیں کہ اُس نے ہم کو ایسے مذہب میں پیدا کیا ہے جس میں سلام علیکم جیسی پیاری اور مبارک چیز سے بات شروع ہوتی

مگر جب ہم دیکھتے ہیں کہ کسی خط میں سلامٌ علیکم نہیں ہے۔ یا اس کی جگہ کوئی انگریزی لفظ ہو تو بے اختیار ہماری زبان سے افسوس نکلتا ہے۔ کاش وہ جانتے کہ سلام نہ لکھنے سے اُنھوں نے اپنا اور ہمارا دونوں کا نقصان کیا۔ اگر وہ سلام علیکم لکھتے تو ہم اُس کے جواب میں "علیکم السلام" کہتے۔ گویا اس طرح دونوں طرف سے دعا ہو جاتی *

اجنبی ملکوں میں جہاں مسلمان ایک دوسرے کی زبان نہیں جانتے سب سے پہلی اور سب سے بڑی چیز یہی سلام علیکم ہے۔ جس سے فوراً معلوم ہو جاتا ہے کہ ہم اپنے دینی بھائی سے مخاطب ہیں *

لہذا اے مسلمانو! تم کو لازم ہے کہ جب آپس میں ملاقات کیا کرو یا کسی کو خط لکھو تو السلام علیکم ضرور استعمال کیا کرو۔ السلام علیکم *

خدا تم کو سلامت رکھے۔

مرغ کی اذان

از اخبار توحید ۱۹۱۳ء

ہر سچا مسلمان جو رمضان شریف کی سحری کے لیئے آج کل پچھلی رات بیدار رہتا ہے۔ مرغ کی اذان سُنتا ہوگا اس پردار جانور کی آواز میں غور کرنے والے مومنین کے لیئے ایک بڑی نصیحت ہے۔ مرغ کہتا ہے میری اذان نیچرل ہے۔ مگر بے نتیجہ ہے۔ مسجد کے مؤذن کی اذان اَن نیچرل ہے لیکن با نتیجہ ہے۔ جو مسلمان خدا اور رسولؐ کے نام کو تقریروں میں اثر پیدا کرنے کے لیئے استعمال کرتے ہیں۔ مگر احکام الٰہی پر عمل نہیں کرتے۔ اُن کی مثال مرغ کی اذان کی سی ہے۔ کہ دوسروں کو جگاتا ہے۔ اور خود عمل نہیں کرتا۔ اصل اذان مسجد کے موذن کی ہے جو نماز کے لیئے بُلاتا ہے اور خود بھی نماز پڑھتا ہے *

تیس راتوں کی شان

اندھیرا روشنی پر غالب ہے

از اخبار توحید ۱۹۱۳ء

گیارہ مہینے کے رات دن رمضان کی تیس راتوں کے مقابلے میں نہیں ٹھہر سکتے *

لوگ کہتے ہیں روزہ دن کا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ دن دُنیا ہے اور رات دین۔ جس طرح دُنیا میں انسان اعمال کرتا ہے اور دین یعنی عالم آخرت میں اُس کا بدلہ پاتا ہے۔ اسی طرح رمضان میں دن کے وقت بھوک پیاس کے اعمال ہیں اور شام کو افطار کے بعد آخرت کی بہاریں +

کیا خدا کی شان ہے۔ رمضان کی تیس راتیں سارے سال کے روشن دنوں پر بھاری ہیں۔ افطار کا لطف رات کے شروع میں تراویح کی کیفیت اسی شب تار میں سحری کی بہار اسی وقت تاریک میں اندھیرا جس قدر فخر کرے کم ہے۔ کہ خدا نے اس کی آبرو کو نور کے سامنے چاند لگا کر دوبالا کر دیا۔ رمضان کی راتیں وہ راتیں ہیں۔ جن میں قرآن شریف نازل ہوا۔ جن میں ایک رات ہزاروں راتوں سے بڑھکر ہے۔

جس کی تجلّیاں آفتاب و ماہتاب اور تمام برق صفات انوار سے اعلیٰ ہیں +

نئی روشنی کی دوزخ جنّت

از صوفی۔ جنوری ۱۹۱۵ء

ایک چیز ہے جس کو نئی روشنی کہتے ہیں۔ وہ مٹی کے تیل یا گیس و برق کے لمپ نہیں ہیں۔ بلکہ نئے بدلے ہوئے زمانے کے حالات۔ خیالات اور جذبات ہیں۔ پرانے وقت کے لوگ اس کو اندھیری روشنی کہیں تو زیبا ہے کہ حضرت ابن عربی نے فرمایا نور کی اصلیت سیاہ فام ہے۔ لیکن نئی روشنی والوں کو آج تک نور کی حقیقت میں پس و پیش ہے۔ سورج چاند اور زمین کی مصنوعی روشنیوں کے سوا اُنھوں نے کبھی کسی کا مشاہدہ نہیں کیا۔ پس ثابت ہوا کہ نور ایک وہمی چیز ہے۔ اور نئی روشنی والوں کو اندھیری روشنی کہنا ایک توہم ہے۔ پرانے لوگ ہمیشہ توہمات کے پانی پر قلعہ بنایا کرتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ مرنے کے بعد آدمی پھر زندہ ہوتا ہے اور اُس کو دوزخ جنت میں جانا پڑتا ہے۔ بھلا یہ کیونکر ممکن ہے۔ جو چیز مر گئی فنا ہو گئی۔ اُس کی جگہ دوسری آگئی۔ نیچر بغیر ضرورت کے کوئی کام نہیں کرتی اور چونکہ دوبارہ زندہ ہونے کی کوئی عقلی ضرورت نہیں ہے لہٰذا مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونا غلط خزاں کے موسم میں درخت کے پتّے سوکھکر گر پڑتے ہیں۔ بہار میں دوسرے پیدا ہو جاتے ہیں۔ قدرت کا یہی قاعدہ ہے۔ مُردہ اور سوکھے پتّے دوبارہ نہیں ہرے ہوتے +

جب قدرت اسپر قادر ہے کہ اور پتّے پیدا کر دے تو اُس کو پُرانے پتوں کے ہرا کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ ثابت ہوتا ہے کہ نہ ضرورت ہے۔ نہ اُس میں طاقت ہے۔ کیونکہ اُس نے کبھی ایسا نہیں کیا پس یہ عقیدہ غلط ہے +

ہم نے جو اچھے بُرے کام کیئے تھے اُن کا بدلہ قانون حکومت سے پا چکے۔ اب دوبارہ حساب کتاب

کی کیا ضرورت ہے۔ اور چونکہ کچھ ضرورت نہیں ہے۔ لہذا حشر کا ہونا اور میزان حساب میں نیکی بدی کا تولنا عبث ہے۔

جو گناہ ایسے ہوئے جن کی خبر قانون کو نہ ہوئی اُن پر ہمارے دل نے جن کو ضمیر بھی کہتے ہیں ملامت کر دی اور ہم کو تکلیف دہ پشیمانی بھی ہو گئی۔ پس یہی حساب اور جزا و سزا ہے۔ اور کچھ ضرورت نہیں کہ ایک عالم آخرت بھی ہو۔ لہذا یہ عقیدہ بھی وہم ہے +

جنت میں جن چیزوں کے دیے جانے کے وعدے ہوئے ہیں وہ بالکل خلاف انسانیت ہیں۔ ایک مرد کئی کئی بیویاں رکھے گا۔ یہ تکلیف دہ کام ہے۔ حالانکہ جنت میں خوشی ہی خوشی بیان کی جاتی ہے +

جنت میں سب جوان ہوں گے۔ یہ خلاف نیچر ہے۔ قدرت نے بوڑھے جوان کا فرق بڑی مصلحت سے رکھا ہے۔ سب ایک وضع کے ہوں گے تو لطف ہی کیا آئے گا + اور چونکہ یہ خلاف نیچر ہے۔ اس لیئے غلط ہے۔ اور غلط ہے اس لیئے وہم ہے۔ اور وہم ہے لہذا پرانے لوگوں کی بات ہے +

جنت میں شراب ایک ہی قسم کی دی جائے گا۔ جس کا نام طہور ہے۔ مگر انسان کی خواہش رنگا رنگی چاہتی ہے۔ اس لیئے اُس نے طرح طرح کی شرابیں بنائی ہیں۔ پس چونکہ یہ بھی خلاف فطرت ہے لہذا غلط ہے +

جنت میں خدمتگار صرف لڑکے ہوں گے۔ اور چونکہ جنت کے باشندوں کو جوان ہونا ضروری ہے لہذا ثابت ہوا کہ یہ لڑکے جنت سے باہر رہیں گے۔ پس وہ خدمت کیونکر کریں گے لہذا یہ دعویٰ بھی غلط ہے

جنت میں مردوں کو زیور پہنائے جائیں گے۔ اور یہ خاصہ عورتوں کا ہے۔ لہذا خلاف فطرت ہے اور جو خلاف فطرت ہے وہ غلط ہے +

جنت میں دودھ شہد کی نہریں ہوں گی۔ لیکن شہد چھتے میں ہوتا ہے اور دودھ تھن میں۔ زمین میں اس کی نہر کا ہونا خلاف فطرت ہے لہذا غلط ہے +

جنت میں ایک موتی کا محل ہوگا۔ موتی اتنا بڑا ہوتا نہیں۔ اور یہ امر سراسر خلاف قدرت ہے لہذا غلط ہے +

دوزخ میں آگ ہی آگ بیان کی جاتی ہے اور اس میں سانپ بچھوؤں کا ہونا بھی ثابت کیا گیا ہے۔ اور چونکہ آگ میں سانپ بچھو زندہ نہیں رہ سکتے لہذا یہ خلاف نیچر ہے اور غلط ہے +

دوزخ میں عذاب کے فرشتے بھی ہوں گے اور فرشتے نوری ہیں اور نور کو نار کا عکس بیان کیا جاتا ہے پس ثابت ہوا کہ فرشتے آگ میں زندہ نہیں رہ سکتے۔ اور ان کا وہاں ہونا خلاف فطرت ہے لہذا غلط ہے +

فطرت نے ہر چیز کا علاج پیدا کیا ہے۔ پس اگر بالفرض دوزخ میں یہ سب باتیں ہوں گی تو ان کا علاج بھی ضرور پیدا کیا ہوگا۔ لہذا کوئی وجہ نہیں کہ انسان کوئی آتش پروف آلہ ایجاد نہ کرے جس طرح کہ پانی کے بچنے کے لیئے واٹر پروف کا آلہ نکلا ہے۔ اور سانپ بچھوؤں سے بچنے کے واسطے اس قسم کا اوزار نہ بنا لے +

اس کے علاوہ دوزخ جنت ہوں گی کہاں۔ دُنیا کی زمین کا رقبہ انسان نے معلوم کر لیا ہے۔ اگر ابتدا سے سب آدمی زندہ ہو جائیں تو اس زمین میں اتنی گنجائش نہ ہوگی۔ اور اس زمین کے علاوہ کسی دوسرے کرہ میں انسان کا زندہ رہنا محال ہے۔ کیونکہ وہ خاکی نژاد ہے اور جنس خاکی ہی میں زندہ رہ سکتا ہے۔ پس ثابت ہوا کہ دوزخ جنت کو زمین پر ہی ہونا چاہیئے۔ اور زمین میں اتنی گنجائش نہیں ہے۔ پس یہ خلاف نیچر ہے۔ لہذا غلط ہے ✤

نئی روشنی والوں کو جواب خود نئی روشنی یہ دیتی ہے :-

چونکہ نیچر و فطرت یکساں حالت پر کبھی نہیں رہتی۔ بدلتا رہنا اس کا خاصہ ہے اس واسطے ایک عرصہ دراز کے بعد اس میں غیر معمولی اور خلاف دستور تبدیلی کا ہونا لازمی ہے اور وہ تبدیلی یہ ہے کہ نئے آدمی زندہ کرنے کی بجائے پرانے مردوں کو زندہ کرے۔ اور چونکہ نیچر خود ضرورت ہے۔ اس لیئے وہ کسی ایسی ضرورت کے ماتحت نہیں ہو سکتی جس کو آدمی کی عقل ضرورت کہتی ہو ✤

قانون حکومت کی حق و ناحق فیصلہ کے لیئے کونسی عدالت ہے۔ ہو سکتا ہے کہ قانون نے غلطی کی اور فیصلہ ٹھیک نہ کیا۔ لہذا اقتضائے فطرت ہے کہ وہ جمع کرتے کرتے سب ایک دن جزا و سزا پر نظر ثانی کرے اور ٹھیک ٹھیک فیصلے کر دے ✤

بہت سے گناہ ہیں جن کو انسان کا ضمیر گناہ نہیں سمجھتا۔ اس لیئے اس پر ملامت نہیں کرتا اس کا فیصلہ ہونا ضروری اور نیچرل ہے۔ لہذا ہونا چاہیئے اور یوم آخرت کو ہوگا ✤

جنت میں سب کام جنتی کی خواہش پر ہوں گے۔ اس لیئے کہ قرآن شریف میں وفیہ ما تشتھون آیا ہے یعنی جنت میں جس کی خواہش کروگے وہی ملے گی۔ پس اگر نئی روشنی والوں کو ایک ہی بیوی منظور ہوگی تو ایک ہی دی جائے گی۔ بلکہ وہ چاہیں گے تو ایک ولایتی میم بھی مل جائے گی ✤

جنت میں سب جوان ہوں گے کیونکہ وہ نیکیوں کا کلب گھر ہے جس طرح دنیا میں بوڑھوں کے کلب علیحدہ ہیں جوانوں کے علیحدہ۔ مجردوں کے جدا۔ شادی شدہ لوگوں کے علیحدہ۔ اور یہ کلب کے ممبر آپس میں ہنسی خوشی سے رہتے ہیں۔ یہ نہیں کہتے کہ ہم میں ناجنس بھی آئے۔ بلکہ ناجنس ممبر سے گھبراتے ہیں۔ پس ثابت ہوا کہ جنتی کلب میں سب کا جوان ہونا حسب فیشن و نیچر ہے ✤

جنت میں خدمتگار لڑکے ہوں گے اور آپ ان کو بوائے کہکر آواز دے سکینگے۔ ان کی حیثیت خدمتگاروں کی ہوگی۔ مالک مکان کی نہ ہوگی۔ اس واسطے ان کا داخل جنت ہونا اس طرح ثابت ہے جس طرح کلب گھر کے بوائز (لڑکوں) کا ✤

جنت میں ہر قسم کی شرابیں ہوں گی۔ طہور کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس کی قسم ایک ہے۔ بلکہ یہ وہاں کی شراب پی کر آپ گندی موریوں میں اوندھے منہ نہیں گریں گے۔ وہ پاک نشہ ہوگا جس سے پاک جذبات و حالات ظاہر ہوں گے ✤

جنت کے زیور مثالاً بیان کیئے گئے ہیں۔ آپ کو صرف ایک انگوٹھی ملیگی۔ جسمیں سونا پیتل ملا ہوا ہوگا

اور نکٹائی و کالر کا پن بلجائے گا۔ اپنی مرضی پر ہے +

دودھ تھن ہی میں نہیں ہوتا۔ ٹین کے ڈبوں میں بھی ہوا کرتا ہے جس نیچر نے اس کو منجمد کر کے اس قابل بنا دیا۔ وہی اس کی نہر بھی بہا سکتا ہے۔ یہی حال شہد کا ہے۔ ایک موتی کا محل خلاف نیچر نہیں ہے۔ اپنی خوردبین سے لگا کر کے دیکھ لینا۔ جس جگہ نیچر سارے جہان کے سب مرے ہوئے آدمیوں کو رکھے گی وہاں کے سمندر بھی چھوٹے نہ ہوں گے اور ان کے موتی بھی دُنیا کے سمندروں کی مانند نہ ہوں گے +

دوزخ میں آگ کے اندر سانپ بچھوؤں کا زندہ رہنا عقل کے موافق ہے۔ آگ کے کیڑے دُنیا میں پائے جاتے ہیں +

دوزخ کے فرشتے بھی آتشی نور کی مخلوق ہیں۔ اس لیئے وہ اُس کے اندر زندہ رہ سکتے ہیں +

بیشک فطرت نے ان کا علاج پیدا کیا ہے۔ اور بتا دیا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ مر کر زندہ ہونے پر یقین رکھو۔ اور اس خبر کے بیان کرنے والوں کے حکموں کو مانو اور اُن پر عمل کرو +

تم واٹر پروف کی جگہ اگر آتش پروف نکال بھی لو۔ تب بھی دوزخ کے عذاب سے نہیں بچ سکتے۔ تمہارے لیئے آگ نہ ہوگی۔ سانپ بچھو نہ ہوں گے +

بلکہ بنک فیل ہونے کی خبریں ہوں گی۔ پیاری مسوں کے انکاری خطوط ہوں گے۔ حقارت کے آوازے ہوں گے۔ شیم شیم کے نعرے ہوں گے۔ تم کو ہر وقت بارش اور کہر کا سامنا ہوگا۔ تمہارے تجارتی جہاز آنکھوں کے سامنے غرق کیے جائیں گے تم کو ہڑتالوں کی خبریں دی جائیں گی۔ تم سے کہا جائے گا کہ تم آزاد نہیں ہو + تم کو سُنایا جائے گا کہ سیلف گورنمنٹ تم کو نہیں مل سکتی۔ تمہارے خلاف اخباروں میں لمبے لمبے آرٹیکل چھاپے جائیں گے اور تم کو دکھائے جائیں گے +

تمہارے آگے تھیٹر اور بائیسکوپ کے تماشے ہوں گے اور اُن میں تمہاری تحقیر و تضحیک کی جائے گی۔ تم کو ڈیم فول کہکر ٹھکرایا جائے گا۔ تم کو بغیر کالر و نکٹائی کے کپڑے پہنا کر بازار میں نکالا جائے گا۔ تم کو میلے اور ٹوٹے ہوئے بوٹ پہنکر مسوں کے کلب میں بھیجا جائے گا۔ اور وہ تم پر قہقہہ لگائیں گی +

تم کو نہانے کو پانی نہ ملے گا۔ تم کو بٹھا کر پیشاب کرایا جائے گا۔ تم کو کہا جائے گا کہ اپنے ضمیر کے خلاف مضامین لکھو۔ اور تم کو چار و ناچار لکھنے پڑیں گے +

دوزخ میں تمہاری عورتوں کو پردے میں بٹھایا جائے گا۔ اور اُن کے ناک کان چھید ے جائیں گے۔ چونکہ یہ سب باتیں تمہارے فیشن۔ تمہاری عادت تمہارے خیالات اور تمہاری خواہشات کے خلاف ہونگی اس واسطے ان میں تم کو وہی تکلیفیں ہوں گی جو ایک سیدھے سادے آدمی کو آگ اور سانپ بچھو سے ہو سکتی ہیں۔ اور اسی کا نام دوزخ ہے +

رہا یہ کہ دوزخ ہوگی کہاں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اسی خاکی زمین پر جس کو نیچر ربڑ کی طرح اتنا لمبا چوڑا بنا دے گی کہ ساری دُنیا کے اگلے پچھلے مرنے والے اس میں بخوبی سما سکیں +

جبکہ فطرت آج کل کے معمولی زمانہ میں زمین کے طویل و مختصر کرنے کے سامان دکھا رہی ہے تو اس زمانہ میں تو اُس کے کارناموں کی کچھ حد نہ ہوگی۔ کیونکہ نیچر اس وقت ایک غیر معمولی تبدیلی و انقلاب کی جانب ہوگی +

پس ثابت ہوگیا کہ میدان حشر۔ جنت۔ دوزخ سب اس زمین پر ہوں گے۔ اور ان کا ہونا از روئے نیچر ثابت ہے ٭

نئی روشنی کی جنت دوزخ کے بحث مباحثہ کو سنکر ان کو دیکھو جو دعوے دار تصوف ہیں اور اپنی دوزخ جنت سارے جہان سے الگ بتاتے ہیں۔ کیا مجذوبانہ بڑ مار رہے ہیں۔ کچھ کچھ تو سمجھ میں آتا ہے۔ ذرا کان لگا کر سننا ٭

کس کی جنت۔ کیسی دوزخ۔ انہوں نے بیچارے بندوں کو کن کی انگلی پر نچا رکھا ہے۔ کسی سے کہتے ہیں جنت دوں گا۔ کسی کو کہتے ہیں دوزخ میں ڈال دوں گا۔ کہیں دیدار کا وعدہ کرتے ہیں۔ کسی کے سامنے صاف مکر جاتے ہیں کہ بھلا مجھ کو کون دیکھ سکتا ہے۔ میں کہیں دیکھنے کی چیز ہوں ٭

مانا کہ تم خدا ہو۔ تم قدرت والے ہو۔ تم کو سب کچھ آتا ہے۔ مگر ان اپنی بنائی ہوئی مورتوں کے ستانے میں کیا رکھا ہے۔ اس میں آپ کو کیا مزا ملتا ہے۔ ہم تو جانیں جب تک کن فیکون کا عملدرآمد ہے۔ ہر ہستی دوزخ میں ہے اور جب یہ دور ختم ہو جائے گا ہر وجود جنت میں چلا جائے گا ٭

شذرات

(از اخبار خطیب ۳۰ جنوری ۱۹۱۵ء و ۱۴ فروری ۱۹۱۵ء)

قہر خدا

پناہ! خدا کا غضب بری چیز ہے۔ خبر آئی ہے کہ اٹلی کے ملک میں ہولناک زلزلہ آیا شہروں کی آبادیاں سرنگوں ہوگئیں۔ لاکھوں آدمی مرگئے اور زخمی ہو گئے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ سینٹ پال کی مورت چھت سے گری اور پاش پاش ہوگئی۔

اٹلی کے دل میں خدا کا خوف نہ رہا تھا اس نے بے گناہ عربوں پر چڑھائی کی تھی۔ اور طرابلس میں ہزاروں معصوم عورتوں اور بچوں کو بیوہ اور یتیم ہی نہیں کیا بلکہ ان کو سنگینوں اور بندوقوں کا نشانہ بنایا تھا۔ اور سمجھتے تھے کہ ہم خود مختار ہیں۔ جو چاہیں کریں۔ ہمارا کوئی پوچھنے والا نہیں ٭

لیکن آسمان کی سلطنت ان شرارتوں کو حساب کے رجسٹروں میں لکھ رہی تھی۔ آخر وقت آگیا اور فرشتے زلزلہ کا عذاب لیکر نازل ہوئے۔ اور اہل اٹلی کو زیر و زبر کر دیا ٭

اٹلی میں بت پرستی کا مرکز ہے۔ وہاں مسیح اور ان کے حواریّن کی پرستش ہوتی ہے۔ گرجاؤں میں بت رکھے ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے قہر نے ان بتوں کو بھی ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔ اب تو جناب پوپ کو ہوشیار ہوکر بت پرستی چھوڑنی چاہیے اس واقعہ سے مسلمانوں کو عبرت حاصل کرنی چاہیئے۔ وہ ہر وقت خدا کے غیظ سے ڈرتے رہیں اور گناہوں کی توبہ کریں۔ توبہ کا دروازہ ہر وقت کھلا ہوا ہے ٭

اپنے دشمنوں کی تباہی پر خوش ہونا نامردی ہے۔ ڈرو کہ تم ان بلاؤں سے محفوظ رہو ٭

صاحب بہادر کا سلام

تم نے سُنا ہو گا کہ جب کسی شخص سے کوئی انگریزی افسر ملاقات کرنی چاہتے ہیں تو چپراسی سے کہتے ہیں۔ فلاں کو ہمارا سلام دو۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہماری ملاقات کے لیئے بُلا لو ✤

حدیث شریف میں آیا ہے کہ جب مومن بندہ کی موت کا وقت قریب آتا ہے تو فرشتہ بھی آن کر یہی کہتا ہے کہ خدا تعالےٰ نے تجھ کو سلام کہا ہے مومن کی روح یہ سُنکر خوشی خوشی جسم سے پرواز کر جاتی ہے ✤

مسلمان اپنے سب سے بڑے "صاحب" پر قربان ہوں۔ کیا ہی مہربان صاحب ہے۔ ایسے ناچیز گنہگار بندوں کو کیسی محبت سے یاد فرماتا ہے۔ پھر کیوں نہ اُس چاہت اور وفاداری کا دم بھرا جائے ✤

من کہ نازک بدن ہستم

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی حضرت زینب کا انتقال ہوا۔ تو آنحضرتؐ ان کے دفنانے کے وقت فرماتے تھے۔ یہ نازک بدن لڑکی ہے مجھے ڈر تھا کہ قبر اس پر تنگی نہ کرے۔ مگر وہ اس پر فراخ ہوگئی ✤

اُمت بھی اپنے رسولؐ کی نازک بدن لڑکی ہے۔ بلکہ اولاد سے بڑھکر پیاری ہے۔ اس واسطے اس کو قبر کی مشکل کے وقت ان کی شفاعت کا بھروسہ ہے۔ خدائے تعالےٰ ہر مسلمان کو اس کٹھن وقت میں اپنے رسول کی شفاعت نصیب کرے۔ آمین۔

مرغ کی اذان

مُرغیوں نے مرغ کی اذانوں سے دق ہو کر مسجد کے موذن سے فریاد کی۔ اُس نے کہا کیا تم مرغ کی اذان سنتی ہو۔ میں تو پانچوں وقت محلہ میں چیخ چیخ کر اذان دیتا ہوں۔ مگر محلہ والوں کے کان میں آواز نہیں جاتی۔ ان سے تو تم اچھیں ✤

مرغ کو خبر ہوئی تو وہ بھی آیا۔ اور بولا میں اپنی ہستی کا یقین دلانے کو اذان دیتا ہوں۔ اس لیئے تم کو ناگوار ہے۔ اور موذن خدا کی ہستی کا اعلان کرتا ہے اس لیئے گوش اغیار بے ہوش ہو جاتے ہیں۔ مگر خدا پرست دوڑتے ہوئے مسجد میں آتے ہیں ✤

غفلت کی نیند

سونے میں تم انگریزوں کی ریس نہ کرو۔ کیونکہ وہ اپنا کام کر چکے ہیں۔ اب ان کو آرام کی نیند اور زیادہ سونا زیب دیتا ہے۔ تم امیروں کی نیند پر نظر نہ کرو۔ ان کو دولت نے بے فکر کر دیا ہے۔ تم اگر تندرست اور مضبوط ہو تو ڈاکٹروں کے قول پر نفرت کا ووٹ پاس کرو۔ اور خوب جاگو۔ ڈاکٹر کہتے ہیں کہ صحت سات گھنٹہ کی نیند مانگتی ہے۔ مگر بڑے بڑے کام کرنے والے کبھی چار گھنٹے سے زیادہ نہیں سوئے۔

حضرت علیؑ نے فرمایا ہے مَنْ طَلَبَ الْعُلیٰ سہرالّیالی جو بڑا بننا چاہے اُس کو راتوں کو جاگنا چاہیئے۔ نپولین زیادہ سونے کا دشمن تھا۔ اسی لیئے قدرت نے بڑائی اور ناموری کو اُس کا دوست بنایا ✤

سردی کی راتیں بڑی ہوتی ہیں۔ تمہارا جو پیشہ ہو اُن کو رات کی بیداری میں ترقی دو۔ اوّل شب سو جاؤ۔ پچھلی رات اُٹھکر کام کرو۔ یہ دُنیا کام کرنے کے لیئے ہے۔ سونے کا دوسرا عالم ہے۔ عمر بھر سوتا رہیگا خاک کے سایہ تلے۔ مشہور قول ہے ✤

اول اول شب بیداری سے تکلیف ہوتی ہے۔ لیکن جب عادت ہو جائے تو خوشی و شادمانی کا ٹھکانا نہیں رہتا۔ ہر وقت انسان بشاش رہتا ہے۔ کیونکہ فرض کی ادائیگی اور ترقی ہی بڑی شادمانی کا سبب ہے ✤

قال را بگزار

کہنے کو سب کہتے ہیں کہ کرنا کہنے سے بہتر ہے۔ مگر یہ بھی قول ہے فعل نہیں ہے۔ اس میں ہم کو انگریزوں سے سبق لینا چاہیئے۔ جو کرتے پہلے ہیں اور کہتے ہیں بعد میں۔ ہندو کانگریس اور مسلم لیگ کے

رزولیوشن میدانِ قال کے بڑے ہونہار جوان ہیں مگر حال کی صف میں آتے ہیں تو نابود ہو جاتے ہیں۔ اگر ان فیشن طراز جماعتوں کو ان قالیہ فوجوں پر فخر ہے تو خدا ان کے فخر کو زیادہ دن تک سلامتی نہ دے ❖

ہمارا حال ماضی کی فراموشی اور استقبال کی خاموشی میں درخشاں ہونا چاہیئے۔ اگر ہم بڑے تھے تو کیا ہوا۔ اگر ہم بڑے ہو جائیں گے تو کون جان سکتا ہے۔ ہم کو آج کی حالت دیکھنی چاہیئے کہ نہ چھوٹے ہیں نہ بڑے ہیں۔ اور ضرورت ہم کو زندہ رہنے کی ہے ❖ خدا کرے ہم قال کو چھوڑیں اور مردانِ حال بنیں ❖

حقہ کے لئے تمباکو

ایک دوکان دار نے شکایت کی کہ ایک پیسہ کی بکری نہیں ہوتی۔ حقہ کا تمباکو بھی گھر سے لانا پڑتا ہے ❖

اس سے کہنا چاہیئے کہ گھر میں جو پو بجی تمباکو منگالی ہے۔ وہ بھی اس دوکان کی بدولت ہے۔ گھبراؤ نہیں یہ چیزوں کی تکلیف لڑائی تک ہے۔ اس کے بعد پھر خوش حالی ہوگی۔ انسان کو مصائب اور تکلیفات کے ایام میں صبر کو شیوہ بنانا چاہیئے۔ کیونکہ صبر اگر نیت کر کے کیا جائے تو بڑا اجر دلواتا ہے۔ ورنہ بے نیت تو ہر شخص کو اسی طرح دل سوسنا پڑتا ہے۔ جس طرح صابر کو۔ لہذا تم تکلیف کی حالت میں صبر کی نیت کر لیا کرو ❖

ہم کو بڑا آدمی بننا چاہیئے

اب بُت شکنی کا زمانہ نہیں ہے طبیعتوں کا میلان لیڈر شکنی کی جانب رجوع ہے مگر انصاف یہ ہے کہ خلقت جن کو لیڈر سمجھتی ہے اور ان کے زور کو توڑنا چاہتی ہے وہ بھی غلطی پر ہے۔ اور جو لوگ چند حاکموں سے میل جول اور ایک خطاب کو لیڈر شپ سمجھتے ہیں وہ بھی غلط راستہ پر ہیں۔ کیونکہ لیڈری اور بڑائی ایک دوسری چیز ہے جس کے ماتحت دِلوں کی کنجیاں ہوتی ہیں ❖

تم خیال نہ کرو کہ اخباروں میں دھواں دھار مضمون لکھنے والے اور حکومت پر نکتہ چینی کرنے والے لیڈر اور بڑے آدمی ہیں۔ نہیں یہ بھی دھوکا ہے۔ کیونکہ یہ لوگ بھی اپنی ذاتی اغراض کی خاطر بے اُصول راستہ پر چلتے ہیں ❖

ہم کو بڑا آدمی بننے کی ضرورت ہے۔ مگر اس کی تکمیل کے لیئے محنت جفاکشی۔ ایثار درکار ہے۔ اپنا وجود کھو کر بڑائی حاصل ہوتی ہے۔ فطرت ہر انسان کی اس کی خواہشوں میں مددگار ہے۔ اگر تم چاہتے ہو کہ رات دن جوانی کے مزے لوٹو۔ اور خرافات میں مبتلا رہو تو فطرت تم کو طاقت اور دولت دینے کو تیار پائی جائے گی۔ اگر تم کو منظور ہو کہ دوسروں کی خوشامد کر کے عارضی بڑائی حاصل کرو تو فطرت تمہاری دماغی قوتوں کو بہترین طریقے تعلیم کریگی اور اگر تم یہ چاہو کہ حاکم و محکوم کو فائدہ پہونچا کر بڑائی حاصل کرو تو اس کے راستے بھی تم کو فطرت ہی کے ذریعے مل جائیں گے۔ پھر تم بہت ہی بدنصیب ہوگے اگر اپنی فطرتی طاقت سے نیک کام نہ لو ❖

اگر دوسروں کی بھلائی کے لیئے تم مشہور ہونے کی خواہش رکھتے ہو تو قدرت تم کو قرآن کی زبان میں آواز دیگی۔ ورفعنا لک ذکرک۔ اگر تم کو دوسروں کا بوجھ ہلکا کرنا منظور ہو تو ووضعنا عنک وزرک کا نعرہ سُنو گے۔ تم چھوٹوں کا دل بڑھاؤ۔ خدا تم کو بڑا آدمی بنا دے گا۔ تم لیڈر بننے کی خواہش کرو اور مخلوقِ خدا کے کام آؤ۔ قدرت تمہاری مدد کرے گی اور تم بڑے آدمی بن جاؤ گے نمایش ضروری چیز ہے۔ مگر اس کو ذریعہ بناؤ۔ اصل مقصود نہ سمجھو۔ کیونکہ نمایش تمہاری بڑائی کا آلہ ہے ❖

خلافت اور اخوّت

اسلامی دُنیا کے یہ دو مسئلے آج کل شد و مد سے اہلِ تدبیر کے زیرِ بحث ہیں۔ اخوت بھائی چارہ ایک رشتۂ روحانی ہے۔ جو لطورِ نعمت الٰہی کے مسلمانوں کو عطا ہوا۔ قرآن شریف کے چوتھے پارے میں اس نعمت کو ان الفاظ میں ادا کیا گیا ہے :-

واذکروا نعمت اللہ علیکم اذ کنتم اعداء فالف بین قلوبکم فاصبحتم بنعمتہ اخوانا

خدا کی اُس نعمت کو یاد کرو جو تم پر نازل ہوئی جبکہ تم آپس میں دشمن بنے ہوئے تھے تو تمہارے دلوں میں باہمی اُلفت ڈال دی اسکے بعد تم اس نعمت خدا کے طفیل میں ایک دوسرے کے بھائی بن گئے

قومیت۔ نگت وطنیت وغیرہ کئی جذبے ایسے ہیں جو افراد انسانی کو باہمی اتحاد کے لئے کھینچتے ہیں مگر اس کشش میں وہ دوام و استحکام نہیں پایا جاتا۔ جو جذبۂ مذہب میں نظر آتا ہے۔ خواہ کوئی مذہب ہو اُس کے پیرو اپنے ہم عقاید سے ایک رشتۂ قلبی رکھتے ہیں +

لیکن اسلام میں بمقابلہ دیگر مذاہب کے ایک نمایاں خصوصیت باہمی ارتباط کی پائی جاتی ہے۔ اس خصوصیت کو اگر مادّی اسباب کے معیار سے معلوم کرنا چاہیں تو میں نہیں کہہ سکتا کیا کیا وجوہات ذہن رسا بتائے۔ مگر بادی النظر میں اس کا جواب آسان نہیں ہے۔ ہم اس زمانہ میں بے شمار مثالیں عیسائی اُخوّت کی دیکھ چکے ہیں۔ خود اپنے ملک میں ہندوؤں اور آریہ سماجیوں کی باہمی الفت کا اندازہ ہو چکا ہے۔ اگرچہ عیسائیوں کی اخوت زیادہ تر سیاسی تحریکوں سے متاثر ہو کر عمل میں آتی تھی اور ترکی حکومت کی مسیحی رعایا میں ہم اس کی مثالیں دیکھتے تھے۔ کیونکہ بیرونی عیسائی حکمران اپنے ملکی مفاد کی بنا پر ان ترکی محکوموں کو بھڑکاتے تھے۔ تاہم اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ عیسائیوں میں اُخوّت کا جذبہ ناپید نہیں ہے۔ وہ نہ ہوتا تو بیرونی تحریکیں کارگر کیسے ہوتیں

اسلامی اخوت باہر کی تحریکوں اور لیڈروں کی رہنمائیوں سے آزاد ہے۔ ایک گاؤں میں جاؤ جہاں کے باشندے جاہل محض اور تمام احساسات و علم سیاست سے نابلد ہوں۔ پھر ان سے کہو فلاں ملک میں مسلمان پر ظلم ہوا ہے۔ تو وہ ایسے بے قرار ہو جائیں گے گویا خود اُن پر کوئی مصیبت آن پڑی ہے۔ ایسے ہی خوشی کی خبر سُنکر اُن کا مسرور ہونا لازمی ہے :

یہ کیا طاقت ہے ؟ اس کے جواب کے لیئے ہم جو مادی دلائل غور و خوض سے پیدا کرتے ہیں وہ سب کی سب دست مادیت سے چھٹی جاتی ہیں۔ اور مجبور کرتی ہیں کہ ہم پھر پھر کر اس آیت کی جانب رجوع کریں۔ اور کہیں کہ سارا طفیل عنایت رب کا ہے۔ اس کو منظور ہے کہ مسلمانوں میں اخوّت کا جذبہ تمام قوموں سے ممتاز رہے +

اخوت کی مادی دلیلیں چند مذہبی مراسم ہیں جن میں حج اور نماز کو زیادہ خصوصیت ہے۔ مگر لاکھوں مسلمان نماز نہیں پڑھتے کروڑوں آج تک حج کو نہیں گئے۔ لیکن ان میں جذبۂ اُخوّت کی کمی نہیں ہے۔ اسی سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ رشتہ کسی مخفی طاقت کے ہاتھ میں ہے جیسا کہ خود اُس طاقت نے اس آیت میں اس کا دعویٰ کیا ہے +

جہاں مسلمانوں میں یہ زبردست طاقت اخوّت کی ہے وہیں ان میں اختلاف بھی بکثرت ہے اور جو حسب روایات احادیث صحیحہ قیامت تک رہے گا۔ اس اختلاف نے مسلمانوں کو ہمیشہ نقصان پہونچایا۔ اُن کی بادشاہتیں خاک میں مل گئیں۔ وہ ذلیل و محکوم بن گئے لیکن ان حالات سے اُخوّت کی طاقت کو کوئی صدمہ نہیں پہونچا۔ وہ جوں کی توں موجود ہے۔ یہ اختلافات بظاہر ہم کو دھوکے میں ڈالتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے گویا ہم میں سے اخوت سلب ہو گئی ہے۔ مگر یہ سب ایک دوسری لائن کی باتیں ہیں اور اخوت اور چیز ہے۔ اخوت بنیاد اور جڑ ہے۔ اور موجودہ اختلافات شاخوں اور سطح پر ہے۔ جڑ سے اسے کچھ سروکار نہیں +

غازی پور کی تازہ تقریر میں سر جیمس میسٹن لفٹننٹ گورنر ممالک متحدہ نے اخوت اسلامی کا تحیر و تعجب سے اعتراف کیا ہے۔ کہ یہ باوجود پیہم صدمات کے اب تک اپنی اصلی حالت پر برقرار ہے۔

کچھ تعجب کی بات نہیں۔ اسلامی اخوت کی ثابت قدمی ظاہری اعتبارات سے بالکل قرین عقل ہے۔ مسلمان نسل اور ملک کے ماتحت نہیں ہیں۔ ان کا اتحادی مرکز :-

کلمۂ وحدت

ہے جو تمدنی، ملکی، سیاسی انقلابات سے قدرتاً متاثر نہیں ہوتا۔ لاٹ صاحب نے فرمایا ہے۔ کہ کوئی دوسری قوم اگر ایسی اخوت قائم کرنی چاہے تو نہیں کر سکتی۔ مگر میں کہتا ہوں فطرت الٰہی نے اپنا احسان مسلمانوں کے لیئے ریزرو نہیں کیا ہے۔ جو قوم کلمۂ توحید کا اقرار کر کے دل و جان سے اس پر یقین کر لے اس کی قومیت اخوت کی طاقت سے اس طرح مالا مال ہو جائے گی جس طرح مسلمان دیکھے جاتے ہیں ✤

حاصل مقصد

مسئلۂ اخوت کی تحقیق کا یہ ہے کہ برٹش حکومت اس طاقت کو نظر انداز نہ کرے۔ اور سمجھے کہ جرمن اسلامی اخوت سے کام لے رہے ہیں اور ہماری سرکار ابھی تک صرف علمی پہلو سے اس پر بحث کر لینا کافی سمجھتی ہے۔ حالانکہ وقت عمل کا ہے۔ میں یہ سوال سنجیدگی سے کرتا ہوں کہ جرمنوں نے فرضی طریق سے سہی قبولیت اسلام کا دعویٰ کر کے جو اثر اخوت کی لہر میں حاصل کر لیا ہے اس کا جواب ہماری گورنمنٹ نے کیا دیا ہے؟ یا تو اس کی باضابطہ موثر طریقے سے تردید ہو یا اور کوئی صورت نکالی جائے ورنہ ان حرکتوں کا اسلامی اخوت پر جو اثر پڑ رہا ہے۔ وہ معمولی نظر سے دیکھنے کے قابل نہیں ہے ✤

خانۂ رسولؐ کے راز و نیاز

محبت کے راز و نیاز کی معاملہ بندیاں شاعروں نے بہت سی لکھیں۔ زمین آسمان کے قلابے ملائے مگر خانہ داری کی الفتوں کا ان کو کیا مزا۔ جو درختوں اور جانوروں کی مثالوں میں جذبات عشق تلاش کرتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے سرو نے قمری کے دل کو جلایا لہذا پھل سے محروم رہا۔ کوئی بولا گل نے بلبل کو ستایا۔ اس لیئے پژمردہ ہو کر کملایا۔ کسی نے شمع و پروانہ کے سوز و گداز پر آنسو بہائے۔ آؤ اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے خانگی راز و نیاز کو سنیں۔ اور اپنے گھروں میں اس محبت کا رواج دیں۔

ذیل کا قصہ صحیح حدیث سے نقل کر کے لکھا جاتا ہے :-

رسول خدا ؐ (حضرت عائشہؓ سے مخاطب ہو کر) ہم جان لیتے ہیں کہ آج تم ہم سے خوش ہو یا ناراض۔

حضرت عائشہ رضؓ :- کیونکر؟ میں قربان ہو جاؤں ذرا بتایئے تو۔

رسول خدا ؐ :- جب تم ہم سے خوش ہوتی ہو تو یوں قسم کھاتی ہو۔ "محمدؐ کے خدا کی قسم" اور جب ناخوش ہوتی ہو تو کہتی ہو۔ ابراہیمؑ کے خدا کی قسم۔

حضرت عائشہ رضؓ :- (متبسم ہو کر) ہاں یا رسول اللہ! خفگی میں آپ کا نام چھوڑ دیتی ہوں۔ نہ کہ آپ کو ✤

اس راز و نیاز میں جو پاکبازانہ لطف ہے۔ وہ اہل محبت سے مخفی نہیں۔ کون سا گھر ہے جہاں رنجشیں پیدا نہیں ہوتیں مگر رنج ہو تو بس اتنا کہ فریقین اپنے جذبات اشاروں کنایوں میں ادا کر کے جی کی بھڑاس نکال لیں۔ نہ یہ کہ توڑ پھوڑ اور اکھاڑ پچھاڑ کر بیٹھیں ✤

مقصودِ زندگی

ہر ایک کو ہے زمانے میں زندگی مقصود
کسے خبر ہے کہ مقصودِ زندگی کیا ہے (اکبر)

نئی روشنی نے تو اس کا جواب یہ دیا کہ اچھا کھانا۔ اچھا پہننا اور عزت کے ساتھ بسر کرکے مرجانا ہر انسان کا مقصدِ زندگانی ہے۔

مگر کوئی پوچھے کہ یہ باتیں تو زندگی ہیں۔ یہ بتاؤ کہ ان باتوں کا حاصل مقصد کیا ہوا۔ کیا اتنی بڑی دُنیا۔ یہ عظیم الشان کائنات یہ عقل کا پتلا آدمزاد اس لیئے پیدا ہوا کہ دو نوالے کھائے۔ دو کپڑے پہنے۔ چار سلام لے اور آنکھ بند کرکے موت کے حوالے ہوجائے۔

مذہب کہتا ہے۔ عبادت۔ ربّ مقصودِ زندگی ہے۔ مگر فطرت کہتی ہے زندگی خود اپنا مقصود ہے۔ زندگی کی شناخت کے لیئے زندگی ملی ہے۔ یہ مجہول کی مجہول تعریف نہیں ہے۔ غور کرو ہر ذرّہ کی حیات اپنے وجود کے عرفان کے لیئے ہے۔

اور انسان جو تمام موجودات کا خلاصہ ہے اپنی اور تمام کائنات کی زندگانی کو پہچاننے اور اُس سے خالق کا عرفان حاصل کرنے کو پیدا ہوا ہے۔ جب شناخت ہوتی ہے۔ خود مردوں کا سر جھکا کر سجدہ میں گر پڑتا ہے۔ اور کہنا پڑتا ہے کہ:-

رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا

پھر عبادت وطاعت بھی شروع ہوتی ہے جو بیان مذہب کی رو سے مقصودِ زندگانی ہے۔ اور کھانے پینے رہنے سہنے کا بھی اصلی لطف آتا ہے جو نئی روشنی کے عقیدے میں مطلوب حیات ہے۔ واہ عرفان تیری کیا بات ہے۔ میری پہچان میں تجھ پر قربان۔ تو آجائے تو جینے کا مزا مل جائے۔

خاک کا ٹھکانا

جب جان خاک میں ملی۔ تو سب نے شادیانے بجائے۔ ترانے گائے اور ہر ایک نے نورِ چشم لختِ جگر کہکر اس خاک آلود جان کو سینے سے لگایا۔ ماں نے گود میں اُٹھایا۔ باپ نے آنکھوں پر بٹھایا۔ اور جب جان خاک سے آزاد ہوئی۔ مٹّی کی آلودگاری سے نجات ملی تو آہ وبکا کے نالے بلند ہوئے۔ کسی نے کہا کہ ہائے میرا لال۔ کوئی بولا ارے میرے سرتاج۔ عورت۔ مرد۔ بچّے۔ بوڑھے یکساں رونے پیٹنے میں مصروف ہوئے کیا خدا کی شان ہے۔ یہ انسان بھی کس قدر انجان ہے۔ ہنسنے کے وقت روتا ہے اور رونے کے موقع پر ہنستا ہے۔ کوئی اس کو بتائے۔ خاک اور جان کے رُتبوں کا فرق سمجھائے۔ جان جسم خاک میں اپنی خوشی سے نہیں آئی تھی۔ حکم حاکم سے مجبور تھی۔ حاکم کو خاک کا رُتبہ بڑھانا تھا۔ ورنہ جان کا خاک نہیں کوئی اور ٹھکانا تھا۔

خاک نے درجہ پایا۔ کچھ دن امر اللہ کے سانسوں کو پیار کے سینے سے لگایا۔ آخر وقت مقرر نے اپنی جان کو رہائی دی۔ اور خاک کو اُس کے ٹھکانے پر بھیجدیا۔

خاک کا ٹھکانا خاک ہے۔ جان کا ٹھکانا شہِ لولاک ہے۔ خاک اپنے ٹھکانے میں پہنچکر غمناک بن جاتی ہے اور جان کا جو حال ہوتا ہے اُس کا اظہار الفاظ ومعانی کی حد سے باہر ہے۔ پھر کون بتائے سوائے اس کے کہ جناب اکبر کا گیت گائے اور یہ شعر پڑھے ؎

جان جب خاک میں ملتی ہے تو ہوتی ہے خوشی
خاک جب خاک میں ملتی ہے تو سب روتے ہیں

پانچویں منزل

سیاست + مُعاشرت + تمدّن

تاج اور کلاہِ درویشی

دربار کی یادگار

(از صوفی جنوری ۱۹۱۲ء)

دہلی میں دربار ہے۔ شہنشاہ ہندوستان وانگلستان یہاں آئیں گے۔ جنگل میں منگل ہوگا۔ ادنےٰ اعلیٰ چھوٹا بڑا۔ ہندو مسلمان عیسائی۔ موسائی خوش ہوگا۔ اور خوشی کا اظہار کرے گا۔

آؤ ہم بھی شاہ جارج کو مبارکباد دیں۔ مگر ساری دُنیا انگریزی قوم اور انگریزی بادشاہ کو مبارکباد دیتی ہے۔ ہم صوفیوں کی طرف سے اُس چیز کو مبارکباد دیں جو سب خوشیوں کا مرکز ہے۔ بیشمار امیدوں کا ملجا و ماوا ہے یعنی:-

تاج

دراصل تاج ہی وہ چیز ہے جس پر بادشاہی شہنشاہی کی مہر لگی ہوئی ہے۔ بغیر تاج کے سب انسان برابر ہیں۔ وہی دو آنکھیں بھی ایک زبان۔ دل بھی ایک۔ قد بھی بہت اونچا نہیں۔ سانس بھی دو ہی۔ پیاس بجھانے کو پانی بھی۔ اور پیٹ بھرنے کو روٹی بھی یکساں۔ حضرت تاج سر پر آجاتے ہیں تو یہ انسانی دو گز کی مورت بادشاہ کہلانے لگتی ہے۔ دیکھنا اس تاج کے اجزا پر غور کرنا۔ یہ کس چیز کا بنا ہوا ہے۔ کیونکہ اس میں یہ عظمت۔ یہ طاقت۔ یہ تاثیر آگئی کہ جہاں یہ سر پر پہونچا کروڑوں سر اس کے سامنے جھکنے لگے۔ بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کو انسانوں نے بنایا ہے اور اس میں وہی اجزا ہیں جو ہر کس و ناکس کے استعمال میں آتے ہیں۔ پھر کیا سبب ہے کہ جب وہ اجزا تاج کی شکل اختیار کرلیں تو انسان کو بادشاہ بنادیں اور گدا کی گدڑی میں سیئے جائیں تو حقارت و ذلت کا ہدف بنیں۔ ہو نہ ہو اس کی حقیقت میں اس کے معانی میں کوئی بھید ہے۔ آؤ اس کو

کہو جو صوفی کہلاتے ہیں۔ جن کی دینی و دنیاوی زندگی حقیقت شناسی ہے۔ تاج کی حقیقت پر غور کریں کہ وہ اس شکل میں آکر ایسا اثر دار کیوں ہو جاتا ہے +

اس کا جواب سوائے اس کے کچھ نہیں کہ وتعزّ من تشآء وتذلّ من تشآء والا معاملہ ہے۔ ایسے بادشاہ بھی گذرے ہیں جن کے تاج کی کچھ عزت نہ تھی تلوار کے زور سے ملک لیا اور کچھ دن کے بعد فنا ہو گئے۔ اور ایسے شہنشاہوں کا ذکر بھی تاریخوں میں مذکور ہے جن کو مرنے کے بعد کفن بھی میسّر نہ آیا +

شاہ جارج کی تاج پوشی لندن میں ہو چکی۔ ہندوستان بھی اُن کی حکومت کا ایک حصّہ ہے اِس کے لیئے دہلی میں خود تشریف لاکر اپنی تاج پوشی کا اعلان کریں گے۔ اعلان کرتے وقت اُن کا دل خوش ہو گا اُن کی خوشی سے رعیّت بھی شادکام ہو گی۔ رعیت کے سب طبقے علیحدہ علیحدہ مبارکباد دیں گے۔ درویشوں اور صوفیوں کی طرف سے کلاہ درویشی صدائے قلندرانہ میں تہنیت گزار ہے +

"جارج" بابا کی خیر۔ کر بھلا۔ ہو بھلا۔ سائل کی قدر کر۔ آس والوں کی آس بر لا۔ گھوڑے والے۔ جوڑے والے۔ توپوں والے۔ ڈوپوں والے۔ شادرہ۔ آبادرہ۔ تیرے جہازوں کی خیر۔ اور اُس آزادی کا بول بالا جو جہاز کے جھنڈوں میں لہرا رہی ہے۔ فقیروں کی طرف بھی دیکھ۔ یہ وہ ہیں جو مغرور اور متکبّر خودسر جفاکار بادشاہوں کو کھری کھری سُنادیا کرتے تھے۔ تو تو نیک دل اور نرم مزاج ہے۔ تیری حکومت میں ہر بات سننے کی صلاحیت ہے۔ دیکھ یہ دُنیا ایک تماشا گاہ ہے۔ دھوکے کی ٹٹّی ہے۔ اس کی شان و شوکت میں جی نہ لگا اور اُس کی طرف متوجہ ہو جس نے تجھ کو یہ شان و شوکت عطا فرمائی ہے +

.... اس ہندوستان میں اُن ہند و مہاراجاؤں کی اولاد جو ایک زمانہ میں اس ملک کے تاجور تھے کس مپرسی کے عالم میں گرفتار ہے۔ تغلق اور خلجی خاندان کے شہزادے اور شہزادیاں دہلی کے کرتے ہیں۔ اور تغلق آباد کے عالیشان قلعے کی کوٹھریوں میں اپنی گزشتہ عظمت کو یاد کر رہے ہیں +

تیموری جاہ و جلال کی افسردہ نشانیاں شہزادے اور شہزادیاں دہلی کے محلّوں میں فاقہ کشی کر رہی ہیں کیوں۔ اس واسطے کہ اُنھوں نے دنیاوی عیش و عشرت میں اپنے انجام کار کو بھلا دیا۔ گردش دوراں کو یاد نہ رکھا، تو نہ بھول۔ تیری یاد ہمیشہ قایم رہے گی۔ غرور سے اکڑ کر نہ چل۔ تیرے تاج کو دائمی قرار نصیب ہو گا +

خدا خوش نصیب ملکہ "میری" کے سہاگ کو چار چاند لگائے اور وہ دیکھیں کہ غریبوں کی دعاؤں کے کپڑے کارچوبی چمکدار کپڑوں سے لاکھ درجہ اچھے ہیں۔ انہیں کو ہمیشہ استعمال کریں +

یہ درویشی کلاہ بھی اقلیم تصوّف کی حکومت کا ایک تاج ہے۔ دلوں پر حکمرانی کرتا ہے۔ ایمان کا سکّہ چلاتا ہے۔ خدائی توپوں اور فوجوں کو رکاب میں رکھتا ہے۔ اے بادشاہ! اس کی دوستانہ مبارکباد قبول کر اور سر بلند ہو +

ٹھکانا ایک بستر کا

از اخبار زمیندار فروری ۱۹۱۲ء

انگریزی سرکار! تجھ کو قرار۔ تیرے نرم گرم بستر کو قرار۔ شاد رہ آباد رہ۔ مسلمان فقیر ہیں بے نوا ہیں۔ مگر تیرے اس بستر کو نظر لگانے والے فقیر نہیں ہیں جو مشرق و مغرب میں بچھا ہوا ہے۔ ان کو صرف ذرا سی جگہ تیرے دل میں درکار ہے جس میں مسلم کی ہستی مختصر کے لیئے ٹھکانا ایک بستر کا ہو جائے۔
اے ہند و سندھ میں پاؤں پھیلا کر سونے والی گورنمنٹ! نیند ہماری آنکھوں میں بھی آتی ہے۔ ہم کو بھی گوشۂ عافیت دے۔ زیادہ نہیں فقط

ٹھکانا ایک بستر کا

کل کے دن ہم تاج والے تخت و بخت کے مالک تھے۔ آج کے دن ہم تیرے راج کے سایے تخت کو تختے بنائے بخت و اقبال لُٹائے بے یار و مددگار کھڑے ہیں۔ مُلک نہیں مانگتے۔ تاج و تخت طلب نہیں کرتے ہمیں تو محض درکار ہے

ٹھکانا ایک بستر کا

دہلی بسانا مبارک۔ لیکن ہمارے نشیمن کو نہ اُجاڑ۔ ہمارے ٹوٹے بوریے کو حجرہ سے نہ پھینک۔ دیکھ ہمارے پاس کچھ نہیں۔ بس یہی باقی ہے۔

ٹھکانا ایک بستر کا

سُنتے ہیں تجویز شدہ نئی دلّی کی تعمیر میں وہ سب رقبہ آگیا ہے جس میں ہم اُجڑے والوں کی مسجدیں ہیں۔ خانقاہیں ہیں۔ مزارات ہیں اور وہ تاریخی چیزیں ہیں جن کو دیکھ کر زمین سے اُبھرا ہوا دیکھکر سانس آتا جاتا ہے یہ مٹ جائیں گی تو ہمارا وہ سب کچھ مٹ جائے گا۔ جس کو ہم کہا کرتے ہیں کہ ابھی باقی ہے:-

ٹھکانا ایک بستر کا

حلقۂ نظام المشائخ نے پنجاب گورنمنٹ کو درخواست بھیجی ہے کہ ان مقدس مقامات کی حفاظت کا خاص طور سے خیال رکھا جائے اور حلقہ۔ مجوزہ رقبہ کے اندر آئی ہوئی۔ تمام مسجدوں خانقاہوں۔ مزارات و تاریخی مقامات کی فہرست بنا رہا ہے۔ اسپر (جب کہ وہ پیش ہو) نظر توجہ کی جائے تاکہ ہم سب گدا گرانِ دلفگار جارج سلطان کے ارمان کو خوشی و خرمی سے پورا ہوتے دیکھیں اور کہیں مل گیا ہمارا

ٹھکانا ایک بستر کا

عقل و دور اندیش رکھنے والے انگریزو۔ ہمیں تم پر بھروسہ ہی۔ اعتماد ہے۔ کہ تم یقیناً ہماری اس شکستہ آواز پر کان دھرو گے اور احتیاط کے ساتھ اُن نشانیوں کو قایم رکھو گے جہاں ہے ہمارا

ٹھکانا ایک بستر کا

مسلم پریس کو اگر اس سوختہ طلبگاری میں بوئے ادب و وفا شعاری محسوس ہو اور کوئی مصلحت مانع نہو تو اس سے بھی درخواست ہے کہ میری اس صدا میں سُر ملائے اور کہے۔ ہاں۔ باقی رہے "

ٹھکانا ایک بستر کا

چمارزادہ سیّد کی گود میں

از اخبار توحید ۱۳؁ ۱۹۱ء

نیچ ذات چھوکرے۔ آ۔ میری گود میں آجا۔ تو شودر ہے۔ کمین ہے۔ چمار ہے۔ پلید ہے۔ گندہ ہے۔ مگر میرے واحد خدا کا بندہ ہے۔ مجھ جیسا آدمی ہے۔ ناک۔ کان۔ ہاتھ پاؤں۔ آنکھ زبان۔ دل دماغ رکھتا ہے۔ تجھ کو کس نے اچھوت اور ناپاک بنا دیا۔ نہیں۔ تو پاک۔ پوتر ہے۔ عزت دار بلند مرتبہ ہے۔ کون ہے جو تجھ کو خدا کی درگاہ میں جھکنے سے روکتا ہے۔ مندر۔ مسجد اور گرجا میں جانے سے منع کرتا ہے۔ کیا ہندو تجھ کو اس لیئے مندر شوالے میں نہیں آنے دیتے کہ تو نے نیچ ذات کے گھر میں جنم پایا ہے۔ کیا عیسائی گورا اس واسطے اپنے بڑے درجہ کے گرجا میں تیرے گھسنے کا روادار نہیں کہ تو ناشایستہ جاہل اور کالا دیسی ہے۔ کیا مسلمان تیرے میلے میلے ہاتھ پاؤں دیکھکر گھن کھاتا ہے اور مسجد میں نہیں آنے دیتا ✦

تو آ۔ سید فقیر۔ عربی رسولؐ کا فرزند۔ تیرے ہاتھ پاؤں دھوئے گا اور اپنے باپ کی بنائی ہوئی مسجد توحید میں ساتھ لے چلے گا ✦

بابا۔ اپنی قدر پہچان۔ میں تجھ پر قربان۔ تو انسان ہے۔ بلند شان ہے۔ خلیفۃ المسلمین محمد خامس کا لخت جگر۔ خاقان الہند جارج خامس کا نور نظر۔ اور تو اے غریب چمار کے پسر۔ خدا کی درگاہ میں سب برابر ہو۔ آؤ عرب دیس کے مہاراجہ اونچی ذات اور نیچی ذات کو برابری کی نگاہ سے دیکھنے والی پتی کی سیوا اور پوجا کریں۔ جنہے پریم پرچار میں امیر غریب۔ ادنیٰ۔ اعلیٰ چھوٹے بڑے۔ پڑھے اَن پڑھ کی کچھ تمیز اور قید نہیں رکھی اور اُپدیش دیا۔ ذات پات نہ پوچھے کوئے۔ ہر کو بھجے نہ ہر کو ہوئے ✦

تو آ۔ ہر کے نام کی بانسری بجائیں۔ ہر کو ڈھونڈیں۔ ہر کو پائیں ✦

جیبی گھڑی کی سازش

(اخبار توحید ۱۳ ۱۹ء)

غلطی یہ ہوئی کہ گھڑی کو بائیں طرف کی جیب میں رکھا۔ وہاں اس شریر چھوٹی کھوٹی قتنی نے میرے دل کو بہکالیا۔ صحبت کا اثر مشہور ہے۔ دل آخر گوشت کا لوتھڑا تھا۔ گھڑی کے چلتے پُرزوں سے کیونکر بچ سکتا۔

گھڑی نے جب وہ جیب کے ہوٹل میں اُتری۔ پاس ایک دھڑکنے والی آواز سنی اس کو معلوم ہوا کہ یہاں قریب میں کوئی بیقرار چیز ٹھہری ہوئی ہے۔ اِس لیئے اُس نے کہا تم کون ہو۔ کیا تم بغیر انٹرڈیوس اور تعارف کی بات کر سکتے ہو۔ دل اُس وقت ذکر خدا کر رہا تھا۔ مرشد کا بتایا ہوا پاس انفاس اُس کے پاس تھا اس کو کسی غیر سے مخاطب ہونے کی اجازت نہ تھی۔ نہ یاد الٰہی کے سرور و لطف میں وہ کسی دوسری طرف متوجہ ہونا پسند کرتا تھا۔

مگر نئے مہمان کی خاطر سے اُس نے اتنا کہا۔ میں دل ہوں۔ سینے کے حجرے میں مدت سے رہتا ہوں۔ آپ کب تشریف لائیں؟ میرے قابل کوئی خدمت ہو تو بتایئے۔

کیونکہ مجھ کو میرے رسولؐ نے حکم دیا ہے کہ اپنے پڑوسی کے کام آنا چاہیئے۔ اپنے مہمان کی خاطرداری کرنی چاہیئے۔ ولایتی گھڑی نے اس گوشہ نشین اللہ والے کی نرم اور مہربان آواز سنکر ناز دلربایانہ سے کہا:۔

تھینک یو مائی ڈیر ہارٹ! شکریہ میرے پیارے دل۔ کیا آپ میرے پاس آ سکتے ہیں؟ میں آپ کی شرکت سے اپنی میز کا فخر بڑھانا چاہتی ہوں۔ آپ کا دم سینے کی اندھیری کوٹھری میں گھبرا گیا ہوگا۔ باہر نکلیئے۔ میرے فرد اسائے کو دیکھیئے۔ اور میرے یاقوت کے زیور ملاحظہ فرمایئے۔ جن کو میں نے پہن رکھا ہے۔

زاہد خشک مزاج دل نے آہ سرد بھری لیکن ایٹی کیٹ (آداب فیشن کے خلاف) پریزاد گھڑی کے پُر ارمان پیام کا جواب نہ دیا۔

فیشن ایبل (گھڑی) گھڑی نے اس خاموشی کو اپنی انسلٹ (توہین) سمجھا اور تیوری پر بل ڈالکر اندر ہی اندر جز بز ہوکر رہ گئی۔

اب اس نے انتقام لینا چاہا۔ وہ خلوت نشین عابد کا تقوے توڑنے کے لیئے تیار ہو گئی۔ اور سوچنے لگی کیونکر میں اس نیم وحشی مگر خوبصورت چیز کو اپنے قابو میں لا سکتی ہوں۔

اتنے میں بارہ بجے کی توپ چلی۔ گھڑی والے نے اس کو جیب سے نکالا۔ اور دست شوقین کی اُنگلیوں سے چٹکی بجاتے کوک بھر دی۔ یہ کوک گھڑی کی غذا تھی جس نے اُس کے دماغ میں کام کرنے اور دل کے خلاف غصہ نکالنے کے لیئے ایک طاقت و پھرتی پیدا کر دی۔

پہلے گھڑی نے اپنا کھٹکا دل کے کھٹکے سے ملا دیا۔ اور اس طرح گویا اُس نے دل کو اپنی طرف متوجہ کرنا چاہا۔ دل نے جب گھڑی کی صدائے وحدت سنی تو بہت خوش ہوا اور اپنی مشغولی حق سے یکسو ہو کر گھڑی سے یوں خطاب کیا۔ تمہارا کھٹکا بہت مضطرب اور جلد بازانہ ہے۔ ذرا آہستہ آہستہ سانس روک کر ذکر کرو۔ ورنہ عمر جلدی تمام ہو جائیگی۔ میرے

مرشد نے حبسِ دم کی اسی واسطے تلقین فرمائی ہے کہ سانس کی اضطراب کو قرار رہے اور سکون و طمانیت سے سب کام پورے ہوں۔
گھڑی بولی میں بے تہذیب دیسی سے ہمکلام ہونا نہیں چاہتی۔ تو ولایت کے آداب سے واقف نہیں ہے۔ تو نے ابھی سوسائٹی کے اعلیٰ رکن عورت ذات کی توہین کی ہے۔ کیوں اُس کی مُنہ مانگی مراد کو پورا نہ کیا +
دل نے جواب دیا میں نامحرم کے پہلو میں ایسے وقت جبکہ تیسرا وہاں کوئی نہ تھا کیونکر آسکتا تھا۔ یہ میرے مذہب کے خلاف تھا۔ کیونکہ وہ غیر عورت کے پاس تخلیہ میں بیٹھنا کجا صورت دیکھنے کی بھی اجازت نہیں دیتا +
کواری گھڑی نے دل کی بات سُن کر ایک بجلی بھرا تبسم کیا اور کہا معاف کیجیے۔ میں آپ کے مذہب کے خلاف کچھ نہیں کہہ سکتی کیونکہ یہ تہذیب و شائستگی نیز قانون حکومت کے خلاف ہے کہ کسی کے مذہبی عقیدے میں دخل دیا جائے۔ مگر اتنا ضرور کہوں گی کہ آپ زندگی کے مزے سے محروم ہو گئے ہیں۔ آپ نہیں جانتے کہ عورت اس لیے پیدا ہوئی ہے کہ وہ مجلسوں اور محفلوں کی کیفیت اور زیب و زینت کو بڑھائے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ عورت کی عصمت ایک شخص کی جائز ملکیت ہونی چاہیئے۔ مگر یہ بالکل ظلم ہے کہ وہ اجنبی مردوں کو اپنے ہنسمکھ چہرے اور اپنی میٹھی باتوں سے محروم کر دے۔ ہماری ولایت کا دستور بہت اچھا۔ کہ غیر شخص دوسرے کی بیوی سے تخلیہ کی ملاقات کر سکتا ہے۔ ہوا خوری کو ساتھ لے جا سکتا ہے اور اُس کے خاوند کے سامنے بیوی کے حسن و جمال کی تعریف کر سکتا ہے۔ تم دیسی لوگ بڑے وحشی ہو۔ اگر کسی کے سامنے اُس کی بیوی کی تعریف کر دی جائے تو وہ یقیناً چھری مارنے پر آمادہ ہو جائے۔
دل گھڑی کی جادو بھری تقریر سے موم ہو گیا۔ اُس نے اپنا مقدس ہاتھ ڈرتے ڈرتے اُٹھایا اور گھڑی کی ہاتھ کو پکڑ کر چومنا چاہا۔ مگر یکایک اُس کو خدا کے ڈر نے اس گناہ سے روکا اور اُس نے کانپ کر ہاتھ چھوڑ دیا۔ دل کی اس حرکت سے گھڑی کھل کھلا کر ہنسی۔ اور بلیک فول بلیک فول (بے وقوف کالا بے وقوف کالا) کہکر عشق کے کوچہ سے ناآشنا غریب کو پریشان کر دیا۔
آخر دل سے نہ رہا گیا اور اُس نے کہا تم میں ایسی کیا خوبی ہے جو نوّ روپیہ خرچ کر کے تم کو خرید آگیا۔ تم جن چیزوں کو ہیرے یاقوت کے زیور کہتی ہو وہ معمولی پتھر کے ریزے ہیں۔ تمہارے اندر پیتل کے چند پُرزوں کے سوا رکھا کیا ہے۔ ہندوستان درحقیقت کالے بے وقوف ہیں جن کو وقت کی پابندی کا تو کچھ خیال نہیں مگر یورپ کی تقلید میں پیتل کے چند ٹکڑوں کو چاندی کے سکّے دیکر خرید لیتے ہیں۔ ہندوستان میں صرف یہ بیکار پیتلی ٹکڑے رہ جاتے ہیں اور ولایت میں چاندی پہونچ جاتی ہے +
میرا بس ہو تو سارے ہندوستان میں ڈھنڈورہ پیٹ دوں کہ گھڑی وہی رکھے جو وقت کی قدر جانتا ہو۔ ظاہری نمائش کے لیے کوئی اپنی دولت غیر ملک میں نہ بھیجے۔ بلکہ میں تو یہی کہوں گا کہ جب تک اپنے ملک میں گھڑی کے کارخانے قائم نہ ہو لیں اور یہاں گھڑیاں نہ بننے لگیں کوئی ہندوستانی گھڑی نہ خریدے +
دل کی اس باغیانہ تقریر سے گھڑی کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ اُس نے اپنے خانساماں کو بُلایا اور اس درویش صفت مگر سرکش وجود کو دھکے دے کر نکلوا دیا +
جناب دل نکل تو آئے مگر اب اُن پر گھڑی کے عشق کا جنون سوار ہے۔ گھڑی کی طلائی زنجیر کے خیال کو اپنے پاؤں کی بیڑی بنا رکھا ہے۔
میں کیونکر کہوں کہ گھڑی کی سازش نے میرے دل کو کہیں کا نہ رکھا +

نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم
نہ اِدھر کا رہا نہ اُدھر کا رہا

چھڑکاؤ کی گاڑی

از اخبار توحید ۱۳ سنہ ۱۹ء

گرد آباد سڑک پر دیکھا ہوگا۔ چھڑکاؤ کرنے والی گاڑی کیونکر تپتی ہوئی زمین کو سیراب کرتی ہے۔ راستہ چلنے والے مسافروں کو تکلیف دینے والی خاک کا مُنہ بند کرنے کے لیئے اپنا سارا سرمایہ مٹی میں ملا دیتی ہے۔

تمہارے لیئے اس میں عبرت ونصیحت ہے۔ اگر تم ذرا غور وفکر کی عادت ڈال لو تو دُنیا کی ہر چیز تم کو راستہ بتاتی ہے مگر تم تو زندگی کی کش مکش میں آنکھ بند کرکے پڑا رہنا چاہتے ہو۔ کہیں اس طرح زندگی بسر ہوا کرتی ہے۔

ظاہر میں چھڑکاؤ کی گاڑی بڑی فضول خرچ معلوم ہوتی ہے۔ اپنا پانی بے تحاشا بہاتی ہے۔ چنانچہ ایک گنوار کا قصّہ مشہور ہے کہ جب وہ کسی شہر میں گیا اور وہاں چھڑکاؤ کی گاڑی کو دیکھا تو کہنے لگا کہ یہ گاڑی والا بھی بڑا بیوقوف ہے۔ پانی بہہ رہا ہے اور اس کو خبر نہیں۔ گھر پہونچتے پہونچتے تو ایک بوند بھی باقی نہیں ہیگی ٭

مگر تم گنوار کی طرح انجان اور ناسمجھ نہ بنو۔ چھڑکاؤ کی گاڑی پر فضول خرچی کا الزام نہ لگاؤ۔ بلکہ خود اپنی دولت دوسروں کی فائدہ رسانی میں خرچ کرنی سیکھو ٭

اب تم اپنے عیش وآرام کے لیئے۔ اپنے نام ونمود کے واسطے شادی بیاہ غمی میں ہزاروں روپئے خرچ کر ڈالتے ہو مگر خدا اور اس کے بندوں کا کوئی کام درپیش ہوتا ہے تو ہاتھ سمیٹ لیتے ہو۔ فضولخرچی کا سہم چڑھ جاتا ہے ٭

فضولخرچی بہت بُری چیز ہے۔ قرآن شریف میں ارشاد ہے ولاتبذر تبذیرا۔ ان المبذرین کانوا اخوان الشیاطین۔ اسراف نہ کرو اسراف کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں۔ دوسری جگہ فرمایا کُلُوا واشربُوا ولا تُسرِفوا۔ کھاؤ پیؤ مگر اسراف نہ کرو ٭

اگر چار آنے گز کے کپڑے میں تمہاری تن پوشی ہو سکتی ہے۔ اگر دو روپئے کی دیسی جوتی تمہاری برہنہ پائی کو دور کر سکتی ہے۔ اگر ایک طرح کے دال سالن سے تمہاری روٹی چل سکتی ہے۔ تو تین چار روپئے گز کے کپڑے پہنکر اپنے جسم کی عادت نہ بگاڑو۔ دس روپئے کا ولایتی بوٹ اور پانچ روپیہ کی کامدار جوتی نہ پہنو۔ دس دس طرح کے کھانے دسترخوان پر نہ لگاؤ۔ تم ایک غریب ملک کے باشندے ہو۔ تم ایک مفلس قوم کے فرد ہو۔ دوسرے بھائیوں کا بھی خیال رکھو کہ وہ کس حال میں ہیں ٭

حضرت محبوب الٰہی کے حال میں لکھا ہے کہ سردی کے موسم میں جب ان کو گرم کپڑا پہنایا جاتا تو وہ آنکھوں میں آنسو لاکر فرماتے پہلے مسجدوں اور بازاروں کے گوشوں میں غریبوں کو دیکھ آؤ۔ ان میں کوئی ننگا تو نہیں ہے۔ اگر ہے تو پہلے اس کو دو۔ وہ حق دار ہے ٭

چھڑکاؤ کی گاڑی تم کو یہ ہی نصیحت کرتی ہے کہ اس کا سب کچھ دوسروں کے لیئے ہے۔ اپنے واسطے وہ ایک بوند بھی گھر لیکر نہیں جاتی ٭

از اخبار توحید میرٹھ ۱۳ ۱۹ء

گرمی کے موسم میں تمہارا جی گھبراتا ہے۔ دھوپ میں باہر نکلو تو دماغ پکنے لگتا ہے۔ گھر میں بیٹھو تو پسینہ چلا آتا ہے جس سے کپڑے تر ہو جاتے ہیں اور ان میں بساندی بساندی بو آنے لگتی ہے +

جانتے بھی ہو۔ پسینہ کیا چیز ہے۔ یہ تمہارے بدن کی زکوٰۃ ہے۔ اللہ میاں گرمی کا موسم بھیجکر آدمی کے بدن کا وہ میل کچیل جو مسامات اور کھال کے نظر نہ آنے والے چھوٹے سوراخوں میں ہوتا ہے پسینے کے پانی سے دھو دیتے ہیں۔ پسینہ ایک طرح کی بھاپ ہے۔ جو گرمی کے اثر سے بدن کے اندر پیدا ہو جاتی ہے۔ اور پسینہ بنکر بہہ جاتی ہے۔

پہاڑوں اور بعض ملکوں میں گرمی کا موسم نہیں آتا تو وہاں کے رہنے والے حمام میں جاکر بناوٹی گرمی سے پسینہ نکلواتے ہیں۔ کیونکہ پسینہ آدمی کی تندرستی کے لیئے بہت ضروری چیز ہے۔

پسینہ اللہ میاں کی بڑی نعمت ہے۔ غریب لوگ گرمی کے موسم میں دن بھر جنگلوں اور بازاروں میں محنت اور مزدوری کرتے ہیں اور ہر وقت پسینے میں شور بور رہتے ہیں۔ مگر جب شام کو اپنے گھر جاتے ہیں تو ان کا دل باغ باغ ہو جاتا ہے۔ کیونکہ محنت اور پسینہ سے ان کے بدن کی ساری بیماریاں دور ہو جاتی ہیں۔ امیر لوگ خس کی ٹٹیاں لگاتے ہیں۔ پنکھے جھلواتے ہیں اور ہر وقت ہائے گرمی ہائے گرمی پکارتے رہتے ہیں جب شام ہوتی ہے تو ان کے چہرے پر اداسی اور پریشانی چھائی ہوئی ہوتی ہے۔ کیونکہ پسینہ نہ آنے اور بیکار پڑے رہنے سے ان کے بدن کا میل بدن کے اندر رہتا ہے۔ اس واسطے یہ بیچارے ہمیشہ حکیموں اور ڈاکٹروں کے دروازے پر پڑے رہتے ہیں۔ اور رات کو اس چین سے پاؤں پھیلا کر نہیں سو سکتے جیسے ٹکے کا آدمی غریب مزدور سوتا ہے +

اور ہاں یہ بھی یاد رکھو کہ جس طرح موسم کی گرمی پسینہ کے ذریعہ بدن کے میل کو دور کرتی ہے اسی طرح انسان کی روح پر چھایا ہوا میل نماز روزہ زکوٰۃ سے دور ہو جاتا ہے۔ قاعدہ ہے کہ جب پسینہ آتا ہے تو آدمی کا جی بہت گھبراتا ہے۔ ایسے ہی نماز کی محنت۔ روزے کی مشقت اور زکوٰۃ کے خرچ سے پہلے پہل تو انسان کو ذرا تکلیف ہوتی ہے مگر جب روح کا میل صاف ہو جاتا ہے تو ایسی خوشی ہوتی ہے جس کی کوئی حد نہیں +

لہٰذا اے اخبار توحید کے پڑھنے والو! آنے والے موسم گرما کو خدا کی نعمت سمجھو جو غریبوں کے لیئے بھیجا گیا ہے اور پسینہ کی قدر کرو اور روح کا میل دور کرنے کے لیئے نمازیں پڑھو۔ روزے رکھو۔ زکوٰۃ دو۔ تاکہ خدا کے گھر جاکر آرام سے رہو +

پاؤں کا جیل خانہ

از اخبار توحید ۱۳ ۱۹ء

لوگو! میں ایک آزاد جنٹلمین کا پاؤں ہوں۔ مجھ کو روز صرف صبح کے وقت غسل دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد سوتی یا اونی یا ریشمی قبا پہنائی جاتی ہے جس کو جرّاب کہتے ہیں۔ اُس وقت میں خوش ہوتا ہوں کہ ایک امیر اور خوشحال آدمی کا پاؤں بنا۔ جو یہ لباس میسّر

آیا۔ غریب کا پاؤں ہوتا تو کیچڑ میں۔ کانٹوں میں۔ دھوپ کی تپتی جھلستی زمین پر چلنا پڑتا +

لیکن جب مجھ کو بوٹ کے جیلخانے میں ڈالا جاتا ہے تو بہت پریشان ہوتا ہوں۔ اپنی عارضی خوشی پر نفرین کرتا ہوں مگر جنٹلمین نہایت بے پروائی سے مجھ کو قفس چرمی میں بند کر دیتا ہے اور مجھ پر زور دیکر کھڑا ہوتا ہے تو لیکچر دیتا ہے کہ اے لوگو! آزادی حاصل کرو۔ آزادی بڑی نعمت ہے۔ اُسوقت بے اختیار میرا جی چاہتا ہے کہ زبان ہو تو کہوں کہ تیری آزادی کا دعوے جھوٹا ہے۔ تونے ٹھنڈے اور گورے ملکوں کی تقلید میں جہاں بوٹ پہننا ضروری ہے ہندوستان میں رہکر خواہ مخواہ اس کو پہنا۔ اور اپنے جسم کے ضروری حصے کو قید کرکے "پابند" ہوگیا۔ اب آزادی کیسی؟ آزادی جب تھی کہ دیسی جوتا پہنتا۔ پانچوں وقت کی نماز کے وقت پاؤں کو دھوتا۔ اور ہندوستانی شریفوں کی محفلوں مسجدوں میں بے روک ٹوک جاتا۔ اب بوٹ اُتارنے کی مشکل کے سبب سب سے محروم ہے +

سوئی کی لن ترانی

از اخبار توحید ۱۳ ۱۹ء

کالے برقع میں چھپی ہوئی کاغذ کی سیاہ پڑیہ میں بند سوئی نے اپنا نوکدار مُنہ باہر نکالا اور کہا۔

کون کہتا ہے انگریز ہندوستان کے بادشاہ ہیں۔ یہ ملک میرا ہے۔ اس کے رہنے والے میری رعایا ہیں۔ آئندہ کوئی شخص میرے سوا کسی کو یہاں کا تاجدار نہ کہے۔ نہ سمجھے۔ نہ مانے ورنہ سزا دی جائے گی +

انگریزوں کا اور میرا صرف اتنا تعلق ہے کہ جہاں میں پیدا ہوئی ہوں۔ وہیں یہ پیدا ہوئے ہیں۔ تو اس کے لیے اتنا ہوسکتا ہے کہ میں ان کو اپنی دوسری ہندوستانی رعایا کے مقابلہ میں کچھ امتیاز دیدوں لیکن ناممکن ہے کہ ان کے دعوائے ہمسری کو برداشت کیا جائے +

سب لوگ میرے محتاج ہیں۔ میں نہ ہوں تو گورے کالے ننگے پھریں۔ یا درخت کے پتوں سے اپنا بدن چھپائیں میرا ہمجنس لوہا سوت کاتتا ہے۔ کپڑا بُنتا ہے اور میں اُس کو سیتی ہوں۔ عزت مجھ سے ہے۔ حرمت مجھ سے ہے۔ اور راحت مجھ سے ہے۔

جب میں پہلے پہل اس مُلک پر حملہ آور ہوئی تو دیسی سوئیوں نے جو کچی تھیں میرا سامنا کیا۔ مگر میں نے اُن کو زک دی اور ناپید کر دیا +

آج میری وہ شان ہے کہ اگر انگریزوں کو اور سب یوروپ والوں کو بلکہ سب انسانوں کو نیچا دکھانا چاہوں تو دکھا سکتی ہوں اور ننگا دھڑنگا پھرا سکتی ہوں +

دیسی کالے بائیکاٹ کا نام لیں تو میں ان کو بائیکاٹ کرکے حیران پریشان کرسکتی ہوں۔ جب وہ جوش کے مارے آپے سے باہر ہوں اور میں ذرا کے ذرا اپنا مُنہ چھپالوں تو نشہ ہرن ہوجائیں اور "ہائے سوئی"۔ "ہائے سوئی" کا غل مچنے لگے۔ ہندوستان سوئی سوئی کا محتاج ہے آواز آنے لگے +

لہذا میں اعلان کرتی ہوں کہ کوئی آدمی دم نہ مارے اور چپ چاپ کام کرتا رہے۔ کیونکہ "تاج میرا - کاج میرا۔ راج میرا"

فُٹ بال

ازاخبار توحید ۱۹۱۳ء

بیچاری گیند میدان فٹ بال میں کھیلنے والوں کی کس طرح ٹھوکریں کھا رہی ہے۔ بڑا ترس آتا ہے۔ چمڑے کا بوٹ چمڑی کی گیند کو ٹھکراتا ہے۔ وہ بھاگتی ہے تو یہ پیچھے دوڑتا ہے۔ ایک طرف سے بچتی ہے تو دوسرا حریف سر پر آتا ہے۔

اس گیند کے اندر ہوا بھری ہوئی ہے۔ اگر ٹھوس ہوتی تو کس کی مجال تھی جو یوں سر بازار ٹھوکریں مار سکتا۔ آدمی کو دیکھو جس کا باطن ایمانِ حق سے بھرا ہوا ہو اُس کو کسی کا خوف نہیں رہتا۔ مگر کھوکھلے ضمیر والے ہمیشہ گردشِ ایام کے بوٹوں سے ٹھکرائے جاتے ہیں۔

فٹ بال بڑا اچھا کھیل ہے۔ گرمی کے موسم میں شام کے وقت دیکھا ہوگا۔ نوجوان اس سے جی بہلایا کرتے ہیں۔ یہ ایک طرح کی ورزش ہے جس سے ہاتھ پاؤں اور بدن میں چستی اور پھرتی پیدا ہوتی ہے۔

اگلے زمانے میں کبڈی کا کھیل تھا جس میں سانس روک کر دوسرے فریق کے پالے میں کبڈی کبڈی کہتے ہوئے جاتے تھے۔ اب کبڈی کا رواج کم ہوتا جاتا ہے۔ حالانکہ کبڈی میں فٹ بال سے بڑھکر فائدے تھے۔ اوّل تو یہ کہ سانس کے روکنے اور دوڑنے سے پھیپھڑہ مضبوط ہوجاتا تھا۔ دوسرے گیند خریدنی نہ پڑتی تھی۔ تیسرے فٹ بال کی وردی اور ایک خاص قسم کا جوتا نہ لینا ہوتا تھا۔ اب یہ عالم ہے کہ دسویں پندرھویں دن گیند خراب ہوجاتی ہے۔ جوتے ٹوٹ جاتے ہیں۔ اور غریب ہندوستانی ولایت والوں کی جیب میں چاندی کے سکے ڈال کر چمڑے کے چند ٹکڑے دوبارہ خریدنے پر مجبور ہوجاتے ہیں۔

بھائی ایسے کھیل کو دور سے سلام جس سے ملک کی دولت برباد ہوتی ہو۔ گھر پھونک تماشا اچھا نہیں۔

ہاتھ کی بغاوت

سالن کی آزادی

ازاخبار توحید ۱۹۱۳ء

میرا ہاتھ سالن کی پیالی میں جانا نہیں چاہتا۔ کہتا ہے پیالی کی اونچی اونچی دیواروں سے دم گھٹتا ہے شوربے اور بوٹی قتلے کے قید خانے میں نہیں جاؤں گا مجھ کو انگریزی پلیٹ چاہیئے جہاں سالن کو آزادی ہے۔ بوٹی

الگ نظر آتی ہے۔ قتلہ جدا معلوم ہوتا ہے۔ شوربا اپنی شان علیحدہ دکھاتا ہے۔ ہاتھ کو اختیار ہے۔ پلیٹ کے کھلے میدان میں جس طرف چاہے جائے۔ پیالی میں انگلیوں کو غوطے مار مار کر بوٹیاں نکالنی پڑتی ہیں ✦

الٰہی خیر۔ ہاتھ ہی باغی ہو گیا تو پیٹ بھوکا مر جائے گا۔ اس کو سمجھاؤ اور کہو۔ دیوالئے۔ غریبوں میں پیدا ہوا ہے غریبوں کی سی باتیں کر۔ ہمارے یہاں بھی پلاؤ زردہ کھلی قاب اور میدانی رکابی میں ہوتا ہے۔ مگر دال اور غریبانہ سالن پیالی کی دیواروں کے پردہ میں اچھا۔ پردہ سے باہر آنا آبرو میں بٹہ لگائے گا۔ انگریز ملک کے بادشاہ ہیں دولت حشمت ان کی غلام ہے۔ وہ تر بتر کھانے کھاتے ہیں۔ اس لئے کھلی رکابیاں ان کو زیبا ہیں۔ تو مفلس کنگال اُبالی دال کھانے والا۔ تجھ کو یہ فضول خرچیاں مناسب نہیں۔ جب تک پلاؤ زردہ میسر نہ آئے۔ صبر شکر سے پیالی پر گزارہ کر۔ آج تو بغاوت کرتا ہے۔ کل عورتیں سرکشی اختیار کریں گی کہ ہم کو بھی پردہ سے نکالو۔ اس وقت کیا ہوگا۔ اب تو پردہ میں پھٹے پرانے پیوند لگے کپڑے چھپے ہوئے ہیں۔ پردہ نہ رہا تو ملک کا سارا بھرم کھل جائیگا اور غریب شوہر اچھے کپڑے بناتے بناتے پاگل بن جائیں گے۔ نادان بات کو سمجھ اور دوسروں کی ریس چھوڑ ✦

پیاسے گلے پر چھری

حاملہ کا قتل

از اخبار توحید میرٹھ ۱۹۱۳ء

مسلمان کہتے ہیں۔ بلغاریوں اور سرویوں نے ترکی عورتوں کو اُن کے بچوں کے سامنے قتل کیا۔ انگریز کہتے ہیں کہ غدر میں ہندوستانیوں نے اُن کے ساتھ یہی سلوک کیا۔ فقیر کہتا ہے کہ اُس بے زبان جانور کو بھی کسی نے دیکھا جس کا نام بکری ہے۔ جو شہروں کے قتل خانوں میں ہزاروں بھوکی پیاسی بے دردی کی چھری سے ذبح ہو جاتی ہیں۔ تم اپنی بیوی بچوں کو لیکر خوش خوش آراستہ دسترخوان پر کھانا کھاتے ہو۔ تمہارے سامنے قلیہ۔ قورمہ۔ کوفتے پسندے کی قابیں ہوتی ہیں۔ ہاتھ بڑھاتے ہو۔ مظلوم بوٹیوں کو دانتوں سے بھنبھوڑتے ہو۔ مگر یہ خیال نہیں کرتے کہ یہ گوشت کہاں سے آیا اور کیونکر آیا۔

کسی دور کے گاؤں سے بکریوں کا ریوڑ چلا۔ مئی کی دھوپ ان کے سر پر تھی۔ بیچاریاں دن بھر کی منزلیں طے کر کے شام کو شہر میں پہونچیں۔ جلادوں نے ایک تنگ مکان میں بند کر دیا۔ اور وہ ہستیاں جن کو دیہات کے کھلے میدانوں میں رہنے کی عادت تھی۔ شہر کے تیرہ و تاریک جیل خانہ میں بھوکی پیاسی مقید رہیں۔ صبح کو مقتل کی بلاؤ ہوئی دیسی ڈاکٹر کی نظر طلاع نے ایک سرسری معائنہ کیا۔ لین دین کے خفیہ اشارے ہوئے۔ اور ناتوان مظلوم قیدی جن کی زبانیں پیاس کی شدت سے نکلی پڑتی تھیں۔ جو حسرت اور مایوسی سے اپنے جلادوں کو دیکھکر رحم کی درخواست کرتے تھے ڈنڈوں اور لاتوں کے زور سے کان اور دُم کھینچ کھینچ کر قتلگاہ میں پہونچائے گئے جہاں

جلاد چھری تیز کیے بغیر بے پروائی سے آستینیں چڑھائے کھڑا تھا۔ اُن میں ایک بکری حاملہ تھی اُس کو دو قدم چلنا دوبھر تھا۔ وہ ظالموں کی لاتوں سے حواس باختہ تھی۔ دم چڑھا جاتا تھا۔ مڑ مڑ کر دیکھتی تھی کہ کوئی خدا کا بندہ ترس کھائے اور پیٹ میں بچہ رکھنے والی کو موت سے بچائے۔ وہاں کون سُنتا تھا۔ سب کے کلیجے پتھر کے تھے۔ کسی نے رحم نہ کیا۔ یہاں تک کہ سب کے ساتھ وہ بھی مقتل کی زمین پر پچھاڑی گئی۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ پیاس کے مارے حلق سوکھ گیا تھا۔ وہ چیخنا چاہتی تھی مگر آواز نہ نکلتی تھی۔ اُس نے چھری کو دیکھا اور سمجھی کہ اب اس کی دھار پانی پلائے گی۔ آخر یہی ہوا۔ جلاد نے گلے کی کھال پر چھری رکھدی۔ حاملہ بکری نے کانپ کر اور لرز کر ایک دفعہ چیخ ماری۔ چھری نے اُس کے ننھے بالوں کو کاٹا۔ کھال کو کاٹا۔ رگوں کو کاٹا اور ہڈی کے پاس جاکر دم لیا خون کے فوارے اُبلے۔ ہاتھ پاؤں سے دم کھینچنا شروع ہوا۔ بیجان لاش چند منٹ تڑپی اور ٹھنڈی ہوگئی اسکے بعد کھال کھینچی گئی۔ پیٹ چاک کیا گیا۔ اور وہ بچے نکالے گئے جو مرنے والی کے پیٹ میں تھے۔ اُس وقت سفاک جلاد نے اتنا کہا۔ اوہو یہ گیابھن تھی۔ بچوں کو جلدی سے چھپانے کی کوشش کی گئی۔ کیونکہ اب قانون کی گرفت کا ڈر تھا۔ اس گوشت کے ٹکڑے پارچے ہوئے۔ کوئی حصہ قلیہ کے کام آیا۔ کوئی قورمے میں بھنا۔ کسی کا قیمہ بنا۔ پسندے کوٹے گئے۔ کسی کو کوفتے کی کوفت اُٹھانی پڑی ٭

یہ ہے تمہارے دسترخوان کی بہار۔ جس کو فخر اور گھمنڈ سے کھا رہے ہو۔ کھاچکو گے تو اخباروں میں بلقانی سفاکیوں پر مضمون لکھوگے۔ اور خیال کروگے کہ تم نے قوم کا ایک بڑا فرض ادا کیا ہے۔ ہاں بے شک تم نے فرض ادا کیا ہے تمہاری تعریف کرنی چاہئے لیکن یہ فرض خود غرضی کا فرض تھا۔ ورنہ تم ان بے زبان ہستیوں کا بھی خیال کرتے ٭

کیا یہ ممکن نہ تھا کہ تم ذبح خانوں کی نگرانی پر زور دیتے۔ اور پبلک سے کہتے کہ وہ بے زبان جانوروں کی خبر گیری کا انتظام کریں۔ اس میں تم پر بغاوت کا الزام نہ لگتا۔ اگر تم لکھتے کہ جن پر چھری چلائی جائے اُن کو پانی پلا دینا چاہیئے۔ اُن کو جس جگہ میں نہ رکھا جائے گیابھن اور حاملہ کی تحقیق خاص طور پر ہو اور جو لوگ اس کے خلاف کوئی حرکت کریں اُن کو عبرتناک سزائیں دی جائیں مگر تم سب (جنمیں راقم فقیر بھی شامل ہے) دوسروں کو کہتے ہو اپنی خبر نہیں لیتے۔ کل قیامت کے دن احکم الحاکمین تم سب سے اس کا جواب طلب کرے گا میں مانتا ہوں کہ جانور تمہارے لیے حلال کیے گئے ہیں۔ بے شک تم ان کا گوشت کھاسکتے ہو۔ مگر ان سفاکیوں کی کسی مذہب نے اجازت نہیں دی۔ خصوصاً اسلام نے ان ناروا ظلموں کو نہایت سختی کے ساتھ رد کیا ہے۔

حضرت خواجہ اجمیری کے غلاموں کو چاہیئے کہ وہ اپنی صوفیانہ نرم دلی کو کام میں لائیں اور ہر شہر میں ایسی انجمنیں قایم کریں، جن کے ممبر روزانہ صبح کے وقت ذبح خانوں میں جاکر۔ حاملہ۔ بیمار۔ کمزور۔ کمسن۔ بھوکے پیاسے جانوروں کو ذبح ہونے سے بچائیں اور اس کا خیال رکھیں کہ ایک جانور دوسرے کے سامنے ذبح نہ ہو۔ چھریاں تیز کرلی جائیں تاکہ ذبح کے وقت زیادہ تکلیف نہ ہو اگر آپ ایسا کریں گے تو مظلوم اور غریب نواز خواجہ رح اور حضرت رب العالمین کی خوشنودی حاصل کریں گے ٭

تخت گاہ کے ایک تختہ کا پیام

وبیسرائے کے نام

جنوری ۱۹۱۲ء

از نیرنگ

مائی لارڈ ہارڈنگ! ۱۹۱۲ء جاتا ہے۔ اور تم آتے ہو۔ بارہ مہینے پہلے انہیں دنوں میں تم اور یہ ۱۹۱۲ء ایک گاڑی

میں سوار ہو کر خبر دینے آئے تھے کہ دہلی برٹش راج کا پایۂ تخت بن گئی۔

اب تم دسمبر میں بحیثیت نائب السلطان مستقل سکونت کے ارادے سے دہلی میں داخل ہوتے ہو اور تمہارے ساتھ سنہ ۱۹۱۲ء کے بدلے سنہ ۱۹۱۳ء پہلو میں بیٹھا نظر آتا ہے۔

گورے تاک کے دہی ۱۳ کے عدد سے بدشگونیاں لیتے ہیں۔ مگر ہم کالوں کے خیال میں یہ خام خیالیاں ہیں۔ تمہارا اور تمہاری حکومت کا بول بالا ہو گا۔ اور تیرہ کا عدد منحوس نہ رہے گا۔

لاٹ صاحب! لوگ کہتے ہیں کہ دنیا بدل رہی ہے۔ ہر وجود تغیر و انقلاب کے میدان میں دوڑا چلا آتا ہے۔ زمانہ نے تمام کائنات کی چھوٹی بڑی اشیاء میں حرکت پیدا کر کے ان کی کایا پلٹنے کا سامان کیا ہے۔

مگر فقیر نہیں جانتا کہ خلقت کا یہ کہنا سچ ہے یا جھوٹ۔ جھوٹ اس لیئے نہیں کہہ سکتا کہ تم نے اور تمہاری حکومت کے اکثر بڑے بڑے آدمیوں نے بارہا یہ بیان کیا ہے کہ ہندوستان میں ایک زبردست انقلاب برپا ہے۔ اور حالات و کیفیات میں تبدیلی ہو رہی ہے۔ ہر قدیم ہستی جدت کا جامہ پہن رہی ہے۔

سچ یوں نہیں مان سکتا کہ تم سب کی یہ باتیں نیچرل مشاہدہ کے خلاف ہیں۔ یاد ہو گا کہ گذشتہ دسمبر میں بھی سردی تھی۔ آسمان کا رنگ نیلا۔ رات کالی۔ دن اُجلا۔ اور ہوا ٹھنڈی سی تھی۔ اور آج کل بھی وہی سماں ہے۔ تارے نکلتے ہیں چاند گھٹتا بڑھتا ہے۔ سورج طلوع و غروب کے دور میں پھنسا ہوا ہے۔ اس زمانہ میں بھی انسان رات بھر سوتے اور دن بھر جاگتے تھے۔ کانوں کا کام سُننا۔ آنکھوں کا دیکھنا۔ ناک کا سونگھنا۔ اور زبان کا بولنا تھا۔ غذا چبا کر کھائی جاتی تھی۔ اور ہاں غذا کی جتنی مقدار سے پہلے پیٹ بھرتا تھا اب بھی اُتنے ہی نوالے درکار ہیں۔ اس میں ذرہ بھر فرق و تفاوت نہیں ہوا۔ پھر تغیر و تبدیلی کس چیز کا نام ہے۔

یہ تو نہیں کہ اگلے وقتوں میں پانی مٹی۔ لکڑی اور تانبے کے پیالوں میں پیا جاتا تھا۔ اب شیشے کے گلاس چل گئے ہیں۔ اُس وقت زمین پر بیٹھکر روٹی کھائی جاتی تھی اب میز کرسی کا رواج ہے۔ اُن دنوں اونٹ بیل گھوڑے کی سواریاں تھیں آج کل ریل موٹر کار ٹرام کا زور ہے۔ اگر اس کا نام زمانہ کی تبدیلی ہے تو میں اس کو نہیں مانتا۔ کیونکہ میرے نزدیک تبدیلی جب ہوتی کہ بغیر پانی کے پیاس بجھ جاتی۔ کھانے کی خواہش جاتی رہتی۔ نقل و حرکت کے واسطے ریل اور موٹر کا بھی محتاج نہ رہنا پڑتا۔

میرے پیارے جارج سلطان کے قائم مقام تم پر سلام۔ ذرا سُننا اُس دہلی کے در و دیوار کیا پیام دیتے ہیں جس میں قدم رکھتے ہو وہ کہتے ہیں:۔

ہارڈنگ بابا کی خیر۔ تخت گاہ کے ایک تختہ کی دعا لیتا جا۔ بھلا ہو گا۔ شاد رہ۔ آباد رہ۔ تیری اُمیدوں کا چمن پھلے پھولے۔ تیرے ارمانوں کا تختہ سرسبز و شاداب ہو۔

دُنیائے فانی میں جی نہ لگا۔ اس خاک پر ہزاروں دفعہ کرنوں اور شعاعوں کے ہجوم میں جھومتے جھامتے سورج کے جلوس نکلے ہیں مگر شام کو ان کی روشنی ہمیشہ ناپید ہو گئی ہے۔ اپنے فرض کو پہچان۔ جس طرح سورج خلقت کی فائدہ رسانی کے خیال میں اپنی آن بان اور شکل و صورت کو نہیں دیکھتا اور دن بھر خدا کے بندوں اور اُس کی تمام مخلوقات پر نعمتوں کا مینہ برساتا رہتا ہے تو بھی اے اُس بادشاہ کے نائب جس کے ملک میں سورج غروب نہیں ہوتا۔ ان ظاہری کھیل تماشوں میں

مشغول نہ ہو۔ اور رحم و انصاف کی طرف توجہ کر ✦

ان ہاتھیوں سے جن پر تو سوار ہے تیری ذمہ داریاں زیادہ بوجھل ہیں۔ توقع نہ رکھ کہ رعیت تیرے آگے جھکتی ہے یا نہیں۔ تیرے احسان کا بوجھ ان کی گردن کو جھکائے۔ تیری انصاف کاریاں سب کے سروں کو خم کرائیں تو بات ہے۔

آج وہ دن ہے کہ دہلی ظاہری اور نمائشی شان و شوکت کے بدلے باطنی اندرونی دبدبہ و تمکنت کی خواستگاری کرتی ہے۔ پایہ تخت کی خشتی و سنگی عمارات کے ساتھ باشندوں کے دلوں میں محبت و الفت کی بنیاد بھی رکھ۔ تاکہ انگریزی تاج کے ہیروں کو اصلی درخشانی نصیب ہو۔ اور دکھائے کہ تو اس خدا کا سچا اور نیک بندہ ہے جس کی۔ مندر مسجد اور گرجا میں عبادت کی جاتی ہے مسجد و گرجا کی نماز میں شریک نہ ہو۔ مندر کے ناقوس اور شوالے کے گھنٹے سے ہمنوائی نہ کر۔ مگر اے خدایت ہندوستان کے مجازی بادشاہ اپنے دل کو ہر وقت شہنشاہ حقیقی کی باز پرس سے خبردار کرتا رہ۔ بھول مت یاد رکھ۔ تاکہ تیری اور انگریزی قوم کی یاد ہمیشہ نیکی سے برقرار رہے ✦

درکار ہیں مستانے چند

از خطیب ۳۰ اپریل ۱۹۱۵ء

ہوش سے بیگانے چند۔ دین کے دیوانے چند۔ درکار ہیں مستانے چند۔ ترک خانہ کریں۔ میخانہ میں رہیں۔ جام کو لٹکائیں۔ ہاتھ اور منہ کو بچائیں۔ زخموں کے کھرنڈ نوچیں۔ اور مرہم والوں کو دکھائیں۔

بھوک جن کی دوائی ہو۔ پیاس جن کی مائی ہو۔ بے سر و سامانی جن کی مانجانی ہو۔ وہی درکار ہیں۔ وہی اس میدان کے شہسوار ہیں ✦

لوگ کہتے ہیں کہ یکتائی اور توحید کی آواز آندھی کے شور میں دنیا تک پہونچاؤ۔ مجھے وہ چاہیئے جو کہے کہ پیاری گھٹا کی بوندوں میں اس لیلی کا محمل بناؤ۔ جرس بجاؤ۔ گھر گھر پہونچاؤ۔ سوکھی زمین سوندھی خوشبو سے مہک اٹھے۔ گھر والے مستی میں آئیں۔ جھولے ڈالیں۔ گائیں بجائیں۔ آندھی ہوگی تو کواڑ بند کیے جائیں گے۔ آنکھ۔ ناک۔ کان کو ڈھکا جائے گا۔ پھر کیا خاک توحید بتانے کا مزا آئیگا۔

انگریز کا لندن ہو یا ہند کا نندن۔ برہما کا رنگون ہو یا نجد کا مجنوں۔ سب کو پریم نگر لے جانا ہے۔ وحدت کی سیج پر سلانا ہے۔ مگر یہ لڑنے جھگڑنے کی سند نہیں۔ تو تکار۔ چیخ پکار سے حاصل نہیں۔ جو لوگ مناظرہ کی تلوار سے لڑتے ہیں اور اسپر ہادی مہدی بنتے ہیں انھوں نے کتنے کافر مسلمان کیے۔ ان کے آگے کس قدر منکر گردنیں خم ہوئیں۔ تجربہ کہتا ہے۔ ایک بھی نہیں۔ بلکہ انکار بڑھا ضد زیادہ ہوئی۔ بگاڑ کی دیواریں اونچی ہوگئیں۔ نہ عیسائی نے مانا نہ موسائی نے۔ نہ ہندو نے تسلیم کیا۔ نہ آریہ نے۔ نہ سکھ مائل ہوئے نہ پارسی گھائل ہوئے۔ ہاں چرچے بہت رہے۔ روپئے جیبوں سے نکلکر ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر آتے جاتے رہے۔ دسترخوان پر کھانے بھی رنگ برنگ کے آئے۔ نوالے بھی نرم گرم چکنے چپڑے دانتوں پر چڑھے اور معدے میں اترے لیکن دل جان توحید کا ارمان نہ نکلا۔ نہ اس کو کسی نے دیکھا۔ نہ وہ کسی کو دیکھ سکی۔ ہر پیکی گھڑی تکتی رہی۔ کہ پیا کا اشارہ پاؤں تو لیلی کو مسند پر لاؤں ✦

جب ہی تو کہتا ہوں۔ ارے دیوانوں کو بلاؤ۔ مستانوں کو پکارو۔ جو انجمن طلبگار اسلام کے نوکر ہوں۔ جو اپنے مطلوب کی چشم

رضا کو تنخواہ بنائیں۔ کفنی پہنیں۔ ہر ہر جیئیں۔ شام کی مُرلی بجائیں۔ گھر گھر دُہائی مچائیں۔ روتوں کو ہنسائیں۔ ہنستوں کو رُلائیں۔

پوچھو ان کا ذکر کس اخبار میں چھپے۔ کہوں جریدۂ سکوت میں۔ دریافت کرو ان کا خیر مقدم کیونکر ہو۔ جواب دوں کس مپرسی سے نہ کوئی ان کو جانے۔ نہ وہ کسی کو جانیں۔ بس ایک جاناں کی دید ہو۔ اسی کی گفت ہو۔ اسی کی شنید ہو۔ تب دیکھنا ہر گھر میں ہولی دوالی ہر گھر میں عید ہو +

اسلام غیر نہیں۔ ہر آدمزاد کے لیئے خیر ہے۔ اس کو زہر نہ بناؤ۔ خود شکر ہو۔ اسلامی شیر میں گھُل کر فنا ہو جاؤ۔ تب مزے لیکر لوگ پیئیں گے۔ کیا لیکچروں اور مباحثوں کے قم سے مُردے جیئیں گے +

تمہاری سچائی خود بینائی کی محتاج ہے۔ اندھوں کو نہ بلاؤ۔ پہلے اپنی آنکھیں بنواؤ +

سُننا۔ مجھے کس نے پکارا۔ رنگون میں آؤ۔ اور برما کو مسلمان بناؤ۔ ذرا الحمد کا کلمہ یاد کر رہا ہوں۔ اور کلے والے کا دل شاد کر رہا ہوں +

ابھی خود مجھ کو یہ بات معلوم نہیں کہ اس اونچے لا کو کیونکر عبور کروں۔ اس پہاڑ سے اُتر لوں تو دامنوں کو سمیٹکر الّا اللہ کا نعرہ بلند کروں گا۔

مگر ہاں میں نہیں تو کیا اور بھی نہیں۔ بہتیرے مستانے دیوانے موجود ہیں۔ گدگُدانے کی دیر ہے۔ کُلبلانے والے نکل ہی آئیں گے +

تو ہاں اُنھیں کیا کرنا چاہیئے۔ یہ کہ جو گھر بار سے آزاد ہوں۔ وہی میدان میں آئیں۔ برما چلیں جنگل میں منگل رچائیں۔ درختوں کے سایہ میں بسیرا جمائیں۔ ملے تو کھائیں۔ نہیں تو مگن ہو کر سو جائیں۔ عبادت رب ان کا شعار ہو۔ چھوٹا بڑا ادنےٰ اعلیٰ ان کا یار ہو۔ برمی زبان آتی ہو تو واہ ہے۔ ورنہ نظر عشق کی زبان سب سمجھتے ہیں۔ اسی میں بات چیت ہو کوئی دس بولے تو وہ ایک اشارۂ ابرو سے سب کا جواب دیں۔ پانچ وقت کی نماز حلقۂ ذکر و شغل ما سوا کی ضرورتوں سے بےخبری اور ذات الٰہی پر توکّل۔ کوئی بیمار ہو تو اُس کی خدمت کریں۔ اپنے دُکھ کی جگہ اُس کا دُکھ سمجھیں۔ دو جسم ایک جان بن جائیں۔ کسی کے کانٹا لگے تو اپنی پلکوں سے نکالیں۔ کوئی ترشی سے پیش آئے تو یہ اپنے اخلاق کی مٹھائی اُسے کھلائیں۔ بات میں سچ ہو۔ گھات میں سچ ہو۔ غرض جو چیز ہو صداقت و راستی کی تصویر ہو۔ پھر دیکھو۔ کہ کیوں نہ ہر برمی کا دل زلف اسلام میں اسیر ہو۔

وہ جو کہتے ہیں کہ ہم روپیہ دیا کرتے تھے۔ اب بھی دیں گے۔ ذرا ورے کو آئیں میں ان کا مُنہ چوم لوں۔ اور ہو سکے تو ان کے خیال کو بھی بوسہ دوں۔ کہ کار خیر کے لیئے روپیہ جیسی دلنشین چیز کو اپنے سے جدا کرنا چاہتے ہیں +

مگر دلدار من۔ یہ کوچہ دوسرا ہے۔ یہاں روپئے کی ضرورت نہیں۔ نہ انجمن سازی کی۔ نہ غل شور کی۔ نہ ہماہمی کی۔ یہاں تو بس پھٹے پُرانے کپڑے پہننے والے یا چاک گریبان متوالے کام کرسکتے ہیں۔ ان کو ڈھونڈو اور پہلے اپنے رنگون کے مسلمانوں کو مسلمان بناؤ۔ میں بھولا۔ اُن کو یہ بتاؤ کہ وہ مسلمان ہیں اور ایک شرمیلے سجیلے سلطان کے تابع فرمان ہیں۔ وہ جو کھجوروں کے جھُنڈ میں اپنی پیاری بکریوں کو جنگل کے پتے کھلاتے تھے۔ اور دیکھنا لمبے لمبے بال شانوں پر ڈالے سورج سے آنکھ لڑاتے تھے۔ لکڑی پر سہارا دیکر کھڑے ہوتے اور کہتے۔ کھاؤ میری بکریوں۔ کھاؤ میری پیاریوں۔ میں تمہاری چوکسی میں کھڑا ہوں۔ کوئی دشمن تمہارے پاس نہ آنے پائے گا +

اور ہاں۔ وہ جو حرا نامی غار میں جاگتے تھے۔ اور اُمت کے سونے کا سامان کرتے تھے۔ اور وہ جو راتوں کو کھڑے ہوکر

نمازیں پڑھتے اور رخساروں پر آنسو بہاتے اور فرماتے۔ الٰہی میری اُمت کو ہنستا رکھیو اور وہ جو آج بھی آٹھویں دن تمہاری رپورٹ سُنتے ہیں اور جب کوئی بُرائی پاتے ہیں تو اس کو چھپاتے ہیں اور دل ہی دل میں فرماتے ہیں۔ کاش میرے پیارے تو ایسا نہ کرتا۔ ارے میری اُمت کہلا کر تو نے جھوٹ بولا۔ دیکھ فرشتے مجھ پر ہنسیں گے۔ ارے مجھ سے منسوب ہو کر شراب پیتا ہے۔ زنا کرتا ہے۔ جوا کھیلتا ہے۔ دل جان میرا کہنا مان۔ ان سب کو چھوڑ۔ میرا بن۔ میرا بن۔ دیکھ تیرے سبب مجھ کو شرمانا پڑتا ہے۔ فرشتوں کے سامنے نظریں نیچی ہوتی ہیں۔ تو میرا ہو کر میری آبرو نہیں بچاتا۔

یہ سُنیں گے تو ننگوں کے مسلمان اصلی مسلمان بنیں گے۔ اور جب اسلام اپنی اصلی حقیقی شکل میں نمودار ہوگا تو ہر دجود غیر مسلم اس کا شیدا و طلبگار ہوگا +

مگر کہنے کو سب یہی کہتے ہیں جو میں نے کہا ضرورت کرنے کی ہے جو عمل کی بولتی ہوئی تصویر ہو۔ اور عمل کی تکمیل بغیر ترک تعلقات ماسوا اور جنون مخصوص کے محال ہے۔ اسی واسطے تو اس مضمون کے دروازہ میں پہلی صدا یہ لگائی تھی:-

درکار ہیں ستانے چند

غریبوں کا بھی کوئی آسرا ہوتا تو کیا ہوتا؟

از اخبار خطیب ۱۴ ر مئی ۱۹۱۵ء

اگر ہوتا تو خدا ہوتا۔ جس نے سورج کی روشنی۔ دریا کا پانی۔ ہوا۔ آگ۔ مٹی سب کو برابر دی تھی۔ امیر۔ غریب چھوٹے بڑے کا امتیاز نہ رکھا تھا۔ مگر اس نے اپنے وجود کو مخفی کر لیا۔ ہر مخلوق کا سہارا اور آسرا بنا۔ مگر پردہ کے پیچھے رہ کر نظروں سے پوشیدہ ہو کر۔ اور انسان بنا تھا دیدہ باز۔ ظاہری ذریعہ پر مٹنے والا +

اس لیے کشمکش ہونے لگی۔ کوئی بڑا بن گیا کوئی چھوٹا رہ گیا۔ کسی نے اتنی دولت پائی۔ جس کی تھاہ نظر نہ آئی کوئی رات کی روٹی کو ترسا۔ اگرچہ رزق کا مینہ گھر گھر برسا +

میں نے اپنے ملک پر نگاہ دوڑائی تو ایک عالمگیر بے قراری سامنے آئی۔ کوئی نائی کہلاتا تھا۔ پاؤں دباتا تھا۔ خوان سر پر اُٹھاتا۔ حجامت بناتا۔ کمین کہلاتا۔ کوئی قصائی تھا۔ صورت آدمی کی رکھتا تھا۔ مگر ذات میں گھٹیا مشہور تھا کوئی چمار تھا۔ چوڑا تھا۔ کمٹ بُنا تھا۔ غرض بڑے کم اور چھوٹوں کی بھیڑ تھی +

پوچھا بھئی انسانوں میں یہ فرق کیسا؟ جواب ملا۔ قدرت کا یہی دستور ہے۔ کسی کو سنوارتی ہے۔ کسی کو بگاڑتی ہے خدا نے پکارا۔ نہیں۔ تمہاری تکلیفیں خود تمہارے ہاتھوں کی ہیں۔ محنت کرو تو بڑے بن جاؤ گے۔ میرے دربار میں کسب اور کرم کی پوچھ ہے +

نائی نے کہا۔ اے خدا! آج عربی میں یہ حکم سُناتا ہے اور کل سنسکرت میں منو جی کی زبانی یہ حکم بھیجا تھا۔ کہ برہمن

میرا سر ہیں۔ اس لیئے علم و عقل کا کام وہ کریں۔ چھتری میرے بازو ہیں۔ جنگ اور حکمرانیاں ان کے حصّے کی۔ ویش میرا شکم ہیں۔ لین دین کاروبار۔ ان کے ذمّہ۔ شودر میرے پاؤں ہیں۔ خدمت۔ چاکری ان کا کام +

خود ہی ذات پات کی قید لگاتا ہے۔ پھر نئے نئے حکم تبدیلی کے سُناتا ہے +

خدا نے اپنے عربی بندے سے کہلوایا۔ نہیں تمہاری سمجھ کا پھیر تھا۔ میں نے کام بانٹے تھے۔ ذات تقسیم نہیں کی۔ تم سب ایک ہو۔ بشرطیکہ نیک ہو۔ بد میرے ملک میں سب سے چھوٹا۔ نیک سب سے بڑا +

یہ باتیں سُنکر ایک خاکروب گرمی میں جھاڑو دیتے دیتے ذرا سیدھا کھڑا ہوا۔ پسینہ میں غرق۔ آنکھوں کو آسمان کی جانب اُٹھایا۔ اور کہا یہ تو بتا۔ ہمارا آسرا کون ہے۔ صبح سے دوپہر ہوگئی۔ غلاظت اُٹھائی۔ جھاڑو دی۔ کمیٹی کے جمعدار کے ڈنڈے کھائے۔ گالیاں سُنیں۔ اب گھر جاتا ہوں۔ میلی کوٹھری میں پڑنا ہوگا۔ جھوٹے ٹکڑے۔ سڑی بسی دال کھانے کو ملے گی۔ گرم پانی پینے میں آئے گا +

ادھر دیکھ۔ یہ امیر ہیں۔ رات بھر بجلی کے پنکھوں میں سوئے۔ آٹھ بجے جاگے۔ انگڑائی لی۔ آنکھیں ملیں۔ نوکروں کو صلواتیں سُنائیں۔ ناشتہ کیا۔ بیت الخلا گئے۔ نہائے پھر آراستہ کمرے میں آئے۔ شطرنج کا دور ہوا۔ کھانا کھایا۔ گانا سُنا سو گئے۔ شام کو ہوا خوری کے لیئے موٹر آئی۔ لینڈ و منگائی۔ غرض کوئی گھڑی محنت و تکلیف کی نہ پائی +

ایک وہ ایک میں دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے +

خاکروب کا شکوہ ختم نہ ہوا تھا کہ سامنے بیگاری چمار آیا۔ سر پر بوجھ۔ دھوپ میں ننگے پاؤں۔ ساتھ میں سپاہی۔ جلدی چلنے کا تقاضہ۔ اس نے دیکھا کہ خاکروب اور خدا میں گفتگو در پیش ہے تو اس نے بھی آہ کی صدا میں آمین پکاری۔ اور کہا۔ ہے میرے باری۔ ہے میری باری۔ دو وقت سے بچے بھوکے ہیں۔ اندھی ماں بخار میں بلبلا رہی ہے۔ گھر سے روزی کی تلاش میں چلا تھا۔ کہ اس فرشتے کے ہاتھ میں پڑا۔ اس نے طمانچے بھی مارے۔ بُرا بھلا بھی کہا۔ اور جانور کی طرح ہانک کر خبر نہیں کہاں لے چلا +

اتنے میں ایک برقعے والی پاس سے گزری۔ دامنوں میں سیکڑوں پیوند۔ ٹوٹی ہوئی جوتی۔ بغل میں ٹوپیوں کی بقچی۔ بازار گئی تھی بیوپاری نے خریدنے سے انکار کیا۔ اور کہا مندا ہے۔ لڑائیوں کے موسم میں کسی چیز کی نکاسی نہیں۔ حیران پریشان گھر چلی ہے۔ یتیم بچّوں کی بھوک۔ اپنی بیکسی کا خیال کرتی ہے۔ آنکھوں میں آنسو اُبلے چلے آتے ہیں +

دو فریادیوں کو دیکھکر وہ بھی پروردگار کی دہائی دینے کھڑی ہوگئی۔

تین عرضیاں گزریں تو عدالت آسمان نے بغیر سمن جاری کیئے دروازہ کھولا۔ اور کہا میرے بندو! مایوس نہ ہو۔ ہر تکلیف کے بعد راحت ہے۔ میرے دفتر میں امیروں کے عیش بھی لکھے جاتے ہیں۔ اور غریبوں کے مصائب بھی۔ ذرّہ ذرّہ اور نکتہ نکتہ پر بحث ہوتی ہے۔ اس دنیا میں بھی عوض ملتا ہے اور آخرت کے واسطے بھی معاوضہ کی فراہمی ہوتی ہے۔ بے انصافی نہ ہوگی۔ جس کو یہاں نہیں اُس کو وہاں ملے گا۔ اور جو یہاں پاچکا اُس کو وہاں کچھ نہیں +

فریادیوں نے کہا۔ ہمیں محنت اور مفلسی کی شکایت نہیں۔ شکوہ اس کا ہے کہ امیر ہم کو حقیر و ذلیل سمجھتے ہیں۔ پاس نہیں بٹھاتے بات نہیں کرتے۔ آدمی نہیں سمجھتے۔ ستاتے ہیں۔ ٹھکراتے ہیں۔ اور بعضے ہمارے سائے تک سے کتراتے ہیں +

یہ سُنکر آسمان لرزنے لگا۔ ہوا سہم کر دم بخود ہوئی۔ فرشتوں نے کچھ اشارے پائے۔ دوزخ کے انگارے اُٹھائے۔ دوزخ بھی چیں بہ جبیں ہوئی۔ سانپ بچھوؤں کو یورش پر آمادہ کیا۔ جنّت نے دروازے بند کیئے **ایسے امیروں پر حرام**

کے بورڈ لگائے۔ آسمان چہارم پر جناب مسیح نے سُنا۔ غیرت خداوندی کو جوش میں دیکھا۔ تو وہ بھی تھرائے۔ مگر خیر ہوئی کہ انکی اُمت کی ٹکٹی فوج دلاسہ کو دور کھڑی نظر آئی۔ جس نے ہزاروں غریبوں کو سہارا دیا تھا۔ تاہم وہ ڈرے۔ کہیں آج ہی یہ سوال نہ ہو جائے کہ کیوں جی تم نے ان سے کہا تھا کہ مجھ کو خدا کا بیٹا کہنا۔ اُس وقت کیا جواب دوں گا + شرم کے مارے گردن جھک جائے گی۔ غریب پروری کی۔ مگر خدا کے یکتائی راستہ سے بھٹکا دیا +

زمین پر جب غضب الٰہی کی شعاعیں نمودار ہوئیں۔ بصیرت والے گھبرا گئے۔ امیروں اور خودسروں مغروروں پر دانت پیسنے لگے۔ کلیجے پر ہاتھ رکھکر غریبوں کی تکلیف محسوس کرنے لگے +

یکایک حجاز سے برقابی خبر آئی۔ ایک بڑے سلطان نے ہمت بندھائی۔ لکھا تھا۔ ان غریبوں کا آسرا میں ہوں۔ لاچاروں بے سہاروں کا سہارا میں ہوں۔ ایک غریب عورت کا بیٹا ہوں جو سوکھی روٹی کھاتی تھی۔ خدا نے بادشاہ بنایا۔ مگر میں نے رعیت کی طرح وقت گزارا۔ مسکینوں میں رہا۔ مسکین بنا۔ اور مسکینوں میں حشر کی تمنا کی۔

آؤ۔ تم میرے ہو۔ تم چمار ہو یا بھنگی۔ نائی ہو یا قصائی۔ کنجڑے ہو یا جلاہے۔ پھٹے حال ہو۔ مفلس کنگال ہو۔ مگر میرے دل کی ٹھنڈک اور فرزند نونہال ہو۔ تم کو گلے لگاؤں۔ پیار کروں۔ نہلاؤں۔ پاؤں دباؤں۔ پنکھا جھلوں۔ آپ پیچھے کھاؤں پہلے تمہیں کھلاؤں +

ارے خدا کو ایک مانو۔ اس کی مرضی پر چلو۔ پھر تم میرے راج دُلارے ہو۔ آنکھوں کے تارے ہو۔ روپیہ پیسہ کیا چیز ہے مجھ کو ایمان عزیز ہے۔ ایمان عزیز ہے۔ کہنا حسن نظامی سے کہنا۔ ہر دعوی دار غلامی سے ذات پات کی قید اُٹھا دو مغل سید پٹھان کا نام مٹاؤ۔ کمینوں کو اچھوتوں کو پاس بلاؤ۔ بیٹیاں دو۔ ساتھ کھلاؤ۔ ان کا آسرا بنو گے تو خدا کو پاؤ گے۔ ورنہ ہاتھ ملتے قبر میں جاؤ گے +

حسن نظامی نے گردن جھکائی۔ اپنے مالک۔ اپنے داتا کی مرضی سر آنکھوں پر اُٹھائی۔ پہلے خاکروب کے قدم لیئے۔ اسکی کوٹھڑی میں خرقہ بچھایا۔ اور ساتھ بیٹھکر جھوٹی روٹی اور باسی دال کا نوالہ کھایا۔ میرا بھائی۔ میرا بھائی کہکر جی بڑھایا پھر بیگاری چمار کے گھر پہونچا۔ اپنا کھانا اُس کے بچّوں کو بانٹا۔ اُس کی نابینا ماں کو دوا پلائی۔ اور جب تک اُس کا لال بیگار سے اُلٹا نہ پھرا۔ اس کا جی بیمار چماری کو پنکھا جھلنے اور پاؤں دابنے سے نہ بھرا +

برقعے والی عورت کا گھر یاد تھا۔ لوگوں سے کہا۔ اس کی ٹوپیاں خریدو۔ شریف ہے۔ خیرات نہ لے گی۔ اس کا دل نہ ٹوٹے۔ ایسی مدد کرو +

جہاں پناہ۔ ہز میجسٹی۔ امیر دو جہان۔ خاقان الانس والجان۔ سلطان العرب والعجم۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی گورنمنٹ ناظر غیب تھی۔ اس نیت کی کارگزاری سے مسرور ہوئی۔ سبز نشان انعام میں بھجوایا۔ اور فرمایا۔ اس کو کھڑا کرو اور غریبوں سے کہو۔ یہ ہے تمہارا آسرا۔ یہ ہے تمہارا سہارا۔ یہ ہے تمہارا ٹھکانا۔ اس کے نیچے آؤ۔ پھر کوئی تمکو ذلیل حقیر نہ کہہ سکے گا + کسی کو پاس بٹھانے۔ ساتھ کھلانے سے عار نہ ہوگا +

یہ جھنڈا وحدت کا ہے یہاں دوئی نہیں سوائے یہاں کے اور کہیں یکسوئی نہیں

کوئی ہے جو حسن نظامی کی طرح اس حکم پر ایمان لائے۔ اور بھنگی چماروں کے ساتھ کھانا کھانے کو آمادہ ہو جائے جسکو انکار ہوگا۔ قہر خدا کا سزاوار ہوگا۔ زمین اُس کو نگل جائے گی۔ دولت اُس کی چھن جائے گی۔ عزت اُسکی مٹ جائیگی

دربدر رسوا ہوگا۔ پھر بعد کے پچھتانے سے کیا ہوگا +

کہہ دو۔ انسان کا جسم گندہ نہیں۔ **اگر ظاہری ناپاکی** نہ ہو تو ہر ولد آدم پاک ہے۔ شاہ و گدا مساوی بحکم شہ لولاک ہے۔ غریب کے آگے جھکو۔ متکبر امیر کے سامنے اکڑو۔ ٹوٹے دل کو جوڑو۔ سنگین دل کو توڑ دو +

جب غریبوں کا یہ آسرا پیدا ہو جائے گا۔ پھر دیکھنا مسلمانوں کے تمدن۔ سیاست وغیرہ میں انقلابی مزہ آئے گا اور اُس وقت اس سوال کا جواب سمجھ میں آجائے گا کہ۔ غریبوں کا بھی کوئی آسرا ہوتا تو کیا ہوتا؟ جب علم سبز کے نیچے کا ہر بہادر بتائے گا کہ۔ یہ ہوتا۔ یہ ہوتا۔ یہ ہوتا +

شذرات

ہماری بُری نیکیاں

یہ طرز احسان کرنے کا تمہیں کو زیب دیتا ہے
مرض میں مبتلا کر کے مریضوں کو دوا دینا

ہندوستانی بڑے مخیّر ہیں۔ خیر خیرات کرنے میں ان کا درجہ بڑی بڑی دولتمند قوموں سے بڑھ گیا ہے۔ مگر ان کی یہ نیکیاں بعض اوقات بُرائیوں سے بڑھ جاتی ہیں +

ہم دیکھتے ہیں کہ بعض ہندو چڑیماروں کو دام دیکر پرندوں کو آزادی دلایا کرتے ہیں۔ ظاہر میں یہ بڑا نیک کام ہے کہ بےزبان جانور ظالم صیاد کے پنجے سے رہائی پاتے ہیں۔ لیکن درحقیقت جانوروں پر ظلم کرانے کا اور چڑیماروں کو جانوروں کو گرفتار کرنے کا اس سے زیادہ کوئی رغبت دلانے والا سبب نہیں ہوسکتا۔ وہ جب دیکھتے ہیں کہ ہماری ستمکاری کی "نقد داد" ملتی ہے تو وہ اور زیادہ محنت و جستجو سے اپنی سفاکیوں کا سلسلہ دراز کرتے ہیں +

اسی طرح موٹے مسٹنڈے بھک منگوں کو خیرات دینا اُن کو بےکار بنانا ہے۔ ملک میں گداگر والوں کی تعداد بڑھانے کے ذمہ دار زیادہ تر یہی نیک لوگ ہیں جو پہلے لوگوں کو بیمار کرتے ہیں پھر دوا تقسیم کرنے کھڑے ہوتے ہیں +

ایسی بُری نیکیوں کا انسداد لیڈران ملک کو سیلف گورنمنٹ کے حصول سے زیادہ ضروری ہے مگر ہم کو لیڈروں کے بھروسہ پر نہ رہنا چاہیئے۔ جس ملک میں فرض ادا کرنیوالے لیڈر نہ ہوں اُس کا ہر باشندہ اپنے ذاتی فرائض کا ذمہ دار ہے لہٰذا ہندوستانیوں کو اس خیرات ناجائز کی رسم پر نظر ثانی اور زبان و قلم کو حرکت میں لاکر حق العباد کے بارے سبکدوش ہونا چاہیئے +

صبا نے کلیوں کو جگایا

کل صبح باغ میں سوتی کلیوں کو صبا جگاتی تھی۔ شانہ ہلاتی تھی۔ یہاں تک کہ گدگدیاں کر کے ہنساتی تھی۔ یہ جگانے کا نرالا انداز دیکھکر میں نے اُس سے کہا تو بڑی ملنسار ہے۔ برگ گل کے رخسار پر سر رکھ کے بولی۔ تم سیکھو کہ بچوں کو یوں پرورش کیا کرتے ہیں۔ یہ برتاؤ ہوگا تو ہر طفل غنچے کی طرح کھلے گا +

میں اپنی نیند خراب کر کے پہلے بیدار ہوئی۔ جنگلوں۔ پہاڑوں کی تازگی چُنتی۔ دامنوں میں بھرتی یہاں آئی۔ تب ان کلیوں کی خدمت بجا لائی۔ تم خود سورج نکلنے کے بعد تک سوتے رہتے ہو تو بچوں کی تر و تازگی کہاں سے آئے گی +

شمع کا قدِ زیبا

حضرتِ اکبر کی میز پر مومی شمع گورے سنتری کی طرح تنی کھڑی تھی۔ اس کا قدِ زیبا۔ سر سے پاؤں تک سڈول پناجی کو بھا گیا۔ چکنی چپڑی صورت پر دل آگیا۔ چاہتا تھا کہ اس بتِ خاموش کو گویا کردوں۔ اور اپنی محبت کے پھندے میں پھنساؤں کہ کسی نے اسکے سر پر شعلے کا تاج رکھ دیا۔ آہا ہا۔ عالم ہی بدل گیا۔ کلاہ نور میں شمع پیاری کی شکل کیسی دلفریب بن گئی۔ پروانے باغ کی ڈالیوں سے اُڑ اُڑ کر کمرے میں آنے لگے۔

میرا لطفِ دید ختم نہ ہوا تھا کہ جناب اکبر کا شعر کان کی راہ آنکھوں میں سما گیا ؎

زینت مقدمہ ہے مصیبت کا دہر میں   سب شمع کو جلاتے ہیں سانچے میں ڈھال کے

صورت شعر کی حالت القائی نے شمع کو بھی رُلا دیا۔ آنسو بہا کر بولی دُنیا کی زینت چاہنے والے میرے جلاپے کی مصیبت کو دیکھیں۔ قدرِ رعنا زیبائش کے ہاتھوں مٹا جاتا ہے۔ نہ ظاہری ٹیپ ٹاپ ہوتی۔ نہ یہ وقت پیش آتا +

تغیرِ فطرت کا سبب

فطرت ہر وقت تبدیلی و تغیر میں مصروف رہتی ہے۔ انسان کے ذرّاتِ جسم و حواس کو دیکھو وہ بھی سکنڈ سکنڈ میں بدلتے رہتے ہیں۔ پوچھا اس کا سبب؟ ہوش نے جواب دیا ہستیٔ مطلق کے گوش تک رسائی پانے کے لیے رنگارنگ طریقے بدلے جاتے ہیں۔ مگر وہاں ایسے پُر حجاب پردے پڑے ہوئے ہیں کہ اس طرح پہونچ نہیں ہوتی۔ بقول اکبر ؎ نہیں پاتی نہیں پاتی رسائی گوشِ جاناں تک + بدلتی ہے طریقے سو طرح میری خبر اپنا

دُنیا میں دُکھ سُکھ کی تبدیلیاں بھی اسی اُصول کی ماتحت ہیں۔ جو ان تغیرات سے دل برداشتہ نہیں ہوتے اور عبادت رب میں مصروف رہتے ہیں اُن کی خبر گوشِ جاناں تک بلا تردد پہونچ جاتی ہے +

جرمنی کا فلسفہ کائنات

ڈاکٹر ہیگل جرمنی کا مشہور فلاسفر ہے جس کی فلاسفی جرمنی درسگاہوں میں رائج ہے اہل جرمن اس کو افلاطون سے بڑھکر سمجھتے ہیں اور بقول ڈاکٹر اقبال باعتبار تخیل کے ہیگل افلاطون سے یقیناً بڑا ہے +

ہیگل موجوداتِ عالم کی ہستی محدود کی زندگانی اُصول تناقض میں مضمر بتاتا ہے اور کہتا ہے کہ کائنات کے تمام محدود وجود آپس میں کٹتے مرتے اور ایک دوسرے سے دست و گریباں ہوتے ہوئے ایک دن ہستیٔ مطلق میں مل جاتے ہیں۔ جب تک ہستی میں ترکیب تناقض موجود ہے کش مکش لازمی ہے +

اہل جرمنی ہیگل کے اس فلسفہ پر ناز سے کہتے ہیں۔ جو ضخیم کتابوں میں قلمبند کیا گیا ہے۔ مگر ہندوستان میں اس کو بچہ بچہ جانتا ہے ذوق مرحوم نے ایک شعر میں اسی کے قریب ایک مضمون لکھا تھا کہ اس جہان کو اختلاف سے زیب ہے، مگر حضرت اکبر الہ آبادی نے تو ہیگل کے سارے سمندر کو اس طرح اس شعر میں بند کیا ہے جیسے انگریزی بیڑے نے جرمنی بیڑے کو نہر کیل میں کیل رکھا ہے وہ فرماتے ہیں ؎ جہاں ہستی ہوئی محدود لاکھوں پیچ پڑتے ہیں + عقیدے عقل عنصر سب کے سب آپس میں لڑتے ہیں

جرمن والوں کو معلوم ہو کہ ہند میں ہمارا فلسفہ مفتوح ہو چکا ہو تو ان کی حرص فتوحات شکست ہو جائے۔ حضرت اکبر کو تو شاید معلوم بھی نہ ہوگا کہ جو شعر ان کے قلم سے بیساختہ نکلتا ہے اُس پر جرمنی کی تمام ساخت پرداخت منحصر ہے اُنھوں نے اس شعر میں روح و مادہ اوزان کے تمام لوازمات کو کس آسانی سے ادا کر دیا ہے +

ہندوؤں کی مہابھارت کے وقت سری کرشن جی نے جو فلسفیانہ لکچر ارجن کو سُنایا تھا اور جو اب گیتا کے نام سے ہندوؤں کی پوجا پاٹ میں

شامل ہے۔ ہیگل کے اس فلسفہ سے کہیں زیادہ لطیف و پرمعانی ہے +
مسلمانوں کے فلسفۂ تصوف کو دیکھا جائے تو اس کی جزئیات میں ہیگل کے کُلیے بکھرے ہوئے ملیں گے تشبیہ و تنزیہہ کے اشارات میں محدود پیکروں کو وجودِ مطلق کے جلوے علانیہ نظر آجائیں گے +
اسمیں شک نہیں۔ محدود ہستیوں کی باہمی کش مکش فطرت و نیچر کے حکم سے ہے۔ جہاں زہر پیدا ہوتا ہے وہیں تریاق بھی پیدا کیا جاتا ہے۔ گرمی و سردی خشکی و تری نیکی و بدی۔ نور و ظلمت، جُڑواں پیدا ہوتے ہیں۔ کیونکہ قدرت نے دُنیا کو دارالامتحان بنایا ہے۔ جہاں سلیم الفطرت انسانوں کو آزمائش کے بعد منتخب کیا جاتا ہے۔ پس ہستی مطلق کے دربار میں مقبولیت انہی کی ہے جو نیچر کی مقررہ حد توازن سے آگے نہیں بڑھتے۔ اور اس توازن کو تقدیرِ الٰہی سمجھکر مصائب پر صبر اور تعیش پر شکر کرتے ہیں۔ ان کا قدم ظلم و زیادتی کی جانب جنبش نہیں کرتا۔ کیونکہ وہ ہستی مطلق کے آداب و سامان کا عرفان رکھتے ہیں +

آرام کہاں ہے؟

نئی روشنی اور پُرانی روشنی بحث کر رہی ہے۔ کہ انسان کی آسایش و راحت خودی میں ہے یا بیخودی میں؟ ایک فریق کہتا ہے۔ خودی مٹانے کا عقیدہ عیش و زندگانی کا دشمن ہے۔ دوسرا بیان کرتا ہے زندگی کی حقیقی کامرانی خودی میں میسّر ہی نہیں آسکتی +
یہ کیسی مشکل بات ہے۔ یہ لوگ تو آپس میں علم کے ہتھیاروں سے لڑتے ہیں۔ اور بے علم جینے کے مزے کو کھڑے ترستے ہیں۔ ان کے لیے حضرت اکبر الٰہ آبادی نے کیا خوب مثال ارشاد فرمائی کہ نیند دن بھر کی محنت کے بعد ذریعۂ آرام ہے۔ مگر اس آرام میں آدمی کی خودی باقی نہیں رہتی جب بے خود ہوتا ہے تو آرام پاتا ہے +

روح و اجل کے دامن

موت و حیات دیکھنے اور کہنے میں دو اور حقیقت میں ایک ذات ہیں کیونکہ ذات واحد کی فرستادہ ہیں۔ جو لوگ موت سے ڈرتے ہیں اور حیات پر مرتے ہیں اُن پر اجل جنگل مارتی اور حیات اُن سے دامن بچاتی ہے اور جن کو خدا سے سروکار ہے جو خالق لیل و نہار ہے اُن کے لیئے اجل کے دامنوں میں حیات بستر بچھاتی ہے۔ اور جب وقت موعود آتا ہے۔ روح رواں بستر اُٹھا کر روانہ ہوجاتی ہے۔ اور اجل اپنے خالی دامن کو جھاڑتی چلی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مومن کو مرنے میں اذیت نہیں ہوتی اور وہ اجل کے صرزیورش سے محفوظ منزلِ مقصود پر پہونچ جاتا ہے۔ ؎ (اکبر)

برباد کیا اجل نے ہم کو کیا یہ کہیے + روحِ رواں نے اپنے دامن کو جھاڑ ڈالا

موج پر کائی نہیں جمتی

بند پانی اور بہتے دریا کی جنس ایک ہے۔ شکل ایک ہے۔ ظاہر ایک ہے۔ باطن ایک ہے۔ مگر آب مقیّد پر کائی چھا جاتی ہے۔ اور موج رواں ہمیشہ سورج سے آنکھ لڑاتی ہے۔
اسی طرح جو آدمی کچھ کام نہیں کرتے تو اُن کی لیاقتیں دل کے دل ہی میں ارمانوں کو مسوس کر مرجاتی ہیں اور جو دین دُنیا کے مشاغل میں رواں دواں رہتے ہیں وہ اوجِ فلک پر سورج بنکر چمکتے ہیں +

میں نہیں ڈوبا

طوفان کشتیوں اور جہازوں کو ڈبوتا ڈبوتا مجھ تک آیا۔ میں ایک بلبلا تھا۔ اور پانی میں تیر رہا تھا۔ اُس نے چاہا۔ مجھ پر حملہ کرے۔ اور وہ کف مُنہ میں لیکر میری جانب بڑھا۔ مگر میں اطمینان سے اُس کو دیکھتا رہا۔ وہ مجھ تک پہونچا بھی نہ تھا کہ پانی نے میری خودی کی ہوا کو شکست دی۔ ہوا فرار ہوئی۔ اور میں پانی ہوگیا۔ طوفان سر پر آیا تو مجھ کو نہ پایا۔ بہت گھبرایا۔ آخر کسی نے سمجھایا۔ خودی کے متوالے ڈوبتے ہیں۔ حباب بیخود ہوگیا۔ اب تو اُس کو کہاں پاسکتا ہے +
دُنیا کے رہنے والے اس مثال کو سُنکر اپنے حریفوں سے مطمئن ہوئے۔ اور اُنھوں نے بھی اپنے اندر کی ہوائے نفسانی کو نکالنا شروع کردیا

اُس وقت میں سمجھا کہ میں اخبار کے دریا میں غرق نہیں ہوا۔ بلکہ لوگوں کو ڈوبنے سے بچایا ✦

کچی نیند کی آنکھیں

ان کی عمر جوانی کی تھی۔ یہ بیداری میں خام تھے۔ نیند کی غفلت میں پختگی کے سوا ان کی ہر ادا کچی تھی۔ سوتے میں انھوں نے کیا پی لیا ہے۔ آنکھیں کھل گئی ہیں۔ مگر کسی نشہ سے بند ہوئی جاتی ہیں۔ دیکھنا۔ ڈیلوں کی سفیدی میں سرخی کیسی نشیلی ہے اور پلکیں کیسی بے قابو ہو ہو کر لڑکھڑا رہی ہیں۔ پتلی کی بیقراری پردہ کے اندر کی چھپی باتوں کو رُک رُک کہنا چاہتی ہے۔ مگر زبان یاری نہیں دیتی ✦

ذرا پوچھنا۔ تم کو عورتوں کی تعلیم و بے پردگی کی بھی کچھ خبر ہے۔ ہندوستان میں عورتوں کو آزاد و بے باک بنانے کی تجویزیں ہو رہی ہیں۔ لیکن کچی نیند کی آنکھیں خود صورت مثال اور زبان حال ہیں۔ مرد مکمل ہو جاتے۔ گویا نیند پوری ہو جاتی۔ اس وقت عورتوں کو جگایا جاتا۔ وہ بے چاریاں پہلے ہی کچی ذات ہیں۔ کچی نیند میں اُٹھائی جائیں گی تو خود بھی گریں گی دوسروں کو بھی گرائیں گی ✦

عالم اسباب

یہ دُنیا عالم اسباب مشہور ہے۔ اس میں ہر چیز دوسری چیز کی ماتحت و محتاج بنائی گئی ہے ✦ صرف انسانوں پر نظر کی جائے تو ہر فرد دوسرے کا دست نگر معلوم ہوگا۔ جس طرح ایک مفلس و غریب آدمی دولت مندوں کا محتاج ہے اسی طرح دولت والے غریبوں کی امداد کے ضرورتمند ہیں۔ خواہ کیسا ہی بڑا فاتح خود مختار شہنشاہ ہو اپنے نوکروں اور ماتحتوں کی مدد بغیر کچھ نہیں کر سکتا اور اس کی عزت و ناموری گمناموں کے عمل پر منحصر ہے ✦

اس سلسلۂ ضروریات کی باہم وابستگی اور ایک دوسرے کی احتیاج قدرت کا بہت بڑا راز ہے یہ نہ ہو تو مخلوق میں خالق کی ہمسری دعوٰی پیدا ہو جائے۔ جب مغرور ہستیاں .... عالم اسباب کی مجبوریوں سے کمتر ہستیوں کے آگے ہاتھ پھیلاتی ہیں تو خودی و نخوت کے نشے ہرن ہو جاتے ہیں ✦

مذہبی کتابوں سے پتہ چلتا ہے کہ خدا تعالیٰ کو شرک بہت ناپسند ہے۔ آثار نیچر میں بھی نظر آتا ہے کہ انسان و حیوان شرکت غیر سے گھبراتے ہیں۔ اسواسطے قدرت نے نہایت لطافت و باریکی سے ہر وجود کا سلسلہ دوسرے وجود کے ساتھ اس ترکیب سے ملایا ہے کہ ضروریات کی تکمیل کے بعد ہر ہستی اپنے کام میں آزاد ہو جائے اور شرکت کی تکلیف میں مبتلا نہ رہے پس اگرچہ کائنات میں اشیاء باہم ایک دوسرے کی محتاج ہیں لیکن ادائے حقوق کے بعد ان کو آزادی ملنی لازمی ہے ✦

چھٹی منزل

درسِ عبرت

نزع کی بیقراری

جس قوم کا زوال قریب ہوتا ہے وہ موت کو وقت کو بھول جاتی ہے یا جان بوجھکر مرنے کا خیال سامنے نہیں آنے دیتی۔ تاکہ عیش زندگی کرکرا نہ ہو۔ قلعۂ دہلی کے قصے مشہور ہیں کہ اُن مغل بادشاہوں کی اولاد جنھوں نے ہمیشہ دریائے مرگ کے کنارے کھڑے ہو کر ملک فتح کیے اب آخر زمانہ میں ایسی ہو گئی تھی کہ اگر کوئی اُسکے سامنے کلمۂ توحید پڑھتا تو وہ کانوں میں اُنگلیاں دے لیتی تھی تاکہ وہ چیز جو مرتے وقت پڑھی جاتی ہے کانوں میں نہ پڑے۔ سورۂ یٰسین کو قلعۂ دہلی کی بیگمات بناوٹی کے نام سے یاد کرتی تھیں یعنی مار ڈالنے والی سورت۔ اکبر شاہ ثانی اور بہادر شاہ بادشاہ کا یہ عالم تھا کہ وہ جب درگاہ حضرت محبوب الٰہیؒ کی زیارت کو آتے تو محمد شاہ بادشاہ کی مقبرہ پر پردے ڈلوا دیے جاتے تھے کیونکہ امیروں وزیروں کو خوف تھا کہ کہیں بادشاہ کی نگاہ بادشاہ کی قبر پر نہ پڑجائے اور زندگی کے انجام کا رکا دھیان ان کو تکلیف نہ دے +

نتیجہ یہ ہوا کہ موت ان سب کو کھا گئی عیش وعشرت ملیامیٹ ہو گئے اور آج اُن کی خوابگاہوں میں یورپ والے جوتیوں سمیت سیر کرتے پھرتے ہیں +

یہ بڑی خوف کا مقام ہے انسان کو ہر وقت آخری منزل کا کھٹکا دل میں رکھنا چاہیئے۔ ہمارے آقائے نامدار مقبول پروردگار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جو شخص رات دن میں چالیس مرتبہ موت کو یاد کرلے وہ شہید کا درجہ پائے گا۔ اس کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ شہید کو تو ایک دفعہ موت کا مزا چکھنا پڑتا ہے مگر جو شخص رات دن میں چالیس دفعہ موت کا خیال کرے تو وہ گویا ہر بار موت کا مزا چکھتا ہے اس لیئے اُس کا رتبہ شہید کی برابر ہو تو کیا تعجب ہے +

ہمارے رسول صلعم موت کو اس قدر قریب جانتے تھے اور ہر وقت مرنے کے لیئے اتنے آمادہ رہتے تھے کہ اگر آج کل کے آدمی اس کا ذکر سُنیں تو حیران ہو جائیں۔ ایک دفعہ آپ نے چاروں اصحاب رضوان اللہ علیہم اجمعین سے دریافت کیا کہ تم موت کو کتنا قریب سمجھتے ہو۔ حضرت صدیق اکبر نے عرض کی صبح کی نماز پڑھنے کے بعد مجھ کو امید نہیں رہتی کہ ظہر کی نماز تک زندہ رہوں گا۔ فاروق اعظم نے کہا کہ میں ظہر پڑھ کر عصر کا وقت ملنے سے نا اُمید ہو جاتا ہوں۔ عثمان غنی بولے مجھ کو عصر کے بعد مغرب کی آس باقی نہیں رہتی۔ حیدر کرار نے التماس کی کہ مغرب ادا کرنے کے بعد عشا کا بھروسا نہیں ہوتا یہ سُنکر ہمارے آقا رسول نامدار نے ارشاد فرمایا کہ قسم ہے اُس ذات کی جس کے قبضہ میں محمدؐ کی جان ہے۔ جب میں نماز میں دائیں طرف سلام پھیرتا ہوں تو مجھکو بائیں جانب گردن پھیرنے کا یقین نہیں ہوتا۔ اور خیال آتا ہے کہ ممکن ہے کہ اس سے پہلے موت آجائے +

جنکو مرنیکا اتنا یقین تھا وہ آج کا کام آج ہی ختم کر دینا چاہتے تھے۔ اسواسطے ان میں نہایت مستعدی جفاکشی اور استقلال کے اوصاف پائے جاتے تھے۔ اب ہم لوگوں کا یہ حال ہے کہ کالر نکٹائی لگا کر بوٹ پہنکر ہوا خوری کو نکلتے ہیں اور رستہ میں کوئی جنازہ مل جاتا ہے تو منہ پھیر لیتے ہیں ہمکو ڈر ہوتا ہے کہ مرنیکا خیال ہمارے دماغ کو مضمحل کر دیگا اور ہم کچہری کا کام اچھی طرح نہ کرسکیں گے مگر کاس ہمکو بہادر شاہ کی مذکورہ مثال سے عبرت ہے جنھوں نے دماغ کی حفاظت میں ملک غارت کر دیا۔ یقین جانو اگر ہم موت کی خوف سے اس کو بھولنا یا بھلانا چاہینگے تو ہماری ہستی ناپید ہو جائیگی اور فنا ہمارے بقائے ظاہری کو نابود کر دے گی +

یہ جتنے امیر اور روپیہ والے لوگ ہیں یا جس قدر تاج و تخت کے مالک کہلاتے ہیں موت کے نام سے ان کا دم فنا ہوتا ہے۔ مرنے کا ذکر کرو تو ان کے چہرہ پر ہوائیاں اڑنے لگتی ہیں بات کا گراں
ذکر کرنے لگتے ہیں لیکن ان بدنصیبوں کو خبر نہیں موت کا وقت قریب آرہا ہے وہ ایک دن ان کی گردن مروڑ کر رکھ دیگا انکا یہ مال دولت تاج و تخت دوسروں کے حصہ میں تقسیم ہو جائیگا۔
اس دن یہ چار گز کپڑے کے کفن کو دوسروں کے محتاج ہوں گے اور جو لوگ ان کی خیرخواہی میں پسینہ پر خون گرانا چاہتے ہیں چھوٹی خبریں کہ ان کے ہاتھوں سے بچنا ہوں پر ظلم کراتے ہیں وہ بیک بیک
مدد گور قبر کی اندھیری کوٹھڑی میں پھینک کر چلے آئیں گے جہاں نہ برقی لیمپ ہونگے نہ گیس کے ہنڈے البتہ دوزخ کی آگ کے شعلوں اور قہر خدا کے شراروں اور عذاب کے فرشتوں کی
چمکتی ہوئی خوفناک آنکھوں کی روشنی ضرور ہوگی ✦ لوح محفوظ اور افق مشرق کے حجابات اٹھ جائیں تو میں ان کو وہ سب کچھ دکھا سکتا ہوں جو میری آنکھیں دیکھتی ہیں گئے مدتران
پردوں کی ڈیوڑھی پر کھڑی ہے کسی کو چھپے ہوئے بھید تک جانے نہیں دیتی اور جا کر ہیں ان کو کہنے نہیں دیتی کس کے لیے یہ وقت آخر آپہنچا کوچ کی تیاری کرو ریل کا لارم کلیر ہو چکا اور تمہارا تک بستر بھی نہیں باندھا
یہ جو عشرت کا تو نہیں کمانی وارننگ پر پڑی خرانٹی لڑی ہیں یہ جو تفریح اور ہنسی خوشی کو باعث زندگی سمجھتے ہیں بیٹھ یوپ میں بیٹھ کر تمہاری لیے کتابیں لکھتے ہیں کہ خوب سمجھو مرنا ہوگی موت کا فکر پاس آنے دو وشبیہ مستانہ ہوگئے
سب کے سب نزع کی بیقراری میں بہت جلد گرفتار ہونے والی ہیں اس وقت ان کی زبان بند ہو جائیگی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائیں گی ایڑیاں رگڑیں گی ٹانگیں پیٹ جینیں اور ہنسلی سے کبھی ہٹیں گے کبھی پھیلائیں گے یا یہ دوست یار بچوں والے دوست
گھر بار کو حسرت و یاس سے دیکھینگے سانس سینے میں ٹھوکریں کھائے گا بدن ٹھنڈا پڑ جائیگا دم کھینچ کھینچ کر آنکھوں میں آئے گا اور ان میں نشتر چبھو دیگا جس طرح زندگی میں دوسروں کی دل آزاریاں کرتے تھے ان کو دکھ پہنچاتے
جانوں کو بیگناہ برباد کرتے تھے تاج و تخت کی ہوس میں غارت بے ظلم و ستم جفا کاری خونریزی ان کا شیوہ ہو گیا تھا آج انکی آنکھوں کے حلقوں میں حساب کتاب کے دفتر کھولے جائینگے آج ان کو معلوم ہوگا کہ جس سے دیتے تھے
گھبراتے تھے چھوت کا انتظام کرتے تھے صفائی اور ڈس انفکشن پر توکل کرتے تھے وہ کسی سے نہ رکی اور آگیا ہے سارا سامان دھرا رہ جائیگا ایک بھی ڈاکٹر نہیں ہے جو جان کو بچائے اب کوئی پہرہ والا نہیں ہے جو موت کے
فرشتہ کو اندر آنے سے روکے اس گھڑی کس کی مجال ہے کہ دم لے ایسی حد یا ایسی ہی موت کی بلا کو ٹال دے اسباب لشکر انیا سب ہیچ ہو گئیں سب ہی طراریاں عاجز آگئیں۔ قصہ مختصر موت یاد رکھنے کی چیز ہے ہندوستانیوں کی سب سے بڑی حد
یہ ہے کہ ان کو یہ وقت آخر بار بار یاد دلایا جائے۔ اگر ان کو کوئی کام کا آدمی بنانا ہے تو صاف صاف کہنا چاہئے کہ جتنی زندگی ہے اس کو غنیمت جانو اور نیکی و پارسائی سے کام کرو۔ وقت ضائع نہ کرو۔
کل خبر نہیں کیا پیش آجائے۔ جو کچھ کرنا ہے آج ہی کر لو ✦

سکرات موت کی ہچکیاں

گرمی کے موسم میں محمد شاہ بادشاہ پائیں باغ کے حوض پر شام کے وقت محفل جمایا کرتا تھا۔ حوض میں گلاب کیوڑے کے فوارے چھٹتے۔ در و دیوار پر خس کا عطر چھڑکا جاتا تھا۔ پری چہرہ خواصیں عیش پناہ بادشاہ کو برابر پنکھا جھلتی رہتی تھیں۔

ایک دن گل خانم نام ایک گجراتی چھوکری عطر کا کنستر لیے دیواروں پر عطر چھڑکتی پھرتی تھی کہ بادشاہ محل سے برآمد ہوگئے۔ یہ لونڈی نئی آئی تھی۔ گجرات کے حاکم نے بھیجی تھی۔ رعب شاہی سے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ بے اوسان ہوگئی۔ اور کنستر ہاتھ سے چھوٹ گیا اور ٹوٹ گیا۔ بادشاہ بالکل قریب آگئے تھے انھوں نے دیکھا ایک سترہ سالہ کنیزہ مظلوم صورت بنائے سہمی ہوئی کھڑی ہے۔ کبھی شکستہ کنستر کو دیکھتی ہے۔ کبھی بادشاہ کی صورت کو۔ شاہی عادت لگ گئی پوچھا گیا۔ کیا حال ہے؟ بولی شیشۂ کامرانی ٹوٹ گیا۔ جمال سلطانی امید کے شکستہ شیشوں کو جوڑ دیا کرتا ہے دیکھتی ہوں یہ شیشہ بھی جڑتا ہے یا نہیں؟ لطیفہ پسند بادشاہ کو یہ برجستگی اور حاضر جوابی بھا گئی۔ فرمایا۔ نام کیا ہے؟۔ عرض کیا "نشیمن بلبل"۔ اب تو بادشاہ پھڑک گئے۔ بیٹھنے کا اشارہ کیا جھک کر آداب بجالائی۔ اور ہاتھ باندھ نظریں نیچی کر دوزانو بیٹھ گئی۔ ارشاد ہوا بلبل کا نشیمن ایک جگہ نہیں رہتا۔ آج اس گلستاں میں کل اس چمن میں پرسوں کسی اور غنچہ پر۔ عرض کی۔ جہاں پناہ کے اقبال سے یہ لونڈی وہ گل ہے جس کو دیکھکر بلبل پھر کسی پھول کے پاس نہیں جاتا۔ ایک ہی جگہ نشیمن بنالیتا ہے ✦

حکم ہوا اس کو محل میں لیجاؤ۔ نہلاؤ۔ دھلاؤ۔ حرم شاہی بناؤ۔ چند روز کے بعد یہ کیفیت ہوگئی کہ گل خانم تمام محل کی بیگمات سے زیادہ منظور نظر بن گئی۔ ایک لمحہ کے لیئے بادشاہ اپنی آنکھ سے اوجھل نہ ہونے دیتے تھے۔ ایک برس تک یہی عالم رہا۔ دوسرے سال سردی

کے موسم میں گل خانم بادشاہ کے پاس تھی۔ کروٹ جولی تو بچھونے میں کوئی چیز چبھی اور پسلیوں میں جلن ہونے لگی۔ پاس ادب مانع تھا ضبط کیا مگر نہ ہو سکا بے اختیار مُنہ سے اُف نکل گئی۔ بادشاہ گھبرا کر پوچھنے لگے خانم کیا ہوا۔ خیر ہے؟ بولی جہاں پناہ خاطر جمع فرمائیں کچھ تردد کی بات نہیں ہے۔ دل کے پاس کوئی چیز خلش کرتی ہے۔ حضور نے اُسی وقت پہرہ والے کو آواز دی۔ لونڈیاں حاضر ہو گئیں۔ شمع قریب لائی گئی۔ بچھونے کو دیکھا تو ایک چھوٹا سا نشتر چارپائی میں اس قرینے سے رکھا ہوا تھا کہ نوک کروٹ لینے والے کے چُبھ جائے۔ فوراً گل خانم کی گرم صدری اُتاری گئی۔ دیکھا دل کے پاس ایک ہلکا سا زخم ہے۔ حکیموں۔ جراحوں کی طلبی ہوئی۔ آن کی آن میں سب حاضر ہو گئے۔ تفتیش سے معلوم ہوا کہ کسی بیگم نے رشک و حسد سے زہر کا بجھا ہوا نشتر رکھوا دیا تھا۔ وہ چُبھا ہے۔ اب جان کی خیر نہیں کیونکہ دل قریب ہے۔ زہر اثر کر چکا ٭

بادشاہ ہائے کر کے بے ہوش ہو گئے۔ گل خانم نے البتہ استقلال کو ہاتھ سے نہ دیا۔ گاؤ تکیہ سے لگ کر بیٹھ گئی۔ اپنے تمام زیورات طلب کیے۔ پلی ہوئی آغا مینا کا پنجرا بھی منگوایا۔ اور سب چیزوں کو نگاہ حسرت سے دیکھا ٭

مینا رات کے سبب چُپ تھی۔ اُس سے مخاطب ہو کر بولی:۔ لو پیاری! تمہاری چاہنے والی دُنیا سے رخصت ہوتی ہے۔ اب تم خدا کے حوالے۔ خبر نہیں میرے بعد تم پر کیا گزرے ٭

اتنا بولنے پائی تھی کہ زہر کا اثر خون پر چھا گیا۔ گردن ڈھلک گئی۔ مُنہ میں کف آنے لگے۔ لونڈیوں نے دوڑ کر سہارا دیا۔ حکیم جراح دوائیں لیکر آ گئے۔ مگر اس کا تو کام تمام ہو چکا تھا۔ شاہی خوابگاہ کی آرائش کا کیا کہنا۔ چپّہ چپّہ بہشت کا نمونہ تھا کافوری شمعیں روشن تھیں۔ چھپر کھٹ میں بادشاہ بے ہوش پڑے تھے۔ جن کو خوشبوئیں اور دوائیں سونگھا کر ہوشیار کیا گیا ٭

بادشاہ اُٹھے گل خانم کا سر اپنے زانو پر رکھا۔ اور دو آنسو اُس کے اُوداس چہرہ پر ٹپکائے۔ خانم نے ذرا کی ذرا آنکھ کھولی۔ اور کہا میرے آقا۔ میرے سلطان۔ میرے مالک۔ میرے تاجدار۔ پانی ایک گھونٹ۔ کلیجہ پُھنکا جاتا ہے۔ اِنتے۔۔۔ قام۔۔۔ نہ ا۔۔۔ یا۔۔۔ جا۔۔۔ سکے۔

اُف۔ آہ۔ ہیں۔ آہ آہ۔ پانی۔ پیاس۔ میں جانہار نامراد جاتی ہوں۔ اب اس زانو پر اور۔۔۔۔ تھوڑا سا پانی۔ اس زانو پر اور سر ہو گا ٭

یہ شمعیں ساتھ بھیجدو۔ قبر میں اندھیرا ہو گا۔ میرے زیور میری سوکنوں کو نہ دینا۔ اللہ اللہ۔ اوہ۔ مجھے اُٹھاؤ۔ برف میں ڈال دو۔ آ۔ آہ۔ آگ بدن میں قاتل کو۔ سہاگ۔ مبارک۔ ہم تو چلے۔ وہ بھی ایک دن اسی طرح پھڑکے۔ تڑپے۔ لا الٰہ الا اللہ۔ الا اللہ۔ الا اللہ۔ محمدؐ۔ محمدؐ رسول۔ رسول اللہ۔

یہ کہنے پائی تھی کہ غش آ گیا۔ بدن تھرتھرانے لگا۔ آنکھیں پتھرا گئیں۔ ناک کا بانسہ ڈھل گیا۔ اور زور سے ایک ہچکی سُبکی کی طرح آئی حاضرین نے بادشاہ سے عرض کیا۔ حضور! اب ان میں کیا رکھا ہے۔ دوسرے کمرہ میں تشریف لے چلیے۔ یہ سُنکر بادشاہ نے مرنے والی کا سر زانو سے اُتار دیا اور تشریف لے گئے۔ جانے کے بعد گل خانم کو دو ہچکیاں اور آئیں اس کے بعد سکرات موت اور زندگی کا خاتمہ ہو گیا ٭

اے اس عبرت نامہ کے پڑھنے والو! سب کو یہ وقت پیش آنا ہے۔ اس سے غافل نہ رہو۔ گناہوں سے توبہ کرو۔ اور اُس زندگی کا اسباب راحت خریدو جہاں موت نہیں ہے ٭

(از اخبار توحید میرٹھ ۶ سنہ ۱۹۱۱ء)

ساتویں منزل

الواحِ مزارات وقبور

لوحِ مزار

سیّدنا حضرت امام حسین علیہ السلام

(از اسوۂ حسنہ نومبر ۱۹۱۴ء)

لبیک اے چشم زائر۔ جو ضریح مظلوم کو دیکھتی ہے۔ جو ابن رسول اللہؐ کے روضۂ خاموش گویائی بخش کو دیکھنے اور اپنی پتلی کو ٹھنڈا کرنے آئی ہے سلامتی ہو تجھ پر اے سلام بھیجنے والے کہ تو ایک مردِ حق کی تربت پر کھڑا ہے۔ یہ شہید کربلا کا مرقد ہے۔ یہ اُس شہسوار کا مزار ہے جس کا مرکب دوش رسول بنا تھا۔ یہ اُس فرزند کی قبر ہے جس کو بنت رسول نے جنا تھا +

یہی وہ شہید ہے جس نے سر کٹا کر شہادت کبریٰ کا لفظ پیدا کیا۔ یہی وہ مقتول ہے جس کے قتل نے کروڑوں دل ذبح کر ڈالے +

یہاں وہ ہے جو مکہ کا دل اور مدینہ کا دماغ تھا۔ یہاں وہ ہے جو اسلام کی جان اور مسلمانوں کا ایمان تھا۔ یہاں وہ ہے جس کو بنت رسول فاطمہ بی بی نے چکی پیس پیس کر پالا تھا۔ جس کو دست رسول نے بار بار گرنے سے سنبھالا تھا۔ یہی وہ حسینؑ ابن علیؑ ہے جو زانوئے رسولؐ پر سوتا تھا جس کو دیکھ کر رسول الثقلینؐ کا دل باغ باغ ہوتا تھا۔ شیر خدا علیؑ مرتضیٰ کا لختِ جگر عرب کے سرداروں کا سر۔ عجم کے بے سہاروں کی سپر۔ اپنے باپ کا لائق پسر۔ اپنے فرزندوں کا غمخوار پدر۔

اُس آقا کو سلام کرو جس نے غلاموں کو آزاد کیا۔ اس بادشاہ کے سامنے سر جھکاؤ جس نے تاجداروں کو بادشاہی سکھائی۔ جس نے باج گزاروں کو راحت کی راہ دکھائی۔

یہاں حسینؑ ابن فاطمہؑ آرام فرماتے ہیں جنہوں نے مساوات۔ جمہوریت کی خاطر تلوار کھینچی تھی جو اپنی رائے کی صداقت کے لیے بے وطن ہوئے تھے جن کا ارادہ تلوار نہ توڑ سکی۔ یہ وہی دلیر ہیں جنہوں نے لشکروں اور نیزوں کے ہجوم میں قول صداقت کو پکارا۔ جن کے بچے آنکھوں کے سامنے کٹ گئے۔ مگر یہ اپنی رائے پر قایم رہے۔

یہ وہی کربلا کا میدان ہے۔ یہ وہی فرات کا کنارہ ہے جہاں تیر برسے تھے جہاں خون کا طوفان آیا تھا۔ یہ وہی زمین ہے جس پر بنی فاطمہؑ کے گیسو دراز فرزند مقتول ہو کر گرے تھے۔ یہیں رسول کے جانشین تہ تیغ کیے گئے تھے اسی جگہ وہ جسم مطہر گھوڑوں کے سموں میں روندا گیا تھا جس کو رسول خدا سینہ سے لگاتے تھے یہ امت مرحوم کو ہادی کی تربت ہے یہ گمراہوں کی ہدایت کا خضر خانہ ہے مہبط تیر ہے۔ فسق و فجور پر اس کا نشانہ ہے۔ یہ تسلیم و رضا کی عملی تصویر ہے

اس کا ہاتھ ہر اُمتی کا دامنگیر ہے کہ دین کو دنیا پر مقدم جانے - اور کار دنیا کو مردانہ سعی سے پورا کرے - گھر سے نکلکر جد و جہد میں مصروف ہو مصائب میں صبر و شکر شیوہ بنائے - بھوک پیاس سے گھبرا نہ جائے - خنجر کی دھار کے سایہ میں بھی نماز کو نہ بھولے - یاس و ہراس کی مایوسی میں بھی خانہ داری کے انتظامات کو فراموش نہ کرے + نجات ہے اُس اُمتی کو جو اِن نشانوں پر چلتا ہو +

نوشتۂ خونیں

مزار حضرت علی اکبر ابن امام حسین علیہ السلام

(از اسوۂ حسنہ میرٹھ نومبر ۱۹۱۴ء)

خون کی لڑیوں کا سہرا باندھنے والا دولھا اس پلنگڑی پر سوتا ہے - برچھی کی نوک کو سینہ میں جگہ دینے والا دل و جگر میں بے پناہ بھالے کو پناہ دینے والا - اس قبر میں آرام کرتا ہے -

یہ شہسوار تھا جو کربلا کے گرم میدانوں میں موت سے چوگان بازی کرنے نکلا - یہ صف شکن تھا جس کی تلوار نے دشمن کی آہنی صفوں کو اپنی گرمی سے موم کرکے بہا دیا - یہ وہی آفتاب ہے جس کی دید کی خاطر اُس دن سورج سوا نیزہ پر آیا تھا - یہ وہی ماہتاب ہے جسکے گرد آلودہ چہرہ کو اشتیاق میں حوریں کے دل بیتاب تھے - فلک رسالت کا روشن ستارہ جو برج ستم میں غروب ہوگیا - مستی شباب کا البیلا - بادۂ حق کی نیم خوابی کا نشیلا وہ جس کی چشم سرگیں کے سامنے تلواریں شرما کر گھونگھٹ نکالتی تھیں جس کے قد رعنا کو دیکھکر سیدھے نیزے جھک جاتے تھے - جس کے سینہ کی چیکلان اور مضبوطی فولادی ڈھالوں کو مات کرتی تھی - جسکی گردن خنجروں سے آنکھ لڑاتی تھی - جس کی زلفیں دام بچھاتی تھیں اور اپنے شانوں تک اُلجھاتی تھیں - وہ خمدار گیسوؤں میں شب کو غم کو ٹھوکریں کھلانے والا - وہ انگڑائی لیکر شیروں کو بے اوسان بنانے والا - وہ نعرہ مار کر دریائے فرات کو سہمانے والا اسی خاکستان کی کمین گاہ میں چھپا ہے +

اٹھارہویں برس کی ارمانوں بھری راتوں کو اس نے باپ دادا کے دین پر نچھاور کر دیا - مُرادوں کے جذبات آلود دن اسی بہادر نوجوان نے حق کی قربانی میں نذر چڑھائے - یہی ابن حسینؑ کی تُربت ہے جسنے بیکس ماں باپ کے سامنے خاک و خون میں تڑپ کر جان دی - یہ علی اکبر کا گورخانہ ہے جسنے قصر رسالت میں اپنی زندگی کا چراغ بجھا کر روشنی کی - یہ بنی ہاشم کے فخریہ گیتوں میں مذکور ہونے والا پہلوان ہے جس نے انصاف اور حقانیت کے جھنڈے کو مرتے دم تک اُٹھائے رکھا +

آؤ اپنے کفن پوش شہزادہ کی لاش کے آگے کھڑے ہو کر دُنیا کو آواز دو کہ ہمارے سرداریوں حسینؑ کیا کرتے تھے - اولاد والے باپوں کو دکھاؤ کہ ابن رسول اللہ کی اولاد اس طرح حق کی حمایت کرتی تھی - آنکھوں والوں کو بُلاؤ - اہل دل کو جمع کرو - بے صبری ماؤں کو بُلا بھیجو - یہاں دو نوجوان کا خزانہ دفن ہے - یہاں خدا کو دل دینے والا چلّہ نشین ہے - یہاں غمگین ماں کا لاڈلا دُنیا سے مُنہ موڑے پڑا ہے - کوئی ہے جو مسلمانوں کو یہ منظر خونیں دکھا کر نصیحت کرے کہ سچے لوگ سچائی کو اس طرح پرورش کرتے ہیں - جوان ایسی پاک شراب پیتے ہیں ارمان والے یوں اپنی آرزوئیں نکالتے ہیں یہ سرفروشی مُلک کی خاطر نہ تھی دولت دُنیا کی غرض سے نہ تھی - نام نمود کے لیئے نہ تھی بلکہ فسق و فجور اور نفسانی جذبات کے مقابلہ میں حق اور راستبازی کی حمایت کرنے میں اپنے باپ کے اس نور نظر نے جان دی +

لوح مزار حضرت علی اصغر ابن سید امام حسین علیہ السلام

اس ننھی سی قبر میں ایک معصوم شہید پڑا سوتا ہے - جو باپ کی گود میں تیر ستم کا نشانا بنا - نام علی اصغر ابن حسینؑ بن علیؑ ابن ابیطالب رضوان اللہ علیہم اجمعین

یہ بے وطن قافلہ کے سردار کا لخت جگر ہے۔ یہ مدینہ کی نشانی ہے جس کو فیوں نے اس دشت بے کسی میں بے نشان کر دیا +
اس کا جرم یہ تھا کہ بے گناہ باپ اس تین دن کے پیاسے کیلیئے پانی مانگنے گیا تھا۔ یہی اس مقتول کی خطا تھی کہ وہ مظلوم باپ کی گود میں تھا۔
اس کے اُس نازنین حلقوم کو اسی خاک میں دفن کیا گیا ہے جس میں تیر کی نوک نے شگاف ڈالا تھا۔ یہاں وہی چھوٹا سا لاشہ مدفون ہے جو باپ کی گود میں خون کا پانی پیکر تڑپتے تڑپتے جنت کو چلا گیا۔ یہ اپنی ماں کی گود سے کربلا کے ہولناک ایام میں جدا ہوا۔ یہ اس سخت دن کا شہید ہے جب کہ امت ہوس دنیا میں اپنے رسول کی اولاد کو ظلم و جور سے ذبح کر رہی تھی۔ یہ خاندان نبوت کے صبر کی امانت ہے۔ اس کو مسلمانوں کی نصیحت کے لیئے یہاں رکھا گیا ہے تاکہ وہ سمجھیں کہ اولاد کے لیئے جھوٹ بولکر دغا بازی سے حقوق غصب کر کے مال فراہم کرنا بد ترین گناہ ہے۔ یہ بھوکی پیاسی خاک و خون میں نہائی ہوئی ننھی سی لاش مسلمانوں سے کہتی ہے کہ وہ بھی میرے باپ کی طرح حق اور صداقت کو ہاتھ سے نہ دیں اور اولاد کی خاطر خود دوزخ کے کُندے نہ بنیں +
دیکھو۔ علی اصغرؑ اپنا خون آلود کفن اُمت کے بچّوں کو دکھاتا ہے کہ وہ ماں باپ سے اچھے کپڑے مانگنے چھوڑ دیں اور جو مل جائے اُسی کو ہنسی خوشی پہن لیں۔ مسلمانو! اپنے معصوموں کے سردار کی بات مانو +

لوح مزار

حضرت زینبؓ بنت علی علیہ السلام

ایک شیر کی شیرنی اس مرقد میں آرام فرماتی ہیں جو لٹنے والے کاروان کی سیدہ تھیں جو جلنے والی خیموں کی مالکہ تھیں جنہوں نے اپنے بہادر مگر مظلوم بھائی حسینؑ کو ہتھیار پہنا کر مقتل بھیجا تھا۔ یہی وہ زینب ہیں جن کی آنکھوں نے بنی فاطمہ کی لاشوں کو گھوڑوں کی سموں میں روندا جاتا دیکھا تھا۔ یہ بنی ہاشم کی ایک بیکس عورت کی قبر ہے جس کے ہاتھ موٹی موٹی رسیوں سے باندھے گئے تھے اور جس کو کربلا سے دمشق تک بے چادر اونٹ پر بٹھایا گیا تھا۔ یہی اُس دلیر اور جری خاتون کا مزار ہے جسنے بنی اُمیہ کے بھرے دربار میں ایک مدلل مؤثر اور لاجواب کر دینے والی تقریر کی تھی +
یہ اُس کی تربت ہے جس نے اپنے باپ کی ساری اولاد کٹوا دی۔ مگر سچائی سے مُنہ نہ موڑا۔ اسی خاک میں وہ پاک وجود ہے جس نے بے بس لاوارث کُنبہ کو بے صبری کی وقت میں تسلّی دی اور ہمت بندھائی۔ یہاں ایک مسلمان عورت مدفون ہے جس نے اپنا طرز عمل مسلمان عورتوں کے لیئے ورثہ چھوڑا ہے جس میں صبر ہمّت استقلال کے مال و منال ہیں +
اُس لُٹی ہوئی بنجارن کی قبر پر درود و سلام بھیجو۔ جس نے نانا کی اُمت کی خاطر اپنا سب کچھ نثار کر دیا۔ ادھر اُدھر دیکھنے والی کو دکھا دیا اور سمجھنے والے کو سمجھا دیا کہ حق اور صداقت کی پاسداری میں مسلمان عورتیں ایسی ہمّت دکھایا کرتی ہیں۔ انھوں نے دکھا دیا کہ مسلمان گھرانوں کی مستورات اپنے مردوں کو سچائی پر آمادہ کرتی ہیں۔ اور قول حق سے مُنہ پھیرنے نہیں دیتیں۔ چاہے ان پر کیسی ہی اُفتاد پڑ جائے +
قبر زینبؑ کے نوشتہ لوح کو غور سے پڑھو۔ اور تم بھی اے اس در سے گزرنے والو اپنی عورتوں کو ایسا ہی صابر ہمّتی مستقل مزاج اور گویا بناؤ تاکہ خدا تم کو بھی اپنا بنائے +

آخری دستخط

میرے مضامین کا پہلا حصہ پورا ہو گیا۔ مجھ سے آخری دستخط مانگے جاتے ہیں اور میں یہ سطریں لکھکر دستخط کرتا ہوں +

چار برس سے زیادہ کا ذکر ہے۔ میرے مضامین کا ایک مجموعہ شایع ہوا تھا۔ یہ مجموعہ ایک جسم معطل تھا۔ اس کے سر پیر نہ تھے۔ آنکھیں کانوں کی جگہ اور کان ناک کے مقام پر اور ناک زبان کے موقع پر چسپاں تھی۔ نہ کوئی ترتیب تھی نہ موزوں قرینہ تھا۔ کیونکہ اُس مجموعہ کا مرتب کرنیوالا میں خود اور چند احباب تھے۔ کچھ ہماری ناقابلیت۔ کچھ مضامین کا ایک وقت میں نہ ملنا اس خرابی کی وجہ سمجھنی چاہیئے۔ دوستوں کو جہاں کہیں کوئی مضمون ملا اُنھوں نے کاپی نویس کو دیدیا۔ تقدیم تاخیر۔ موزوں غیر موزوں کا خیال نہ کیا۔ اس پر بھی صدہا مضامین رہ گئے اور وہ اخبار و رسائل نہ مل سکے جن میں یہ مضامین شایع ہوئے تھے۔ خود میرے ہاں ایک بوری ایسے اخبارات و رسائل کی غلطی سے ردی میں چلی گئی جن میں میرے مضامین تھے اور اُن کو ترتیب مجموعہ کے خیال سے جمع کیا گیا تھا +

باوجود ایسی بے ترتیبی و بے سلیقگی کے یہ مجموعہ لوگوں نے پسند کیا اور دو برس کے اندر (غالباً) دو ہزار جلدیں فروخت ہو گئیں۔ اور مانگ باقی رہی۔ لیکن اس طلب کا جواب موجود نہ رہا +

اسی زمانہ میں قلم الفقیر ملک محمد دین نظامی اڈیٹر رسالہ صوفی نے میرے مضامین کا مجموعہ مرتب کیا اور عزیزم مقبول احمد نظامی فطرتی سیوہاروی نے اس پر دیباچہ میرے حالات کیساتھ لکھا۔ یہ مجموعہ کاپی پر آچکا تھا مگر چھاپہ خانہ میں جاکر ضایع ہو گیا۔

اب وہ وقت تھا کہ اخبار توحید کی ضبطی نے ہندوستان میں میرے مضامین کا شوق بڑھا دیا تھا۔ کیونکہ میں نے اخبارات و رسائل میں لکھنا چھوڑ دیا تھا۔ خلقت کے مضطربانہ اشتیاق کو دیکھکر اخبار توحید کے مالک شیخ محمد احسان الحق قادری میرٹھی نے توحید کے پرچوں کو میرے مضامین اخذ کیے اور ان کا ایک مجموعہ چھاپ دیا۔ یہ مجموعہ صرف توحیدی مضامین کا تھا۔ تاہم ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور اس کی ترتیب پبلک کو بہت پسند آئی حقیقت میں انتخاب توحید کی ترتیب تھی بھی ایسی باقاعدہ کہ خواہ مخواہ اچھی معلوم ہوتی تھی۔ اس تجربہ سے بھیا احسان کو جرأت ہوئی اور اُنھوں نے اُسی وقت سے تمام اخبارات و رسائل سے میری مضامین جمع کرنے شروع کیے۔ اور اُن کی ترتیب کو ابواب مقرر کر دیے اسی اثناء میں ملک دکن کے محکمہ تعلیم نے اسکول کے بچوں کے واسطے میرا پہلا مجموعہ منظور کیا۔ اور اسکی خریداری کی باضابطہ اطلاع مجھ کو دی لیکن میں اسکی تعمیل کیونکر کر سکتا تھا یہ تو ایک کتاب بہ زیادہ دوہم تھی یہ معلوم کرکے بھیا احسان نے جلدی جلدی مجموعہ مضامین کا پہلا حصہ مرتب کرکے محمد انوار ہاشمی کے عصر جدید پریس میرٹھ میں چھپوا دیا۔ اور ملا محمد الواحدی کے درویش پریس میں اسکا ٹائٹل چھپوا کر کتاب پوری کر دی +

اس مجموعہ میں انتخاب توحید اور سابقہ مجموعہ سے اقتباس کیا گیا۔ جو مضامین موجودہ جنگ کے سبب خلاف مصلحت تھے اُن کو حذف کر دیا اس کی اخباروں اور رسالوں کے جدید مضامین بھی لیئے۔ مگر وہ اتنے زیادہ تھے کہ کتاب کے بہت ضخیم ہو جانے کا اندیشہ تھا اس واسطے دو حصے کر دیے گئے۔ پہلا حصہ یہ ہے دوسرا تیار ہو رہا ہے جو خدا نے چاہا دو چار ماہ کے اندر چھپ جائے گا۔ برادرم شیخ محمد احسان الحق صاحب نے اسکی ترتیب اور عزیز قلبی محمد انوار ہاشمی نے لکھائی چھپائی اور تصحیح میں بہت محنت کی ہے اور محض اخلاص محبت کی بنا پر مہینوں کی دردسری اُٹھائی ہے اس کا میں شکریہ تو کیا ادا کروں۔ محبت کے کوچہ میں یہ رسم منع ہے اپنی خوشی کا اظہار کرتا ہوں۔ اور خداتعالی کا شکر کرتا ہوں جس نے مجھ کو ایسے بے غرض مخلص دیے +

عزیزم ملا محمد الواحدی اڈیٹر رسالہ نظام المشائخ و اخبار خطیب دہلی نے اس مجموعہ پر جو دیباچہ لکھا ہے وہ نئی طرز کا ریویو ہے۔ امید ہے کہ اس دیباچہ کو دلچسپی سے پڑھا جائیگا۔ میں واحدی صاحب کا بھی احسانمند نہیں ہوں اُنھوں نے بھی حق تعلق ادا کیا۔

دوسرا دیباچہ ملک کے شہرہ آفاق انشا پرداز اور اردو ادب کے عملی خدمتگزار جناب مولوی عبدالحق صاحب بی۔ اے سکرٹری انجمن ترقی اردو اورنگ آباد تحت

محکمہ تعلیمات دکن کا ہے۔ مولانا نے علمدوستی اور اُردو زبان کے ذوق سلیم کی بنا پر ان مضامین کی داد دی ہے خدا اُن کو داد دیگا۔ کہ اُنھوں نے ترقی اُردو کے مقاصد کو ملحوظ رکھکر میری حوصلہ افزائی میں مبالغہ کیا ہے ۔

برادر طریقت مولوی سید غلام بھیک صاحب فقیر اللہ شاہ نظامی بی اے وکیل انبالہ جو میر نیرنگ کے تخلص سے ادیبوں میں شہرت عام رکھتے ہیں سابقہ مجموعہ پر اُنھوں نے ایک دیباچہ لکھا تھا وہ بھی بھیا احسان نے اس مجموعہ میں داخل کر دیا ہے +

ایک غلطی

بھیا احسان سے ایک نادانستہ غلطی اس مجموعہ میں ہو گئی ہے جس کا اظہار ضروری ہے۔ گو ان پر الزام عائد نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ ان کو خبر بھی نہ تھی اور وہ یہ ہے کہ جناب سیماب اکبرآبادی کا ایک مضمون اس مجموعہ میں آ گیا جس کا عنوان "ایک پیسہ" ہے اس کی حقیقت یہ ہے کہ میں نے سیماب صاحب کو اسلامی سکہ کا ایک پیسہ دیا تھا اُنھوں نے آگرہ اخبار میں اسپر مضمون لکھا اور اپنی خداداد قابلیت سے میرے انداز میں لکھا۔ وہ مضمون "طریقت لاہور" میں میرے نام سے نقل کیا گیا کیونکہ اس مضمون پر سیماب صاحب کا نام نہ تھا۔ پیرایہ سے اڈیٹر طریقت نے اس کو میرا سمجھ لیا اور بھیا احسان نے طریقت میں اس کو دیکھکر میرے نام سے مجموعہ میں لے لیا۔

دوسرے حصہ کی دلچسپیاں !

احباب کا خیال ہے کہ اس پہلے حصہ سے دوسرا حصہ زیادہ دلچسپ ہوگا کیونکہ اس میں وہ نئے مضامین زیادہ ہیں جو میں نے آج کل لکھے ہیں اور جنکو ہندوستان میں بہت پسند کیا گیا ہے۔ ان میں قصے اور ظریفانہ مضامین بہت ہی مقبول ہوئے ہیں۔ یقیناً یہ دوسرا حصہ بھی دکن کے اسکولوں میں منظور ہوگا کیونکہ وہ بچوں کی سمجھ کی موافق ہے۔ اور اخلاقی نتیجے بلا امتیاز قومیت کے اس سے نکلتے ہیں +

اپنی رائے

دیباچہ لکھنے والوں نے تو ان مضامین پر رائے زنی کر دی اب میں خود اپنی رائے کے دو لفظ لکھکر آخری دستخط کرتا ہوں +

دلی میں رہنے والے کا یہ کچھ کمال نہیں ہے کہ اُس نے اُردو زبان میں اپنے خیالات کو صفائی سے ادا کر دیا اسواسطے میں ان مضامین کی زبان پر تعریفی الفاظ لکھنے نہیں چاہتا البتہ اپنے ذہن اور تصور کی ستائش کرتا ہوں جس نے میرے قلم سے اُن تخیلات کو کاغذ پر نمایاں کرا دیا اور یہ ستائش خودی کے ذہن اور تصور کی نہیں ہے بلکہ خالق ذہن و تصور کی تعریف ہے۔ وہ نہ ہوتا تو میں بھی نہ ہوتا۔ اور میرا ذہن و تصور بھی نہ ہوتا۔ وہ تھا۔ ہے۔ رہیگا۔ میرا وجود بھی ہوا۔ اور اُس نے جذبات کو مجسم کرکے دکھا دیا +

میں ذکر کرتا ہوں۔ خدا نے مجھے بڑی نعمت دی ہے اور نعمت کا ظاہر کرنا مجھپر لازم گردانا ہے۔ ان مضامین میں بعض اشارہ وہ ہیں جن کو نہ خود میں سمجھا نہ امید ہے کہ آج کل کوئی سمجھ سکیگا۔ لیکن قلم نے کسی طاقت سے متاثر ہو کر ان کو لکھا ہے لہذا وقت آئے گا کہ ان کی سمجھنے والے پیدا ہوں وہ سمجھ لینگے تو میری اپنی اس رائے کی قدر کریں گے اور ان آخری دستخطوں کا مطلب جان جائیں گے جو میں نے خاص اپنی روش تحریر دکھانے کو اپنے قلم سے لکھے ہیں +

یکم جون ۱۹۱۶ع

حسن نظامی

عصر جدید پریس میرٹھ واقع سید محل میں محمد اقبال ہاشمی کے اہتمام سے چھپکر شائع ہوئی

خدا کے مقرر کردہ وقت تک یہ مجموعہ میری یادگار قایم رکھے گا۔

یادگاری میں اپنی علم دوست زوجہ

لیلیٰ خواجہ بانو

کو بھی شریک کرنا چاہتا ہوں، اور یہ کتاب اُن کے نام سے منسوب کرتا
وہ میری معیشت خانگی اور بود و باش علمی و ادبی میں برابر کی شریک ہیں
ان دنوں میں جس قدر حصہ مضامین نویسی اور خدمت قوم میں لے رہا ہوں
خیالات۔ طرز عمل اور طریقہ ادا میں بہت کچھ اس مونس و ہمدم کا دخل ہے

حسن نظامی
۲۱ رجب ۱۳۳۴ھ
۲۵ مئی ۱۹۱۶ء

حجرہ رین بسیرا
درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء
دہلی